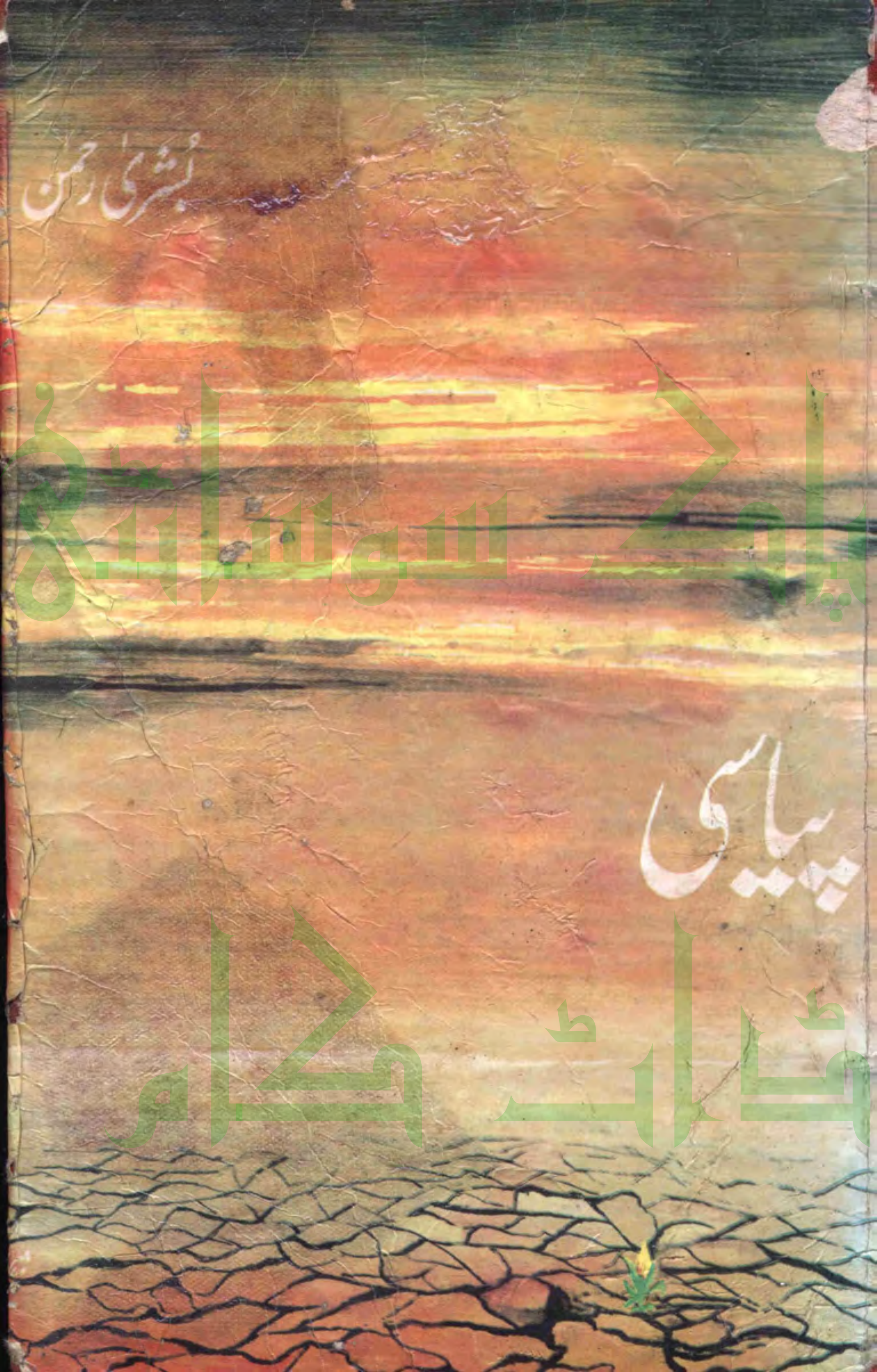

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سفر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عشق نتیں کوئی بھا اولڑی   میں تاں بھل چک وِچ ونج پئیاں
سڑ بجھ گئیاں

شرم و حیا دی چنڑی چولی   میڈی تھی گئی دھجیاں دھجیاں
چُپ کر گئیاں

ماں پیو ویری وڑن نہ ڈیندے   میکو طعنے ڈیون سئیاں
تے کے جھئیاں

یار فرید چا کرم کریں   اُڈ پلڑا در تے پئیاں
جھئیاں کھئیاں

حضرت خواجہ غلام فرید

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوتے تو کمرہ نیم تاریک اور نیم گرم تھا۔ پانچ چھ بستر لگے تھے۔ جن میں کوئی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سب پر نیند اپنا سحر پھونک چکی ہے۔ انہوں نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر توقف کیا تو انہیں لمبی لمبی سانسیں بھی صاف سنائی دینے لگیں۔ حماد کی فطانت نے فی الفور دو اندازے لگا لیے۔

ایک تو یہ کہ کمرے میں مختلف عمروں کے لوگ سوتے ہوتے ہیں۔ معمر افراد کی سانسیں بے سری سیٹیاں بجا رہی تھیں بچوں کی سانسیں ان کی شرارتوں کی طرح نڈر اور معصوم تھیں —— ان میں جوان کون کون تھا۔ وہ فی الحال اندازہ نہ لگا سکا۔ دراصل جوانی میں سانسیں یوں بے قابو نہیں ہوتیں۔ کبھی تو وہ اپنے خوابوں کے پیچھے تیرتے بادلوں کی طرح دم سادھے بھاگتی ہیں اور کبھی ارمانوں کے پالنے کو دونوں ہاتھوں سے تھام تھام کر بے خود ہو جاتی ہیں۔ دوسرا اندازہ اس کا یہ تھا کہ ——

اس گھر کے مکین نچلے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے پھولوں والی چھینٹ کی رضائیاں —— نیم میلے بستر —— چکنے تکیے —— اور بے ڈھنگے پایوں

والی چار پائیوں کے علاوہ کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا فرش بھی حماد کی ذہانت کی گواہی دے رہا تھا۔

مگر کمرے میں زندگی سے بھرپور ایک گرم مہک تھی۔ ایسی مہک جسے نہ تو خوشبو کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ صحیح معنوں میں بدبو ہی کہا جا سکتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی باس ——— جوتوں اور جرابوں کی بو ——— اور انسانی تنفس کی مہک نے مل جل کر کمرے کو ایک عجیب و غریب حرارت آمیز خوشبو بخش دی تھی۔ جو طبع خوش ذوق پر گراں تو گزرتی ہے۔ مگر ایک یخ بستہ رات کے دو ٹھٹھرے ہوئے مسافروں کو زندگی بسر کرنے کا جواز بھی بخشتی ہے۔ تھوڑی سی ناگواری اور مصنوعی خوشگواری کے ساتھ دونوں کمرے کے وسط میں آکھڑے ہوتے۔

اتنی شدید سردی میں انہوں نے کوئی خاص گرم کپڑے نہیں پہنے ہوتے تھے۔ اسمٰعیل کے یونیفارم کا گہرا نیلا کوٹ تو پھر بھی ٹخنوں تک لمبا تھا۔ مگر حماد اپنی اسی درویشانہ حالت میں تھا۔ اس نے اپنا اکلوتا کمبل سارے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اور اس نیم تاریک کمرے میں وہ کوئی گدڑی پوش قلندر لگ رہا تھا۔

اسمٰعیل تھوڑی دیر دم سادھے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے حماد کے کان میں سرگوشی کی۔

"سب لوگ گہری نیند سو چکے ہیں شاید ——— چپ چاپ میرے پیچھے چلے آؤ۔ ہم اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔"

"لیکن ———؟" وہ قدم بڑھاتے ہی رک گیا۔ "میں پہلے منوں کو جگالوں۔ وہی بے چاری اس وقت ہماری مدد کر سکے گی۔"

وہ جلدی سے کونے میں پڑی ہوئی ایک الگ سی چارپائی کی طرف بڑھا۔ حماد نے غور کیا۔ وہ بستر نسبتاً صاف تھا۔ رضائی بھی سادہ مگر صاف تھی۔ سرہانے کی میز

پر ایک سستا سا ٹیبل لیمپ پڑا تھا۔ کچھ رسائل اور کتابیں اس کے تکیئے کے آس پاس بھری پڑی تھیں۔ جیسے کوئی پڑھتے پڑھتے سو گیا ہو۔

اسمٰعیل نے رضائی کا کونہ اٹھا کر جانے اس کے کان میں کیا پھونکا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے حماد نے اس کی لہراتی ہوئی لمبی سی چوٹی دیکھی۔ جو گرم بستر میں اس کی نازک کمر سے لپٹ کر سوئی پڑی تھی۔ اور اب اسے رضائی پرے پھینکتے دیکھ کر جھلا کر یوں الگ ہوئی تھی۔ جیسے لپٹانے والی کی اس شب خیزی پر خفا ہو گئی ہو۔

وہ لڑکی ایک دم گھومی اور اس نے اپنے پاؤں بستر سے نیچے لٹکا دیئے۔ نیند میں ستا ہوا چہرہ اور غلافی بوجھل آنکھیں ——— اس کے سوا اس مدھم روشنی میں حماد کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔

مگر ایک بات نے اسے بہت متاثر کیا۔

اس قدر شدید سردی میں اتنے گرم بستر سے ——— یوں ایک ننھی سی سرگوشی سن کر فوراً اٹھ کھڑے ہونا مستعدی اور خدمت گزاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس عمر میں جب میٹھے خواب پلکوں پہ سائبان بن کر چھاتے ہوں، جوانی بیدار ہوتے ہوتے مچلتی ہے، کسمساتی ہے اور بعض اوقات بدکتی ہے۔

کوئی درد مند لگتی تھی وہ ———

یوں تو اپنے سارے گھرانے کا تعارف اسمٰعیل نے دوران سفر ہی کرا دیا تھا۔ حماد سوچنے لگا ——— آج کی رات ——— کچھ دیر پہلے وہ بالکل اجنبی تھے ——— اور پھر ایک ایسا موڑ آیا جب اجنبیت کی دیوار خود بخود ڈھے گئی اور وہ دنیا سے بے نیاز یوں گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ جیسے انہیں جنم جنم سے ایک دوسرے کی تلاش تھی ——— جیسے وہ ایک دوسرے کا مرہم تھے۔ صدیوں سے سینوں پڑی سلیں

لئے پھر رہے تھے ـــــ اور آج ایک دوسرے سے مل کر انہیں یہ ذہنی سلیں اپنی آنکھوں سے سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے آگہی کے چولے بدل کر ایک دوسرے کا بوجھ بانٹ لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اسمٰعیل جب سے ایس۔ ٹی۔ ای۔ ہوا تھا۔ اور گاڑیوں کے ساتھ آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ملاقات روز نئے اور عجیب و غریب قسم کے لوگوں سے ہوتی تھی بعض لوگ اسی کی مانند اس تسلسل کے ساتھ سفر میں رہتے تھے کہ اس نے ان کے ٹکٹ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا ـــ وہ ان پہ ایک بھروسہ سا کرنے لگ گیا تھا۔ بہتوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی کا یہ حلقہ روز بروز وسیع تر ہو رہا تھا۔

آج کی دوستی بھی ایسے ہی ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ ہوا یوں تھا کہ اسمٰعیل گاڑی کی چیکنگ کے بعد دوپہر کو ڈائننگ کار میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کہ ائر کنڈیشنڈ کوچ کا اٹینڈنٹ ATTENDENT کنڈکٹر گارڈ کو ڈھونڈتا ہوا ڈائننگ کار میں آ گیا۔ اسے کنڈکٹر گارڈ تو نہ ملا البتہ اسمٰعیل وہاں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ اس کے قریب آیا اور بولا۔

"جی! پچھلے سٹیشن سے ایک مشکوک مسافر اے۔ سی میں سوار ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب ـــ؟" اسمٰعیل نے چونک کر پوچھا۔

"یوں لگتا ہے جی، کہ جیسے اس کے پاس اے۔ سی۔ کا ٹکٹ نہیں ہے۔ یونہی سوار ہو گیا ہے۔"

"تمہیں یہ شک کیسے گذرا ـــ؟"

"جی اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا ہے۔ آپ مہربانی کر کے اسے ذرا چیک کر لیں۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔" اسمٰعیل نے بظاہر اطمینان سے کہا۔

"جی، وہ کہیں اگلے سٹیشن پہ اتر نہ جاتے۔"

اسمٰعیل ایک دم کھڑا ہو گیا۔

اے سی۔ سی کی کوریڈور میں جوان لڑکیوں کا ایک غول کھڑا دیکھ کر اسمٰعیل جھجک گیا۔ کیونکہ ان کے درمیان سے گزر کر اسے اس کوچ میں جانا تھا جس کی طرف اٹینڈنٹ نے اشارہ کیا تھا۔ اصل میں کراچی کے ایک کالج کی شوخ و شنگ لڑکیاں اسی ٹرین سے پنڈی جا رہی تھیں۔ آگے انہوں نے مری کی "سنو فال" دیکھنے جانا تھا۔ اس وقت وہ تمام لڑکیاں کوریڈور کے شیشوں کے ساتھ لگی باہر کے کھیتوں اور جنگلی دہقانوں میں جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے جو اسمٰعیل کو اپنی طرف آتا دیکھا تو سب سفر کی بوریت کم کرنے پہ آمادہ نظر آئیں۔ اسمٰعیل کی وجاہت اس کی ریلوے کی نیلی وردی سے ماورا تھی۔ وہ اس وردی میں بڑا اسمارٹ اور بڑا ہی پیارا لگتا۔ خاص طور پر جب وہ نروس ہونے کے بعد اپنی کاسنی رنگ کی مٹیل سے اپنے ہی ہونٹوں پر گل بوٹے بنانے لگتا تو اور بھی بھلا لگتا۔ اس نے EXCUSE ME کہہ کر ان شریر ہرنیوں سے راستہ مانگا۔ تو ایک راستہ دینے کی بجائے راستہ روک کر بولی۔

"بابو جی، ٹکٹ چیک کرنے آئے ہیں؟"

دوسری جلدی سے بولی۔

"بابو جی، اس کا ٹکٹ ضرور چیک کریں۔ اس کے پاس تو ٹکٹوں کا البم ہے۔"

تیسری نے طرح دی۔

"بابو جی! ٹکٹ تو میرے پاس بھی ہیں۔ مگر وہ لفافے پہ لگے ہوئے ہیں۔"

اسمٰعیل کو معلوم تھا اگر وہ یہاں ذرا سا بھی رکا تو یہ بے باک حسینائیں اس کی دُرگت بنا دیں گی۔ یوں بھی وہ بڑا شریف النفس لڑکا تھا اور شریف ہوتے کا دوسرا مطلب بُزدل ہونا ہے وہ زندگی کے تلخ حقائق سے ہٹ کر تمناؤں کو بہلانے کا عادی نہیں تھا۔ اسی لئے لڑکیوں کی باتیں سنی ان سنی کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں اٹینڈنٹ کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

اندر ایک نوجوان جس کے ماتھے پر بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور جس نے کمبل کا حجرا بنایا ہوا تھا۔ جس میں صرف اُس کی گردن باہر نظر آرہی تھی ـــ ایک کتاب پڑھنے میں مستغرق تھا۔ ابھی وہ اس نوجوان سے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ لڑکیوں کا غول اس کے پیچھے ہی اندر گھس آیا۔ دراصل اس کی بوکھلاہٹ نے لڑکیوں کو شہہ دی تھی۔ اور وہ مزید دل لگی کے لئے اس کے پیچھے چلی آئی تھیں۔

وہ لڑکی جس نے سب سے پہلے اسے مخاطب کیا تھا۔ اب بھی لیڈر بنی ہوئی تھی بولی۔

"بابو جی! آپ نے ہمارے ٹکٹ تو چیک کئے نہیں اور ادھر آگئے ہیں"

"مس پلیز! ـــ" بالآخر اسمٰعیل عاجز آتے ہوئے بولا۔

"میں آپ لوگوں کے ٹکٹ چیک کرنے نہیں آیا تھا"

"تو کیا ـــ" ایک گداز جسم والی آگے بڑھ کر بولی۔

"تو کیا آپ اس "چیز" کا ٹکٹ چیک کرنے آتے تھے"۔ اس نے نیم دراز مسافر کی طرف اشارہ کرکے کہا جو بظاہر بے نیاز بنا ابھی تک کتاب میں مستغرق تھا۔

"ناچیز کو "چیز" بنانے کا شکریہ محترمہ!" نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس پر سب لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ اور آپس میں ہائے اُوئی کی آمیزش کے ساتھ کھسر پھسر کرنے لگیں۔

"ارے جانور بھی بولتا ہے" ایک کونونٹ کی انگریزی میں بولی۔

"جانور ہی سہی لیکن ہوں آپ ہی کی قسم کا ـــ"

اس نے بڑی شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

"ٹی اے ٹی ـــ" اسی لڑکی نے دروازے سے مُنہ باہر نکال کر کہا ـــ

"بھاگ کر یہاں ایک چیز ہے جو تمہاری طرح انگریزی بولتی ہے۔ آ تجھے دکھائیں ـــ"

اب پہلی بار اس نوجوان اور اسمٰعیل کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور وہ دونوں معنی خیز انداز میں مُسکرائے۔

ایک لمبوترے سے منہ والی لڑکی جس کے بال کندھوں تک کٹے ہوئے تھے۔ بھاگتی آئی اور خالص انگریزی لہجے میں بولی۔

"پہلے مجھے کہیں سے چائے پلوا دو ورنہ میرا دم نکل جائے گا!"

"کیوں بابو جی؟ چائے مِل سکے گی؟" ایک لڑکی نے شرارت سے اسمٰعیل کی طرف دیکھ کر بولی۔

اسمٰعیل ابھی کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ وہ مسافر بول اٹھا۔

"ضرور ضرور..." پھر اس نے گھنٹی بجائی اور اٹینڈنٹ کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا۔

"مگر ہم تو چائے بابو جی سے پئیں گے" اسی لڑکی نے اسمٰعیل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسمٰعیل جھینپ گیا۔

"پلا دیں گے بابو جی چائے ـــ" مسافر نے اسمٰعیل کی طرف سے بول کر اسے سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ "ایک چائے پر ہی کیا موقوف ہے اس ساری گاڑی کی مالک آپ ہیں۔ اور کوئی حکم ـــ؟"

مُسافر نے ایسے انداز میں کہا۔ کہ اپنی تمام تر شوخی اور حاضر جوابی کے باوجود لڑکیاں جھینپ گئیں۔

"مگر جس طرح تم بابو جی کو دیکھ رہی ہو اس کا تقاضا تو یہی ہے۔ آج تم ہی انہیں چائے پلواؤ ـــ" دوسری لڑکی نے پہلی کو انگریزی میں کہا۔

اس پر سب لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ اسمٰعیل نے مجرمانہ نگاہوں سے جھٹ حماد کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "میرا تو کوئی قصور نہیں ناں"۔ اتنے میں چائے آگئی۔

اسمٰعیل حماد والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سیٹ لڑکیوں کے لئے خالی کر دی گئی۔

"پلیز بیٹھئے نا ؟ ـــــ" اسمٰعیل نے انکساری سے کہا۔

لڑکیاں ہچکچاتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ ان میں سے ایک بولی۔

"ہم چائے اس شرط پر پئیں گے۔ کہ اس کا بل ہم خود ادا کریں گے۔"

اس کا فیصلہ تو بابو جی کریں گے۔ کیونکہ آج کے میزبان یہ ہیں۔ پھر ان ہی کے توسط سے آپ یہاں آگئی ہیں" حماد نے اسمٰعیل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں ... یہ چائے میری طرف سے سمجھئیے" اسمٰعیل پہلی بار براہِ راست ان لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔

ہرّا .... " لڑکیوں نے ایک ملی جلی چیخ ماری۔ اور پھر چائے کی طرف بڑھیں۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی کافی تھے۔ انہوں نے بے تکلفی سے چائے پی۔ ایک ایک پیالی اسمٰعیل اور نوجوان کو بھی بنا کر دی۔ چائے کے دوران گپ بازی بھی ہوتی رہی۔

پھر گھڑی دیکھ کر وہ سب ایک دم کھڑی ہوگئیں۔

"اب ہمیں اجازت دیجئے۔ ہماری مس جاگ اٹھی ہوں گی۔"

ایک دو کھسر پھسر کرنے لگیں۔ غالباً وہ بل کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ مسافر نے گھنٹی بجائی بیرا آگیا۔ اس نے اپنے سرہانے کے نیچے سے ایک کتاب نکالی۔ اسے کھولا۔ اس کی تہہ میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا اور بیرے کو چائے کا بل دے دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں جی آپ ـــــ" سب لڑکیاں چیخ اٹھیں ـــــ مسافر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا۔

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے آج کے میزبان یہ ہیں" اس نے اسمٰعیل کی طرف اشارہ کیا

"پلیز میری بات سنیئے" مسافر بڑے نرم لہجے میں انگریزی میں بولا۔ "آج آپ سب چونکہ اتفاقاً میرے کمرے میں اکٹھے ہوگئے تھے اس لئے میزبانی کے فرائض انجام دینا میرا فرض بنتا ہے۔ اگر آپ نہیں مانیں گی تو ایک شریف آدمی اسے اپنی توہین سمجھے گا۔"

نوجوان نے کچھ اس یقین سے کہا کہ لڑکیاں خاموش ہوگئیں۔ اب کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ ملی جلی زبانوں میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل گئیں۔

ان کے نکلتے ہی اسمٰعیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور نوجوان اس کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگا۔ پھر ملائمت سے بولا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

"آپ کو اگر زحمت نہ ہو تو اپنا ٹکٹ دکھا دیں"

نوجوان کی شانِ بے نیازی سے وہ کافی مرعوب ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے دل میں شبہ تھا۔ جسے دور کرنا ضروری تھا۔

حماد نے تکیئے کے نیچے سے ایک اور کتاب نکالی۔ اس کی کسی تہہ میں سے اپنا ٹکٹ نکالا۔ اور اسمٰعیل کی طرف بڑھا دیا۔

لاہور تک کے لئے اس نے سیٹ ریزرو کرائی ہوئی تھی۔ اسمٰعیل کو اٹینڈنٹ پر بہت غصہ آیا۔ غور سے دیکھنے پر اس کا حلیہ بھی کچھ زیادہ مشکوک نہ لگا۔ سوائے اس کے اس نے کمبل میں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ تو کیا صرف سوٹڈ بوٹڈ آدمیوں کو ہی اے۔ سی۔ سی کی بوگیوں میں سفر کرنا چاہیئے۔

اسمٰعیل نے دستخط کر کے شکریے کے ساتھ ٹکٹ واپس کر دیا اور شرمندہ سا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

نوجوان نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ اور بولا۔

"کیا آپ کو کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی"

"جی ہاں ـــــ" پھر اسمٰعیل نے اٹینڈنٹ کی ساری بات اسے بتا دی۔

وہ قہقہے لگا کر بڑی دیر تک ہنستا رہا۔

"لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے"

"آپ مجھے اور شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔"

نوجوان نے اپنے کرتے کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکالی اور اسمٰعیل کی طرف بڑھاتے ہوتے بولا۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔ مجھے تو حماد کہتے ہیں۔"

"مجھے اسمٰعیل کہتے ہیں۔"

حماد نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بولا "میں اخبار کے ایک دفتر میں ملازم ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری مالی حالت مجھے ائر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی کبھی میں نے اس قسم کی جرأت کی ہے۔ بات یوں ہے کہ مجھے اخبار کے ایک خصوصی ایڈیشن میں مشاہدات پر ایک فیچر لکھنا تھا۔ اس کے دفتر کی جانب سے مجھے کچھ رقم دی گئی تھی۔ میں لاہور سے کراچی گیا ـــــ اور کراچی سے پھر اسی ٹرین پہ واپس آ رہا ہوں۔ دو دو سو میل ہر کلاس میں سفر کیا ہے۔ آخری دو سو میل میں نے اے سی سی میں سفر کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس طرح فیچر کے لئے میٹریل اکٹھا کر رہا ہوں۔"

"خوب ـــــ!" اسمٰعیل سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا۔

"میرے خیال میں سب سے اچھا مشاہدہ بھی اسی ڈبے میں ہوا ہے۔"

"وہ بھی آپ کے طفیل ـــــ" وہ دونوں ہنسنے لگے۔ فی الواقعہ اسمٰعیل کو حماد بہت پسند آگیا تھا۔ اس کا بے تکلفانہ انداز ـــــ درویشانہ رکھ رکھاؤ ـــــ اور صاف باطنی ـــــ اس کا دل چاہنے لگا کہ اس شخص سے کچھ اور باتیں کرے....

بعض اوقات زندگی کے بھاگتے دوڑتے سفر میں کوئی ایسا ساتھی مل جاتا ہے۔ جس کے آئینہ دل میں اپنا ہی عکس نظر آنے لگتا ہے اور حجاب کے سارے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ کہنے کو کچھ رہتا نہیں ـــــ مگر زبان کہتے کہتے تھکتی نہیں ـــــ جب کہانیاں پھر شروع ہونے کے لئے ختم ہوتیں تو وہ ایک دوسرے کے بڑے پیارے

دوست بن چکے تھے۔

وہ اپنی باتوں میں اس قدر گم تھے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ بہت سے سٹیشن گزر گئے ہیں اور کنڈکٹر گارڈ اٹینڈنٹ کے شیشے کی بنا پہ ایک بار آ کر انہیں جھانک گیا ہے۔ اب چھانگا مانگا کے جنگلات شروع ہو چکے تھے۔ جس مطلب تھا لاہور قریب ہے اسمٰعیل نے سوچا اسے اب جانا چاہیئے۔ اٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بتاؤ تم رہتے کہاں ہو؟"

"ارے ہم جیسوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ رات ہوتے ہی ٹھکانا ڈھونڈتے ہیں۔ جو در کھل جائے وہ ہمارا گھر ہوتا ہے۔"

"پھر بھی ـــــ؟"

"پھر بھی کیا ـــــ میں نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں زیادہ تر میری نائٹ شفٹ ہوتی ہے ورنہ خود ہی نائٹ شفٹ لے لیتا ہوں۔ باقی کولیگ شادی شدہ ہیں احسان مند رہتے ہیں۔ کبھی تو رات ڈیسک پر ہی کالی اور بدمزہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بسر ہوتی ہے۔ ورنہ کسی یار دوست کی چوکھٹ پر پڑا رہتا ہوں۔ میرا بوجھ ہی کتنا ہے۔ ایک جھلنگا سی چارپائی چاہیئے۔ تکیہ اور کمبل میرا اپنا ہے۔ اگر چارپائی نہ ملے، تو فرش پر پڑا رہتا ہوں۔ صبح ایک پیالی چائے پی کر پھر بیل کی طرح کام میں جت جاتا ہوں۔"

"گفتار کے غازی ہو یار! خدا کی قسم ـــــ ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ تمہاری زندگی پہ رشک آرہا ہے۔"

"جی حضور! کردار کا بھی غازی ہوں۔ کبھی آزما کر تو دیکھیئے!"

"دوستی آزمائش سے بالاتر ہوتی ہے۔ مگر تمہاری بات پر کس کافر کو شک ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ تم کتنے بے ضرر دوست ہو۔"

"تو کیا خیال ہے تمہارا ـــــ؟"

"یا حضرت یا قبلہ میرے "اعزب خانے" کو بھی قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیے۔"

"بھئی یہ "اعزب خانے" کی ترکیب بھی خوب رہی" حماد لطف اندوز ہوا۔ "انکساری کی نئی مثال ہے۔"

"بات ٹال کیوں رہے ہو۔" اسمٰعیل بولا۔

"یار! میں نتھی ہوگیا تو گلے پڑ جاؤں گا۔ گلے پڑ گیا تو ہار ہو جاؤں گا ــــ چھڑانا چاہو گے تو بکھر جاؤں گا ــــ"

"واللہ بڑا خوبصورت فلسفہ بیان کر گئے ہو۔ خدا کی قسم اگر ادیب یا شاعر ہوتا تو ایک دیوان تمہاری مدح میں چھپوا دیتا۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟" حماد نے شوخی سے پوچھا۔

"اب تو صرف "در دل" اور "در نطق" ہی وا کر سکتا ہوں۔ اگر سرفراز کرو تو ــــ چلو میرے ساتھ ــــ"

"میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔"

جس کمرے میں اسمٰعیل نے اسے لاکر بٹھایا تھا۔ وہ ان کمروں میں سے نہیں تھا۔ جن کے نام بھی ہوتے ہیں۔ پرانے سے ایک صوفے کے اوپر ملیشیا کے کور چڑھا کر اس کے بازوؤں کا خستہ پن اور پشت کی چکناہٹ چھپائی گئی تھی۔ ایک کونے میں صوفے کے ساتھ کا پرانا سا دیوان پڑا تھا۔ جس پر میلا سا بستر لگا تھا۔ ایک تپائی جس کا رنگ و روغن اڑ چکا تھا۔ درمیان میں پڑی تھی۔ کمرے میں ایک طرف بید کی سیٹ والی چار کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ جن پر چار مختلف نمونوں کی ریشمی گدیاں رکھی تھیں جو غالباً پرانی زنانہ قمیضوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ ایک میلا کچیلا صدیوں پرانا قالین (جس کی اصل رنگت معلوم کرنے کے لئے پرانے مؤرخوں سے رابطہ قائم کرنا پڑے) کمرے کے وسط میں پڑا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ جن کی خانہ پری گتا کاٹ کر اور اس پر مختلف رنگ چڑھا کر کی گئی تھی۔ شاید ایک عام آدمی کے لئے ایک نظر میں ان سب چیزوں کا مشاہدہ کر لینا اتنا آسان نہ ہو۔ مگر حماد جیسے کائیاں آدمی سے کسی چیز کے حسن و قبح کا چھپا رہنا ممکن نہ تھا اور تو اور اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ سستے کپڑے کے جو پردے دروازوں اور کھڑکیوں پر ٹوٹی ہڈی کی مانند لٹک رہے تھے۔ انہیں دھلے ہوئے چھ ماہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔

یہ ڈرائنگ روم تو نہیں تھا۔ البتہ ایک نچلے متوسط طبقے کے اقتصادی بحران کا اچھا خاصا ترجمان ضرور تھا۔

وہ کمبل کی بکل مار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

اُف اس کی ہڈیاں چیخ اٹھیں۔ کسی وضع دار نواب کی طرح صوفہ بھی اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ بیٹھتے میں جابجا گڑھے پڑتے تھے۔ اور کوہان کی ساخت کی کچھ چیزیں جسم میں چبھتی تھیں۔

بہر حال حماد بیٹھ گیا۔ وہ یہاں کوئی نقاد بن کر تو نہیں آیا تھا۔ یہ چیزیں عادتاً اس کے مشاہدے میں آ گئی تھیں۔ ورنہ ان کھٹارہ سی اشیاء میں اسے اسمٰعیل کا خلوص جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے اس خستہ حال کمرے میں آ کر وہ اتنا مطمئن کیوں ہو گیا تھا۔

یہ ایک گھر تھا ——

مکمل گھر ——

بہت سی روحوں کی باہمی تگ و دو، اختلافات اور روابط کا مرکز ——

گھر جس سے وہ ایک عرصہ سے محروم تھا اور جس کا تصور تک اس کے ذہن سے مٹ گیا تھا۔

والدین کے ساتھ رہنا —— بہن بھائیوں سے لڑنا جھگڑنا —— دیر سویر گھر آنے پر ڈانٹ کھانا —— یہ سب خواب کی سی باتیں تھیں۔

اسمٰعیل غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ اور وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ کہ اتنے میں آمنہ چائے کا ٹرے تھامے اندر آئی۔ اس نے کالی شال کی بکل ماری ہوئی تھی۔ سردی سے اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اور آگ جلانے سے اس کی آنکھیں کچھ سوج گئی تھیں۔ سردی اور نیم شب کی بیداری نے اس کے حسنِ بے پروا کو ایک سوز بخش دیا تھا۔

اس نے تپائی سرکا کر حماد کے آگے رکھی۔ اس پر پڑا ہوا داغ دھبوں سے بھرپور میز پوش جھاڑ کر دوبارہ بچھایا۔ اور اوپر چائے کے برتن رکھنے لگی۔ حماد اس کے ہاتھوں کی ہر جنبش کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر اسمٰعیل نے غسلخانے سے سر باہر نکال کر جھانکا۔

"یہ آمنہ ہے حماد، میری دُلاری بہن!" اس نے وہیں کھڑے کھڑے تعارف کرایا۔ اور پھر تولیہ ڈھونڈنے غسل خانے کے اندر چلا گیا۔

"آمَنّا وَ صَدَّقنَا ..." حماد نے ایک پُر اعتماد اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

آمنہ نے چونک کر حماد کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی کالی آنکھوں میں تمام تر کشش سمیٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

آمنہ کی نظر لڑکھڑا گئی مگر اس نے مسکرا کر بے نیازی سے پلکیں جھکا لیں اس کا چہرہ غماز تھا کہ وہ حماد کی بات کا مطلب سمجھ گئی ہے۔ حماد کو یہ لڑکی بے حد ذہین لگی۔

"منّو یہ میرا دوست ہے حماد!" اسمٰعیل تولیئے سے ہاتھ پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔

"بھائی جان! کبھی کسی دشمن کو بھی لایا کیجیے۔ آپ کی دوست نوازیوں سے تو میں عاجز آ گئی ہوں۔" آمنہ نے شوخی سے کہا۔

"کیا کروں منّو؟ میرا حالِ زار دیکھ کر تو میرے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔"

"محترمہ! دوستی کا دعویٰ تو میں نے اسمٰعیل سے کیا ہے۔ تم سے نہیں —— میں تمہارا اچھا دشمن ثابت ہو سکتا ہوں۔ خاطر جمع رکھنا۔ کیوں کہ آج سے میں نے بھی اسی گھر میں رہنے کا تہیہ کر لیا ہے ——"

"جی —— خوب گزرے گی۔ کیونکہ ہمیں بھی مخالف ہواؤں سے الجھنے کی عادت ہے۔"

"حماد! تم منّو سے نہیں جیت سکتے۔ میری بہن بہت ذہین ہے۔"

اسمٰعیل نے آمنہ کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب! اوّل تو میں ہار جیت کے چکر میں پڑتا نہیں۔ اور پھر ——"

اس نے آمنہ کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا۔ "ان سے جیتنے میں کیا مزہ جن سے ہارنا عین زندگی ہو۔"

آمنہ کا دل ذرا زور سے دھڑکا۔ مگر اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ ابھی تک اس نے اس اجنبی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا جس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا۔ مگر جس نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھ کر پہلی ملاقات میں ہی اسے "تم" کہہ دیا تھا۔ یہ بات اسے کچھ بُری سی لگی۔ وہ اسے کچھ بدتمیز اور جھگڑالو سا آدمی لگا۔

آمنہ جانے لگی —— تو اسمٰعیل نے پکارا۔

"کچھ کھانے کو بھی ہو گا منّوں! خالی چائے سے آج گزارا نہیں ہو گا۔"

"میں سمجھی آپ حسب معمول کھانا کھا کر آئے ہیں۔"

"گھر میں کچھ بچا کھچا ہو تو لا دو۔"

"کچھ بھی تو نہیں ہے۔" آمنہ نے رکتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ تو کب کے کھانا کھا کر سو چکے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو آملیٹ بنا لاؤں۔"

"لے آؤ —— آملیٹ ہی لے آؤ۔ اور کیا ڈبل روٹی ہو گی؟"

"نہیں ——" وہ ذرا سا جھجکی —— کہ اجنبی کیا کہے گا۔ اتنے دقیانوس ہیں۔ ان کے گھر میں ڈبل روٹی بھی نہیں۔ "آٹا گندھا پڑا ہے۔ میں پھلکے پکا لاؤں گی۔"

"اس وقت نہیں پلیز ——" حماد نے ایک دم ہمدردی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "چائے سے کام چل جائے گا۔"

"جی —! آپ مجھ سے دشمنی کی ابتدا ابھی سے نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔"

آمنہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے بھائی کو پکارا۔ اسمٰعیل اس طرف گیا۔ واپسی پہ

وہ ہنستا ہوا آیا اور حماد کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جانتے ہو آمنہ کیا کہہ رہی تھی ——؟"

"کیا ——؟"

"کہہ رہی تھی شلجم کی بھجیا پڑی ہوئی ہے۔ ہم نے تو وہی کھائی تھی۔ لیکن خبر نہیں آپ اپنے دوست کو کھلائیں گے یا نہیں اس لئے میں نے کہہ دیا کہ کچھ بچا کھچا نہیں ہے۔۔۔۔"

"پھر تم نے کیا کہا ——" حماد نے سوگواری سے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا میرا یہ دوست شاہیوں کا شاہ۔ اور درویشوں کا درویش ہے —— انڈے مت بناؤ وہی بھجیا لے آؤ۔ ہم تو تکلف کی سرد یوار پھاند چکے ہیں۔" اسمٰعیل ہنسا۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو یہ کہہ دیا۔ وہ بیچاری تکلیف سے بچ جائے گی۔"

"دیکھا تم نے کتنی اچھی ہے میری بہن! اچھی ہے نا؟" اسمٰعیل نے تائید کے لئے حماد سے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے۔ خدا کی قسم اس گھر میں یہ لڑکی نہ ہوتی تو —— اس گھر میں کوئی دلکشی نہ ہوتی۔"

"واقعی"

حماد سوچ میں پڑ گیا تھا۔ بھلا اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ آمنہ کے متعلق کوئی رائے دے۔ غریب گھرانے کی ایک معمولی سی لڑکی۔ چند لمحے تو اس کے سامنے رہی اسے کیا معلوم وہ کیسی ہے؟ لیکن چند لمحوں میں اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ لوگ جو ایک محاورہ بولتے ہیں "گدڑی میں لعل" وہ لعل یقیناً ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

تھوڑی دیر بعد آمنہ کھانا لے آئی۔ پھر جا کر پانی لائی۔ انہوں نے چپ چاپ کھانا کھایا۔ اس دوران بات چیت کم ہوئی۔

شاید دونوں بہت بھوکے تھے۔

"منّوں! ایک اور بستر لادے کہیں سے۔ حماد تو میرے بستر پر سوجائے گا۔ میں اپنا بستر یہاں فرش پر لگالوں گا۔" اس نے بوسیدہ قالین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اسٹور کی چابی تو امّی کے پاس ہے۔ انہیں جگالوں۔"

"نہیں نہیں..." اسمٰعیل جلدی سے بول اٹھا۔" انہیں اس وقت تکلیف مت دو ہم ایک ہی بستر سے گزارا کرلیں گے۔"

آمنہ برتن اٹھا کر چلی گئی۔

حماد غسلخانے میں چلا گیا۔ اسمٰعیل نے اپنا بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھایا اور حماد کو ساتھ سونے کی دعوت دے کر خود بستر میں گھس گیا۔

اتنے میں آمنہ ایک بستر اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسمٰعیل کا منہ رضائی میں تھا۔ اس نے جانا کہ حماد بستر میں گھس چکا ہے۔ چنانچہ اس نے فرش پر اپنے بھائی کے لئے بڑے قرینے سے بستر لگایا۔ رضائی کی تہہ جما کر پائینتی کی طرف رکھی۔ اُٹھ کر جانے لگی تو حماد غسل خانے سے باہر نکلا۔ آمنہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ میں اپنا بستر آپ کے لئے ——" نظر اٹھائی تو حماد تھا۔ اس کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ دراصل ایک دم وہ شرمندہ ہوگئی تھی" تو بھائی جان سو گئے کیا —— ؟ میں سمجھی وہ غسل خانے میں ہیں"۔ اس نے منہ باہر موڑ کر کہا۔

پیشتر اس کے کہ حماد کچھ جواب دے۔ اسمٰعیل نے جھٹ رضائی میں سے منہ باہر نکالا "کیا بات ہے منّوں؟"

"میں یہ بستر لائی تھی آپ کے لئے ——" اس نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں سے لائی ہے؟"

"اندر سے ——"

"کیا فالتو تھا؟"

"ہاں ——" اُس نے نظریں جھکا کر کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اب حماد اس بستر میں سوئے گا۔ اس لئے حجاب نے اسے اعتراف نہ کرنے دیا کہ وہ کہے کہ یہ اُس کا بستر ہے۔

"اللہ تیرا بھلا کرے منّوں۔ جا اب تو بھی سوجا۔"

"حماد بھائی معاف کرنا" وہ حماد سے مخاطب ہوا۔" میں اب گرم ہوگیا ہوں۔ اگر بُرا نہ مانو تو تم زمین پر ہی سوجاؤ۔"

"اوہو! کوئی بات نہیں —— میں اس بستر میں سونا عین راحت سمجھوں گا۔" وہ جلدی سے زمین پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔

"سچی بات تو یہ ہے یار۔ کہ اس دیوان کا حال زمین سے بدتر ہے۔ زمین سخت ضرور ہے۔ مگر برابر تو ہے۔ اس دیوان میں تو جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے تم آج فرش پر ہی سو رہو۔"

"تم ناحق محسوس کر رہے ہو —— میں تو ہر رات اسی بستر میں اسی فرش پر سونے کو تیار ہوں"۔ اس نے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اب باقی ماندہ برتن سمیٹ رہی تھی۔

"بھائی جان! کسی اور شے کی ضرورت تو نہیں"۔ آمنہ نے حماد کی نظروں سے بچنے کے لئے جلدی سے کہا۔

"نہیں! تو اب جا کے آرام کر بٹیا!" اسمٰعیل پیار سے اُسے کبھی کبھی بٹیا بھی کہتا تھا۔

"شکریہ ——" حماد نے آنکھوں میں بے پناہ عقیدت بھر کے اپنے بستر میں لیٹتے ہوئے اس سے کہا۔ جسے صرف وہ ہی سُن سکی۔

"ذرا یہ بتّی بجھاتی جانا۔"

اُس نے بتّی بجھانے سے پہلے مُڑ کر حماد کی طرف دیکھا اور فوراً ڈھیلے ڈھالے

سوچ کو دبا دیا۔ حماد نے آنکھیں موندلیں۔ وہ سونا نہیں، سوچنا چاہتا تھا۔

آمنہ ایسی ہوگی۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا

کتنی پیاری اور پُر وقار لڑکی ہے ایسا لگتا ہے جیسے درد سے بھری ہوئی کوئی بانسری ہے ذرا منہ سے لگایا تو سوز بکھیر دے گی اس کا سراپا کچی صراحی کی مانند تھا مسلسل بھٹی میں پک رہی ہو۔ اس نے فیروزی رنگ کا کاٹن کا ملگجا سا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اوپر صرف ایک چھوٹی سی کالی شال اوڑھے ہوئے تھی، اتنی سخت سردی میں کوئی سوئٹر یا کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔

اس عمر میں سوئٹر یا کوٹ کی ضرورت بھی تو محسوس نہیں ہوتی، اس کی پتلی سی لچکدار کمر کاٹن کی قمیض سے صاف عیاں تھی۔ اس کا جسم کتنا خوب صورت تھا۔ بلور سا۔

جی چاہے کہ دونوں ہتھیلیوں میں اس کی نازک کمر کو لے کر گھما دیا جائے اور چال ایسی کہ بے اختیار کمر میں بازو حمائل کرنے کو جی چاہے یا چلتے میں خواہ مخواہ سہارا دینے کو دل مچلے — کہ کہیں گر نہ جائے۔

ایسے لوگ دنیا میں کیوں پیدا ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آگے بڑھنے۔ بڑھ کر رکنے اور روک کر ہاتھ تھامنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ہمارے سہارے کے محتاج ہوں نہ ہوں ہم ان کے لئے ابدی سہارا بننے ہی کو زندگی کی معراج سمجھ بیٹھتے ہیں۔

حماد نے کروٹ بدل لی۔

آمنہ نے جب چھمی کی بدبودار رضائی اٹھائی تو ذرا سا رکی پہلے اس کا دل نہ چاہا کہ اس کے ساتھ سوئے۔ بند جوتے پہن کر سارا دن پھرنے والا چھمی اب جوتوں سمیت سویا پڑا تھا اور اس کی رضائی متعفن ہو چکی تھی۔

مگر اپنا بستر تو اس نے اپنی خوشی سے دیا تھا۔ اور کبھی دو دو سو رہے

چھمی کے، پہلے تو مجبوری کے ایسے موقعوں پر وہ چھمی کے بستر کو دُور سے ہی سلام کرتی تھی۔ مگر آج

ڈرائینگ روم بھی خالی نہیں تھا۔

بستر اس کا اجنبی کے پاس تھا۔

اور وہ اجنبی کون تھا؟

"اجنبی صاحب! تم بڑے گھاگ شکاری معلوم ہوتے ہو۔ اور میں بھی قفس کی چڑیا نہیں ہوں۔"

ایک انوکھے احساس سے مغلوب ہو کر وہ بستر میں گھس گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

صبح کمرے میں ایک مسلسل سرسراہٹ اور جھاڑ پونچھ کی آواز نے حماد کو جگا دیا۔ اس نے رضائی سے منہ باہر نکالا۔ اور مُندی پلکوں کو کھول کھول کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

وہ حیران ہوا اور اس نے ایک دم بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا پھر کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھنے لگا۔

کمرے کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ صوفوں پر سفید براق ایسے کور چڑھے ہوئے تھے بستر صاف ستھرا تھا۔ اب اس پر ایک پھول دار بیڈ کور پڑا ہوا تھا۔ تپائی کا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کرسیوں پر نئی صاف ستھری اور رنگ برنگی گدیاں پڑی تھیں۔ غرض ایک ہی رات میں کمرے نے اپنا چولا بدل لیا تھا۔ اس وقت کمرے کی حالت اس مفلس اور نوجوان لڑکی کی مانند ہو رہی تھی جو خصوصی مہمانوں کی آمد کا سن کر نہا دھو کر صاف کپڑے پہن لیتی ہے اور مزید سنورنے کے لئے آنکھوں میں ذرا سا کاجل لگا کے ہونٹوں کو دنداسے سے رنگ لیتی ہے مگر اس کا ملول حسن اور سادہ سی پُرکاری اس کی غربت کا برا مذاق اڑاتے جاتی ہے۔

بہر حال یہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا کون الہ دین ہے جس نے علی الصبح کمرے کی بھی صفائی کر دی تھی اور اسے سوتے میں پتہ ہی نہ چلا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔

اوہ۔ اور وہ اسے ابھی علی الصبح ہی سمجھ رہا تھا۔ اسمٰعیل غالباً کب کا جا چکا تھا۔ کیونکہ اسے صبح سات بجے اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری۔ انگڑائی لی اور رضائی پرے پھینک دی۔

اچانک اس کی نظر اس لمبی چوٹی پر پڑی جو فیروزی کاٹن کے سوٹ کے ساتھ لپٹی ہوئی کمر سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ وہ غالباً زمین پر بیٹھی پردوں کے ٹوٹے ہوتے ہک سوئی کے ساتھ جوڑ رہی تھی۔

وہ بڑی فرض شناس اور مستعد لگ رہی تھی۔

کل رات کمرہ بہت گندہ تھا۔ آج صبح ہی صبح صفائی کر کے شاید وہ رات کی تلافی کرنا چاہتی تھی یا ویسے ہی حماد پر کوئی اثر ڈالنا چاہتی تھی اسی لئے تو اس کے اٹھنے سے پیشتر اس نے ہر شے کو سنوار دیا تھا۔

واقعی کمرہ بہت روشن اور بھلا لگ رہا تھا۔

اس نے پردے جوڑ لئے تو کرسی پر چڑھ کر انہیں کھڑکیوں پر لٹکانے لگی۔ یہ کام بحسن و خوبی کرنے کے بعد اس نے جھاڑن اٹھایا اور دروازے اور کھڑکیاں جھاڑنے لگی۔

صبح کی روشنی میں اس کا چہرہ چکنا اور زرد لگ رہا تھا۔ شاید اس نے منہ دھو کر کوئی کولڈ کریم لگا رکھی تھی۔ اس کے کچھ بال چٹیا میں سے نکل کر گردن اور کنپٹی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے زیادہ میلے لگ رہے تھے۔ وہ اس وقت متفکر زیادہ اور سنجیدہ کم لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت ہی معصوم دکھائی دے

پاک سوسائٹی

رہی تھی۔

"شہزادی تیرے سر میں جادو کی سوئیاں کس نے چبھو دی ہیں؟" حماد کا دل
وہ اسے جھنجوڑ دے۔

"اوں ہوں.... حماد زور سے کھنکارا۔ جھاڑن اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اُس
جھٹ مڑ کر حماد کی طرف دیکھا۔

"آپ کے جاگنے کی اطلاع مل گئی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"صبح کا سلام مادام...." حماد نے جنگلیوں کی طرح ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وعلیکم السّلام" وہ بڑے وقار سے بولی۔ "ابھی تو سورج بھی نہیں نکلا صاحب
آپ کچی نیند سے بیدار کیوں ہو گئے؟"

"تم نے ارادتاً مجھے جگایا ہے۔ اب جاگ اٹھا ہوں تو مجھے طعنے دے رہی ہو۔"

"میں نے ــــ؟ وہ کیسے ــــ؟" وہ ستانے کے لئے ایک کرسی پر بیٹھ

"تم اس طرح زور زور سے جھاڑ پونچھ کر رہی تھیں کہ جیسے اب جھاڑن میرے سر
بھی دے مارو گی۔ میں تو اسی لئے ڈر کر اٹھ بیٹھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"دراصل مجھے سحر خیزی کی عادت ہے اور پھر فارغ بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا
کوئی نہ کوئی کام کرنے لگتی ہوں۔"

"میں نے جب آنکھیں کھولیں تو محسوس ہوا رات کسی اور کمرے میں منتقل
کر دیا گیا ہوں۔"

"کیوں ــــ؟"

"میں اپنے کمرے کو پہچان ہی نہیں سکا۔ یہ رات والا کمرہ تو نہیں لگ رہا۔"

"آمنہ کا دل ایک دم بجھ گیا۔ شاید اجنبی ان کی غربت کا مذاق اڑا رہا تھا۔

رومیوں کے احساس اور مجبوریوں کے تصور سے اس کے دل میں درد سا اُٹھا۔
سفید پوشی کیوں؟ ــــ ہم اپنی حیثیت کسی صورت نہیں چھپا سکتے۔

"آخر یہ صبح ہی صبح اتنی سخت سردی میں صفائی کس سلسلے میں ہو رہی تھی؟"
ماد نے کھڑے ہو کر خوش دلی سے کہا۔

"تاکہ آپ پر رعب ڈالا جا سکے۔" آمنہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"کس قسم کا رعب ......؟"

"کہ ہم غریب نہیں ہیں!" یہ کہتے ہوئے جانے کیوں اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے
اڑن ہاتھ میں مروڑا اور منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"منّوں ــــ" حماد جلدی سے اس کی طرف لپکا۔ خدا کی قسم میرا یہ مطلب ہرگز
نہیں تھا۔"

وہ آمنہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

آمنہ کی ٹھوڑی جھکتے جھکتے سینے سے جا لگی تھی۔ شاید وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی
ی۔ جانے وہ اتنی سی بات پر اتنی آزردہ کیوں ہو گئی تھی۔

"منّوں..." وہ اس کے اور قریب آ گیا.... "منّوں...."

وہ دو قدم اور آگے آ گیا.... اتنا قریب کہ اس کا سراپا آمنہ کے وجود پر چھا گیا۔

تھوڑی دیر وہ تذبذب میں کھڑا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے
رتے ڈرتے اپنا انگوٹھا اس کی پیشانی پر رکھا۔ انگلی بالوں میں جمائی اور انگوٹھے کی مدد
ے اس کا چہرہ زبردستی اونچا کرنے لگا۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں دو موٹے موٹے قطرے تیر رہے تھے۔ جنہیں
پانے کے لئے وہ عروسِ نو بنی کھڑی تھی۔

"ایسی تو میں نے کوئی بات نہیں کہی منّوں۔ جس سے تیرے نازک دل کو ٹھیس

لگی ہو۔"

اُسے آمنہ ایک چھوٹی سی بچّی لگی جو میلے میں اپنے بابا سے بچھڑ گئی ہو اور غم
بے بسی کا مرقع بنی ایک تنہا موڑ پر کھڑی آنسو بہا رہی ہو۔

آمنہ نے اپنی پرنم آنکھیں کھول کر حماد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کل سے ایک بار
اس نے اس عجیب و غریب آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا باتوں کے دوران ایک اچٹتی
سی نظر ڈالتی اور جھکا لیتی۔ اس کے چہرے کے نقوش کیسے ہیں، اسے پتہ ہی نہ چلا
ہاں اتنا احساس اسے ضرور ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں بڑی بات ہے۔ اور اس
سے "بات" پیدا کرنے میں وہ بڑا ماہر ہے۔"

اس کے چہرے پر، یا آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ وہ اس
کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ یا طنز سے کام لے رہا ہے۔

اس کا چہرہ عاجزی اور انکساری کی تصویر بنا ہوا تھا۔ دیر سے جاگنے کی وجہ
اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کا سانولا رنگ سُرخی مائل ہو رہا تھا۔ اس کے بال الجھے
ہوتے تھے۔ اس کے کپڑے سلوٹ زدہ تھے۔ وہ عجیب طرح کا جوکر بنا کھڑا تھا۔ مگر
پھر بھی اس میں بلا کی مردانہ وجاہت تھی۔ اس کے جسم سے ایک گرم مہک اٹھ رہی
وہ بڑا مضبوط، بڑا انوکھا، بڑا جیالا لگ رہا تھا۔

مرد ایسے ہوتے ہیں۔

اور پھر وہ آمنہ کے اس قدر قریب بھی تو کھڑا تھا۔ اگرچہ یہ حرکت اس سے غیر ارادی
طور پر ہوئی تھی۔ وہ آمنہ کا دل دکھا کر شرمندہ تھا اور اب اس جنگلی کو سمجھ نہیں آ رہی
کہ کس طرح اس لڑکی کی دلجوئی کرے۔ وہ اس کے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگا
طرح ننھے بچّوں کو چمکارتے ہیں۔ اس طرح آمنہ کے قریب آج تک کون کھڑا ہوا
کوئی نہیں ——

اتنے قریب تو صرف اس کے خواب تھے۔

مرد کی قربت یا اس کی قربت کا احساس کیا ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس
لئے وہ مٹی کا بت بنی کھڑی تھی۔

حیران تھی ——

ششدر تھی ——

اور سُن تھی ——

اور اسے غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایک اجنبی کے آگے وہ اتنی پھُس پھُسی کیوں ثابت ہوئی۔

"منّوں —— تُو تو بڑی عظیم لڑکی ہے —— بڑی ہی مقدّس ——"

حماد نے رک رک کر کہنا شروع کیا ——

"میں تو کل رات سے تیرے متعلق سوچ رہا ہوں.... شاید تیرے فرشتوں کو
بھی اس بات کا علم نہ ہو.... (اس کی آواز سرگوشی بن گئی)

"میں.... میں.... تجھے دیکھ کر رستہ بھول گیا ہوں۔ یا —— صحیح راستے پر
آگیا ہوں....

"میں بڑی جلدی فیصلے کرنے کا عادی ہوں۔" وہ ذرا سا رُکا اور پھر بولا ——
"تُو ایک ہی رات میں میری زندگی کے ریگستان میں ٹھنڈی میٹھی آبجو بن کر داخل ہو
گئی ہے۔ تیری بیکراں وسعتوں سے میں اپنے تشنہ نفس کو سیراب کرنا اپنی حیات کی
معراج سمجھوں گا....

اس کا ہاتھ سر سے کھسکتا ہوا آمنہ کے کاندھوں پر آ ٹکا۔

آمنہ تھر تھر کانپنے لگی —— اس کی کپکپاہٹ حماد اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

"منّوں!" اس نے اس کا لرزتا ہوا کندھا مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"میں اپنی ساری زندگی تیرے سامنے رکھ دوں گا پھر تو مجھے کبھی غلط نہیں سمجھے

گی کبھی نہیں . . . کبھی بھی نہیں . . . . مجھے اس کا یقین ہے —— تیری آنکھوں میں سچائی اور نیکی کی دو مشعلیں روشن ہیں منّوں! میں اُن سے روشنی کی بھیک مانگتا ہوں منّوں۔"

وہ دوزانو جھکنے لگا تھا —— کہ معاً آمنہ کو ہوش آگیا یا شرم اس پر غالب آگئی، وہ چونک کر ایسے بھاگی، جیسے ہرنی نے شکاری کو پہچان لیا ہو۔ بھاگتی ہوئی وہ صندوقوں والی کوٹھڑی میں پہنچ گئی۔

یہی کوٹھڑی یا کمرہ اس کا ہمدرد و غمگسار تھا یا دوسرے لفظوں میں یہ اس کا پرائیویٹ کمرہ تھا۔ ایک چھوٹے سے مربع کمرے میں گھر بھر کے صندوق اور قیمتی اشیا رکھی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا پلنگ بچھا ہوا تھا جس میں برائے نام سا بستر لگا تھا۔ پلنگ کے سرہانے ایک الماری تھی۔ جس میں منّوں اپنی ذاتی چیزیں مثلاً کتابیں، خطوط، ڈائریاں اور چوڑیاں وغیرہ رکھتی تھی۔ گو وہ رات کو سب کے ساتھ بڑے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ مگر تنہائی میں زیادہ وقت اسی کمرے میں گزارتی تھی۔ کمرے میں ٹین کے صندوق بھی تھے۔ جنہیں اس نے بڑے قرینے سے لگا رکھا تھا۔ اور بستر کی پرانی چادروں کے رومال سی کر —— انھیں خوب دھو کر صندوقوں پر ڈالا ہوا تھا۔ باقی جو کاٹھ کباڑ نظر کو اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے پلنگ کے نیچے ڈال کر پلنگ کے اوپر بڑا سا پلنگ پوش بچھا دیا تھا۔ اُس کو بھرے پُرے گھر میں سکون کے چند لمحے اسے اسی کمرے میں میسر آتے تھے۔ اس لئے وہ صندوقوں والا کمرہ کم اور آمنہ کا زیادہ کہلاتا تھا۔

اپنے پلنگ پر لیٹ کر اس نے تکیہ منہ پر رکھ لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

اسے اپنی توہین کا احساس تھا جو اس اجنبی نے کی تھی۔

اسے اس گھٹے گھٹے ماحول اور چیتھڑے لگی زندگی سے شکوہ تھا جس پر پردہ ڈالنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ اسی لئے اس کی زندگی میں ایسے نازک موڑ آجاتے تھے۔

نہیں ——— !

رونا تو اس بات پر آرہا تھا کہ حماد نے اُسے سوچنے کا ذرا سا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ کسی روایتی یا رسمی چکر میں نہیں ڈالا تھا۔ دن دہاڑے اس کے تصورات پر کمند ڈال کے سب کچھ اپنے احاطے میں منتقل کر لیا تھا۔

وہ ان اندھیری راہوں پر روشنی کی ایک کرن کے لئے ترس رہی تھی۔

حماد ایک دم سورج بن کر جگمگانے لگا تھا۔

وہ جن خوابوں سے دامن بچائے —— وقت کی چکی میں پس رہی تھی۔ حماد اُن خوابوں کی تعبیر بن جانے کو بے قرار تھا۔

وہ جس خوشی کو اپنے اوپر حرام سمجھ بیٹھی تھی۔ حماد اسی خوشی کا علمبردار بن کر آگیا تھا۔

کتنا سچا ———

کتنا کھرا ———

کتنا تلخ ———

اور کتنا پیارا تھا یہ مہمان!

اتنی بڑی بات —— جسے کہنے کے لئے صدیاں چاہئیں۔ اُس نے پل بھر میں کتنے سکون سے کہہ دی تھی —— اور کس اعتماد سے کہی ———

اور وہ فیصلہ جسے آمنہ مدتوں نہ کر سکتی اس کے لب کی جنبش نے خود ہی کروا ڈالا ———

پل بھر میں زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آسکتا ہے بھلا —— ؟

ہاں ——

سیلاب لانے کے لیئے مدِ مقابل ایک عظیم آدمی ہونا چاہیئے۔ جو دریاؤں کا موڑ دے اور پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دے۔

اور میرے پاس کیا ہے ——— ؟؟؟
اور میں کون ہوں ——— ؟
فقط خوابوں اور خیالوں کا ایک پیکر . . . . .
مایوسیوں اور حسرتوں کی ایک آماجگاہ . . . .
اجنبی . . . . اجنبی . . . . .
یوں میرے آگے دامن نہ پھیلاؤ۔
میں تو لق و دق صحرا ہوں ———
میں تو چٹیل میدان میں ریت کا ایک تودہ ہوں۔
میں تو حالات کی تپش میں سلگتی ہوتی ایک شمع ہوں۔
میں تو . . . .
میں تو . . . .
اجنبی۔ !
اجنبی . . . . !

ناشتے کی میز پر طرح طرح کے لوازمات پڑے تھے، ناشتہ نہیں بلکہ اچھی خاصی دعوت لگ رہی تھی اور بیگم ابراہیم اپنی شیریں سخنی سے حماد کی خاطر مدارات میں اضافہ کر رہی تھیں باتوں کے دوران وہ حماد سے اصرار بھی کرتی جاتیں کہ بیٹا یہ کھاؤ ——— وہ چکھو ——— ہائے تم تو بالکل کچھ نہیں کھاتے میں سمجھتی تھی آج کل کی نگوڑی لڑکیاں ہی ڈائٹنگ کرتی ہیں۔ تم تو ان سے بھی کچھ ہاتھ آگے ہو۔"

حماد ایک محجوب مسکراہٹ کے ساتھ تھوڑی سی وہ شے چکھ لیتا، جس کی طرف

بیگم ابراہیم اشارہ کرتیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس نے ایک عرصہ سے ناشتہ کی عادت ہی ختم کر ڈالی تھی صرف چائے کی دو چار کڑوی پیالیوں پہ ہی گزارا کرتا تھا۔ آج اپنی تواضع میں یوں بھری میز دیکھ کر اسے عجیب طرح کی الجھن اور کوفت ہو رہی تھی۔ الجھن اس لیئے کہ ناشتے کے لوازمات میں اکثر اشیاء کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ پھر ایک آدمی کے لئے اتنا اہتمام کرنا اسے اچھا نہ لگا۔ آخر ایک اکیلے آدمی کے پیٹ میں کیا کچھ سما سکتا ہے۔

اور کوفت اس لئے ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ پیسوں کا ضیاع ہوا۔ گھر کے اقتصادی حالات سے اسمٰعیل نے اسے آگاہ کر دیا تھا اور اپنی امی کی شاہ خرچیوں اور روایات کو برقرار رکھنے کے جنون کی داستانیں بھی سنا دی تھیں. . . . اسی لئے وہ خاموش بیٹھا تھا۔ کھانے سے انکار کر کے اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنی چاہتا تھا۔ کیونکہ بیگم ابراہیم اپنے سامنے بحث اور جرح کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔

یہ بات تو حماد کے علم میں بھی نہ تھی۔ صبح دفتر جاتے ہوئے اسمٰعیل اپنی ماں کو حماد کے خاندان کے متعلق سب کچھ بتا کر گیا تھا۔ بلکہ کچھ بڑھا چڑھا کر ہی بتا گیا تھا۔ تاکہ اس کی ماں کو حماد کے یہاں رہنے پر اعتراض نہ ہو۔ کیونکہ صاحبِ حیثیت لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کی وہ بڑی شائق تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں سے ملتے رہنے سے اپنا STATUS (سٹیٹس) بھی اونچا ہو جاتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں توقیر بھی بڑھتی ہے۔ پھر جہاں لڑکے لڑکیاں جوان ہوں۔ وہاں اور بھی فائدہ رہتا ہے۔

اپنے اسی نظریئے کے تحت ہی انہوں نے بڑی لڑکی سکینہ بڑے امیر گھرانے میں بیاہی تھی۔ اور اب انہیں آمنہ کے کہیں اٹک جانے کی فکر دامن گیر تھی۔

اسی لئے جب کسی اچھی سی سرکاری ملازمت والا یا امیر خاندان کا لڑکا ان سے متعارف کرایا جاتا۔ تو پہلی ملاقات میں ہی وہ بچھ بچھ جاتیں۔

اور ـــــ حماد کے خاندان کا قصیدہ پڑھنے کے بعد اسمٰعیل نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"امی ـــــ میرا یہ دوست فی الحال یہیں رہے گا۔ جب تک اسے کوئی مناسب گھر نہیں مل جاتا۔ رہنے کو تو وہ اچھے سے اچھے ہوٹل میں بھی رہ سکتا ہے۔ مگر میں ہی زبردستی اپنے گھر میں لے آیا ہوں۔"

"بہت عقلمندی کی بیٹے ـــــ بلکہ دوستی کا حق ادا کیا تم نے ـــــ میں جانتی ہوں اچھے دوستوں پر کئے ہوئے احسان ضائع نہیں جاتے۔" انہوں نے اپنے خاص انداز میں کہا۔

"اور ہاں۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "کیا کام کرتا ہے۔ تمہارا یہ دوست ـــ؟"

"امی۔ وہ ـــــ" اسمٰعیل ذرا سا رکا۔ پھر اس نے سچ بولنے میں ہی عافیت جانی کیونکہ یہ بات یہاں رہ کر چھپائی نہ جا سکتی تھی۔

"امی، حماد اخبار کے ایک دفتر میں ملازم ہے۔"

"اخبار کے دفتر میں ـــــ؟ اور تم کہتے ہو اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔" بیگم ابراہیم نے ماتھے پر بل ڈال کر حقارت سے پوچھا۔

"جی امی ـــــ ہے تو بڑے باپ کا بیٹا ہی ـــ مگر اس کا باپ سرکاری ملازمت کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنا ایک اخبار نکالنا چاہتا ہے۔ اس لئے فی الحال اسے ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے۔ یہاں لاہور میں ایک بہت بڑے اخبار کے دفتر میں ملازم کروا دیا ہے۔ پھر مزید ٹریننگ کے لئے اسے یورپ بھیجے گا۔"

یہ کہانی اسمٰعیل کی ذہانت نے یقیناً کھڑے کھڑے گھڑی تھی۔ ورنہ اس کی ماں ابھی ابھی اسے باہر نکالنے کا فتویٰ صادر کر دیتی۔

"مگر اس کی تنخواہ تو بہت تھوڑی ہوگی۔" بیگم ابراہیم نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہ گزارا

کیسے کرتا ہوگا۔"

"واہ امی ـــــ اُسے پیسوں کی کیا پرواہ ہے۔ اس کا باپ اسے ہر ماہ اتنی کثیر رقم بھیج دیتا ہے۔ جس پر اس کے کئی دوست پل رہے ہیں۔ مگر ذرا فضول خرچ واقع ہوا ہے اور فطرتاً درویش ـــــ ہے۔ اپنی پوزیشن بنا کے نہیں رکھتا۔"

"خیر .... خیر ....." بیگم ابراہیم سنبھل گئیں۔ "مجھے اس سے کیا غرض ـــــ؟ تمہارا دوست ہے۔ کچھ دن کے لئے آیا ہے ـــــ آخر چلا جائے گا۔"

"اور امی ـــــ" اسمٰعیل کھڑے ہوتے ہوتے بولا ـــ "میرا مطلب ہے ذرا خاطر تواضع ـــــ"

"ہاں، ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ کل کو ہمیں بھی اس سے کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گی۔"

اسمٰعیل اپنی ماں کی عادات سے واقف تھا۔ ان کی ہر بات اور ہر حرکت میں ذاتی غرض شامل ہوتی تھی۔ وہ تو بے غرض عبادت کی بھی قائل نہ تھیں۔ نمازیں اور وظائف بھی انہیں دنوں شدت سے پڑھتیں۔ جب انہیں کوئی اشد ضرورت آ پڑتی۔ مراد اگر فوراً بر نہ آتی تو وہ نمازیں اور وظیفہ فوراً چھوڑ دیتی تھیں۔ مطلب برآری اور بدلہ لینے کی رسم کو وہ موجودہ دور کی سب سے بڑی "ضرورت" سمجھتی تھیں۔ ذاتی اغراض سے بالاتر دوستی رشتہ داری یا تعلقات کو وہ محض حماقت اور تضیع اوقات کہتی تھیں۔ اس لئے ان کے سوچنے کے انداز کو بدلنا، اسمٰعیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

ادھر اس کو صبح سات بجے اسٹیشن پر بھی پہنچنا تھا اس لئے وہ جلد ہی گھر سے نکل گیا۔ منوں صبح اسے نظر ہی نہیں آئی تھی ورنہ وہ اسے بھی کچھ ہدایات دیتا۔

تاہم بیگم ابراہیم نے حماد کے اٹھنے تک ناشتے کا اتنا انتظام کر لیا تھا کہ حماد بھی میز پر انواع و اقسام کی چیزیں دیکھ کر سٹپٹا رہا تھا۔ ذہنی طور پر وہ رسمی تکلفات

کا قائل ہی نہ تھا اور پھر جہاں قیام کرنا ہو، وہاں گھریلو فضا ہونی چاہیئے۔ گھر والے غیر ضروری تواضع کا بوجھ مہمان کے ذہن پر ڈالتے چلے جائیں تو مہمان کو خواہ مخواہ شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ حماد کو بھی اسی قسم کی الجھن کا سامنا تھا۔ اور سب کچھ کھانا پڑ رہا تھا۔ اسمٰعیل کا خلوص مخلِ نظر تھا۔ ورنہ وہ اس وقت بھی [illegible] گوئی پر اتر آتا۔

چنانچہ جس قدر اس کے پیٹ میں سما سکتا تھا اس نے کھایا اور سعادت مندی سے بیگم ابراہیم کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

"ارے۔ یہ آمنہ صبح سے کہاں ہے ابھی تک اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا" انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

حماد نے بھی ان کی تقلید میں سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر بات کے جواب میں تو اسے بہرحال خاموش رہنا تھا اور وہ کہتا بھی کیا۔

کہ آج صبح ہی صبح۔۔۔ میں نے اس کے دل کے سوتے سوتے تارِ مضرابِ خلوص سے چھیڑ دیئے ہیں یا ——

ایک پرسکون سوئی سوئی لڑکی کو آبِ حیات چھڑک کر جگا دیا ہے۔۔۔۔

معاً حماد کو صبح کے لمحات بے طرح یاد آگئے۔۔۔۔ اور اس لڑکی کو دیکھنے کو دل مچلنے لگا۔

"ارے کوئی ہے —— ... چھمی تو ہی جا بیٹا اور منّو آپا کو اس کے کمرے سے بلا لا۔" بیگم ابراہیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔ اور پھر واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"یہ لڑکی بھی عجیب سے مزاج کی مالک ہے۔ دنیا کی کوئی شے اسے پسند نہیں آتی۔ ہر بات میں ناک چڑھاتی ہے۔ کھانے پینے میں دلچسپی نہیں لیتی —— انسانوں سے کتراتی ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی اس کا کیا بنے گا؟"

"جی ہاں ——" حماد مسکرایا۔ "اس عمر میں عام طور پر لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"نہیں جی! یہ تو شروع سے ہی اور طرح کی ہے۔" بیگم ابراہیم نے اپنی اسی شانِ بے نیازی سے پھر کہنا شروع کیا۔ "میری بیٹی سکینہ تو بالکل ایسی نہیں تھی۔ شروع ہی سے ہر ایک سا تھ گھل مل کر رہنے کی عادت تھی۔ دو منٹ میں ہر کسی کو گرویدہ بنا لیتی تھی اور پھر قسمت کی بھی دھنی نکلی!"

"جی —— ؟" حماد نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"ماشاءاللہ بہت بڑا گھرانا ملا ہے اسے ——" بیگم ابراہیم کے چہرے پر خوشیوں کا نور پھوٹ پڑا۔ "کسی شے کی کمی نہیں۔ لاکھوں میں کھیلتی ہے۔ پلنگ پر بیٹھے ہر چیز ملتی ہے اسے ——"

حماد کا دل چاہا وہ ان سے پوچھے ——

"کیا وہ اپاہج ہے؟" مگر اس نے سنجیدہ سی شکل بنا کر کہا۔ "کہاں ہوئی ہے ان کی شادی؟"

"یہیں —— بھئی گلبرگ میں رہتی ہے میری سکینہ! محل نما کوٹھی ان کی اپنی ہے میرا داماد اپنا کاروبار کرتا ہے۔ ماشاءاللہ پانچ بچے ہیں میری بیٹی کے۔"

بیگم ابراہیم اس بات سے خوش ہو رہی تھیں کہ حماد ان کی گفتگو میں نہ صرف دلچسپی لے رہا ہے، بلکہ متاثر بھی ہو رہا ہے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے خالہ جان!" اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "لڑکی اپنے گھر میں آسودہ ہو تو والدین دوری کا دکھ بھول جاتے ہیں۔"

"اجی! وہ تو سینکڑوں کو کھلا سکتی ہے اس وقت۔ بس سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ہے ہی قسمت کی دھنی۔ اور پھر زمانے کے حالات کو پہچانتی بھی ہے۔ اس کو احساس ہے کہ فی زمانہ جس کے پاس دولت نہیں، وہ کچھ بھی نہیں ——" انہوں نے بُرا سا

منہ بنایا ——

"اور یہ میری چھوٹی بیٹی آمنہ —— یہ تو کسی مصلح کی بیٹی لگتی ہے۔ہاں — اس کا مزاج اپنے باپ پر گیا ہے۔" انھوں نے بیزاری سے کہا۔"وہ بھی ہمیشہ کہتے ہیں انسان کو پرکھنے کا پیمانہ دولت نہیں اس کا کردار اور اس کا ظرف ہے۔اور آمنہ کو بھی ہر دولت مند آدمی میں ساتوں عیب نظر آتے ہیں۔"

حماد حیران ہوا کہ آخر یہ ساری کتھا اسے سنانے سے مطلب —— ؟ مگر وہ چپکا بیٹھا رہا۔اگر اسے اسمٰعیل نے اپنی ماں کے متعلق اشارے کنائے سے سب کچھ نہ بتا دیا ہوتا تو وہ ان کی پہلی گفتگو سننے کے بعد رفو چکر ہو گیا ہوتا۔

"خدا معلوم اس لڑکی کا کیا بنے گا؟ اس کی قسمت میں جانے کیا لکھا ہے؟" بیگم ابراہیم نے مصنوعی تردد سے کہا۔

"آپ کو وہم کیوں ہو گیا ہے کہ اس کی قسمت اچھی نہیں ہوگی۔یہ تو سب خدا کے اختیار میں ہے اور ہو سکتا ہے آپ کی یہی بچی آپ کے سب بچوں میں قسمت والی ہو۔"

خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا۔ مجھے تو اس کی عادتوں سے خوف آتا ہے۔ اور یہ کسی کو خاطر میں بھی تو نہیں لاتی۔"

ابھی حماد اس بات کا جواب نہیں دے پایا تھا کہ اس نے دیکھا چھوٹی آمنہ کا بازو پکڑے اسے گھسیٹے لا رہا ہے۔اس کو آتا دیکھ کر حماد چائے کی پیالی بنانے میں مشغول ہو گیا۔

آمنہ قریب آئی تو اس کا چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔اس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں اور ناک بھی لال ہو رہی تھی۔ جیسے وہ خاصا رو کر آئی ہو —— ان سب باتوں کے باوجود اس کے چہرے پر ایک سوز اور ایک شگفتگی تھی۔

حماد نے جب سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔تو وہ اس کی نظروں کی راہ سے۔اس کے دل میں اترتی چلی گئی اور وہ اس کے خوبصورت چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔

وہ چہرہ جو اس کے ہر خواب کی حقیقت افروز تعبیر تھا۔

جیسے بارش کے بعد موسم نکھر جاتا ہے ایسے ہی دل کا غبار نکال دینے سے اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔بہار کے اس پہلے پھول کی مانند جس کا منہ ساری رات شبنم کے موتی دھوتے رہے ہوں اور سورج کی پہلی کرن نے اس کے معصوم جلوؤں کو جگا دیا ہو۔حماد جانتا تھا۔ وہ روئی ہوگی۔ وہ ضرور روئی ہوگی۔ایسی حساس اور پاکیزہ لڑکیاں۔ذرا سی ٹھیس سے دکھ جاتی ہیں۔کبھی تو اپنے خوابوں کو جیتا پا کر ان پر ہیجان طاری ہو جاتا ہے۔

اور کبھی ساری زندگی ایک خوبصورت آس اور ایک طویل انتظار کے دامن کو تھام کر گزار لیتی ہیں۔

اُمید کی روشنی ان کا واحد سہارا ہوتی ہے۔

مگر جب اپنی منزل کو دو چار قدم پہ دیکھ لیتی ہیں۔تو انہیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔یا ——

اپنے گمان کو یقین میں بدلتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

اپنی خوش بختی میں اپنے دل کو شریک نہیں کر سکتیں۔اس سے لپٹ لپٹ کر اسے مبارک باد دینے کی بجائے اسے توہمات کے حوالے کر دیتی ہیں۔

اور خود پلکوں کی چوکھٹ وا کر کے آنسو بہانے پہ اکتفا کرتی ہیں۔

آنسو —— جو ہر قسم کے جذبات کو مدغم کر دیتے ہیں۔راہیں کھول دیتے ہیں۔ غبار نکال دیتے ہیں۔ہائے۔یہ معصوم لڑکیاں ——؟؟

ان کی تمنا پوری نہیں ہوتی تو روتی ہیں۔

تمنا بر آئے تو بھی روتی ہیں۔

اُن کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کے اختیار میں صرف آنسو ہیں۔

یہ تو اپنے جنم دن سے ہی دوسروں کی دستِ نگر ہوتی ہیں۔

یہ تو اپنی قسمت کا فیصلہ بھی خود نہیں کر سکتیں۔

اُن کے ذہنوں میں بس چور دروازے ہوتے ہیں۔ ان چور دروازوں کے رستے

یہ اپنے من کی دنیا بسا لیتی ہیں۔

اور پھر بقایا زندگی ان چور دروازوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی سیپ میں بند ایک موتی ہوتی ہے۔ جو اکثر غلط ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔

یہ تو محض خواب دیکھنے کو پیدا ہوتی ہیں۔

کہانیاں بنانے کو پیدا ہوتی ہیں۔

کہانیاں بن جانے کو پیدا ہوتی ہیں۔

ان کو منزل کے مل جانے کا بھی اتنا ہی غم ہوتا ہے۔ جتنا منزل کے بچھڑ جانے کا۔

اور ایسے وقتوں میں یہ روتی ہیں۔ جب ان کو مسکرانا چاہیئے۔

خوشی کا خیر مقدم بھی آنسوؤں سے کیوں ہو؟

میری شہزادی! مجھے دیکھ کر مت رو۔ میں تجھے رُلانے نہیں ہنسانے آیا ہوں

میں غلامی کے یہ طوق تیری گردن سے اتار پھینکوں گا۔

مجھ پر بھروسہ رکھو ——

اعتماد کرو مجھ پر . . . .

اکیلا نہیں جاؤں گا یہاں سے —— ؟

ہاں —— جیج ہلاتے ہوتے اتنی ڈھیر ساری باتیں سوچ کر حماد نے جب نظر اسی وقت آمنہ نے بھی اپنی جھکی ہوئی نظر اٹھا کر پہلی مرتبہ حماد کی جانب دیکھا۔ اُس کی

ڈری ڈری، التجا کرتی ہوئی نظر جب حماد کی پُر یقین اور فاتح نظر سے ٹکرائی تو اس کا دل بج اٹھا۔

ایک ثانیئے کے اس تصادم میں حماد نے اس کو صاف کہہ دیا۔

"اکیلا نہیں جاؤں گا یہاں سے ——

تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا ——

مجھ پر بھروسہ رکھو!"

اور آمنہ نے اس کی خود اعتمادی کے آگے پگھلتے ہوئے جیسے اپنا مستقبل اس کے حوالے کر دیا۔

وہ برائے نام سا ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔

"پھر ہو گیا نا، تمہیں زکام ——" بیگم ابراہیم نے اس کی روتی روتی آنکھوں اور سرخ ناک کو دیکھ کر کہا۔

"اپنی ہمت سے زیادہ کام کیوں کرتی ہو؟ صبح سے اٹھ کر سردی میں جانے کیا کچھ کرتی پھر رہی ہو۔ مجھے یقین تھا تمہیں کچھ ہو جائے گا۔ کر لیا نا خود کو بیمار ——"

پھر انہوں نے حماد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کام کرنے کی اس لڑکی کو بالکل عادت نہیں ہے۔ جب بھی ضد کر کے کام کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا یہی حشر ہو جاتا ہے۔"

ایک سوگوار سا تبسم لبوں پر لیکر آمنہ نے اپنی ماں کی دروغ گوئی پر معذرت طلب نظروں سے حماد کی جانب دیکھا۔ حماد سنجیدگی سے بیگم ابراہیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر اس نے اس چور آنکھ کی تپش محسوس کر لی تھی۔ اس کا اندازہ آمنہ کو بھی ہو گیا تھا۔

"میں تو اچھی بھلی ہوں امی ——" آمنہ نے مسکراتے ہوئے کہا —— "یونہی ذرا ——"

"ہاں یہ تیری یونہی ذرا ہمیشہ پریشان کیا کرتی ہے۔" بیگم ابراہیم نے بات کاٹتے ہوئے

کہا۔ "مہربانی کر کے ابھی دوائی کھا کے بستر میں لیٹ جاؤ۔ زیادہ بیمار ہو گئیں تو ہلا نہ جاؤ گی۔"

"بیمار تو میں بالکل نہیں ہوں۔" آمنہ نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر آہستہ سے

"اور اچھی بھی آپ بالکل نہیں ہیں ——" حماد نے اسی لہجے میں برجستہ کہا۔

آمنہ کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ دل دھڑک کر رہ گیا۔ نہ اس سے پلکیں اٹھائی گئیں نہ کوئی جواب دیا گیا۔ اس نے تو واقعی ایک بیماری سے معاہدہ کر لیا تھا۔

بیگم ابراہیم ان عورتوں میں سے تھیں جو نام و نمود کی خاطر اپنا گھر پھونک کر تماشا دیکھتی ہیں۔ بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ کہنے کو تو وہ ایک ریلوے گارڈ کی بیوی تھیں۔ مگر ان کی باتیں سن کر یوں محسوس ہوتا گویا وہ کسی ریاست کی مالکہ ہیں۔ ناممکنات کو اپنی گفتگو میں جگہ دیتے ہوئے وہ ذرا نہیں جھجکتی تھیں اور بعید از قیاس شیخیاں بگھارتے ہوئے انہیں ذرا شرم نہیں آتی تھیں۔

وہ بیچاری جانے کس احساسِ کمتری کی ماری ہوئی تھیں۔ کہ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ اپنی ذات رہتی اور وہ ساری دنیا کو اس ذات پر مرکوز دیکھنا عین حیات سمجھتی تھیں۔ اور بدقسمتی سے ہوتا اس کے برعکس تھا۔ بلکہ ان کی خاص الخاص سہیلیاں بھی پیٹھ پیچھے ان کی ہنسی اڑاتی تھیں۔

ابراہیم صاحب بڑے ہی مدبر، متحمل مزاج اور ملنسار آدمی تھے۔ نیاز مندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ علم و ادب کے رسیا تھے مگر روزگار کی خاطر انہوں نے ریلوے گارڈ بننا بھی قبول کر لیا تھا۔ ساری کی ساری تنخواہ وہ اپنی بیگم کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ وہ اس بات کے پرزور حامی تھے کہ جتنی چادر دیکھو۔ اتنے پاؤں پھیلاؤ۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کبھی اگر بیگم سے اُن کی کھٹ پھٹ ہو جاتی تو صرف اسی بات پر ـــــ جب ان کی بگم چادر کی وسعت کا خیال کئے بغیر اتنے پاؤں پھیلاتیں کہ ان کے پاؤں ہر کس و ناکس کو نظر آنے لگتے۔ وہ انہیں محبت اور نرمی سے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ ان کا خیا تھا ان کی بیگم کو اپنی آمدنی کے حساب سے خرچ کرنا چاہیئے۔ اور کچھ پس انداز بھی کرنا چاہ کیونکہ وہ کثیر الاولاد تھے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے شائق تھے۔ وہ کہتے تھے ا کی زندگی تو محض ایک مجبوری میں ڈھل گئی ہے۔ کم از کم وہ اپنے بچوں کو بہتر مستقبل دے کر اس کی تلافی کر جائیں۔ اس لئے وہ اپنی بیگم کی فضول خرچیوں سے ہر دم نالاں رہتے تھے۔

لیکن بیگم ابراہیم کل کے متعلق سوچنے کی عادی نہیں تھیں۔ وہ نہ صرف مہینے پہلے ساری تنخواہ ختم کر دیتیں بلکہ کچھ قرض بھی سر پر چڑھا لیتیں۔ اور مہینے کے بقیہ دن میاں بیوی آپس میں الجھتے ہوئے گزار دیتے۔

ہر چند کہ ابراہیم کم گو واقع ہوئے تھے مگر بیگم کی زیادتیوں پر کبھی کبھار بھڑک ہی اٹھ ان آئے دن کی بدمزگیوں کا اثر بچوں پر بھی پڑتا۔ وہ یوں ڈرے ڈرے سہمے سہمے ر گویا ان کے گھر میں کہیں کوئی بم چھپا ہوا ہے۔

بیگم ابراہیم خانیوال کے ایک گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پچھلی زندگی گاؤ میں ہی گزری تھی۔ ابراہیم ان دنوں خانیوال میں ملازم تھے۔ ان کا کوئی لمبا چوڑا خاندان نہ تھا ایک باپ ہی تھا۔ جس کے ریٹائر ہونے پر گارڈ کی یہ ملازمت انہیں خود بخود مل گئی تھی۔ و نہ معلوم انہیں ملازمت کے سلسلے میں کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا۔

خانیوال میں ان کا ایک چھوٹا سا آبائی مکان بھی تھا۔ شادی کے بعد ان کی تبدیلی لا ہو گئی۔ اور یہ لاہور آ گئے۔ اس وقت ان کے تین بچے ہو چکے تھے اور والد وفا پا چکے تھے۔

لاہور میں اوسط اور نچلے درجے کے ریلوے ملازمین کے لئے گڑھی شاہو کے قرب و جوار میں کوٹھیاں اور کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہیں پر انہیں بھی ایک بوسیدہ کوٹھی کا آدھا پورشن مل گیا تھا۔ جس میں صبر و رضا کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ان کی بیگم کو شروع ہی سے لاہور میں رہنے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا لاہور میں سب امراء رہتے ہیں۔ اگر وہ امیر نہیں بھی ہوتے تو بھی چھوٹے شہروں کے مکین ان کے سر میں سرخاب کا پر ضرور ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی تو لاہور آ کر مراد بر آئی تھی۔ مگر ان کو اپنا محلہ اور نچلے طبقے کے لوگ بالکل پسند نہیں آئے تھے۔ انہوں نے اپنے طبقے کے لوگوں سے کبھی راہ و رسم نہیں رکھی تھی، بلکہ وہاں کچھ کوٹھیاں بڑے افسروں کو ملی ہوئی تھیں ہر دم انکی بیگمات کی طرف مائل رہتیں۔ ان کے اعزاز میں موقع بے موقع دعوتیں اور پارٹیاں بھی دیتیں۔ عید، بقر عید پر ان کے لئے کم قیمت کے تحائف بھی لے جاتیں۔ منہ پر تو وہ اُن کے ساتھ اخلاق برتنے پر مجبور ہو جاتیں۔ مگر ان کے پیچھے ان کے ڈھول کا پول کھول دیتیں۔

بیگم ابراہیم اپنی حیثیت سے بڑی بیگمات کے طنز اور ٹھٹھے کا بالکل بُرا نہیں مانتی تھیں ان کو تو اسی بات نے زندگی کا ڈھیر سارا سکھ چین بخش رکھا تھا کہ کبھی کبھار جب ان کی ہزار منت سماجت کے بعد کوئی بیگم اپنی بڑی سی کار میں ان کی کوارٹر نما کوٹھی کے آگے آ کر اترتی ہے تو سارے محلے والیاں چقیں اور بوریوں کے پردے اٹھا کر ان کے گھر جھانکتی ہیں اور غالباً دل ہی دل میں ان کی قسمت پر رشک بھی کرتی ہیں۔

وہ نہ صرف اپنے محلے والیوں پر دھونس جمانا چاہتی تھیں کہ گارڈ کی بیوی ہونے کے بارجود ان کا درجہ ان سب سے بلند ہے۔ بلکہ وہ اپنے میکے والوں کو بھی یہ ٹاتزد بنا چاہتی تھیں کہ وہ لاہور کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بڑے بڑے افسروں کی بیگمات کا ان کے ہاں آنا جانا ہے وہ پڑھے لکھے طبقے میں ہر دلعزیز ہیں۔ ان کا شوہر گارڈ ہوا تو کیا۔

اُنھوں نے اپنی خوش اخلاقی اور فراخدلی سے سارے لاہور کا دل موہ لیا ہے۔ آئے
وہ اپنے رشتے داروں کو لاہور دیکھنے کی دعوت دیتیں۔ اور پھر انہیں ہفتوں، مہینوں
ٹھہرائے رکھتیں۔ اپنے غریب رشتے داروں کو مجبور کرتیں کہ وہ اپنے بچے ان کی تحویل
میں چھوڑ جائیں۔ تاکہ وہ انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے بہتر شہری بنائیں۔

اور ہوتا بھی یہی ——— ہمیشہ ان کے میکے کے دُور دراز کے رشتے داروں کے
تین بچے ان کے گھر میں ہی رہتے۔

ابراہیم جب بھی دبے لفظوں میں انہیں تنبیہہ کرتے کہ ——— "بیگم تمہارے اپنے
چھ بچے ہیں۔ پہلے انہیں تو تمام سہولتیں مہیا کرو ———" بس بیگم کو اتنی سی بات پر آگ
لگ جاتی۔

"ایک تو گارڈ کی بیوی بن کر میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ مجھ میں آخر کیا خرابی ہے۔ م
کسی بھی بڑے سرکاری افسر کی بیوی ہو سکتی تھی۔ لیکن صرف تمہاری بیوی بن جانے سے
سوسائٹی میں میری عزت گھٹ گئی ہے۔ اگر میں ہوتی کسی بڑے افسر کی بیگم تو سارے گاؤں
کو یہاں بلا لیتی۔ بڑا بن کے آدمی کسی کا بھلا نہ کر سکے تو ایسی بڑائی کس کام کی ———"

"لیکن تم جانتی ہو بیگم، تم کسی بڑے افسر کی بیگم نہیں ہو۔" ابراہیم اس کا وار بڑی خندہ
پیشانی سے اپنے کلیجے پر سہہ لیتے۔ "تم ایک غریب آدمی کی بیوی ہو۔ اس لئے رفاہِ
کے یہ کام چھوڑ دو۔ اپنے بچوں کی طرف دھیان دو۔ بچوں کی صحیح پرورش کرنا بھی نیکی ہے"

"اور کیا میں اپنے بچوں کو فاقے مار رہی ہوں۔ خدا کی قسم تم بہت ہی سفلے آدمی
ہو۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں لوگ خاندان کا انسان پر ضرور اثر ہوتا ہے۔ اگر تم کسی بڑے خاندان
سے ہوتے، تو کبھی ایسی نیچی باتیں نہ کرتے . . . . ."

"بہر حال ——— میرے جیسے سفلے آدمی کو تم جیسی اعلیٰ خاندان کی معزز اور ہر دلعزیز
خاتون مل ہی گئی ہے۔ مجھے کمتر ہونے سے کیا فرق پڑا ہے ———"

اس چوٹ پر بیگم ابراہیم تلملا جاتیں۔ مگر وہ بھی ایک ہی کائیاں تھیں۔ جھٹ بات کا
رخ پلٹ دیتیں۔

"کسی غریب کے بچے کو اگر گھر میں رکھ لیتی ہوں تو اپنے ہی مطلب کو ——— بچا کھچا
کھا لیتے ہیں۔ لیکن سارا دن نوکروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اب اس مہنگائی کے زمانے
میں نوکر رکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ پھر ایک پنتھ دو کاج کر رہی ہوں . . . ." ذرا
سا دانستہ رکتیں۔ تاکہ ابراہیم کا ردِ عمل دیکھ سکیں۔ اگر وہ خاموش رہتے تو پھر شروع ہو
جاتیں ———

"تمہیں برا لگتا ہے تو واپس بھیج دوں گی ان کم بختوں کو۔ آج بھلے کا زمانہ کہاں ہے
وہ تو تمہارے نوکر بنے پھرتے ہیں۔ اور تم ان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ذلیل کرتے ہو۔"

ابراہیم تب بھی خاموش رہتے۔ اُن کو معلوم تھا۔ نہ یہ اس گھر سے جائیں گے۔ نہ بیگم
کے مزاج و موقف میں کچھ تبدیلی آئے گی۔ پھر گھر کی فضا کو مزید مکدّر کرنے سے فائدہ ———؟
یوں بیگم کی کسی نہ کسی بے اصولی بات پر شکر رنجی کا ہو جانا تو ایک قدرتی امر تھا۔
لیکن رفتہ رفتہ ابراہیم نے بیگم کے معاملات میں دخل دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ خصوصاً جب سے
بیگم نے سکینہ کی شادی اپنی منشاء کے مطابق کر دی تھی، انہیں تو چپ ہی لگ گئی تھی
اور اس چپ کا راز سینے میں دبا کر وہ ان سب سے دور چلے گئے تھے۔ تھے تو وہ ہمیشہ
کے زیرک اور معاملہ فہم ——— ایسے نازک وقت میں انھوں نے جانے کی ٹھانی کر
خاندان کی ڈوبتی عزت کو بھی بچا لیا۔

یہ حادثہ بھی اپنی جگہ پر انتہائی اندوہناک تھا۔

ایک رات مسافروں سے بھری گاڑی وہ روہڑی سے لا رہے تھے۔ اِدھر سے
ایک مال گاڑی چھکا چھک دوڑی جا رہی تھی۔ کانٹا نہیں بدلا گیا دونوں ایک ہی لائن
پر آمنے سامنے بھاگی آ رہی تھیں۔ سامنا ہوا اور ٹکرا گئیں ———

پاک سوسائٹی

ایک قیامت بپا ہوگئی۔ وہ کہرام مچا کہ الاماں —— جن جن کی موت آئی تھی۔ وا
دورانِ سفر منزل کو پہنچے۔ اور ابراہیم جو موت کو سامنے دیکھ کر گھبرائے نہیں۔ بلکہ ان کے
پرخچے ہی اڑ گئے ——

گھر آئی بھی تو ایک ٹوپی —— جو اڑ کر دور جا گری تھی۔

اور اب وہ ٹوپی آمنہ کے ٹرنک میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ غریب جب کبھی آلام
گھبرا جاتی تو اس ٹوپی سے لپٹ لپٹ کر رو دیتی۔ ان کی ایسی دردناک موت کا زیادہ تر
آمنہ اور اسمٰعیل پر ہی ہوا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب قرض خواہ در پے آزار تھے۔ ہر روز قرقی کی دھمکیاں دی
سود بڑھ رہا تھا — گھر کا رزق اڑ گیا تھا۔ سکون تو اس گھر میں پہلے ہی عنقا تھا۔

سکینہ ابراہیم کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ زند
کی آسودگیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ انہی دنوں ابراہیم دائم المریض نظر آنے لگ
جانے وہ حادثہ ان کی ذہنی پریشانی کے باعث ہوا یا تقدیر میں یوں رقم تھا۔

تاہم ان کے انتقال کے بعد پراویڈنٹ فنڈ اور گریجویٹی کی اتنی رقم ضرور مل گئی
جس سے قرض ادا کر دیا گیا تھا۔ گویا مر کر بھی ابراہیم خاندان پر ایک احسان کر گئے تھے اور
تمام تر ذمہ داریاں سکون پسند اسمٰعیل کے کاندھوں پر ڈال گئے تھے۔

اسمٰعیل ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ باپ کا عکس —— نہ صرف شکل و صورت
میں بلکہ عادات و اطوار بھی —— وہی کم گوئی — وہی متحمل مزاجی —— وہی ملنسا
سوچ سمجھ میں توازن —— فضولیات سے کنارہ کشی —— ہمیشہ مستقبل
نظر ——"

وہ بھی اپنی ماں کی فضول خرچیوں سے پریشان ہوا اٹھتا۔ مگر وہ کچھ کہتا نہیں تھا
باپ کے ہوتے ہوئے اُسے کچھ کہنے کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ اس صورت میں جبکہ
خود اُن کے رحم و کرم پر پڑا تھا۔

جب ابراہیم کا حادثے میں انتقال ہوا تو اسمٰعیل ایم اے کے پہلے سال میں تھا۔
اس کے باپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ لیکن باپ کی وفات
کے بعد گھر کی زبوں حالی نے اُسے تعلیم جاری رکھنے سے روک دیا۔ اگر وہ بھی ریلوے میں
ملازمت نہ کرتا تو یہ گھر اُن سے چھن جاتا —— اس طلسمی شہر میں نوکری تو جیسے تیسے مل جاتی
ہے۔ لیکن اتنے بڑے کنبے کے لئے گھر تلاش کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس کے والد کی
خدمات کے عوض اسے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی ٹی۔ ٹی کی نوکری مل گئی تھی۔ اور رہنے
کو وہی گھر ——

وہ بھی اپنی ساری تنخواہ ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور پلٹ کر نہ پوچھتا کہ کہاں اور
کیسے خرچ ہوئی؟

سکینہ اسمٰعیل سے دو سال چھوٹی تھی۔ سب بچوں میں یہی ایک لڑکی بیاہی ہوئی
تھی۔

بیگم ابراہیم اور سکینہ ابراہیم کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا تھا۔ دولت اور مرتبہ دونوں
کی کمزوری تھی۔ امراء کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا دونوں کو جنون تھا۔ وہ اپنے کالج
کے زمانے میں، چن چن کر تاجروں اور افسروں کی بیٹیوں کو سہیلیاں بناتی اور ان کو یہ تاثر
دینے کی کوشش کرتی کہ وہ بڑے "لینڈ لارڈ" کی بیٹی ہے۔ محض تفنن طبع کے لئے اس
کے ڈیڈی ریلوے میں ملازمت کرتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں تو ان کا محل نما گھر ہے۔ جو
ڈھنڈار پڑا ہے۔ چونکہ اس کا اٹھنا بیٹھنا کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ تھا اس
کے اخراجات کافی زیادہ تھے۔ وہ اچھا اور قیمتی لباس پہننے کی بہت دلدادہ تھی۔ آج کل
کے زمانے میں جہاں لباس کی تخصیص ہی ختم ہو گئی ہے۔ جب تک بیش قیمت اور جاذب
نظر لباس نہ پہنا جائے انفرادیت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

بیگم ابراہیم اس اصراف پر اسے کبھی نہیں ٹوکتی تھیں۔ بلکہ یہ سب انہیں اس
جائز مطالبات لگتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کسی نہ کسی طرح اسے کسی بڑی فیملی میں بیاہ دیں
اپنی بیٹی کو دولت مند گھرانے میں بیاہنے کے لئے بیگم ابراہیم نے کیا کیا جتن
کئے۔ ایک تو اُسے شہر کے بہترین کالج میں داخل کرایا۔ پھر اسے اونچے طبقے میں گھو
اور سوشل پارٹیوں میں شرکت کی اجازت دی اس کے علاوہ کوئی نہ کوئی مشاطہ ان
ماہانہ وصول کرتی رہتی تھی۔ جو نئے و پرانے رئیس زادوں کی تصویریں اور شجرہ ہائے نسب
آئے دن ان کو لاکر دکھاتی۔ لین دین پر بات ہوتی۔ آمد و خرچ کی فہرستیں عائد کی جاتیں
بارے ایک نودولتیئے خاندان کو انہوں نے پھنسا ہی لیا۔ لڑکے نے تو صرف لڑکی دیکھ
کی شرط رکھی۔ مگر گھر والوں نے مطالبات اپنے شایانِ شان پیش کئے۔

لڑکے کو لڑکی بنا سنوار کر دکھا دی گئی۔ اسے پسند آگئی۔

بیگم ابراہیم کو تو جیسے دولتِ عظمیٰ مل گئی۔ یہی تو ان کی زندگی کا نصب العین تھا
انہوں نے جہیز ان کے شایانِ شان دینے کا وعدہ کرلیا۔

ابراہیم مرحوم نے بیگم کو لاکھ سمجھایا کہ ہم ان کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ پھر پانچ مزید بچوں کا
بوجھ ہمارے سر پر ہے۔ ایک لڑکی کو دھوم دھام سے بیاہ کر ان پانچوں کا مستقبل تباہ
نہ کرو اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہ کرو۔ لین دین پر جو رشتے طے کئے جاتے ہیں۔ ان میں ذرا
سی چوک بھی انجام کو بھیانک بنا دیتی ہے۔

مگر بیگم ابراہیم کو خدا نے ایک عرصہ بعد سربلند ہونے کا موقع دیا تھا۔ ان کے سمدھی
لاہور کے رئیس کہلاتے تھے۔ اگرچہ رئیس بنے بھی انہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے تھے
اور کیا ——— یہ آٹھ دن کی مسافت تھوڑی تھی ——— ؟ گلبرگ میں ان کی بہت
بڑی کوٹھی تھی۔ ان کا ہونے والا داماد کئی مرتبہ امریکہ ہو آیا تھا۔ ایک لڑکی اونچی جگہ لگ
گئی تو دوسری کے لئے خود بخود کسی نوابی خاندان کا در وا ہو جاتا گا۔ اور پھر بیگم ابراہیم

اپنی برادری میں ناک بھی اونچی رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جن لوگوں میں دم خم نہ
ہو، نہ تو وہ اونچے گھرانوں میں رشتے کرنے کی جرات کرتے ہیں اور نہ دھوم دھڑکے سے
دے دلا سکتے ہیں۔

سو دونوں ہاتھوں سے سود پر قرض لے کر وہ دھوم دھام کی شادی کی کہ میاں
کی نوکری کے لالے پڑ گئے۔ بھلا ایک گارڈ اپنی بیٹی کو ایسا جہیز کب دے سکتا ہے۔ وہ تو
محکمے والے ابراہیم کی نیک نفسی اور پاک طینتی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ورنہ جانے کیا
ہوتا ——— ؟

لیکن اس دھوم دھام اور کر و فر کا سکینہ کو تو فائدہ نہ ہوا۔ اس کا ہزاروں کا جہیز
لے کر کسی کروڑ پتی کے ہاں جانا۔ بالکل ایسا تھا۔ جیسے کوئی کسی شہنشاہ کو چند جھوٹے موتی
تحفے میں دے دے۔

اس کے سسرال والے اسے اچھوت ہی سمجھتے تھے۔ جب بھی لینے دینے کی
بات نکلتی وہ اسے اس کے میکے کی "سفید پوشی" کا طعنہ ضرور دیتے۔ اور تو اور اس کا
شوہر بھی اکثر ڈھکے چھپے الفاظ میں طنز کے تیر چلا جاتا۔ حتیٰ کہ اس کے میکے میں آکر
انہیں ذلیل کر جاتا مگر سکینہ کو یہ باتیں کبھی بُری نہ لگی تھیں۔

اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ہمہ وقت موتیوں میں گندھی رہے۔ اور
سونے کے بوجھ تلے دبی رہے۔ اس کے لئے اسے ہر گھٹیا سے گھٹیا شرط بھی منظور
تھی۔ سو وہ جب بھی اپنے میکے آتی۔ سونے سے پُھل آتی۔

اور جو ایک دو نئے زیور اس نے بنوائے ہوتے۔ وہ بھی ساتھ لے آتی۔ اس
کی ماں۔ اس کے نت نئے زیور بنوانے کے شوق کا چرچا سارے محلے اور ساری برادری
میں بڑے فخر سے کرتی۔ تاکہ لوگ رشک و حسد سے جل جل مریں۔

سکینہ کے بس دو ہی پسندیدہ کام تھے بچے پیدا کرنا اور نئے نئے زیور بنوانا۔

یوں شہر بھر کے قیمتی کپڑوں کے اس کے پاس انبار تھے۔

یہ اور بات ہے کہ اس کا شوہر نہ صرف خود اس کے میکے جانا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اسے بھی زیادہ دیر کے لئے نہیں جانے دیتا تھا۔ اصل میں وہ بچوں کو اس ماحول سے بچانا چاہتا تھا کہ ان کے رشتہ دار اتنے غریب ہیں۔ اور ایسی غلیظ جگہ پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھار منت وزاری کر کے سکینہ اسے ایک آدھ دن کے لئے میکے لے آتی تھی اور پھر ریلوے کوارٹرز میں وہ دن دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔

ان کے آنے سے پہلے سارے گھر کے فرش دھوئے جاتے۔ صوفوں کے غلاف اور بستروں کی چادریں بدلی جاتیں۔ یعنی ہر طریقے سے گھر کو ان کے رہنے کے قابل بنایا جاتا۔ مگر اکھڑے ہوئے فرش اور کھدر کی سفید چادروں میں لپٹا ہوا گھر اس بیوہ کی مانند لگتا۔ جس کا چہرہ کثرتِ آرائش کے باوجود صاف صاف کہے دیتا ہے کہ عمارت تو کب چکی اب کھنڈرات ہی سے دل بہلا لو۔

اور سکینہ کو میکے میں آتے ہی چاروں طرف گندگی اور غلاظت نظر آنے لگتی۔ وہ بات بات میں اپنی ماں کو ڈانٹتی اور آمنہ کو ٹوکتی ـــــ

"ہائے اللہ امی۔ آپ کا گھر ہمیشہ ہی کتنا گندہ ہوتا ہے۔ کبھی تو صاف رکھا کیجئے توبہ ـــ توبہ ـــ اس قدر مکھیوں میں نہ جانے آپ کس طرح رہ رہی ہیں"

"ارے بچو! اس طرف نہ جانا ـــ" پھر وہ بچوں کے پیچھے پڑ جاتی۔ ادھر کوارٹرز میں غلیظ بچے رہتے ہیں۔۔۔

"چھی۔۔۔ چھی۔۔۔ زمین پر بیٹھ کر کپڑے گندے کر رہے ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ کھیلنے کی ضرورت نہیں ـــ اندر سے کرسیاں لے جاؤ۔ اور ان پر بیٹھ کر ان کا کھیل دیکھو ـــ"

پھر وہ بچوں کی جان چھوڑ کر آمنہ کے سر پر سوار ہو جاتی۔

"آمنہ تو ہی ذرا اس گھر کا خیال رکھا کر۔ خبر نہیں تو گھر سے بے پرواہ کیوں رہتی ہے تیری تعلیم کا کیا فائدہ ـــ جب میں یہاں تھی تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا اب تو یہاں آتے ہوتے شرم آتی ہے۔" آمنہ ایک سوگوار سے تبسم سے ٹال جاتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ گھر کے نقشے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی صرف سکینہ آپا کے ذہن میں آ گئی تھی۔ گلبرگ کی محل نما کوٹھی اور ریلوے کوارٹرز میں ایک طویل فاصلہ تھا اور اس فاصلے کو پھلانگ جانا سکینہ آپا کے بس کا روگ نہیں تھا۔

آمنہ سکینہ سے آٹھ سال چھوٹی تھی۔ اس سے چھوٹا یعقوب تھا۔ یعقوب سے چھوٹے دو اور بھائی تھے۔ عرفان اور سلمان۔ بیگم ابراہیم کے سارے بچے ایک دوسرے سے مختلف تھے اور گھر کے ماحول کا اثر سب ہی نے مختلف انداز میں قبول کیا تھا۔ اسمٰعیل تو سامان لادنے والا گدھا بن گیا تھا۔ جس نے اُف نہیں کرنی اور بوجھ اٹھاتے چلتے رہنا ہے۔ اس پورے کنبے کا ساربان بن کر ان کی مہار تھامے منزل کی طرف رواں رہنا اس نے اپنی زندگی کا فریضہ بنا لیا تھا۔ خواہ دورانِ سفر پاؤں پہ آبلے پڑ جائیں یا آبلے رستے رہیں۔

سکینہ انتہائی خود غرض لڑکی تھی۔ اس کی اپنی ذات تھی۔ اور اپنی ذات کو نگینوں میں سجا کر وہ اس ماحول سے نکل گئی تھی۔

آمنہ ـــ؟

آمنہ کون تھی؟ اور یہاں کیوں آگئی تھی؟

وہ صابر اور کھوئی ہوئی لڑکی راستہ بھول کر یہاں آگئی تھی۔ اپنی حیران آنکھوں سے سارا تماشا دیکھتی اور ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹیں لئے سرگرم سفر رہتی۔ اس کی بھٹکی ہوئی بے ضرر روح کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جس وقت ابراہیم مرحوم کا انتقال ہوا۔ آمنہ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ ابراہیم اپنے

سب بچوں میں آمنہ اور اسمٰعیل کو بہت چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا ان دونوں بچوں کو خوب تعلیم دلوائیں گے۔ مگر ان کا یہ خواب بھی ادھورا ہی رہا۔ کیونکہ ان کی وفات کے بعد گھر کی حالت دن بہ دن دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ اسمٰعیل کی تنخواہ بھی اخراجات کو سنبھالا نہ دے سکی تو بی اے ڈ کر کے آمنہ نے ایک کونونٹ سکول میں نوکری کر لی تھی

اپنی آرزوؤں کو اپنے پہلو میں دبا کر آمنہ ایک ایسی راہ پر چل پڑی تھی جو اس کی منزل کو ہرگز نہیں جاتی تھی۔ لیکن وہ اس بات کے لئے شاکی بھی نہیں تھی۔ یہ راستہ اس نے خود منتخب کیا تھا۔ وہ گھر کی شکستہ کشتی کے سوراخوں پر بند بن کر بیٹھ گئی تھی یہ اس کا فرض تھا اور پھر اسے ہمہ وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں سکینہ آپا کی مانند اس کا سودا بھی کسی نودولتیئے کے ہاتھوں نہ کر دیا جائے۔ اس سودے بازی سے بچنے کے لئے اس نے استانی بننا قبول کر لیا تھا۔

پہلے پہل اس کی ماں تلملائی تھی۔ اسے خوف دلایا تھا کہ اس طرح اچھے رشتے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ ہمارے معاشرے میں ملازمت کرنے والی لڑکی کی قیمت آدھی رہ جاتی ہے۔ نوکری کرنے والی لڑکی کو لوگ یوں سمجھتے ہیں۔ جیسے گروی سے چھڑایا ہوا مکان ہو۔ یا سود پر لگایا ہوا روپیہ ـــــ

لیکن جب ایک بندھی ٹکی آمدنی گھر کے غیر ضروری اخراجات کو سنبھالا دینے کے لئے ماہ بہ ماہ گھر میں آنے لگی۔ تو بیگم ابراہیم کا منہ آپ ہی آپ بند ہو گیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق ملنے جلنے والوں سے یہی کہہ کر اپنی دھونس جماتیں ـــــ کہ

اس کو بھلا نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے میں تو کہتی ہوں۔ گھر بیٹھ جاؤ۔ آرام کرو ـــــ مگر اب آپ سے کیا چھپانا۔ اس لڑکی کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ ان کی وفات کا غم اس نے یوں اپنی جان کو

لگایا کہ اس کی صحت خراب رہنے لگی۔ بس اس کی صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے اسے نوکری کرنے کی اجازت دے دی کہ ذرا اس کا جی لگا رہے گا۔ ورنہ ہمارا ارادہ تو اسے ایم اے کروانے کا تھا ـــــ"

اب کوئی پوچھے کہ بھئی صحت کو ٹھیک رکھنے کا واحد طریقہ کیا سکول میں پڑھانا ہی ہے۔ اور کیا تفریحِ طبع کسی اور طریقے سے ممکن نہیں؟

اس منطق پر غور کرنا بیگم ابراہیم کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ یہ باتیں غریب آمنہ کو اور بھی تکلیف پہنچاتیں۔ پیوند کے اوپر پیوند لگانا کہاں تک جائز ہے؟ ـــــ

اس گھر کے ماحول کا آئینہ تو یعقوب تھا۔ وہ آمنہ سے دو برس چھوٹا تھا۔

سارے گھرانے میں بس وہی ایک باغی فرد تھا۔ ذہنی طور پر اس نے اس نظامِ حیات کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ کسی بھول یا گھپلے کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ابھی وہ نوعمر تھا اور اپنی ذہنی ناپختگی کے باعث نہ تو اس خاندانی الجھن کو کوئی نام دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتا تھا۔ اس لئے وہ ایک "بُرا لڑکا" بن گیا تھا۔

پہلے پہل صرف اپنے گھر کے لئے اور پھر سارے محلے کے لئے ـــــ

سکول سے کئی کئی دن غائب رہتا ـــــ رات گئے گھر آتا ـــــ گھر پر جس کے پیسے بھی ہاتھ لگتے اٹھا کر چمپت ہو جاتا ـــــ جرائم پیشہ لڑکوں کے ساتھ مل کر جوا کھیلتا ـــــ اور ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا ـــــ

جس وقت اس میں تباہ ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ اس وقت سارے گھر پر سکینہ آپا کا راج تھا اور ان کا ہر ناجائز نتیجہ جائز سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کی شادی طے ہو چکی تھی۔

کوبی کی طرف کون توجہ دیتا ـــــ"

اس کی بُری عادتوں کے طفیل اس پر انگارے برسائے جاتے۔ ادھر وہ گھر میں داخل ہوا ادھر لعنت ملامت کا مینہ برسنے لگا۔ کبھی وہ چپکا ہو رہتا اور کبھی خوب سناتا۔ اگلی صبح وہ گھر کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر بھاگ جاتا۔ جب نوبت چھوٹے موٹے زیوروں تک جا پہنچی تو بیگم ابراہیم بوکھلا اٹھیں۔ چھلا۔ مندری (انگوٹھی) تو وہ پل میں اٹھا کر ہوا ہو جاتا۔

پڑھائی کا یہ عالم تھا کہ چار سالوں میں وہ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا۔ اس لئے سب نے اس کے حق میں یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ پڑھ ہی نہیں سکتا۔

ابراہیم مرحوم کی زندگی میں وہ اتنا دیدہ دلیر نہیں تھا۔ باپ سے ڈرتا تھا۔ چوری کا اعتراف بھی کر لیتا تھا اور گھر میں سب کے مرتبے کا لحاظ کرتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اور اس کے درمیان چشم پوشی کا باریک سا پردہ حائل کر رکھا تھا۔ ہمیشہ محبت سے اس کی بات سنتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اور ان کی یہی بات بیگم کو بہت بُری لگتی تھی۔

بیگم ابراہیم تو اسے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتیں۔ اسے چھاجوں کوسنے دینے لگتیں۔ کبھی کبھار جوتا نکال کر مرمت بھی کر دیتیں ——— دیر سویر گھر آتا۔ تو کسی کو اس کے کھانے کی فکر نہ ہوتی۔ نتیجتاً وہ باورچی خانے میں گھس جاتا۔ اور جنگلیوں کی مانند ——— جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگتا ——— ہڑپ کر جاتا۔

ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد تو گھر والوں نے اس کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ باپ کی دردناک موت نے اسے بھی جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اور اس نے جی ہی جی میں "اچھا لڑکا" بن جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر یہ دُنیا دلوں میں کہاں جھانکتی ہے؟

یہاں جس کے ماتھے پر ایک بار برائی کا لیبل لگ گیا وہ سدا کو بُرا ہو گیا۔ اب جبکہ وہ سکول جانے لگ گیا تھا۔ شوق سے پڑھائی کرنے لگا تھا۔ سارا وقت گھر میں

تو اسے تب بھی طرح طرح کے طعنے سننے پڑتے ——— جو اس کے باغی ذہن کو پھر "بگڑا بچہ" بن جانے پر اکساتے "حد ہے بھئی ———" وہ اندر ہی اندر کھولنے لگتا۔ کیا دنیا کی ساری پھٹکار میرے لئے ہی رہ گئی ہے۔

اور پھر جس دن سکینہ آپا اپنی سسرال سے گھر آجاتیں۔ تو اس دن اسے بار بار سولی پر لٹکایا جاتا ——— کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ سسرال میں ان کی کم مائیگی کا باعث یہی ننگ خاندان لڑکا ہے ———

اگر اس کے طور طریقے کسی بڑے افسر یا رئیس زادوں کے سے ہوتے تو انہیں اسے اپنا بھائی کہتے ہوئے ذرا بھی شرم نہ محسوس ہوتی۔ ایسی ہی باتوں سے تنگ آکر۔ ایک روز وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ لیکن اس کی پرواہ کس نے کی تھی؟

"چلا گیا ہے تو دفعان کرو اس کو ——— خس کم جہاں پاک ——— اس کے گھر میں رہنے سے ہمیں کون سا سکھ تھا۔ ایسے فضول لوگوں کو گھر سے باہر بھی کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ دو چار دن خراب ہو کر ——— بے غیرتوں کی طرح خود ہی چلا آئے گا۔ خبردار جو کوئی اس کے پیچھے گیا ———" سکینہ آپا نے جب اتنا بڑا فتویٰ صادر کر دیا۔ تو پھر کس میں زبان ہلانے کی جرأت تھی۔

ہاں ——— اس گھر میں اگر کسی کو اس کی پرواہ تھی تو وہ آمنہ تھی۔ آمنہ پہروں اسکے لئے کھانا چھپا کر رکھتی تھی۔ اس کو معاشرے کا بہترین فرد بن جانے پر اکساتی تھی ——— اس پر اپنی جان نچھاور کرنا چاہتی تھی ——— اس کی ضرورت کا خیال رکھتی تھی ——— اپنی جمع شدہ پونجی ہمیشہ اسے دے دیتی اس وعدے پر کہ وہ آئندہ چوری نہیں کریگا۔ وہ وعدہ تو کر لیتا۔ مگر ایفا نہ کر سکتا ———

اس کا بدگمان ذہن آمنہ کے خلوص کو بھی قبول نہیں کرتا تھا۔ اور اگر قبول کر بھی لیتا تو وہ کیا کرتا ——— آمنہ تو خود ببول کی شاخوں میں لٹکی ہوئی انگور کی بیل تھی۔

سو وہ گھر سے ہی نکل گیا۔

کہاں اور کیوں ——

ایسی باتیں اس گھر میں کوئی نہیں سوچتا تھا۔ اب بھی دو چار مہینوں کے بعد جب اسے گھر کی یاد ستاتی تو وہ آمنہ کو ملنے کے بہانے گھر چلا آتا تھا۔ آمنہ کے علاوہ اُسے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ وہ چاہے کتنے عرصے بعد گھر آئے۔ اس کے وجود کو بُری طرح نظرانداز کیا جاتا تھا۔ اس کی پرواہ کرتا بھی کون ——

اسمٰعیل تو گھر کا گدھا تھا۔

گدھوں کے پاس ذہن نہیں ہوتا۔ بوجھ اٹھانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ آمنہ لڑکی تھی بس کُڑھ سکتی تھی۔ جل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔

بیگم ابراہیم کے لئے سکینہ آپا کے صادر کئے ہوئے فتوے سے سرمو انحراف ناممکن تھا۔

باقی رہ گئے —— عرفی اور چھمی!

بیگم ابراہیم نے اپنی زندگی کی ایک حسرت عرفی پر بھی نکالی تھی۔ ان کے کسی بچے نے کونونٹ سکول میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ وہ جب بڑے افسران اور امراء کے بچوں کو لاہور کے بڑے بڑے انگریزی سکولوں میں پڑھتے دیکھتیں تو ان کے دل پر گھونسا سا لگتا۔ بچوں کے سکولوں سے بھی تو STATUS سٹیٹس کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے ضد کر کے عرفان کو لاہور کے ایک بہت بڑے کونونٹ سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ داخل تو وہ ہو گیا۔ لیکن جب اس کے یونیفارم اور فیسوں کا تخمینہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ اتنے پیسوں میں تین بچے آسانی سے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن بیگم ابراہیم آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا وہ یہ خرچہ اپنے ذاتی بجٹ سے پورا کریں گی۔ گھر کی گاڑی پھر رینگنے لگی۔

ایک ہی سال میں عرفی صاحب کا دماغ بھی پلٹ گیا۔ وہ "صاحب لوگوں" کے ساتھ پڑھ کر احساسِ برتری کا شکار ہو گیا۔ نہ اسے گھر کا ماحول اچھا لگتا —— نہ گھر کا کھانا ——

چھوٹے بھائی سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔

بڑوں کو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔

سکول میں سب کچھ مغربی ——

اور گھر سارا مشرقی ——

دو تہذیبوں کے درمیان وہ گیند کی مانند اچھلنے لگا۔

بیگم ابراہیم نے اپنی دانست میں ایک اور دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ یعنی اسے ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ کیونکہ گھر کا ماحول اس کی مرضی کے مطابق نہیں تھا۔

خرچہ اور بڑا ——

ماحول میں کھچاوٹ اور بڑھی۔

ایک اور غلطی کا اثر خاندان پر پڑا ——

مگر اس کی قیمت کسے ادا کرنا پڑی ——

اسمٰعیل اور آمنہ کو ——

جو —— دونوں چُپ تھے ——

اب عرفی صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرتا —— اور اُن تین مہینوں میں پورا گھر ہی نہیں —— سارا محلہ اس کے وجود سے عاجز آیا رہتا۔ گھر کی اک اک شے سے نفرت کے اظہار کے علاوہ وہ سارا وقت مار دھاڑ پر آمادہ رہتا۔ ایک مصنوعی پستول گلے میں اور ایک مصنوعی خنجر ہاتھ میں پکڑے —— آنکھوں پر بڑے بڑے خول چڑھائے سارا وقت وہ "کاؤ بوائے" بنا پھرتا رہتا۔ اور محلے کے کسی نہ کسی بچے کے کان، منہ یا بازوؤں سے خون نکلتا رہتا۔ اس کے سکول کھلنے کے بعد سارا محلہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ اور بیگم ابراہیم

پلّو سے آنسو پونچھ کر گلوگیر آواز میں کہتیں ——

جلتی ہیں کم بختیں میرے لعل سے —— سب سے زیادہ خوبصورت اور سفید ہے میرا یہ بچّہ —— گھر کی خوراک تو اسے لگتی ہی نہیں —— جب بھی چھٹیوں پہ گھر آتا ہے۔ کمزور ہوتا ہے ——"

دوسرے لفظوں میں عرفی بیگم ابراہیم اور سکینہ آپا کی ایک چھوٹی سی شرارتی سی تصویر تھا۔

باقی رہ گیا —— سلمان —— تو اس کے مقدّر میں وہی کچھ تھا جو اسمٰعیل اور آمنہ کے ——

آٹھ سالہ چھمی بڑا معصوم اور صابر بچّہ تھا۔ دبلا پتلا اور زرد رو اس کے لئے پیلو کا ماڈل سکول ہی کافی تھا۔ علی الصبح ملیشیا کا یونیفارم پہنے —— بستہ بغل میں دبائے پیدل اسکول چلا جاتا۔ اور شام کو خود ہی آجاتا —— جو کچھ ملتا کھا لیتا۔ اور جو پہننے کو دیا پہن لیتا —— وہ اگر اپنی جماعت میں ہر سال اوّل آتا تو بیگم ابراہیم کو منظور نہ تھا۔ عرفی کو عرش پہ چڑھا کر انہوں نے چھمی کو ایک انمٹ احساسِ کمتری بخش دیا تھا۔ اس لئے عرفی کے گھر آتے ہی وہ ملازموں کی طرح اس کی تابعداری کرنے لگتا جس کے جواب میں اسے اپنے "رئیسانہ ذہنیت" رکھنے والے بھائی کی شدید نفرت اور مار کٹائی ملتی۔

اس کے علاوہ —— حسبِ معمول ان کے غریب رشتے داروں کی دو بچیاں نعیمہ اور رابعہ بھی بیگم ابراہیم کے باورچی خانے کی زینت تھیں۔ اپنی امیر سہیلیوں کے سامنے جنہیں وہ نوکرانیاں بنا کر پیش کرتی تھیں۔

اس طرح یہ ایک کنبہ تھا —— جو اندھوں کی مانند ایک ہی لاٹھی کو تھامے —— مستقبل کی پرپیچ اور نامعلوم راہوں کی جانب رواں تھا۔

"یہ چھٹیاں بھی کیسی عجیب، اور جذب و کیف میں ڈوبی دنیا لائی ہیں۔"

آمنہ باہر والے برآمدے میں بیٹھی۔ جانے کتنی دیر سے یہ سوچ رہی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ... زندگی میں کیسا انقلاب آچکا تھا۔

بوسیدہ چار دیواری اور گریاں درو دیوار کی اوٹ سے ایک نیا چاند طلوع ہو گیا تھا ہر ذرّہ گل و گلزار کا رنگ اختیار کر رہا تھا ... سونی سونی اور روکھی روکھی زندگی ایک دم بڑی پیاری لگنے لگی تھی۔ وہ سونی راہ گزاریں جنہیں ہر روز سینکڑوں افراد روندتے تھے ... اور جن پہ چل چل کر آمنہ تھک گئی تھی۔ وہی راہ گزاریں اب پھولوں سے اٹی پڑی تھیں۔ اس کو ہر شے ہنستی گاتی محسوس ہوتی تھی —— اس کا جی بات بات پہ مسکرانے کو چاہتا۔ دنیا کی ایک ایک شے کو چومنے کا ارمان دل میں مچلتا۔ اور ہر کثیف شے میں بھی اسے ایک ان دیکھے حسن کا پرتو نظر آنے لگا تھا۔

وہ کب سے باہر بیٹھی یہی سوچ رہی تھی۔

یوں دیکھنے میں وہ ریڈیو سن رہی تھی۔ کئی سال پرانا ایک ریڈیو باہر والے برآمدے میں رکھا تھا۔ جس کا ہر کل پرزہ جواب دے چکا تھا۔ جب کبھی کسی کا ریڈیو سننے کو جی

چاہتا وہ اس کے ٹوٹے ہوئے بٹن جوڑ کر کہیں نہ کہیں سے کوئی سر نکال ہی لیتا اور یہ حال بھی زیادہ تر آمنہ کو پیش آتی جب وہ ذہنی طور پر تھک جاتی یا کشاکش شب و روز اسے اداس کر دیتے تو وہ یہ ٹوٹا ہوا ریڈیو تاریں ملا کر جوڑتی اور ہلکے سروں میں لگا لیتی تب اس کے دل میں بہتر اور خوبصورت زندگی کی بے شمار تمنائیں... جگنوؤں کے غول کی مانند جگمگا اٹھتیں۔

خواہشیں ــــ آرزوئیں ــــ

آسائشیں ــــ

من چاہے کام ــــ

دِل کو بھانے والے لوگ ــــ

صاف ستھری زندگی!

محبّت، سادگی حُسن ــــ پھُول ــــ ستارے ــــ سُر سنگیت ــــ

رعنائیاں....

جھنکار!

پیارے پیارے کھیل!

سچّی سچّی باتیں!

جانے وہ کیا کیا سوچا کرتی ــــ اور کیا کیا گنگنایا کرتی ــــ زندگی کا واضح تصوّر اس کے سامنے نہیں تھا۔ دل کیوں بیٹھے بٹھائے مچلنے لگتا ہے اگر یہ گھر ہے تو پھر کس گھر کی اگنی من میں جل رہی ہے۔

اور پھر اس ماحول میں رہ کر کون پھولوں میں گھرا اور گیتوں میں سجا اپنے دل کا دروازہ وا کرے گا ــــ یہاں تو روشن روشنی سے بغلگیر ہوتی ہے۔ جھنکار، جھنکار کو ترستی ہے ــــ یہ سنہری روپہلی رم جھم اِدھر تو نہیں ہے۔

اس طرف تو گھپ اندھیرا ہے ــــ یا اس اندھیارے میں جگمگاتے ہوئے ننھے منھے جگنو۔ لاتعداد تمنائیں ــــ

یا پھر گہرا سناٹا۔

بھئی جگنو کی روشنی سے کب کسی کا گھر منوّر ہو سکتا ہے؟

یہاں ہر گھر والے کو جھلملاتے فانوس اور خیرہ چشم روشنیاں چاہئیں!

تو اس کا مطلب ہے ــــ روشنیوں کی تلاش میں جوگ لے لینا چاہیئے۔

نگر نگر دوارے دوارے ــــ

کہیں تو ــــ کبھی تو ــــ من کا اُجیارا ــــ راہوں میں بکھرا ہوا ملے گا ــــ اور تو کون سی ایسی شہزادی ہے کہ تیری خاطر کوئی البیلا شہزادہ کسی جوگی کسی سنیاسی کا بھیس بدل کر نکل کھڑا ہو۔

دنیا بہت وسیع ہے۔ آسودگیوں اور آرائشوں نے اسے بہت تنگ کر دیا ہے ــــ موٹروں پر گھومنے والے ــــ تلاشِ مسلسل کے قائل نہیں ہوتے ــــ پہلے چار قدموں پر دل کا سوداگر ڈھونڈ لیتے ہیں ــــ اور ــــ تیری طرح خوابوں کے پیچھے دوڑنے والے ــــ موٹروں کی گرد بن جاتے ہیں ــــ نہ بھی بنیں تو کسی کی کٹی ہوئی پتنگ لوٹنے کے لالچ میں اپنی ہی منڈیر سے گر پڑتے ہیں۔

تو آمنہ بی!

تو کسی کی کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے نہ دوڑ۔ اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لے۔

اسے اسکول سے جب بھی چھٹیاں ہوتیں تو تنہائیاں اسے واہموں میں اسیر کر دیتیں ــــ وہ اپنے الجھے خیالات سے الجھ الجھ کر اور بھی تھک جاتی ــــ سردہ ہو جاتی۔ یاسیت اُسے اَدھ مُوا کر دیتی۔

عام دنوں میں تو وہ ہر روز مصروف رہتی تھی۔ اسکول جانا اور پھر واپس آ کر گھر کے کاموں

میں جُت جانا خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ یوں اسکول میں بھی وہ اپنا کام بڑی دلجمعی سے
تھی۔ اس لئے بے حد تھک کر گھر آتی۔ تاکہ کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ گھر
میں نہ صرف سوچنے ہی سوچنے کو وقت ملتا بلکہ جلنے کڑھنے کے لئے بھی اچھا
مواد بہم ہوجاتا۔ پھر جب کہیں جانا نہ ہو ___ تفریحات کے مواقع نہ ہوں۔ گھر
آسودگی نہ ہو۔ اور اپنی خوشی کی خاطر انسان کچھ بھی نہ کر سکے اور صرف رو رو کر
کی چار دیواری کو دھوتا رہے تو پھر ان چھٹیوں کا کیا فائدہ ___؟

جہاں اور لوگ چھٹیوں کے دن طویل ہوجانے کی دعائیں کرتے۔ وہاں آ
خواہش ہوتی کہ پلک جھپکنے میں چھٹیاں گزر جائیں۔

اس مرتبہ جانے کیسی چھٹیاں آئیں۔ کہ بیٹھے بٹھائے اسے ایک نئی دنیا ل
اس کے تصوّر کے کئی بند روزن کھل گئے اور اس کے سوتے ہوئے خواب انگڑ
لے کر بیدار ہونے لگے اس کے میلے کچیلے آنگن میں نیا سورج طلوع ہوا اور چارو
آنکھوں میں چبھ جانے والی روشنی پھیل گئی۔

وہ حیران تھی۔

اور بیٹھی سوچ رہی تھی۔

یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے ___ ایک انسان‘ صرف ایک انسان زندگی کے گھُ
اندھیرے میں امید کا ستارہ بن کر جگمگانے لگتا ہے۔ تو زندگی کے سارے غم گر
پتوں کی طرح ڈھیر ہوجاتے ہیں۔

اور یہ کیسا نظام ہے۔

کہ یہی بنی نوعِ انسان‘ انسان کو مایوسیوں میں گمراہ کر کے موت کی جانب دھکیل
ہے۔

اور یہی انسان بعض اوقات جینے کی امنگ بن جاتا ہے۔

اور پھر کتنی عجیب بات ہے یہ کہ ایک ہستی آلام کی چکی میں پستے پستے جینے کا قرینہ بھول جاتی ہے ___ ناکارہ بن بیٹھتی ہے ___ کوئی ناطہ اسے سچا ناطہ نہیں لگتا ___ اور کوئی شے خوشی نہیں بخشتی ___ پھر ایک دن ایک اجنبی ___ کہ جس کی شبیہ تک اس کے ذہن میں نہیں ہوتی۔ اپنی ذراسی جھلک دکھلا کے ___ دل کے تاروں کو اپنی نگاہ کی مضراب سے چھیڑ کے ___ اس کو ایک دم انمول اور پیاری شے بنا دیتا ہے۔

ایک مشین زندگی بن جاتی ہے۔

اور کل پرزے دل وجگر کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اور وہی روزمرّہ کی گھسی پٹی باتیں ___

وہی قصّے ___

وہی سو بار سُنی سنائی کہانیاں۔

وہی سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی روایات۔

اور دنیا کا کہنہ ڈھنگ ___

سب ایک دم اپنا چولا بدل لیتے ہیں۔

ہر شے نئی اور سہانی لگنے لگتی ہے۔

آنکھوں میں نئے نور کے جلوے آجاتے ہیں۔ یا واقعی ہر بات نئے آہنگ کی صدا بن جاتی ہے۔

کان حسنِ سماعت سے آشنا ہوجاتے ہیں یا ہر آواز ایک جاں سوز ترنم میں ڈھل جاتی ہے۔

لبوں کو شیرینیٔ گفتار کا اعجاز مل جاتا ہے۔ یا زبان اپنی میلی نہیں اتار پھینکتی ہے۔

بہرحال کچھ نہ کچھ ضرور ہوجاتا ہے۔

"وہ کچھ ــــ" جس کا راز اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس چھپا رکھا ہے جس راز کوا
سے پوشیدہ رکھ کے انوکھا اور مقدّس بنا دیا ہے۔

اِس راز کے معانی کچھ کچھ محبت سے ملتے جلتے ہیں۔

آمنہ کا دل بڑی پیاری لے میں دھڑکنے لگا۔

یہ دھڑکن تو اس کی اپنی نہیں۔ یقیناً یہ کسی اور کی دھڑکن تھی۔ یہ دل جو اس کا دل تھا۔ اب کسی اور کا معلوم ہو رہا تھا۔

بیٹھے بٹھائے یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

آخر اس جیسی کم مایہ لڑکی کو کھوجنے والا جو گی اس کے دوارے آن کھڑا ہوا تھ

جو کچھ بھی ہوا ــــ بہرحال ــــ اس سے روح کو طمانیت اور قلب کو سکوُ ضرور میسر آگیا تھا۔ جیسے جاں بلب سسکتے، کراہتے مریض کو کسی نے حیات بخ امرت پلا دیا ہو۔

انجام اس کہانی کا کیسا ہی کیوں نہ ہو ــــ آمنہ کی تڑپتی سسکتی رو قرار آگیا تھا۔

وہ ایسے مطمئن بیٹھی تھی۔ جیسے اس نے ایک بیش قیمت امانت اس کے اص وارث کے سپرد کر دی ہو۔

حقیقت یہی ہے۔

اور جو گزر چکا ایک خواب تھا۔

وہ کانٹوں سے بھرا ہوا ایسا رستہ تھا۔ منزل پانے کی خاطر جسے عبور کرنا ہو پھر اسے تعجب بھی ہوا کہ اتنی مسافت تن تنہا طے کرنے کے باوجود اب اسے کی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

وہ گھر کے گیٹ کے بالکل مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نظر اٹھائی تو پودل

نیچے سے کسی آنے والے راہی کے دو پاؤں نظر آتے تو اس کا دل خود بخود تیز دھڑکنے لگا اس کے چہرے پر رنگ سا آگیا۔ اور آنکھوں میں خوبصورت سی چمک ــــ مگر وہ . . . . وہ تو کوئی راہگیر تھا۔ جو ان کے دروازے کے آگے سے گزر گیا تھا۔

تب آمنہ کو سمجھ آئی کہ وہ اس باہر والے برآمدے میں آکر کیوں بیٹھ گئی ہے۔

اس کا چہرہ سڑک کی طرف تھا ہر گزرنے والے راہی کے پاؤں پہلے نظر آجاتے تھے۔ ہر قدم پہ وہ نظریں بچھائے بیٹھی تھی۔ جب کسی راہ گیر کے جوتے ان جوتوں سے ملتے جلتے ہوتے۔ جن کی آہٹ اس کے دل میں بس چکی تھی، تو وہ از سرِ نو سراپا شوق بن جاتی۔

"تو منو جان! تو یہاں اس لئے آکر بیٹھی ہے"۔ اس مرتبہ مایوس ہو کر آمنہ نے اپنے آپ کو خود ہی شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔

"یہ والہانہ پن کی کون سی قسم ہے اور اتنی جلدی یہ مقام کیوں؟"

پہلے روز کی گفتگو کے بعد آمنہ اور حماد میں کوئی اور اس قسم کی بات نہیں ہوئی تھی۔ حماد کو ان کے گھر میں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کی بے تکلفی اور فطری سادگی کے باعث گھر کا ہر چھوٹا بڑا فرد اس سے مانوس ہو گیا تھا اور اب سب لوگ اسے اس گھر کا ہی ایک فرد سمجھنے لگے تھے۔ اور تو اور ــــ بیگم ابراہیم بھی اس کی بڑی مدّاح نظر آتی تھیں۔ وہ بھی ان سے خوب لچھے دار باتیں کرتا تھا۔ جو باتیں لوگوں کی نظر میں بیگم ابراہیم کی خامیاں تھیں۔ وہ انہیں کو ان کی خوبیاں بنا کر خوب تعریف و توصیف کے پل باندھتا۔

اس کے آجانے سے گھر میں ایک اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

پھر اس کے آجانے سے بار ہی کون سا پڑا تھا۔

گھر سے وہ صبح کی چائے پی کر چلا جاتا۔ دوپہر کا کھانا وہ گھر سے نہیں کھاتا تھا۔ اس

نے کہہ رکھا تھا کہ دوپہر کو اسے کھانا کھانے کی کوئی خاص عادت نہیں۔ اس لئے کا انتظار نہ کیا جائے۔ البتہ رات کا کھانا وہ بے قاعدگی سے گھر پہ کھاتا تھا۔ جو کچھ پکا ہوتا سب کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتا اگر اس کی "نائٹ شفٹ" ہوتی تو وہ رات کے کھانے کو بھی منع کر جاتا۔

بیگم ابراہیم نے بھی وہ بے جا تکلفات چھوڑ دیئے تھے اور حالات کا رخ پور موڑنے کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ایسی چیزوں کی فرمائشیں کرتا جن پہ پیسے کم خرچ ہوتے ہوں۔

مثلاً

"خالہ جان! کتنے دنوں سے چنے کی دال نہیں کھائی۔ آپ نے تو شاید نہ پکوانے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

یا

"آج بینگن کا بھرتہ ہو جائے تو کیسا رہے؟"

وغیرہ وغیرہ ——

یہ نہیں کہ کبھی اس نے آمنہ سے بات ہی نہیں کی تھی یا وہ اس سے لجانے لگی تھی۔ بلکہ وہ جب بھی ملتے بڑی بے تکلفی سے بحث و تکرار کرتے۔ سب کی موجودگی میں بھی کھل مل کر باتیں کرتے۔ خصوصاً جب اسمٰعیل گھر پہ ہوتا تو آمنہ کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی۔ پہروں مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتیں۔ تینوں ایک دوسرے سے الجھ بھی پڑتے اور ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوششیں بھی کی جاتیں مگر ——

دل کو چھو لینے والی باتیں پھر کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

وہ دونوں تو جیسے ایک بند گرہ کو کھول کر اطمینان سے اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے تھے۔ اسی لئے اب دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے تھے اور نگاہیں ایک

ِجے کی مشتاق رہتی تھیں۔

تبھی تو —— جب بھی حماد کو دفتر سے آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی۔ تو آمنہ بے چین سی ہو جاتی۔ اس بے چینی میں کوئی الجھن۔ شک و شبہ یا وہم و گمان کا دخل نہیں تھا۔

یہ تو وہ خوبصورت اضطراب تھا۔ جو اپنا آپ منواتا ہے۔ جو خود بخود دل پہ طاری ہو جاتا ہے۔

اور جس کے بغیر زندگی بے معنی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے۔

آمنہ بی بی!

تیری بے رنگ و بو زندگی میں رنگوں کا طوفان کیسے آ گیا؟

تُو تو پتھر تھی۔

خشک اور سرد پتھر ——!

واقعی! وہ تو شروع سے ہی بہت عجیب و غریب تھی۔

بچپن میں تو وہ بہت ہی کم گو اور حساس تھی۔

گھر میں کوئی ہنگامہ ہو —— جھگڑا ہو —— یا خوشی کا موقعہ وہ اپنی گھنیری پلکوں والی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اک اک کے منہ کو تکا کرتی۔ جیسے سب کچھ آنکھوں کی راہ سے سمجھ لینا چاہتی ہو۔ اسے اگر کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف بھی پہنچتی تو یہی بے زبان آنکھیں زبان بن جاتیں اور وہ موٹے موٹے آنسو بہانے پر ہی اکتفا کرتی۔

اس کی اِس مسلسل رونے والی عادت سے سبھی نالاں تھے۔ سب سے الگ تھلگ۔ ایک کونے میں بیٹھی ہے۔ زار و قطار رو رہی ہے۔ کسی کو کیا پتہ وہ کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔ اور اگر رو رہی ہے تو کیوں ——؟

ایسے میں اگر کوئی اس کی دلدہی کرتا تو وہ اسمٰعیل تھا۔ اسمٰعیل جانتا تھا کہ وہ حد

سے زیادہ حساس ہے اور جتنی حساس ہے اتنی ہی کم زبان بھی ہے۔

جبھی تو وہ بچپن ہی سے اسمٰعیل سے بہت زیادہ مانوس تھی اور اسی کو اپنا ہمدرد بنا دیا کرتی تھی۔

یہ عادتیں —— اسکول میں بھی اس کے ساتھ گئیں۔

وہ کم گو شی کے ساتھ کبھی کسی لڑکی کو سہیلی نہ بنا سکی۔ اور اگر سہیلی بنا لی تو اس سے کی بات کبھی نہ کہہ سکی۔ شروع ہی سے اس پہ ایک بے اعتباری کی کیفیت طاری جیسے دنیا میں کوئی بھی بھروسے کے لائق نہ ہو۔ یا کسی سے دل کی بات کہہ دی تو اسے ذلیل و رسوا سمجھنے لگے گا۔

وہ اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکی تھی۔ اسے کورس کی کتابوں سے اتنی دلچسپی تھی۔ البتہ ادھر ادھر سے جو بھی کتاب ہاتھ لگتی پڑھ ڈالتی۔

جس عمر میں لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں۔ وہ مختلف قسم کے رسالے اور کتابیں جمع کر کے پڑھا کرتی تھی۔ کتابیں پڑھنے کی لگن اور سوچ بچار کی عادت نے اسے ذہنی طو پر اپنی ہم جولیوں سے بلند کر دیا وہ کبھی انہیں اپنا ہم خیال نہ بنا سکی۔

ہائی کلاسوں میں پہنچ کر لڑکیاں خود کو ذرا "کچھ" سمجھنے لگتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عم جہاں انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ وہاں امنگوں اور نئے ولولوں سے بھرپور بھی ہوتی ہے۔ عمر کا یہ دور پل صراط ہوتا ہے۔

لڑکے ہوں یا لڑکیاں —— کچے ذہن کی اڑان کے آگے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے ہر شے ان کی خاکِ پا ہوتی ہے۔ اور ہر شخص ان کے نوخیز و فتنہ سامان شباب کا دشمن۔

آمنہ کا دل ایسے جذبات سے عاری رہا۔ عمر کے اس پل صراط پر وہ پرسکون اور مصفا ندی کی مانند ہولے ہولے گزر گئی تھی۔

وہ اپنے سکول کی لڑکیوں کے ابھرتے ہوئے عجیب و غریب رجحانات پر ہنسا کرتی تھی۔ .....

سر اٹھاتے ہی لڑکیاں اپنی ذات کے حصار میں مقید ہو جاتیں۔ اپنی صورت اور اپنی شخصیت ہی ان کا منتہائے نظر ہوتا —— یا پھر اپنے وجود سے باہر آتے ہی کسی ہم جنس یا اسکول کی مس کی شخصیت دنیا کی خوبصورت حقیقت بن کر ان کے سامنے آجاتی اور وہ اسی کو توجہ کا مرکز بنا کر پوجنے لگتیں۔

مگر آمنہ پر یہ دور نہیں آیا تھا۔ نہ تو اس نے کبھی خود پرستی اختیار کی۔ اور نہ اپنے وجود میں گم ہو کر کپڑوں، چوڑیوں اور رنگ برنگے ربنوں کی دنیا بسائی۔ اس کو تو وہ پہننا تھا۔ جو میسر آجاتا۔ جو اسے لے دیا جاتا۔

اور باوجود کوشش کے وہ کسی "مس" کے عشق میں گرفتار نہ ہو سکی۔ کلاس میں ہوشیار ہونے کی وجہ سے ساری استانیاں اس کی عزت کرتی تھیں۔ لیکن کسی "مخصوص مس" کے انتظار میں راہوں میں کھڑے ہو جانا —— پھولوں کا تحفہ دے کر شرمانا —— یا کاپیاں اٹھا کر اسٹاف روم تک ساتھ جانا اور راستہ بھر مس کی شان میں مدح سرائی کرتے جانا۔ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے یہ سب بے معنی اور مہمل لگتا۔

بھلا اس سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

آج ایک مس اور کل دوسری ——

آج ایک لڑکی اور کل دوسری ——

خوشامد اور چاپلوسی سے کیوں اپنا مقام پیدا کیا جاتے —— یہ مقام عارضی اور نظروں سے گرا دینے والا ہوتا ہے۔ اپنے کردار اور عمل سے ایسی بات کیوں نہ پیدا کی جائے۔ کہ سب خود بخود تمہاری جانب کھنچے چلے آئیں۔ سب کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کرنے اور چونکا دینے کی ایک لگن ضرور اس کے لاشعور میں تھی۔ جس کی باریابی کے لئے اس نے دل جمعی سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ہر سال جب وہ کلاس

میں فرسٹ یا سیکنڈ آتی۔ تو اسے اسٹیج پر بلایا جاتا۔ سارا ہال تالیاں پیٹتا۔ اور نوٹس بورڈ پر سب سے اوپر اس کا نام لکھا جاتا۔ تو اس کی روح کو بڑی تسکین ہوتی۔

جس عمر میں لڑکیاں اپنے وجود کے حصار میں گم ہو جاتی ہیں اور اپنے ارد گرد خوبصورت کپڑوں چوڑیوں۔ بندوں اور رنگوں کی ایک دنیا آباد کر لیتی ہیں۔ آمنہ ادھر ادھر سے بیشمار ادبی و نیم ادبی رسالے جمع کر کے لے آتی۔ انہیں پڑھتی۔ کچھ سمجھتی کچھ نہ سمجھتی۔ پھر ان میں سے اپنی پسند کے بیشمار اشعار اپنی نوٹ بک میں نقل کیا کرتی۔

اشعار کیا ہوتے ___؟ اور ان کا آمنہ کی معصوم زندگی سے کیا تعلق تھا۔؟ وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے تو بس درد بھرے شعر اچھے لگتے۔ جنہیں پڑھتے ہوتے دل میں کہیں درد ہوتا۔ اور آنکھ نم ہو جاتی۔ بہت سے شعروں کے معانی بھی اسے سمجھ میں آتے تھے۔ مگر چونکہ اس کے احساسات کو چھو لیتے تھے۔ یا اس کی غم پسندی کو تسکین دیتے تھے اس لئے وہ انہیں اپنی بیاض میں نقل کر لیتی۔ مثلاً۔ کوئی اگر اس کی بیاض کو کھول کر دیکھتا تو کچھ اس قسم کے غلط یا صحیح اشعار لکھے ہوئے ملتے۔

مایوسیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

ایک وہ ہیں کہ جن کے ہونٹوں سے نقرئی قہقہے ابھرتے ہیں
ایک ہم ہیں کہ تیری دنیا میں ایک تبسم کو بھی ترستے ہیں

میری چشم تمنا کی نمی تم نے نہیں دیکھی
لبوں پر میرے اکثر اک تبسم تم نے دیکھا ہے

تبسم کے پس پردہ جو غم کی ایک دنیا ہے
جھلک اس ایک دنیا کی ابھی تم نے نہیں دیکھی

مزہ برسات کا چاہو مری آنکھوں میں آ بیٹھو
وہ برسوں میں کہیں برسے یہ برسوں سے برستی ہیں

بڑے خلوص سے دُنیا فریب دیتی ہے
بڑے وثوق سے ہم اعتبار کرتے ہیں

اے موج حوادث اُن کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل پر موجوں کا نظارہ کرتے ہیں

ابھی ابتداء ہی کی تھی ابھی آپ نے سُنا کیا
جو ابھی سے نم ہیں پلکیں تو میں کہہ چکا کہانی

کب تک ہر ایک چیز پہ لِکھ لِکھ کے تیرا نام
رسوائیوں کے ڈر سے مٹایا کرے کوئی

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر
وغیرہ وغیرہ

غرض یہاں کہیں بھی اسے سوز و غم میں ڈوبا کوئی شعر نظر آتا جھٹ اسے اپنی ب
میں نقل کر لیتی۔ اور پھر سارے گھر سے چھپائے پھرتی۔ کہ کہیں کوئی اسے بھی معیوب س
کر اس کی سزا نہ دے۔

اور جس عمر میں لڑکیاں فلموں اور گانوں کی باتیں کرتی ہیں۔ اپنے محبوب فلم ایکٹرو
اور ایکٹرسوں کی تصویریں اپنی کتابوں میں رکھتی ہیں۔ وہ کونوں کھدروں میں بیٹھ کر ننھے
منھے افسانے و کہانیاں لکھا کرتی۔ گھر کے حالات ایسے نہ تھے کہ اسے ہر فلم دکھا
جاتی۔ یوں بھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ فلم کو اس کے لئے "شجرِ ممنوعہ" سمجھا گیا۔ کبھی کبھار اگر
کسی عزیز کے ساتھ اسے فلم دیکھنے کا موقعہ مل جاتا۔ تو وہ سارے سال کے تذکرے کے
لئے بالکل ناکافی ہوتا۔

جبکہ لڑکیاں ہر ہفتہ نئی فلم پر تبصرہ کرتیں۔ اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ اس معاملے
میں وہ ان کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے جب اسے کوئی خالی پیریڈ مل جاتا۔
"بریک" میں ہی وہ اکیلی دور درختوں کے جھنڈ تلے جا بیٹھتی۔ فنکاروں کی طرح نظریں خلا
میں جما دیتی۔ پنسل کو ہونٹوں میں داب لیتی۔ اور مہمل و لایعنی کہانیاں صفحوں پر اتارنا شروع
کر دیتی۔ . . . اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ پھر لڑکیوں میں ممیّز ہو گئی تھی۔ وہ اس
کے ہاتھوں میں کاغذوں کے پلندے دیکھ کر اسے "ارسطو" اور "مس ادیبہ" کے نام سے چھیڑنے
لگ گئی تھیں۔

وہ کسی کھیل، کسی ڈرامے، کسی فنکشن میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ اگر اسکول کی استانیاں
استفسار کرتیں کہ بھئی آخر تم اتنی اچھی اسٹوڈنٹ ہو کر ان چیزوں میں حصہ کیوں نہیں لیتی
ہو۔ تو اس کی سہیلیاں جھٹ بول اٹھتیں ——

"مس یہ آرٹ کی دنیا میں گم رہتی ہے۔"

"مس یہ کہانیاں لکھتی ہے۔"

"مس اس کو صرف شعر جمع کرنے کا جنون ہے۔"

کبھی کبھار وہ اپنے اسکول کی "بزمِ ادب" میں ایک آدھ کہانی بھی پڑھ لیتی۔ اس
پر اتنی زیادہ واہ واہ ہوتی کہ دنوں اس پر نشہ چھایا رہتا۔

یوں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کر کے اس نے نہ صرف گھر والوں کی عدمِ توجہی کا
خلا پُر کر لیا تھا بلکہ اپنی انا کی تسکین کا سامان بھی پیدا کر لیا تھا۔

اسی طرح وہ کالج میں پہونچ گئی تھی۔

کالج میں اس کی وہ بات تو نہ بن سکی تھی جو اسکول میں تھی۔ کیونکہ کالج کی بے شمار
لڑکیاں —— اور ان میں ہر قسم کی لڑکیاں۔ اس کی ننھی منی کہانیوں کو کچھ ماننے پر تیار ہی
نہ ہوتی تھیں۔ الٹا اس کا مذاق اڑاتیں۔ اور اس کی "آرٹ کی دنیا میں گم" رہنے والی عادت
پر پھبتیاں کستیں —— یہاں پہنچ کر ایک دفعہ پھر وہ شدید تنہائی کا شکار ہوئی لیکن تھوڑی
دیر ہراساں رہ کر سنبھل گئی۔ اس نے دو مشغلے اپنا لئے۔ لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنا۔
اور خوبصورت پھولوں کو کتابوں کے صفحوں میں جمع کرنا۔ جہاں کہیں اُسے خوشنما پھول نظر آتا۔ توڑ کر اپنی
کتابوں میں رکھ لیتی۔ پھر اُس کے پاس اتنے زیادہ سوکھے ہوئے پھول اکٹھے ہو گئے کہ اس
کی کتابوں کے علاوہ اُس کے بکس میں، اس کے بستر میں ہر وقت پھول ہی پھول نظر
آنے لگے اور کالج میں سب لڑکیاں اسے "پھولوں والی" کہنے لگ گئیں۔ اپنا یہ نام
اسے بہت پسند آیا —— یوں سب کی نظروں میں آ جانا بھی بہت بھلا لگا۔ البتہ کتابیں
پڑھنے والی "ہابی" نے اس کے ذہن کو جلا بخشی۔ اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت
اور بڑھ گئی۔ جبھی تو اسے سہیلیاں بنانے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔

کالج کے اس دور میں —— جبکہ لڑکیاں اپنے آپ کو فیشن کی کنجیاں ظاہر کرتی
ہیں۔ اور خالی وقت میں مزے لے لے کر ان اسٹاپوں پر لڑکوں کے ساتھ تصادم
کے قصے سُناتی ہیں۔ یا اپنے "کزنوں" کی محبتوں کے خود ساختہ لطیفے بیان کرتی ہیں

آمنہ فلسفے اور منطق کی باتیں کیا کرتی ـــــ وہ موٹے موٹے ادبی رسالوں کے حوالے بات بات میں شعر پڑھتی ـــــ اور لڑکیاں یوں جل جاتیں کہ شاید ان پر اپنی علمیت کا رُعب ڈال رہی ہے اور بچاری آمنہ رُعب کون سا ڈالتی۔

بس اشاپ پر اس کے ساتھ کبھی کوئی خوشگوار تصادم نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی زرد رنگت اور دبلے جسم کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار تھی۔ اس پر اس کا کوئی اتنا بڑا خاندان نہیں تھا۔ جس میں بے شمار کزن ہوتے اور پھر ان کے ساتھ دھوپ چھاؤں کے کھیل بھی۔ اور نہیں تو ـــــ اگر وہ سکینہ آپا کی طرح ہوتی تو ایسے قصے اپنے سے گھڑ کر سُنا دیتی۔ مگر وہ تو ان باتوں سے کوسوں دور تھی۔

لڑکوں کا ذکر لڑکیوں کی زندگی میں کیوں اتنا ضروری ہے۔" افسانوی محبتیں لڑکیوں کے ذہنوں پر کیوں طاری رہتی ہیں۔ اسے یہ سب باتیں ناپسند تھیں! اس کا خیال تھا کہ ان سب رنگینیوں کو زندگی سے نکال کر ـــــ اور محبت کو کمزوری بغیر بھی زندگی گذر سکتی ہے۔

اپنے دلائل کو منوانے کے لئے اس نے کالج کے مباحثوں میں حصہ لہ شروع کر دیا۔ یوں اس کا چرچا ہوا۔ تو وہ اپنے کئی بے نام دکھ بھول گئی ـــــ زندگی میں اس نے ہمیشہ توازن رکھا۔ اگر وہ اپنی زندگی کے ابتدائی خلا اس طرح پُر نہ کر لیتی۔ تو جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ کیونکہ وہ پیدائشی طور پر "بورنگ" لڑکیوں سے بڑی مختلف تھی۔

جب وہ ڈگری کلاسز میں پہنچی تو اس کا شعور کافی پختہ ہو چکا تھا۔ بہت سی باتیں جو اس کی ہم عمر لڑکیوں کے لئے ناقابل فہم تھیں۔ آمنہ کے لئے ان کی تہہ تک پہنچ جانا بالکل آسان تھا۔ سوچ سمجھ کی عادت اور کتابیں پڑھنے کے شوق نے اس کے ذہن کو جلا بخشی تھی۔

وہ سیدھے راستے پر تو چل رہی تھی۔ مگر اس کی زندگی کو خوشی کی زندگی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ خصوصًا اس وقت جب اس نے اپنے ذہن میں "مخالف جنس" کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہوئی تھی۔

جبھی تو اس نے "ایبنارمل" ABNORMAL لڑکیوں کی طرح مردوں سے الگ ایک جہاں بسانے کے لئے لمبی چوڑی تعلیم حاصل کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ وہ سوچتی ـــــ وہ بہت سی ڈگریاں حاصل کر لے گی۔

پھر ـــــ پھر وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے گی ـــــ ایسا کارنامہ کہ ـــــ دنیا میں ایک دھماکہ ہوگا اور ساری دنیا اس دھماکے سے چونک جائیگی۔

لیکن دھماکہ ہوا بھی تو کیسا ـــــ ؟

جس نے صرف اسی کو چونکا کر اور پھر مفلوج کر کے رکھ دیا۔ جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھی اس کے باپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اور اسے اپنے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو چکنا چور کر کے نوکری کر لینی پڑی۔ یوں اس کے لاشعور میں چھپے ہوئے خوبصورت خیال اور مستقبل کے سنہرے خواب اندھیروں میں کھو گئے۔

پنی ماں سے اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ ایک دن ضرور اسے کیکر کی شاخ سے لٹکا دے گی۔ محبت کا تصور اس کے ذہن میں آتا بھی تو کیسے ـــــ ؟

پھر اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ محبت کرنا اور محبت کروانا امیر لڑکیوں کا مقدر ہے۔

آج کے زمانے میں غریب اور مجبور لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے۔ اس لئے بازار سے گزرتے ہوئے وہ کبھی کسی مرد کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتی۔ کسی بھی پیکر کو اپنے آئیڈیل میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرتی۔

رفتہ رفتہ وہ مردوں سے متنفر رہنے لگی۔

"آخر مردوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا ؟"۔

آج اپنے اس رویّے پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔

یقیناً وہ ایک بیمار ذہن رکھتی تھی۔ ایک غلط خیال دل میں بٹھا کر نفرت کئے
کہاں کی عقلمندی ہے۔

اور اگر تیرے ذہن میں کسی مرد کا کبھی کوئی تصور نہیں تھا۔ اور اگر واقعی تجھے ک
سے نفرت تھی۔

اور اگر تیرے لاشعور سے مستقبل کا خاکہ بالکل مٹ گیا تھا۔

اور —— اگر انجانے میں تجھے کسی کا انتظار نہیں تھا۔

تو تو نے ——

اس اجنبی کو —— جسے تو آج سے ایک ماہ پیشتر جانتی تک نہیں تھی۔

آمنّا و صدّقنا —— کہہ کر کیوں قبول کر لیا ہے۔

جب اس نے تجھے پکارا۔ تو تجھے یوں کیوں لگا کہ جیسے وہ صدیوں سے ب
پکارتا آیا ہو —— اور تیری نگاہ اس کی نظر سے بچھڑے ہوئے بچے کی مانند کیو
کر مل گئی۔ اس طرح لوگ اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔

سمجھیں —— ؟

اور اگر تو ذہنی طور پر اس "حادثے" یا "تصادم" کے لئے تیار ہوتی۔ تو یوں ایک
شعلے سے یہ تیرے خرمنِ ہوش کو خاکستر نہ کرتا۔

آمنہ اپنی بند آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔

اُوہ! کتنا طویل سفر وہ طے کر آئی تھی۔ اُسے یہاں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے
گئے تھے۔ پرانے گیت بھی ختم ہو چکے تھے۔ سائے ڈھل رہے تھے اور۔۔۔

پھر اسے دو شناسا قدم دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ اس
نگاہیں سراسر شوق بن گئیں۔ دل دھڑکا۔۔۔ اور۔۔۔

وہ قدم آگے نکل گئے ——

وہ کوئی اور تھا جو سڑک پر جا رہا تھا۔

اس بار اسے خود پر بڑا غصہ آیا۔ اسے حماد کے جوتوں کی اچھی طرح پہچان تھی۔ پھر
وہ ذرا سی مشابہت پر جان بوجھ کر کیوں دھوکا کھا جاتی تھی۔

اس نے جھلا کر دروازے کی جانب سے پیٹھ موڑ لی۔ اور لڑکیوں کی کاپیاں اٹھا
کر گود میں رکھ لیں۔ گویا وہ اپنے کام میں منہمک ہو جانا چاہتی ہے۔ اتنی دفعہ جو اس کے
واہمہ نے ٹھوکر کھائی تھی۔ وہ اس کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

ابھی اسے کام شروع کئے پانچ منٹ ہی ہوتے تھے کہ اسے گیٹ کی جانب
سے مانوس سی چاپ سنائی دی۔ مگر اس مرتبہ وہ دل کو مضبوط کر کے بیٹھی رہی۔

"میں بھی مڑ کر نہیں دیکھوں گی۔ خواہ آئے یا نہ آئے ——"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دو مضبوط ہاتھ اس کی آنکھوں پر آہستگی سے ٹک گئے۔ اور وہ ایک دم ہڑبڑا اٹھی۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ ان ہاتھوں نے اس کے چہرے سے مس ہوتے ہی بتا دیا کہ وہ کون تھا؟۔ مگر عادتاً اس نے چونکتے ہوئے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر آنکھوں سے ہٹا دیا۔

آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا تھا۔ مگر دل میں خوشیوں نے اجالا بکھیر دیا تھا۔ ابھی تک پلکیں جھپک جھپک کر اپنی نظر ٹھیک کر رہی تھی۔ مگر بے خیالی میں اس نے حماد کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔

"یہ کیا عورتوں کی سی حرکت کی ہے آپ نے؟"

"اب تم بھی جواب میں کہیں مردوں کی سی حرکت نہ کر بیٹھنا"

"وہ کیا ——؟"

آمنہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاتھ پکڑ کر چھوڑ نہ دینا ——" حماد نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھوں کا نور انڈیلتے ہوئے کہا۔

آمنہ نے شرما کر ایک دم اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

"آج بڑی دیر لگا دی آپ نے؟" آمنہ نے ذرا پرے ہٹ کر کہا۔

حماد اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو گویا تم میرا انتظار کر رہی تھیں"

"نہیں تو ——" وہ سٹپٹائی ——"میں تو ذرا —— یہ کاپیاں چیک کرنے یہاں آبیٹھی تھی"

"یہ کاپیاں تو کسی بھی کمرے میں بیٹھ کر دیکھی جاسکتی تھیں۔ سمجھیں ——؟ یہ اتنا بڑا پلندہ اٹھا کر عین دروازے کے سامنے بیٹھنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"جبھی تو میں دروازے کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھی ہوئی تھی"

"کیا خبر میری آمد کا اندازہ کر کے تم نے پیٹھ موڑ لی ہو محض مجھے یہ احساس دلانے کے لئے کہ تم اپنے کام کی خاطر یہاں آبیٹھی ہو"

"خوش فہمی ملاحظہ ہو۔ حضور کی ——" آمنہ نے بظاہر خوش دلی سے کہا "زیادہ قیافہ شناس بننے کی کوشش نہ کیجئے ایسا نہ ہو کہ آپ کا اپنے آپ سے بھی اعتبار اٹھ جائے"

مگر اندر سے آمنہ کہہ رہی تھی۔

انتہائی خطرناک آدمی —— اس کی پاتال تک رسائی ہے۔ اس سے کچھ چھپانا فضول ہے۔ اس کو دھوکہ دینا بے سود ہے۔

"اچھا مونی! اگر یہ میری خوش فہمی ہی ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب میں نے خوش فہمیوں کے سہارے زندگی گذارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ تم جانتی ہو اگر زندگی میں یہ خود ساختہ پن اور خوش فہمیاں نہ ہوں تو باقی کیا رہ جائے گا...."

—— اور تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتیں۔ کہ تم گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھی

میرا انتظار کر رہی ہو۔" اس نے لہجہ بدل کر درشتی سے کہا۔

"جی ——" آمنہ نے اپنی کرسی ذرا پرے کر لی اور سنجیدہ سا چہرہ بنا کر بولی۔

"صرف ذرا سی غلطی ہوئی ہے آپ سے —— میں ایک گھنٹے سے نہیں بلکہ گھنٹے سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

جب دونوں کی نگاہیں ملیں۔ تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بظاہر آمنہ نے یہ بات مذاحیہ انداز میں کہی تھی۔ مگر اس میں کتنی حقیقت ہے۔ حماد ہی جانتا تھا۔

دفعتاً ایک موٹر رکشا سامنے دروازے پر آکر رکا۔ دونوں نے اُدھر نظر کی تو اس سے اتر کر ایک ہٹا کٹا نوجوان نہایت بے ڈھنگے کپڑے پہنے انہیں کی طرف آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر پہلے تو آمنہ کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر ایک سوگوار سی خوشی اس کے چہرے پر ابھر آئی۔

اس نوجوان نے ذرا سے فاصلے پر کھڑے ہو کر سارے گھر کا جائزہ لیا اور پھر حماد کو گھورنے لگا۔

آمنہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"آؤ.... آجاؤ...." وہ اس کی طرف بڑھی۔ "امی تو آج دوپہر سے عرفی کو لے کر آپا کے گھر گئی ہوئی ہیں...."

وہ جھومتا جھامتا آگے بڑھ آیا۔

"کیسے آئے ہو ——؟ اچھے تو ہو؟"... آمنہ نے پیار سے پوچھا۔

"ضروری کام ——" اس نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

آمنہ اس کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے ایک کرخت سی نگاہ حماد پر بھی ڈالی۔ جو ماتھے پر بل ڈالے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

آمنہ اس کو لے کر سیدھی اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

"منی آپا - میں بڑی جلدی میں ہوں۔" اس نے خجالت سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"کتنے پیسے چاہئیں تمہیں ——؟"

"صرف پچاس روپے ——" وہ فرش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"دیکھتی ہوں اگر پورے ہو گئے تو —— چھٹیاں ہیں نا آجکل —— ! گھر میں خرچ ہو جاتے ہیں۔"

اس نے اپنی مقفّل الماری کھولی۔ اور الماری میں بچھے ہوئے پرانے اخبارات کی بوسیدہ تہیں ٹٹولنے لگی۔

اِدھر اُدھر سے نوٹ اور ریزگاری اکٹھے کر کے اس نے پچاس روپے پورے کئے اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھائے۔

"آج تو لاج رہ گئی اس الماری کی۔"

اس نے پیسے تھام لئے اور ڈھٹائی سے بولا۔

"تمہیں یاد ہے منی آپا۔ کبھی میں اس الماری کا تالا سلائیوں سے کھول کر تمہارے جمع شدہ پیسے اڑا لیتا تھا۔"

"سب یاد ہے بھیا! مجھے سب یاد ہے۔" آمنہ نے الماری کو مقفل کرتے ہوئے کہا۔ جس میں اب پیسے تو نہیں تھے۔ البتہ اس کی متاع بے بہا اس کی ڈائریاں اور بچپن کی لکھی ہوئی بیاضیں پڑی تھیں۔

"اور تم اب کون سی کسر چھوڑتے ہو۔ تب چرایا کرتے تھے اب میری جمع شدہ پونجی ایسے ہتھیا کر لے جاتے ہو۔ یاد رکھو میں تم سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گی۔"

"ضرور.... ضرور...." اس نے جیب میں روپے ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم اپنا حساب لکھتی رہو منی آپا۔ میں تمہارا ایک ایک پیسہ لوٹا دوں گا۔"

"مگر کب ـــــ ؟" اچانک اس کا بازو تھام کر آمنہ بولی۔ "میرا احساب تو بہ... لمبا ہو گیا ہے کوبی! اور میں دن گن رہی ہوں۔ کب۔۔۔۔ آخر کب ـــــ ؟" یہ ک... آمنہ کی آواز بھرا گئی۔

کوبی کے دل کو جیسے چوٹ سی لگی۔ دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگا! اور... آواز میں بولا۔

"منی آپا! آجکل میں بڑی لگن سے کام سیکھ رہا ہوں۔ بس صرف تیرے ... نوکری لگ جانے دے۔ تجھے روپے میں تول دوں گا۔"

"پتہ نہیں تو اب بھی سنجیدہ ہوا ہے۔ یا پہلے کی طرح جھوٹ بول رہا ہے۔"

"نہیں منی آپا!" کوبی نے نظریں جھکا کر کہا۔ "اس مرتبہ میں بالکل سچ کہہ... اور اس کے لئے بھی تیرا شکر گزار ہوں اگر تو وقتاً فوقتاً مجھے پیسے دے دے کر م... ضمیر کو اتنے کچوکے نہ لگاتی تو وہ شاید کبھی بیدار نہ ہوتا۔ یہ پچاس روپے میں عیاشی ک... نہیں لے جا رہا ہوں ـــــ مجھے معلوم ہے تو نے اپنی کئی ضرورتوں کو دبا ک... میرے لئے رکھے ہوں گے۔ منی آپا۔۔۔ یہ تیرے مقدس پیسے مجھے تیری طر... ہیں۔ اب میں وہ بدبخت کوبی نہیں ہوں۔ جو تیری حلال کی کمائی سے جوا کھیلا کرتا...

"آپا تجھے میری بات کا اعتبار نہیں کیا ـــــ ؟" اس نے گم صم کھڑی آمنہ...

"ہے کیوں نہیں ـــــ ؟ مجھے تو دنیا میں صرف تیری بات کا اعتبار ہے کو... میں تو اس دن کے تصور میں جی رہی ہوں جب میرا بھتیا اپنا گھر بنا کر مجھے لینے آ... کوبی! تو کیا جانے میں گھڑیاں گن گن کر دن کاٹ رہی ہوں۔"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ـــــ کوبی کا چہرہ اور آنکھیں لال ہو رہی تھیں...

"جھوٹ کار گر ہوئی ہے ـــــ" آمنہ نے سوچا۔

"اچھا اب میں جاؤں ـــــ" کوبی نے باہر نکلتے ہوتے کہا۔

"کچھ کھاؤ گے پیو گے نہیں۔"

"رکشا باہر کھڑا ہے۔ اور میں بہت جلدی میں ہوں۔ یونہی کرایا پڑتا رہے گا۔"

"اچھا تو جاؤ ـــــ پھر کب آؤ گے ـــــ" آمنہ نے پوچھا۔

"پھر ـــــ" کوبی دانت پھاڑ کر ہنسا۔ "جب ضرورت کھینچ لائے گی۔"

"بدو کہیں کے ـــــ" آمنہ بھی ہنسی۔ "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔"

"یاد ہے جی ـــــ یاد ہے ـــــ" کوبی ہاتھ ہلاتا ہوا رکشے میں جا بیٹھا۔

آمنہ لوٹ کر آئی تو حماد برآمدے میں نہیں تھا۔ وہ غالباً اپنے کمرے میں چلا گیا تھا آمنہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ حماد ایک کرسی پر بیٹھا بڑی محویت سے ایک رسالہ دیکھ رہا تھا۔ آمنہ جا کر اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔ مگر اس نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ وہ ذرا سا اور آگے ہو گئی اور اس کا سایہ رسالے پر پڑنے لگا۔

"مہربانی کر کے روشنی آنے دو۔" حماد نے نظریں اٹھاتے بغیر کہا۔

"ہر روشنی کے پیچھے اندھیرا ہوتا ہے۔" آمنہ نے شوخی سے کہا۔

"ہاں۔ تمہارے پیچھے جو اندھیرا ہے۔ وہ بھی میں نے آج دیکھ لیا ہے۔" حماد نے بڑے طنز سے کہا۔

"جی ـــــ ؟ کیا کہا ـــــ ذرا پھر سے کہیئے ؟"

آمنہ وہیں زمین پر پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی اور حیرت سے جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"اتنی معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ کہ میں پھر فریب کھا جاؤں۔"

"حماد صاحب! آپ کا دماغ چل گیا ہے شاید ـــــ" ایک دم حماد کے موڈ بگڑنے کی وجہ آمنہ کی سمجھ میں آ گئی۔۔۔ اس نے کیوں منہ پھلا رکھا ہے ـــــ اور کیوں روٹھ کر اندر چلا آیا ہے۔۔۔ اور اسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ جاتے جاتے کوبی نے جو یہ فقرہ

کہا تھا۔ "جب ضرورت کھینچ لائے گی تب آؤں گا ـــــ" تو حماد کا بدگمان ذہن "ضرورت" کے لفظ کو معانی کے کیسے کیسے لبادے پہنا رہا تھا۔ اور پھر آمنہ کا اُس سے یہ کہنا "اپنا وعدہ یاد رکھنا"۔ اور اسے گیٹ تک چھوڑنے جانا ۔ ۔ ۔ ۔ نہ چاہتے ہو بھی وہ یہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

تو گویا۔ یہ عورتیں سبھی ـــــ

اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ اور چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا۔ غصے کا بھوت اس ذہن کے آنگن میں ناچنے لگا تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ آمنہ ایسی نہیں ہوسکتی۔

"جناب حماد صاحب! وہ کوئی نہ تھا۔ میرا بھائی یعقوب ـــــ" آمنہ نے انتہائی عصّہ سے کہا ـــــ اور اٹھ کر جانے کو مڑی۔

اٹھتے ہی اس کا دامن حماد نے پکڑ لیا۔

"مجھے جانے دیجئے۔" آمنہ نے دُرشت لہجے میں کہا۔ "ایسا غلیظ ذہن رکھنے آدمی سے میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"منوں ـــــ" حماد کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"مہربانی فرما کر مجھ جیسی دھوکے باز لڑکی کا نام بھی مت لیجئے۔"

"منوں ـــــ" یکلخت حماد اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا او اپنے دونوں ہاتھوں سے اس نے اُس کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ لئے۔ ابھی تک آ کی اس کی طرف پشت تھی۔

"منوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دے۔ تو سمجھتی کیوں نہیں ـــــ آخر سمجھ کیو نہیں جاتی میں بالکل گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک پل کے لئے بھی تیری توجہ میری طرف سے ہٹ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے ہوتے ہوئے تو اپنے سگے بھائی سے بھی بات کر "مجبوری ہے۔" آمنہ نے رکھائی سے کہا۔

"ایسے شخص کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اور نہ اس کے ساتھ میرا نباہ ہوسکتا ہے۔"

"میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ منوں! میں ٹھیک ہو جاؤں گا ۔ ۔ ۔ خدا کی قسم میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میں ایک بیمار آدمی ہوں۔ دیکھ! میں خود اعتراف کر رہا ہوں۔"

حماد نے کچھ اس لجاجت سے کہا کہ آمنہ کو ہنسی آگئی۔ مگر اس نے اپنا منہ دوسری طرف ہی رکھا۔ حماد نے ابھی تک اس کے پاؤں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔

"اگر تو اس کرسی پر نہیں بیٹھے گی تو میں اپنا سر تیرے قدموں میں رکھ دوں گا۔ بتا پھر کیا کرے گی؟"

آمنہ نے اپنے پاؤں چھڑا لئے اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

حماد کے چہرے پر بے حد خجالت تھی۔ اس نے مری ہوئی آواز میں پھر گفتگو کرنا چاہی۔

"تو کیا وہ پھر تجھ سے پیسے لینے آیا تھا ـــــ" یعقوب کی کارستانیاں بھی اسمٰعیل ہی کی زبانی اسے معلوم ہو گئی تھیں۔ اس معاملے میں اسمٰعیل آمنہ کا ہم خیال نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا اس طرح اسے وقت بے وقت پیسے دے کر آمنہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

"جی! وہ پیسے ہی لینے آیا تھا۔"

"آخر تم کب تک اس کی پشت پناہی کرتی رہو گی؟"

"جب تک حوصلہ رہا ـــــ" آمنہ نے ناگواری سے جواب دیا۔

"آمنہ! تم سمجھتی ہو تم اس کا بھلا کر رہی ہو؟"

"جی! میں سمجھتی ہوں۔ اور سمجھتی رہوں گی۔ اگر میں بھی اس سے منہ موڑ لوں۔ تو ضرورت کے وقت میرے پاس آنے کی بجائے وہ چوریاں کرے ـــــ ڈاکے ڈالے ـــــ جیبیں کاٹے اور جیل چلا جائے۔"

"تمہیں یہ قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ کیا اس طرح تم اسے کاہل اور خود غرض بنا رہی ہو؟"

"میں اس معاملے میں آپ کی مداخلت بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ میرا طریقِ کار ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور سدھر جائے گا ——— اگر میں روشنی اور ہوا کا یہ روزن بھی بند کردوں۔ تو محبّت کے لئے ترس ترس کر وہ اندھیروں سے ٹکر پھرے گا۔ سب گھر والوں کے ساتھ میں آپ کو بھی چیلنج کرتی ہوں کہ ایک دن کوئی اور دیانت دار شہری بن جائے گا۔ میں آپ سے زیادہ اسے سمجھتی ہوں۔ اب آ اس پہ طبع آزمائی کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔"

آمنہ ابھی تک غصہ میں تھی اور یوں اپنا غصہ نکال رہی تھی۔

"منوں۔ تو نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔" حماد کا لہجہ ایک دم بدل کر معص اور یتیم بچے جیسا ہو گیا۔ "میں بھی تیری توجہ اور محبّت کا مستحق ہوں۔"

"آپ بے حد بدگمان اور حاسد ہیں ———"

"تم ٹھیک کہتی ہو منوں؟"

"میں انتہائی بدگمان اور حاسد ہوں۔ اور تیرے معاملے میں تو میں اور بھی تنگ ہوں۔ اور تجھے آگے آگے پتہ چلے گا۔ میں کس قدر حسد کرتا ہوں۔ ہاں میں ہر ا سے حسد کروں گا۔ میرے علاوہ جس سے تو بات بھی کرے گی۔ ہوا بھی تجھے چھو گز گی۔ تو میں اس سے بھی بدگمان ہوجایا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں ہمہ وقت تیری تما توجّہ میری طرف رہے۔ تو تمام تر صرف میری ہو۔ اور جب تو میرے روبرو بیٹھی ہو تو فرشتے سے بھی ہمکلام نہ ہو۔ آمنہ ——— میں واقعی مریض ہوں۔ میرے معالج کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

"دوسرا کوئی ———"

وہی انداز ——— ٹھکرایا ہوا ——— گمراہ کیا ہوا ——— محبّت کو ترستا ہوا ضدی بچہ۔ بگڑا ہوا بچہ!

آمنہ کو اپنے سینے میں اس کے لئے ایک آنچ سی محسوس ہوئی۔ اسے وہ ایک دم بے قصور نظر آنے لگا۔ جانے کیوں اتنا بدظن ہو گیا ہے ——— جانے ماں نے کس موڑ پہ اور کن حالات کے تحت اپنی معطّر گود سے دھتکارا ہوگا اسے ———

آج یہ دَر در بھکاری بنا پھرتا ہے۔ جانے کس نے اس کے معصوم ذہن میں زہر بھر دیا ہے ——— جانے اس کا سراپا کس آگ میں جل گیا ہے ———

وہ نفسیات کی طالبہ تھی۔ اور نفسیات ہی میں اس کا ایم اے کرنے کا ارادہ تھا۔ ایم اے تو وہ نہ کرسکی تھی۔ البتہ اب بھی زیادہ تر نفسیاتی رسالے اور کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔

اور تو کس کس کی پیاسی رُوح کو اپنی محبّت کے جھرنے سے سیراب کرے گی پگلی!

کیا تو اپنے آپ کو صحت مند سمجھتی ہے؟

کیا تجھے جھولیاں بھر بھر محبت اور شفقت نہیں چاہیئے؟

"منوں! مجھے معاف کردے ——— معاف کردے نا منوں!" حماد لجاجت سے کہہ رہا تھا۔ "میں نے اب تجھے بتا دیا ہے نا! کہ مجھ سے یہ حرکت اکثر سرزد ہوا کرے گی۔ بہتر ہے تو مجھے اس کا موقع ہی نہ دے۔ تجھے معلوم ہے جس سے آدمی بے اندازہ محبت کرے اس سے بہت جلد بدگمان بھی ہوجاتا ہے۔"

آمنہ زور سے ہنس پڑی۔

یہ صاف گوئی کی انتہا ہے۔

بجائے یہ کہنے کے آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے آئندہ بھی ایسی حرکت کی توقع رکھو۔ آمنہ کو ہنستے دیکھ کر حماد نے جانا کہ وہ اس کا مذاق اڑا

رہی ہے۔ یا اس کی بات کو ہنسی میں ٹال رہی ہے۔ بولا ——

اظہارِ محبت پہ ہنسی آتی ہے ہنس لو
تم نے ابھی تاثیرِ محبت نہیں دیکھی

پھر ایک دم سے وہ ننھا سا ضدّی بچّہ بن گیا —— آگے بڑھ کر اس نے اپنا آمنہ کی گود میں رکھ دیا اور اس کی دونوں ٹانگیں اپنے بازوؤں کے حلقہ میں لے لیں

"منوں! میں بہت بھوکا ہوں . . . . بہت بھوکا ہوں . . . ."

آمنہ کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ اس طرح اُس کے سر گود میں رکھ سے پہلے تو وہ سٹپٹا گئی۔ پھر اپنی جگہ پر سُن ہو گئی۔ خود سپردگی کا یہ انداز اگرچہ بڑا پ تھا۔ لیکن باہر سے کوئی اچانک آ جائے تو —— گیٹ بھی تو سامنے ہی نظر آ اتنی بے باکی بھی اچھی نہیں۔ جس سے دوسروں کی عزت پر بن آئے۔

پھر جب اس نے جھک کر ان اُلجھے اُلجھے بالوں کو دیکھا —— جو سر کے سا اس کی گود میں سجدہ ریز تھے۔ تو اسے اس ضدی بچے پر پیار آنے لگا۔ اُس کا د وہ ماں بن کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لے . . . . اس کا دل یہ بھی چاہنے لگا ان اُلجھے بکھرے بکھرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سہلاتے تاکہ اس کا ہوا ذہن اطمینان اور تسکین حاصل کرے۔ مگر وہ ڈر کے مارے ایسا نہ کر سکی۔ انگلیوں کا مس اس پر کیا کیفیت طاری کر دے۔ وہ تو انتہائی بے باک اور نڈر آدمی ہ اس سے بڑھ کر کوئی بڑی حرکت کر دے تو ——

اور بڑی سے بڑی حرکت کر کے وہ معصومیت سے معافی مانگ لے گا۔ اور معاف کرتے ہی بنے گی۔ کیونکہ وہ تو اس کے ساتھ سختی۔ کر ہی نہیں سکتی۔

منوں! تو میری ماں بن جا!
منوں! تو میرا خدا بن جا!
میری ساری خطائیں معاف کر دیا کر۔
میری ہر ضد مان لیا کر —— میں زندگی بھر تیرا غلام بنا رہوں گا۔"

حماد ابھی تک اپنا سر اس کے زانو پہ رگڑ رہا تھا اور ایک دم اس کے وجود کا احساس کر کے آمنہ کے اندر ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے حماد کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور بولی۔

"آپ کو بھوک لگی ہو گی۔ میں کھانا لے آؤں۔"

حماد اس کی طرف دیکھ کر سوگواری سے ہنسا۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سارے چہرے پہ ایک دلنشیں سوز تھا۔ آمنہ کو اس حالت میں وہ اور بھی پیارا لگا۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچا کہ "میں نے اسے کلیجے سے کیوں نہیں لگایا ——" اور پھر کس ہمت سے جدا کر دیا ہے ——"

"کیا تیرا خیال ہے کہ کھانا کھانے سے میری بھوک مٹ جائے گی" حماد نے مغموم آواز میں پوچھا۔

"اور کس طرح مٹے گی جناب ——"

"یہ صرف تم جانتی ہو؟"

آمنہ اپنی چپل ٹھیک کرنے کے لئے نیچے جھکی تو اس نے دیکھا حماد کی کرسی کے پیچھے ایک ٹوکرا پڑا ہوا تھا۔

"وہ کیا ہے" اچانک اس نے پوچھ ڈالا۔

"وہ ٹوکرے میں ——" اور پھر حماد کو خاموش دیکھ کر خود ہی سمجھ گئی۔

"پھر لے آئے نا آپ پھل —— ؟ آخر آپ کا اس سے مقصد کیا ہے" حماد نے یہ عادت ہی بنا لی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن پھل۔ مٹھائی یا تازہ سبزیوں کا ٹوکرا لے آتا تھا۔ بیگم ابراہیم نے دو ایک بار رسماً اسے منع کیا تھا۔ مگر دل سے وہ ان ڈالیوں

کو پسند کرتی تھیں۔ اسی لئے تو انہیں حماد ایک بوجھ نہیں محسوس ہوتا تھا۔ البتہ آمنہ اور ا
اسے کئی بار سنجیدگی سے منع کر چکے تھے۔ چونکہ وہ بیگم ابراہیم کو ہر طرح سے خوش
چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آج آمنہ کو پھر اس کی حرکت پر غصہ آگیا تھا۔

"آخر آپ ہم لوگوں کو اتنا سفلہ کیوں سمجھتے ہیں"؟

"خدانخواستہ ——— میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا"۔

"اسی لئے تو آپ ساتھ ساتھ حساب بھی چکاتے رہتے ہیں"۔

"کونسا حساب بھئی ———" حماد انجان بن گیا۔

"یہی کہ آپ ہمارے گھر میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہم پر بوجھ نہیں بننا چاہ
یہ صرف تمہارے زرخیز ذہن کی اختراع ہے۔ ورنہ میں تو خود کو گھر کا ایک
سمجھ کر ایسا کرتا ہوں۔ خود ہی سوچو اگر میرا کوئی گھر ہوتا۔ تو کیا میں اپنے گھر یہ چیز
لے کر جایا کرتا اور جب میرا کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے، گھر پہ لے آتا ہوں۔ یہاں
مل جل کر کھا لیتے ہیں۔ بازار میں کھڑے ہو کر کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

"ہاں ٹھیک ہی کہا آپ نے ——— آپ کو اس گھر میں اپنی پسند کی کوئی شے
کھانے کو نہیں مل سکتی"۔ آمنہ افسردہ ہو گئی۔

"خدا کے لئے آمنہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لحاظ سے تو میں سب
بے غیرت ہوں۔ دنوں سے یہاں پڑا ہوں"۔

"آپ کون سا کسی پر بوجھ ہیں۔ کھانا آپ یہاں سے برائے نام کھاتے ہیں
جانتی ہوں۔ دوپہر کو آپ جان بوجھ کر کھانا کھانے نہیں آتے۔ رات کو بھی کبھی کب
کھاتے ہیں۔ ہمیشہ کسی دوست کے گھر کا بہانہ کر کے باہر سے کھا آتے ہیں۔ آپ سمجھ
اس گھر میں سبھی بے وقوف ہیں۔ کہ آپ کی اس پالیسی کو نہیں سمجھ پاتے ———

کہ اسمٰعیل بھائی تو بے چارے گھر میں مسافروں کی مانند رہتے ہیں۔ انہیں تو کچھ
بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ کیا میں بھی اندھی ہوں"؟

"آمنہ ———" حماد نے اسے ٹوکا۔

"اور کچھ نہیں تو آپ اتنا ہی سوچ لیں۔ کہ میں بھی اس گھرانے کی ایک کمانے
والی فرد ہوں۔ کم از کم میری تنخواہ آپ کی روٹی کی متحمل تو ہو ہی سکتی ہے"۔

"آمنہ.... آمنہ ———" حماد چلّانے لگا۔

ٹھیک اسی وقت ایک رکشا گیٹ پہ آکر رکا۔ آمنہ دوڑ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی
گئی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس رکشے میں بیگم ابراہیم اور عرفی آئے تھے۔

اگرچہ کسی نے کبھی آمنہ کو حماد کے پاس بیٹھنے سے منع نہیں کیا تھا۔ نہ کسی کو
ان پر کوئی شک ہی گزرا تھا۔ لیکن چونکہ ان کے دل میں چور تھا اس لئے وہ کسی کو بھی
بھانپنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ بلکہ سب کے سامنے دونوں بے نیاز بنے
رہتے۔ بیگم ابراہیم نے حماد کو اندر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ادھر ہی چلی آئیں۔

"السّلام علیکم خالہ جان"۔ حماد کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السّلام ——— کب آئے بیٹا تم ———"

"یہی کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا ہو گا"۔

"اور کھانا یا چائے ——— کچھ لیا"۔

"جی نہیں ———" "ارے آمنہ! کدھر چلی گئی۔ ابھی تک کسی نے کچھ پوچھا ہی نہیں
——— یہ کم بخت نعیمہ اور رابعہ کہاں مر گئیں"؟ انہوں نے اقربا پروری کے تحت
ان دو لڑکیوں کو گھر میں رکھا ہوا تھا۔ انہیں پکارنے لگیں"۔ پھر کوارٹروں میں جا کر
یں کھیل رہی ہوں گی کمبختیں ———"

"ہیلو کاؤ بوائے ———" حماد نے حسب عادت عرفی کو چھیڑا۔

عرفی نے زبان نکال کر اس کو منہ چڑا دیا۔

"بیٹے، یہ کیا بدتمیزی ہے ——"، بیگم ابراہیم نے اسے جھوٹ موٹ ڈانٹا

عرفی کی نظر اچانک پھل والے ٹوکرے پر جا پڑی۔ وہ دوڑ کر اس پر جھپٹا

تین کیلے و مالٹے نوچ کر جلدی جلدی کھانے لگا۔

"ہائے ہائے یہ کیا کرتے ہو بیٹا۔ پہلے بڑے بھائی سے پوچھ تو لو ——

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے خالہ جان۔ بچّوں ہی کے لئے تو میں لایا ہوں"

حماد نے ٹوکرا اٹھا کر بیگم ابراہیم کے آگے کر دیا۔

"دیکھو بیٹا! میں نے تمہیں ہزار بار منع کیا ہے کہ ایسے تکلفات مت برتا کرو

تم اس گھر کو اپنا نہیں سمجھتے —— ؟" بیگم ابراہیم نے ٹوکرا اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اپنا سمجھتا ہوں تو ایسا کرتا ہوں۔ خالہ جان! آپ تو یونہی شرمندہ کرتی ہیں"

"اچھا اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو رکھ لیتی ہوں" وہ ٹوکرا اٹھا کر چلنے لگیں

"ارے ——" چلتے چلتے وہ رک گئیں۔

"عرفی! بھائی کا شکریہ تو ادا کرو۔ کیسے بھوکوں کی طرح کھائے جاتے ہو"

انہوں نے معذرت طلب نظروں سے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

کہنا شروع کیا۔

"بچّوں کا بھی کچھ مت پوچھو —— سکینہ نے سارا دن اسے اتنا کچھ کھلایا

کیا بتاؤں —— اس کے ہاں تو قسم قسم کی مٹھائیاں اور پھل یونہی دیتے رہتے

اگر گھڑی بھر کے لئے چلے جاؤ تو اتنی تواضع کرتی ہے دنیا جہان کی چیزیں آ

ڈھیر کر دیتی ہے کہ کچھ بھی کھانے کی حسرت باقی نہیں رہتی۔

"اسے دیکھو! اتنا کچھ کھا پی کر بھی ایسے ندیدے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے

صبح سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔"

"کب اتنا کچھ کھایا ہے جی!" عرفی کیلا نگلتے ہوئے بولا۔ "اپنے بچّوں کو سکینہ آپا

یادہ دیتی ہے۔ اور مجھے کم۔ اور پھر کھاتے ہیں وکی بھائی گھورتے بھی تو بہت ہیں...

ی بھوکی ہے سکینہ آپا۔ میں جاؤں تو فرج کو تالا لگا دیتی ہے۔

وہ حماد کی گود میں گھس کر بولا

"کم بخت بکواس کرتا ہے" بیگم ابراہیم خفت سے بولیں۔ "اتنا کچھ کھا پی کر اس کو

نام کرتا ہے۔ ان ندیدوں سے فیض کسی کو نہیں۔ اصل میں ان کا خون ہی ایسا

ہے۔ جس تھالی میں کھائیں گے اسی میں چھید کریں گے۔"

"کیوں جی۔ میں کوئی جھوٹ بولتا ہوں —— سچّی بات کہتا ہوں ہاں ——"

رفی اپنے گندے ہاتھ حماد کے کوٹ سے رگڑتے ہوتے بولا

"حماد بھائی تو سکینہ آپا سے کہیں اچھے ہیں۔ ہر روز اتنے مزے مزے کی چیزیں

اکر کھلاتے ہیں ——"

"اچھا تو ناشکرے تو اسی کا شکریہ ادا کر دے۔"

بیگم ابراہیم شرمندہ سی ہو کر باہر کو لپکیں۔

HAMAD BHAİ THE GREAT BORN IN A PLATE

IN FRONT OF MY GATE

ہاہا.... ہوہو....

عرفی چلاّ چلاّ کر ناچنے لگا۔

آمنہ کے ذہن و دل پر آج پھر گھٹائیں اُمنڈ گھمنڈ کر آئی تھیں اور وہ برس پڑ
کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

ہوا یوں کہ آج صبح دس بجے کے قریب، حسب معمول ایک پھیری والے
دروازے پر آواز لگائی اور بیگم ابراہیم اسے روک کر مول تول کرنے لگیں۔ جب ا
نے رابعہ کو حکم دیا کہ وہ گھر کی چارپائیوں کے نیچے اور الماریوں کے پیچھے گھس ک
پرانے جوتے ڈھونڈ کر لے آئے۔ تو آمنہ کا ماتھا ٹھنکا۔ دوڑی دوڑی باہر گئی ت
کہ بیگم ابراہیم ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی تھیں۔ ریڑھی پر دیسی چینی او
کے چھوٹے بڑے برتن سجے تھے اور وہ چینی کے کچھ برتن اٹھا اٹھا کر الگ رکھ
تھیں۔ جبکہ پھیری والا زمین پر بیٹھا کچھ مردانے جوتے ٹھوک بجا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ
کہ اور کوئی شغل نہ پا کر آج اس کی ماں، گھر کے پرانے جوتوں کے عوض چینی کے
خریدنا چاہتی ہے۔

"امی! اگر آپ کو سودا کرنا ہے تو اسے پچھلے دروازے کی طرف بُلا لیجیے۔" آ
نے اپنی برہم سانس روکتے ہوئے کہا۔ "یہ تو آنے جانے کا راستہ ہے اگر کوئی آ

اسے تو آجکل بس حماد سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گو انہوں نے حماد سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ حماد کو اس قسم کے گھٹیا لین دین کا علم ہو۔ سفید پوشی کوئی عیب نہیں۔ مگر زندگی کا ایک معیار تو ہر ایک کے ذہن میں ہوتا ہی ہے نا؟۔

یوں بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ حماد اس کی ماں کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کرے۔ سارا دن تو بیگم ابراہیم اپنی خوش حالی کے گن اُس کے آگے گاتی رہتی تھیں اور اب پرانے جوتے دے کر برتن خرید رہی تھیں۔ اگرچہ ایسا لین دین اس محلے کی عورتوں کا معمول تھا۔ چھان بُورا۔ ٹین کنستر، ردّی اور پرانا گوٹا کناری لینے والوں کی آوازیں ہر روز تھوڑے وقفے کے بعد سننے میں آتی رہتیں اور تقریباً ہر گھر سے ہی ان کو آواز پڑتی تھی۔ کبھی کبھار بیگم ابراہیم بھی اپنے گھر کا کاٹھ کباڑ نکال کر مول تول کرنے بیٹھ جایا کرتیں۔ آمنہ کو اُن کا یہ فعل، جو پہلے کبھی برا نہیں لگا تھا، آج بہت بُرا لگا۔ بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے کہ آئے گئے کا لحاظ نہ کیا جاتے۔ مگر وہ اپنی ماں کی ہٹ دھرمی سے بھی واقف تھی۔ لہٰذا وہ اس نیت سے اِدھر آئی تھی کہ اپنی ماں کو یہاں سے اٹھا کر پیچھے گلی والے دروازے کی طرف بھیج دے گی۔ کیونکہ وہاں سے کسی کے آنے جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ مگر بیگم ابراہیم اس کی بات سن کر بے نیازی سے بولیں۔

"اب میں نے اس کو اندر بلا لیا ہے۔ بچارا ریڑھی لیکر کیسے اس تنگ گلی سے آئے گا۔ بس میرا سودا تو دو منٹوں میں ہو جائے گا۔"

"امی! اگر اچانک کوئی آپ کی ملنے والی آگئی تو کیا کہے گی؟"

آمنہ کے پاس یہی آخری ہتھیار تھا۔ حالانکہ وہ ان کی ملنے والیوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی تھی۔

"مجھے پتہ ہے۔ میری ملنے والیوں میں سے اس وقت کوئی نہیں آسکتی۔"

وہ پھر برتن چننے میں مشغول ہوگئیں۔

"امی! آنے والوں کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے آپ اس دروازہ سے ہٹ جائیے۔" آمنہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"چل چل تو اندر جاکر بیٹھ۔ جیسے مجھے کچھ خیال ہی نہیں مجھے نصیحتیں کرنے چلی ہے کون سا وقت ہے کسی کے آنے کا —— بس میں ایک منٹ میں اس کو فارغ کئے دیتی ہوں۔"

اتنے میں رابعہ باقی ماندہ تمام پرانے جوتے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر لے آئی اور ریڑھی والے کے آگے ڈھیر کر دیئے۔

آمنہ کا خون کھولنے لگا۔ گھر میں مزید برتنوں کی بالکل ضرورت نہ تھی اور پھر سالہا جوتے اتنے بیکار بھی نہ تھے کہ ان کو ردی سمجھ کر بیچ دیا جاتا۔ اپنی ماں کی مصلحتیں اور روائتیں وہ آج تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ بے دلی سے سامنے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ ایک منٹ کی بات نہیں ہے۔

وہی ہوا۔ بیگم ابراہیم نے ڈھیروں برتن ان جوتوں کے عوض ایک طرف لگا دیئے برتنوں والا جھگڑنے لگا۔ وہ کچھ برتن نکال لیتا۔ بیگم ابراہیم لپک کر پھر اٹھا لیتیں۔ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ گویا لاکھوں کا سودا ہو ——

"چلیں جانے دیں۔ غریب کچھ زیادہ لے جائے گا تو کیا نقصان ہو جائے گا۔" آمنہ جو اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اتنا کہہ کر پھر کتاب کے ورق الٹنے میں مشغول ہوگئی۔

بیگم ابراہیم نے سودا کرنے میں پلاشبہ ایک گھنٹہ لگا دیا۔ خدا خدا کر کے انہوں نے اپنی منشاء کے مطابق چیزیں الگ رکھوالیں۔ پھر رابعہ کو آواز دی کہ برتن اُٹھا لے جائے

ابھی انہوں نے اندر جانے کو پیٹھ موڑی ہی تھی کہ کوئی ان کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ مڑکر دیکھا تو حماد تھا۔ بیگم ابراہیم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔

آمنہ نے اسے دیکھا تو پیچ و تاب کھاتی ہوئی سیدھی اپنی کوٹھڑی میں دوڑ گئی۔ آنے والوں کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ آخر جس بات کا ڈر تھا وہ ہوگئی نا —— ؟

بیگم ابراہیم بھی اسے دیکھ کر اندر ہی اندر تو سٹپٹا گئی تھیں۔ مگر چونکہ بات بنانے میں ہوشیار تھیں۔ اس لئے خندہ پیشانی سے بولیں: "اتنی جلدی کیسے آگئے بیٹا ؟"

"خالہ جان! ابھی اسٹیشن سے اسمٰعیل نے میرے دفتر فون کیا تھا . . ." پھر وہ چلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھ آیا اور یوں ظاہر کرنے لگا۔ جیسے اس نے پرانے جوتوں کو بالکل نہیں دیکھا۔ جنہیں ایک دھجی میں باندھ کر ریڑھی والا تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ حقیقت میں تو اس کی ذہین نظروں نے اندر قدم رکھتے ہی سارا معاملہ بھانپ لیا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ بھانڈہ پھوٹنے پر بیچاری بیگم ابراہیم کی حالت قابل رحم ہوگئی ہے۔

"کیا آج اسمٰعیل آرہا ہے ——" انہوں نے ملائمت سے پوچھا۔

"جی۔ وہ آج دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔ اُس نے فون پر مجھے تاکید کی تھی کہ میں ابھی گھر چلا جاؤں۔ اور کھانے پر سب کے ساتھ اس کا انتظار کروں۔ کیونکہ وہ کافی دنوں بعد گھر آرہا ہے۔ اس لئے بڑا اُداس ہے۔"

"اچھا کیا بیٹا۔ تم نے آکر اطلاع دے دی۔ میں ابھی جاکر اس کی پسندیدہ کوئی ڈش بنا دیتی ہوں۔ ویسے باقی کھانا تو تقریباً تیار ہی ہے ——"

"چلو . . چلو۔ نکالو ریڑھی باہر" . . . جاتے جاتے انہوں نے زوردار آواز میں (تاکہ حماد سُن سکے) ریڑھی والے کو ڈانٹا۔ "تم بڑے بے ایمان آدمی ہو۔ ہمیں نہیں ضرورت اِن چیزوں کی۔"

"واہ جی واہ —— ایک تو مجھے لوٹ لیا۔ اوپر سے ڈانٹ بھی پلا رہی ہیں۔ خدا

کی قسم ساری جوتیاں ناقص ہیں اور اتنے جوتوں کے بدلے میں میں نے اتنے ڈھیر!
برتن آج تک کسی کو نہیں دیئے۔۔۔ خدا کی قسم آج یونہی ہی گھاٹے پر کی ہے!
برتنوں والا بڑبڑاتا ہوا، اپنی ریڑھی باہر نکالنے لگا۔ بیگم ابراہیم اور بھی جھنجھ
کہ اس ذلیل کو منہ ہی کیوں لگایا۔

اندر جاتے جاتے حماد نے برتنوں والے کے ریمارکس سن لئے تھے۔ مگ
نے یوں ظاہر کیا تھا۔ جیسے نہ کچھ سنا ہے اور نہ کچھ دیکھا ہے۔

اور اب گھر کے سارے افراد ڈرائنگ روم میں بیٹھے اسمٰعیل کا انتظار کر رہے تھے
ب بج چکا تھا۔ اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور آمنہ لدے پھندے بادلوں کی طرح برسنے
نی بیٹھی تھی۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہی کمرہ جو پہلے عرفِ عام میں ڈرائنگ روم
رڈائننگ روم ہوا کرتا تھا اب اسمٰعیل اور حماد کا کمرہ بن چکا تھا۔ کھانے کی میز ادھر
ے نکال کر گھر کے اندرونی برآمدے میں رکھ دی گئی تھی۔ جس کے آگے لکڑی کی جالی
، ہوئی تھی۔ صوفے اور کرسیاں دیوار کے ساتھ لگا کر وہاں ایک پلنگ کی جگہ نکالی
، تھی اور اس پر حماد کے لئے بستر لگا دیا گیا تھا۔ اسمٰعیل اکثر رات کو دوروں پہ ہوتا۔
جن دنوں گھر لوٹ آتا تو اسی پرانے دیوان پر ہی سوتا تھا۔ وہیں آتش دان میں رات
ک جلا لی جاتی۔ اور اس بوسیدہ قالین پر بیٹھ کر گپ بازی کی جاتی۔ چائے کے
چلتے۔ کبھی کبھی تاش کی بازی بھی لگ جاتی۔

گھر کے وسط میں ایک بڑا ہال تھا۔ جو عام طور پر ریلوے کی کوٹھیوں میں ہوتا ہے
، میں بے شمار پلنگ اور چار الماریاں کپڑوں کی رکھی ہوئی تھیں۔ بچے اور عام قسم
لے مہمان یہیں پر سوتے تھے۔ یہیں ہال کے ایک کونے میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آمنہ کی کھاٹ بھی لگی تھی۔

حماد اور اسمٰعیل والے کمرے کا ایک دروازہ اس ہال میں کھلتا تھا اس
کی بغل میں ایک چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس کی نالی کا دہانا اتنا چھوٹا اور فرش
اونچا تھا کہ پانی ہمہ وقت غسل خانے میں کھڑا رہتا تھا یہ غسل خانہ عام طور پر م
اور مہمانوں کے استعمال کے لئے تھا۔ اس غسل خانے سے ملحقہ وہ کوٹھڑی
کو آمنہ نے گوشۂ عافیت بنا رکھا تھا اور اس ہال کے دوسرے کونے میں ایک
ڈرائنگ روم جتنا بڑا کمرہ تھا جو ابراہیم مرحوم کا کمرہ کہلاتا تھا۔ مگر آجکل بیگم ابراہیم
تصرف میں تھا اس میں ابھی تک دو مسہریاں بچھی تھیں جن پر سفید چادریں پڑی
کھانے پینے کا خشک سامان اور گھی شکر وغیرہ اکثر ان پلنگوں کے نیچے چھپا د
اس کمرے کے ساتھ بھی ایک غسل خانہ تھا جس کا نل سارا دن چلتا رہتا تھا ج
تو دھواں دھار نل بہتا رہتا اور جب پانی چلا جاتا تو کسی ضعیف العمر شخص کی مانند نلکے
نرخرے سے عجیب و غریب آوازیں نکلتی رہتیں۔ یہ غسل خانہ عام استعمال کے لئے
اس کے آگے ساتھ ہی ٹین کی چھت کا چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے
چھوٹا پکا صحن تھا اور باقی کچھ زمین پر برائے نام سی سبزیاں اگائی گئی تھیں۔

گھر میں جو کچھ بھی نکھار تھا وہ آمنہ کی وجہ سے تھا ایک تو وہ سارے گھر کی
دیوانوں کی طرح کرتی رہتی تھی۔ دوسرے ادھر ادھر سے پودے اور پھول لاکر
سنوارتی رہتی تھی۔

اس وقت ڈرائنگ روم میں آمنہ۔ بیگم ابراہیم اور حماد بیٹھے ہوئے۔
چھوٹی تپائی پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اس پر کھانے کی سادہ اور سستی پلیٹیں
ہوئی تھیں آمنہ ایک کتاب پر جھکی، محویت سے پڑھ رہی تھی اور حماد آمنہ کا چہ
کی کوشش کر رہا تھا جو دلی تکلیف کا اشتہار بنا ہوا تھا۔

بیگم ابراہیم جب کمرے میں آکر بیٹھیں تو صبح والی خفت مٹانے کے لئے کچھ یوں
گفتگو کا آغاز کیا۔

"ابھی تک اسمٰعیل نہیں آیا، حماد بیٹا۔ تم نے اس کا فون تو ٹھیک طرح سے سنا تھا۔"

"جی خالہ جان! میرا خیال ہے بس آتا ہی ہو گا۔" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی کو
دیکھ کر کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی کام پڑ گیا ہو۔"

"تم لوگ کھانا کھاؤ گے یا اس کا انتظار کرو گے۔ دیر تو کافی ہو چکی ہے۔"

"میں تو یقیناً اس کا انتظار کروں گا۔" حماد نے عاجزی سے کہا۔ "پورے ایک ہفتے
کے بعد وہ گھر آرہا ہے۔ خواہ وہ چار بجے آئے۔ میں کھانا اس کے ساتھ ہی کھاؤں
گا۔ آپ کو بھوک محسوس ہو رہی ہو تو آپ اور منوں کھا سکتے ہیں۔" اس نے آمنہ کی طرف
پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔" آمنہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

"آج اس شعلے کو کس بات نے ہوا دی ہے... چنگاری پھر کیوں دمک رہی ہے"
... حماد سوچنے لگا۔

بیگم ابراہیم اطمینان بھری لمبی سانس چھوڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور دونوں
ہاتھوں سے اپنے گھٹنے دباتے ہوئے بولیں۔

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے.... گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کسی شے
کی کمی نہیں ہے۔ اس کا فضل ہے..." وہ حماد کی طرف دیکھے بغیر رک رک
کے کہے گئیں۔

حماد خاموش بیٹھا رہا۔

"اگر زمینوں کی تھوڑی بہت آمدنی نہ ہو جاتی تو شہر کے اخراجات برداشت
کرنا مشکل ہو جاتے۔"

"جی ہاں! زمینوں کی آمدنی میں تو بڑی برکت ہوتی ہے اور فی زمانہ زمینیں بہت
بڑی نعمت ہیں۔" حماد نے بڑی تابعداری سے کہا اور پھر سوچنے لگا کہ اسمٰعیل نے آج تک
زمینوں کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

"گندم تو سال بھر کی وہیں سے آجاتی ہے اور تھوڑے بہت دوسرے اجناس
بھی ....." آمنہ چونک پڑی۔

ان کے ایک دور کے رشتہ دار کی چونکہ بچیاں یہاں رہتی تھیں اس لئے وہ سال
بھر میں دو تین بوریاں گندم بھجوا دیا کرتا تھا اور ان بوریوں کے منگوانے پر ہی ان کی آدھی
جتنا خرچ اٹھ جایا کرتا تھا۔ سال بھر کی گندم کیا معنی۔؟

"اور خانیوال میں ہمارا بہت بڑا مکان ہے۔ کرایہ کافی آجاتا ہے اس کا —
صرف پچاس روپے مہینہ پر چڑھ سکا ہے۔ وہ چھوٹا سا مکان اور سال بھر
چھ سو روپے بنے۔"

دکھ سے آمنہ کا چہرہ لال ہوگیا۔ اسے اپنی روح گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میں تو ہر چیز شہر سے ہی خرید کر لاتی ہوں۔ سکینہ مجھے اپنی موٹر میں لے جاتی ہے
... یہاں تو یونہی .... کبھی کبھی بوریت کو دور کرنے کی خاطر کسی پھیری والے کو بلا
لیتی ہوں۔ پھر یہ کمبخت جان ہی نہیں چھوڑتے۔ کچھ نہ کچھ خریدنا ہی پڑتا ہے ...."

ایک بے اختیار سا آنسو آمنہ کے رخسار پر ڈھلک آیا جسے اس نے کمال چالاکی
سے چھنگلی کی مدد سے اڑا دیا۔

وہی پیوند پہ پیوند لگانا —— ..

اب صبح والی بات پر پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ عیب کو چھپانا اسے اور نمایاں
بنا دیتا ہے۔ ....

حماد نے آمنہ کے رخسار سے اڑتا ہوا وہ ننھا سا بادل دیکھ لیا۔ گو وہ چہرہ جھکائے

ہوئی تھی اور اپنے منہ پر اس طرح ہاتھ کا زاویہ بنا رکھا تھا کہ کسی کو پورا چہرہ نظر نہ آسکے۔
مگر آمنہ کے چہرے کو تو حماد سات پردوں میں بھی پڑھ سکتا تھا۔ اور اس کے دل کی کیفیت
اس کے چہرے کے ایک ہی رنگ سے بھانپ لیتا تھا۔

اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ بیگم ابراہیم کو اس قسم کی گفتگو کرنے سے منع کر دیتا۔
اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ آمنہ کی آنکھوں سے رستا ہوا خون دیکھ سکتا۔
بھلا اس تصنع کی کیا ضرورت تھی جو صبح ہوگیا سو ہوگیا۔ تاہم اس نے محسوس
کیا کہ اگر بات کا رخ نہ پلٹا گیا تو آمنہ یہاں سے اٹھ کر چلی جائے گی۔ لیکن بھلا ہو عرفی
اور چھچی کا۔

دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ چھچی دوڑ کر
ماں کی گود میں گھس گیا۔ اور بولا ——

"امی! مجھے عرفی لوہے کی سلاخ مارتا ہے۔"

عرفی نے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ پکڑی ہوئی تھی اور ابھی تک اس کے مارنے
کے درپے تھا۔

"نہیں بیٹے چھوٹے بھائی کو مت مارو۔" بیگم ابراہیم نے نرمی سے عرفی کو کہا۔

"پہلے اسے اپنی گود سے نکالیں۔ میں بڑا ہوں تو اس نے مجھے منع کیوں کیا ہے۔ یہ
مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں اس کا مار مار کے بھرکس نکال دوں گا۔" عرفی غرّانے لگا۔

"کس بات سے منع کیا ہے؟" بیگم ابراہیم بولیں۔

"امی! یہ رابعہ اور نعیمہ کو مار رہا تھا۔ وہ بیچاریاں اس قدر رو رہی تھیں۔ میں نے اسے
مارنے سے منع کیا ہے۔" چھچی نے ماں کی گود سے منہ باہر نکال کر کہا۔

"امی! وہ دونوں بہت ذلیل ہیں۔ پتہ ہے کیا کر رہی تھیں۔" عرفی آنکھیں نکال
کر بولا۔

"رابعہ کوارٹروں کی لڑکیوں سے کہہ رہی تھی۔ مجھے مس رُوبی کہا کرو۔ اور نعیمہ کہہ رہ
مجھے ممی کہا کرو۔ اور یہ محلے کی لڑکیوں کو جمع کر کے ڈانس کر رہی تھیں۔ میں نے بھی سلا
کے وہ مارا ہے کہ اب روتی ہی رہیں گی۔"

بجائے اسے ڈانٹنے کے بیگم ابراہیم ہنسنے لگیں۔ "واقعی لاہور آ گئے ان چیونٹیو
بھی پر نکل آتے ہیں۔"

"اب میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔ یہ بھی انہی کی طرح کمینہ ہے اور ان کا سا
دیتا ہے۔" وہ دُبکے ہوئے چھمی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔

"عرفی ——— !" چپ چاپ بیٹھی ہوئی آمنہ پر ایک دم غیض و غضب طاری
"انسان بنتے ہو یا نہیں۔ اپنی بیہودہ حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ اتنے جوتے لگ
گی کہ دماغ درست ہو جائے گا۔"

وہ غصے میں کھڑی ہو گئی۔ عرفی بالکل نہیں ڈرا۔ بلکہ ذرا پرے ہٹ کر زبان نکا
اس کا منہ چڑا دیا۔

"بدتہذیب، جنگلی۔ بہت سر چڑھ گیا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ سے سلاخ چھیننے
آگے بڑھی۔

"اونہہ ——— حماد بھائی کے سامنے اترا رہی ہے۔ بڑی آئی رعب ڈالنے
ہے تو دو پیسے کی اُستانی نا؟" ———

یہ یقیناً سکینہ آپا کے الفاظ تھے۔ جو وہ وقتاً فوقتاً آمنہ کے لئے استعمال کرتی
آمنہ کے ذہن میں زلزلہ آ گیا۔

اس نے لپک کر عرفی کو پکڑا۔ اور پھر پوری طاقت سے دو طمانچے اس کے د
رخساروں پر جڑ دیئے۔ عرفی نے منہ پھاڑا اور چیخ و پکار سے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا
ابراہیم چھمی کو پرے ہٹا کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور چلاتے ہوئے عرفی کو اپنے

سے لگا لیا۔
"چند دن کے لئے گھر آتا ہے میرا بچہ ——— تو مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیتے
ں۔ خبر نہیں سارے گھر والے کیوں اس سے جلتے ہیں ... کچھ دنوں میں چلا جائیگا
——— دو چار ہی تو چھٹیاں رہ گئی ہیں .... خوش ہو جانا کم بختو! گھر میں شادیانے
بجانا ———" وہ اسے چمکارنے لگیں۔

"توبہ ہے آجکل بہن بھائیوں میں محبت تو بالکل رہی نہیں۔ غیروں کے صدقے واری
دتے ہیں۔ اپنوں سے بیر.... توبہ توبہ....." جانے وہ یہ باتیں۔ کسے سُنا رہی
یں۔ اور ان کا روئے سُخن کس کی طرف تھا۔ آمنہ اپنی جگہ پر بیٹھی پُھنک رہی تھی اور
ھمی سہم کر کرسی کے نیچے گھس گیا تھا۔

"کم بخت چوہے ہے تو اس کی جان کا دشمن ہے۔ چلا جائے گا نا؟ تو جی بھر کے ناچ
بنا ——— اس کے جانے کے بعد بھی تیرے چہرے کی نحوست تو نہیں مٹے گی۔"

بیگم ابراہیم نے آخری وار چھمی پر کیا۔ اور عرفی کو چمکارتے ہوتے باہر لے گئیں۔
چھمی نے بے بسی سے آمنہ اور حماد کی جانب دیکھا۔ اور پھر بھُس بھُس کر کے
رنے لگا۔

"ارے" ——— حماد نے لپک کر اسے کرسی کے نیچے سے نکالا اور پھر گود
بٹھا کر پیار کرنے لگا۔ "تم تو بڑے اچھے ہو چھمی۔ تم کیوں رو رہے ہو بھائی؟"
"حماد بھائی میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔"
"نہیں بیٹے!" حماد نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
"اور منی آپا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔"
"ہاں۔ منی آپا بھی بے قصور ہیں"۔ حماد نے آمنہ کی طرف دیکھا۔
"پھر ہمیں کو ڈانٹ کیوں پڑی ہے۔"

حماد ہنس دیا اور آمنہ رو دی۔ موٹے موٹے آنسوؤں نے جیسے راہ دیکھ

"تمہارا اور منوں کا قصور یہی یہ ہے کہ تم دونوں بہت اچھے ہو۔" حماد نے
بھرے لہجے میں کہا۔

آمنہ کے آنسوؤں کے سامنے ٹھہرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ا
نے چھمی سے کہا۔

"ایک کام کرو گے بھیا؟"

"ہاں جی!" چھمی اچک کر کھڑا ہو گیا۔ حماد نے جیب سے ایک روپیہ نکالا
باہر والے کھوکھے سے ایک سگریٹ کی ڈبیا لا دو۔"

"بس ـــــ؟"

"اور ایک ماچس بھی ـــــ!"

"بس ـــــ؟" جاتے ہوتے چھمی رک گیا۔

"اور باقی جو پیسے بچیں اُن کی تم ٹافیاں لے لینا۔"

"اچھا جی" ـــــ کہتے ہوتے چھمی سرپٹ دوڑا۔

"منوں!" حماد اٹھ کر آمنہ کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔

"خدا کے لئے اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے کیوں میری شامت لاتے ہیں۔"

"پہلے تم رونا بند کرو۔ تم جانتی ہو میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا"

"اس وقت مجھے کچھ نہ کہیئے۔ جن باتوں کو آپ سمجھتے نہیں اُن کے متعلق"

"میں سب سمجھتا ہوں اور سب جانتا ہوں۔"

حماد نے آمنہ کے دوپٹے کا پلو پکڑا اور اس کی آنکھوں کی طرف بڑھایا۔

"حماد! خدا کے لئے میرے حال پر رحم کیجئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے امّا
ادھر آتی ہوں گی۔"

"پہلے تم اپنی آنکھیں صاف کرو۔ چہرہ ٹھیک کرو ورنہ میں ایسی حرکت کرونگا کہ ــ"

آمنہ نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کر لیا اور
منت بھرے لہجہ میں بولی۔"اب تو اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے جا کر ـــــ"

"اگر تم وعدہ کرو کہ تم روؤ گی نہیں۔ تو میں چلا جاتا ہوں۔"

آمنہ نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔ حماد واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

"میری موجودگی میں تو روتے۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا ـــــ بہت رو چکی ہو۔
اب نہیں رونے دوں گا۔ آئندہ اگر تو نے ایسا کیا تو پھر..... سب کے سامنے مجھ
سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو گئی تو مجھے دوش مت دینا۔"

"آپ کو تو بس ایسی ویسی حرکت کے لئے بہانہ چاہیئے۔ کسی کے دل پر کچھ گذر
جاتے....؟" آمنہ کی آواز پھر بھرا گئی۔

"آمنہ یہ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ تیرے دل پر جو گذرتی ہے وہ میرے دل
پر کس قدر قیامت ڈھاتی ہے۔ کیونکہ میری حالت تجھ سے بھی بدتر ہے۔ چاہتے ہوئے
بھی فی الحال کچھ نہیں کر سکتا ـــــ"

ابھی اس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ چھمی اسمٰعیل کا بازو پکڑے ہوتے شور مچاتا اندر آگیا

"بھائی جان آگئے ـــــ بھائی جان آگئے۔"

حماد اٹھ کر اسمٰعیل سے بغل گیر ہو گیا۔ آمنہ نے مسکرا کر سلام کیا۔

اسمٰعیل نے جھک کر بطورِ خاص آمنہ کا سرخ اور پھولا ہوا چہرہ دیکھا۔ اور پھر
خوش دلی سے بولا۔

"میدانِ کارزار گرم ہوا ہے نا؟ ـــــ چہرہ ہی کہہ رہا ہے۔"

"آمنہ ہنس پڑی ـــــ "گرم پانی کب سے رکھا ہے۔ آپ پہلے غسل کر لیں۔
بوا کو کھانے کا کہتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اسمٰعیل واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کی وردی گرد آلود ہو رہی تھی اور لمبے سفر کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد اسمٰعیل غسلخانے میں چلا گیا۔

چھمی حماد کے پاس بیٹھ کر مزے سے ٹافیاں کھانے لگا۔

آمنہ نے میز پر برتن لگا دیئے اور کھانا بھی لا کر میز پر چن دیا۔ آمنہ نے جلدی جلدی اپنا موڈ بھی ٹھیک کر لیا اور ذرا پرے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرسی پر چھمی کی پڑی تھی۔ پنسل اٹھا کر وہ حسب عادت اپنی ہتھیلی کی لکیروں میں اور گہری کرنے لگی غسلخانے سے اسمٰعیل کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

"تمہاری قسمت بہت اچھی ہے" حماد نے شوخی سے کہا۔ کیوں لکیریں گہری کر رہی ہو"

"اس لئے کہ وہ آپ سے وابستہ ہو گئی ہے" آمنہ نے بغیر نظر اٹھائے کہا۔

"اور ہم ایسے ہی تو نہیں وابستہ کر لیتے کسی کو اپنے سے ——— دیکھا۔ قسمت والی ہو ——— بہکا لیا ———"

آمنہ ہنسنے لگی۔ اسی وقت بیگم ابراہیم شامی کباب اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ آمنہ کو اتنے خوبصورت انداز میں ہنستے دیکھ کر انہوں نے حماد کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں والہانہ پن کی چمک تھی اور وہ دیوانوں کی مانند آمنہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

"ہوں ———؟" بیگم ابراہیم کا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے میں اسمٰعیل باہر آ گیا۔ اور سب کھانے پر بیٹھ گئے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ سب خاموشی سے کھانے میں مگن ہو گئے۔ جب تقریباً کھانا کھایا جا چکا تو بیگم ابراہیم نے اسمٰعیل کو مخاطب کر کے کہا۔

"سکینہ کی طرف سے تو بہت تقاضا ہو رہا ہے"

"کس بات کا ———؟" اسمٰعیل تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

"ارے وہی آمنہ کے لئے ——— میں نے تمہیں بتایا تو تھا ———" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اسمٰعیل نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ اور اس کی روتی روتی آنکھوں کی طرف بھی اور پھر خاموش ہو گیا۔

"آپ آمنہ سے پوچھ لیں" اسمٰعیل نے تھوڑی دیر بعد آہستہ سے کہا۔ یہ لمحے آمنہ اور حماد کے لئے انتہائی کٹھن ہو گئے۔ دونوں کو یہ موضوع اس وقت بہت ناگوار گزرا۔ آمنہ نے پانی سے گلاس بھرا اور منہ سے لگا لیا۔ بھلا یہ اس بات کا کون سا وقت تھا ———؟

"آمنہ کو کیا پتہ ———؟" انہوں نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے تو صرف رونا آتا ہے۔ بات کرو تو جھل جھل نیر برسائے گی۔ اتنا بڑا خاندان ہے۔ سمن آباد میں ان کی دو کوٹھیاں ہیں۔ لڑکا اچھی پوسٹ پر ہے اور ان کا گھرانہ سکینہ کو بہت پسند آیا ہے"

"سکینہ کی پسند سے کیا ہوتا ہے امی۔ لڑکا منوں کو دکھا دیں۔ بہرحال دونوں بہنوں کی پسند میں بڑا فرق ہے"

آمنہ نے اتنا ہی سنا اور کچھ برتن ہاتھ میں اٹھا کر باہر کو چل دی۔

اسمٰعیل کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ وہ بولا۔ امی ابھی اسے سوچنے کا موقع دیں۔ وہ کوئی بچی نہیں ہے"

"بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جلدی ہی اس کو بھی ٹھکانے لگاؤں گی ....."

جانے وہ ابھی اور کیا کہتیں کہ اسمٰعیل بول اٹھا۔

"جلدی کے کام اچھے نہیں ہوتے۔ ذرا حوصلے سے سب کچھ کریں۔"
جانے یہ سب حماد کو سنانا مقصود تھا۔ یا بیگم ابراہیم نے ہمیشہ کے لاابالی پن
دیا تھا۔

کھانا ختم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک وزنی سل حماد کے سینے پر آپڑی۔ بیگم بچوں کو لے کر باہر چلی گئیں اور جاتے جاتے کہہ گئیں۔ "کل رمضان کا چاند نظر آجائے گا تو وہ لوگ عید کے بعد آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

آمنہ نے باری باری برتن اٹھانے شروع کر دیئے۔

"آمنہ سمجھدار لڑکی ہے۔ میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کروں گا۔" اسمٰعیل نے حماد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ اپنے بارے میں بہتر سوچ سکتی ہے۔ اور ہمیں اسے سوچنے کا موقع دینا"
اتنے میں آمنہ ٹرے ہاتھ میں پکڑے باقی ماندہ برتن اٹھانے کو اندر آئی تو حماد نے
انداز میں کہا۔

"آمنہ اپنی سوچوں میں مجھے بھی یاد رکھنا۔"

"جی۔" آمنہ چونک اٹھی۔ اور آنکھیں پھاڑے حماد کی طرف دیکھنے لگی۔

"جب مستقبل کا فیصلہ کرنے لگو۔ تو مجھ پر بھی نظر ثانی کرنا۔ میں نے یہ کہا ہے۔"

آمنہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آج غالباً حماد کا دماغ چل گیا ہے۔

اسمٰعیل اپنی جگہ حیرت زدہ تھا۔ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کون کہہ سکتا ہے اور پھر میرے سامنے۔ یقیناً حماد مذاق کر رہا ہے۔ اسمٰعیل نے دل میں سوچا۔ اور مرے ہوتے لہجہ میں بولا۔

"تنگ نہ کرو بیچاری کو ــــ ورنہ پھر رو پڑے گی ــــ"

آمنہ برتن لے کر باہر نکل گئی۔

"اسمٰعیل۔" حماد نے سگریٹ سلگا لیا اور بڑے اعتماد سے کہنا شروع کیا۔ "تمہارا خیال ہے میں مذاق کر رہا ہوں۔"

"ہاں ... ہاں"!

"نہیں دوست!" حماد نے پہلو بدلا۔ "میری صاف گوئی کا بُرا نہ ماننا۔ میرا انداز مزاحیہ ہوگا مگر میں نے یہ سب بڑی سنجیدگی سے کہا ہے۔" اسمٰعیل حیرت سے منہ پھاڑے حماد کو تکنے لگا۔

"مجھے یہ سب کچھ اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا اور پھر اس گھر میں رہ کر مجھ پر کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ میں تمہارا دوست بن کر اس گھر میں داخل ہوا ہوں۔ تمہیں دھوکہ دینے کی کبھی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے سوچا تھا عنقریب یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور پھر سلیقے سے پیغام بھجواؤں گا۔ مگر آج خالہ جان کی باتوں نے یک بیک اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"اسمٰعیل .... تمہاری بہن آمنہ کچھ اور طرح کی ہے۔ اس کی زندگی برباد نہ کرنا۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ چاہو تو ٹھکرا سکتے ہو۔ مگر ٹھکرانے سے پہلے ایک ہی طرف مت دیکھنا ...."

اسمٰعیل معصوم سی شکل بناتے حماد کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی اتنی باتیں سن کر اس نے جلدی جلدی صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کے درمیان میں یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے آمنہ حماد کو پسند کرنے لگی ہو۔

اگرچہ حماد کی ان باتوں سے اسمٰعیل کو دھچکا ضرور لگا۔ مگر اسے یہ باتیں بُری نہیں لگیں۔ اس نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا اور اگر آمنہ کو منظور ہو تو کیا بُرا ہے ....

وہ گم صُم سا بیٹھا ــ سگریٹ پینے لگا۔

اب کے آمنہ باقی ماندہ برتن اٹھانے اندر آئی تو اسمٰعیل نے کہا۔

"مموں۔ حماد مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اس کی بات پر سنجیدگی سے غور کرنا!"
اور آمنہ بے ہوش ہوتے ہوتے باہر نکل گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آج عیدالفطر تھی۔

سارا گھرانا چار بجے ہی بیدار ہو گیا تھا اور چھوٹے بچوں نے اٹھتے ہی اودھم مچانا شروع کر دیا تھا۔

اس عید پر تو بیگم ابراہیم نے اپنے سب بچوں کے ساتھ نعیمہ اور رابعہ کو بھی نئے پڑے بنوا کر دیئے تھے۔ عرفی بھی عید کی تین چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا اور رات کو سونے سے پہلے نعیمہ، رابعہ اور چھپی کو دھمکا رہا تھا کہ ان کے سوتے ہی وہ اُن کے کپڑوں میں ں لگادے گا۔ تبھی تو وہ تینوں اپنے کپڑے اپنے تکیے تلے رکھ کر سوتے تھے۔ اس ت بھی رات کی باتیں بھول چکے تھے۔

بیگم ابراہیم تو باورچی خانے میں جا گھسی تھیں اور سویاں ابالنے کے لئے ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر رکھ چھوڑا تھا۔

کوئی پوچھے کہ کیوں ——؟

آج تو باقاعدہ ان کے ہاں لنگر چلنا تھا۔

صبح ہی صبح وہ کئی قسم کی سویاں پکا کر اپنی امیر سہیلیوں اور محلے والیوں کے گھر بھجوانا

شروع کر دیتی تھیں۔ سویوں کا زردہ، شیر قورمہ، سویوں کی کھیر، سادی سویاں، نمکین دم پخت سویاں۔ غرض وہ کئی قسم کی سویاں پکانا جانتی تھیں اور اتنی ہی زیادہ وہ ان کی دلدادہ تھیں۔ اس لئے سویوں کے اوپر چاندی کے ورق لگاتیں۔ پھر پسے ہوئے بادام اور پستے سے مبارک باد لکھتیں۔ اور خوانچے چلانا شروع کر دیتیں۔

اب خاتونوں کی تربیت یافتہ بیگم ابراہیم کو کون سمجھاتا کہ یہ لاہور ہے اور یہاں خوانچے چلانے کا کچھ ایسا رواج نہیں ہے۔ اگر کبھی تھا تو اب وقت کی کروٹ میں دب چکا ہے اب سبھی اچھے اپنے گھروں میں پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ ہر گھر کا حال ہوگا۔ چنانچہ اِدھر اُدھر سے آنے والے خوانچے بے قدری کی نذر ہی ہوتے ہیں اور عید کے روز سویاں بھیجنا چہ معنی دارد۔؟

جبکہ ہر گھر میں سویوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہاں تو عیدین پر مٹھائی کے ڈبے اور پھلوں کے ٹوکرے چلتے ہیں۔ عید مبارک سنہری لفظوں میں جکڑے ہوئے کیک اور رنگ برنگی پیسٹریاں بھیجی جاتی ہیں۔

اب بیگم ابراہیم غریب کی اتنی استطاعت تو تھی نہیں اس لئے وہ سویوں کے مختلف پکوان پکا کر اپنے دل کی حسرت پوری کر لیتی تھیں۔

بچوں نے کپڑے بدلنے اور نہانے دھونے کے لئے ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ آمنہ نے سب سے پہلے بچوں کو سنبھالا۔ نہلا دھلا کر ان کے کپڑے بدلے۔ انہیں ناشتہ کرایا اور عید گاہ جانے کے لئے تیار کر دیا۔

پھر اسمٰعیل اور حماد کے غسل کے لئے گرم پانی غسلخانے میں رکھا۔ اسمٰعیل کو تین چھٹیاں تھیں اور وہ دونوں مزے سے بیٹھے یہ تین چھٹیاں منانے کے پروگرام مرتب کر رہے تھے

عید کے دن تو یوں بھی کام خود بخود بڑھ جاتا ہے۔

آمنہ جب بچوں سے فارغ ہو کر اسمٰعیل اور حماد کے لئے سویوں کے قاب بھر کر

کمرے میں لائی تو وہ دونوں عید گاہ جانے کے لئے بالکل تیار کھڑے تھے۔ دونوں نے بالکل ایک جیسی اچکنیں پہنی ہوئی تھیں۔ آمنہ کی ذہین نظروں نے تاڑ لیا کہ یہ سب حماد کی کارستانی ہے اسی نے اتنی قیمتی دو اچکنیں ایک ساتھ بنوائی ہوں گی۔ ورنہ غریب اسمٰعیل کی جیب تو وردی کے علاوہ۔ کسی سوٹ کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لٹھے کی گھیر دار شلوار۔ کالی اچکن اور قراقلی ٹوپی میں حماد بڑا ہی جاذب نظر لگ رہا تھا۔

آمنہ نے اس پر اتنا نکھار پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

ورنہ وہ تو ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتا۔ وہی ٹیڑھی میڑھی ڈھیلی ڈھالی سفید پینٹ اور استری سے بے نیاز سفید قمیص ۔۔۔

آمنہ نے اسے مذاق ہی مذاق میں کئی بار ٹوکا بھی تھا کہ ۔۔۔ "کیا آپ اخباری لوگ فرشتے ہیں۔ جو ہمیشہ سفید کپڑے پہنتے ہیں ۔۔۔"

یا ۔۔۔

"شاید اخبار نویسوں کا یونیفارم سفید ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ صلح کا علمبردار ہے"

اور حماد ہمیشہ اس کے شستہ مذاق کا لطف لیا کرتا تھا۔

"اجی۔ کیوں ہماری "سفید پوشی" کا مذاق اڑاتی ہو۔ اب کیا بتائیں کہ ہمارا پردہ اسی سفید پوشی نے رکھا ہوا ہے"

مگر کبھی کبھی آمنہ کا دل ضرور چاہتا کہ اور مردوں کی طرح حماد سوٹ پہنے، ٹائی باندھے اس نے اس خواہش کا اظہار حماد کے سامنے کبھی نہیں کیا تھا۔ آج جو اسے شہزادوں کے لباس میں بانکا چھبیلا بنا دیکھا تو مبہوت رہ گئی۔

حماد اتنا خوبصورت بھی لگ سکتا ہے۔ وہ کھڑی سوچتی رہی۔

اس کے دل میں ایک پُر غرور سا جذبہ ابھرا۔ کہ وہ اس کا ہے۔ وہ جو سارے جہاں

سے زیادہ خوبصورت ہے۔

وہ جتنی دیر تک سوّیاں کھاتے رہے، آمنہ حماد کو دیکھتی رہی۔ حماد بھی یہ
کچھ محسوس کرکے خوب اترا رہا تھا۔ وہ دونوں جب باہر نکلنے لگے۔ تو آمنہ نے ایک
اور معنی خیز نگاہ حماد پر ڈالی۔ جیسے اسے ہر نگاہِ بد سے محفوظ رہنے کی دعا دے ر
اور حماد اس کی اس نگاہ کو۔ جس میں یہ بھی لکھا تھا "کہ تم صرف میری ملکیت
دل میں اتار کر باہر نکل گیا۔

ہائے یہ لڑکیاں ـــــ
بھلا ان کی پڑھائی کا کیا فائدہ ہوا؟
یہ جاہل ہی رہیں تو اچھا ہے۔
جب دِل کی بات انھیں آنسوؤں سے ہی کہنی ہے۔

جب وہ دونوں عید کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو آمنہ تیار ہو چکی تھی۔ وہ کمر
میں داخل ہوئی تو حماد اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اب مبہوت ہونے کی اس کی باری تھی

اُس نے ہلکے جوگیا رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر کالی لیس ٹکی تھی۔ لمبی چٹیا
جوگیا رنگ کا ربن تھا۔ آنکھوں میں لمبا لمبا کاجل اور چہرہ سارا گلابی۔ وہ مسکراتی ہوئی
اور حماد کے بالمقابل کھڑی ہو گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو ـ

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

حماد کو اپنے دل پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس نے ٹوپی اتار کر دور پھینکی۔ اور جیب
سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ پینے لگا۔

"عید مبارک بھائی جان!" آمنہ نے اسمٰعیل کی طرف منہ کر کے کہا۔

اسمٰعیل نے محبت سے آگے آکر آمنہ کے سر کو سہلایا۔ اور دس روپے کا نوٹ

کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے دیکھتے ہی عرفی اور چھمی بھی دوڑے دوڑے آئے۔
اسمٰعیل نے پانچ پانچ روپے ان دونوں کو دیئے۔

حماد بھائی "EID GREETINGS" عرفی چلا چلا کر حماد کے گرد ہو گیا اور ساتھ
ہی ساتھ وہ انگریزی میں عید مبارک کا ورد بھی کرتا جاتا۔

حماد نے جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور عرفی کے ہاتھ پر رکھ کر بولا

"دونوں بھائی آدھا آدھا بانٹ لو"

"واہ جی واہ ـــــ" عرفی نے نوٹ اُچک لیا۔ "یہ تو صرف میرا ہو گیا۔ جس کے ہاتھ
میں آیا۔ مال اسی کا ہو گیا"

اس کو بے ایمان ہوتا دیکھ کر چھمی منہ بسورنے لگا۔ حماد نے جلدی سے جیب میں
ہاتھ ڈالا اور دس کا ایک اور نوٹ نکال کر چھمی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

حماد بھائی زندہ باد۔

حماد بھائی زندہ باد!

وہ دونوں خوش و خرم نعرے لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"آپ مجھے عیدی نہیں دیں گے۔؟" آمنہ نے حماد کے سامنے رُک کر کہا۔

حماد ابھی تک کھویا کھویا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کے بیچوں بیچ اس
سراپا شعلے کو دیکھ رہا تھا۔

آمنہ اسے اس عالم میں دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہنسنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو ـــــ
اب بولئے جناب! بہت بن ٹھن کر چلے تھے.... ہے تاب نظارہ ـــــ؟

حماد نے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اعترافِ شکست کر لیا اور پھر دھیرے سے
نفی میں سر ہلا دیا۔ تو آمنہ نے جلدی سے بات بنائی۔

"کیوں نہیں دیں گے جی آپ مجھے عیدی ـــــ؟"

"تم نے سلیقے سے مجھے عید کی مبارک باد نہیں دی۔ تو میں کیوں عیدی دوں۔" حماد بولا
"میں نے تو آپ دونوں کو اکٹھی عید مبارک کہی تھی۔"
"تو پھر اکٹھی ہی عیدی بھی سمجھ لو۔"
"لیجئے۔ اب عید مبارک کہے دیتی ہوں۔" آمنہ نے جھک کر اسے آداب کیا۔
"اب نہیں۔ اب وقت گزر گیا۔" حماد ہنسنے لگا۔
"یوں کہیئے کہ آپ کی جیب کا بھرم کھل گیا ہے۔"
"درست! میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔" حماد نے ایک خاص انداز میں کہا۔
"کیوں ——؟" پوچھتے پوچھتے آمنہ رک گئی۔ حماد کی آواز میں ایک خاص بات تھی جسے آمنہ نے نوٹ کر لیا تھا۔ وہ اگر غلطی سے پوچھ بیٹھتی اور وہ اس کے جواب میں برملا کہہ دیتا —— کہ "میں تمہیں پہلے ہی سب کچھ دے چکا ہوں ——"
تو آمنہ کیا کر لیتی۔

گو اس روز کے بعد ان تینوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور حماد کو بھی ان کے گھر میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہو چلے تھے۔ مگر جیسے ان تینوں کے درمیان ایک خاموش سا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اور اسمٰعیل نے بھی ایک خوبصورت سے کنایئے سے ان کی مرضی پر اپنی مہر رضا ثبت کر دی تھی۔ زبانیں تینوں کی بند تھیں۔ ایک حجاب تھا کہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر چپ تھے اور اس موضوع کو دوبارہ نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ مگر وہ تینوں دلوں کا بھید جان چکے تھے۔

اس واقعے کے بعد حماد یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ مگر اسمٰعیل نے اسے جانے نہیں دیا۔ اس کا خیال تھا۔ مصلحتاً ابھی حماد کو کچھ عرصہ اور ان کے گھر میں ٹھہرنا چاہیئے۔

لیکن یہ آمنہ تو بالکل نہیں چاہتی تھی کہ حماد یہ گھر چھوڑ کر جائے۔ کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آتے —— اور وہ پیاس بجھائے بغیر اسے پھیر دے۔
اور پھر خود آس و یاس کے گھروندے بنا بنا کر بوند بوند کو ترستی پھرے ——
یہ رسک لینے کو وہ بالکل تیار نہ تھی۔ اس لئے ایک دن اس نے حماد سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "خواہ حالات کچھ ہوں۔ آپ میری رضا کے بغیر یہ گھر چھوڑ کر نہیں جائیں گے!"
اور اُسے آگے حامی بھرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ بھلا وہ اس کی مرضی کے خلاف کیسے زندہ رہ سکتا تھا۔

اب کبھی وہ دونوں زیادہ دیر تک تنہائی میں بیٹھ کر گفتگو تو نہیں کرتے تھے۔ مگر اسمٰعیل کی موجودگی میں ہنسی مذاق کر لیتے تھے۔ جس کا لطف خود اسمٰعیل بھی اٹھاتا تھا۔ جب حماد نے اسے عیدی دینے سے بالکل انکار کر دیا۔ تو آمنہ ڈھیٹ ہوتے ہوئے بولی۔
"تو پھر آپ مجھ سے عیدی لے لیں۔" اُس نے اسمٰعیل کا دیا ہوا نوٹ حماد کی طرف بڑھایا۔
حماد اور اسمٰعیل کھل کھلا کر ہنس دیئے۔
"تمہاری یونہی میں کیوں لے لوں۔ اگر کہیں سے کچھ اور نہ ملا تو مجھے بد دعائیں دو گی۔"
حماد یہ کہہ کر نیم دراز ہو گیا۔ آمنہ باہر جانے لگی تو حماد نے سر اٹھا کر کہا۔
"چائے نہیں پلاؤ گی۔"
"نہیں ——"
"پلیز ایک کپ ——" حماد نے منت کی۔
"ہاں منوں! صبح ٹھیک سے چائے نہیں پی۔" اسمٰعیل نے بھی تائید کر دی۔ اس وقت

گرم گرم چائے پلادو تو مزہ آجائے۔

آمنہ باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد چائے کا ٹرے تھامے اندر آئی۔

وہ چارپائی پر چائے کا ٹرے رکھ کر جانے لگی تو حماد نے نیم وا آنکھوں سے کہا

"براہِ کرم ایک کپ بنا دو۔۔۔۔"

"بھئی آپ خود بنا لیں۔ باہر کچھ مہمان آگئے ہیں۔ اور امیّ مجھے بلا رہی ہیں۔" وہ جلدی میں تھی۔

"پلیز۔۔۔۔" حماد نے اپنی آواز میں التجا بھر کر کچھ اِس طرح کہا کہ آمنہ جلدی جلدی بنانے لگی۔

اصل میں حماد آج آمنہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ چائے کا تو اس نے محض وسیلہ ڈھونڈا تھا۔ آج جبکہ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی تو کسی اور کی نظر اس پر کیوں پڑتی۔

گیروے رنگ کے کپڑوں میں وہ کوئی جوگن لگ رہی تھی۔ جو سر پہ کالی پٹی باندھے دِل کا کشکول تھامے۔ اپنے پریتم کو کھوجتی پھر رہی ہو۔ گھنے جنگلوں سے چھنتی ہوئی بنفشی شعاعوں کا حُسن اس کے چہرے پر بکھرا ہوا تھا ـــــ اور وہ بانسری سے بچھڑی ہوئی ایک ایسی پُرسوز لے لگ رہی تھی جو خواہ مخواہ دِلوں سے جا ٹکرائی تھی۔

ابھی اس نے چائے کی پیالی حماد کو تھمائی تھی کہ باہر سے بیگم ابراہیم نے اُسے پکارنا شروع کر دیا۔

وہ دوڑ کر باہر چلی گئی۔

وہ دونوں اندر بیٹھے چائے پیتے رہے۔

پھر گھر میں ایک شور و غل بپا ہو گیا۔

پتہ چلا کہ بیگم ابراہیم نے آج ایک دعوتِ خاص کا اہتمام کیا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد۔ اسمٰعیل حماد سے معذرت طلب کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسے آج کچھ سینئر افسروں کے ہاں۔ اور خصوصیت سے سکینہ آپا کے ہاں عید مبارک کہنے جانا تھا۔ حماد تو خیر ساتھ جانے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ اور پھر آج وہ گھر پہ رہ کر آمنہ سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسمٰعیل چلا گیا تو حماد کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔

وہ بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دِل میں کھول بھی رہا تھا۔

اسے لیٹے لیٹے ایک اونگھ بھی آگئی تھی آنکھ کھلی تو دیکھا دو بج رہے تھے۔ مگر آمنہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ گھر تو سارا عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا ایک آدھ بار اُسے باہر آمنہ کی جھلک بھی نظر آئی۔ مگر اس عالم میں کہ ـــــ ہاتھوں میں سالن کے ڈش یا پانی کا جگ پکڑے ہوئے خدمت گزاری میں مگن ہے۔ اسے تو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ نظر اٹھا کر دُور ہی سے اس کی جانب دیکھ لیتی۔

اور پھر دو بج گئے تھے۔ کسی کو اسے کھانے پہ بلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔

حماد کو غصّہ آنے لگا۔

جانے کب تک یہ ہنگامہ رہے گا۔

پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی ـــــ اس نے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پہ رکھی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

رات کے بارہ بجے تھکا ہارا واپس آیا۔ کہاں کہاں وہ مارا نہیں پھرا تھا۔ اور کی

——— ؟ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

آمنہ کی بے پروائی سے وہ سیخ پا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بے بس ہے۔ مگر برداشت کا مادّہ اس میں کہاں تھا۔؟

یوں بھی اسے کسی قیمت پر یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے گھر میں موجود ہوتے ہوئے لوگوں کی آؤ بھگت کرتی پھرے۔

شہر میں اُس کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ دفتر اُس کا بند تھا۔ عید کے روز کوئی بھی کا مشتاق نہیں تھا۔

پھر بھی طیش میں آکر وہ گھر سے نکل گیا۔

سیدھا ایک ہوٹل میں پہنچا۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ چار بجے تک وہیں بیٹھا سگریٹ پھونک کر دل جلاتا رہا۔ اُس کے وہاں بیٹھے بیٹھے کئی خوش فکر جوڑے ہنستے مسکراتے گزرے تھے۔ قہقہوں کا سیلاب اور خوشیوں کی لپٹیں کئی بار اس کے قریب سے گذری تھیں۔

سب لوگ بیٹھے عید منا رہے تھے۔

اور وہ بیٹھا سوگ منا رہا تھا۔

آج کے دن بھی اگر وہ آمنہ سے نہیں مل سکتا۔ آج کے دن بھی اگر اسے اپنے ساتھ باہر نہیں لے جا سکتا——— آج کے دن بھی اپنی یہ ننھی سی خوشی پوری نہیں کر سکتا۔ تو یہ معاشرہ اور یہ سوسائٹی ایک بے معنی سی چیز ہے۔

ہر شے کو آگ لگ جائے تو اچھا!

یہ نقلی دُنیا ہے۔ یہ نقلی باشندے ہیں۔

یہ کوک بھرے کھلونے ہیں۔

یہاں کی ہر چیز سے مجھے نفرت ہے۔

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اُٹھ کر ہر شے کو تہہ و بالا کر دے۔ یا توڑ پھوڑ کا تخریبی عمل شروع کر دے۔ بالکل اس طرح جس طرح اس کے ذہن میں توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔

اور وہ کم بخت اتنی مجبور ہے کہ چاہتے ہوئے بھی میرے پاس نہیں آسکتی——— وہ اندر ہی اندر آمنہ پر کھول رہا تھا۔ جو بزدل ہے اور بے وقوف بھی!

اور میں نے کون سے دو جہاں مانگ لئے ہیں؟

میں نے بھی تو ایک بزدل اور بے وقوف لڑکی پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اسے چاہ لیا ہے۔ اسے مانگ لیا ہے——— اور اس کے ساتھ زندگی گذارنے کا پیمان باندھا ہے دُنیا کے اس وسیع سمندر میں سے ایک قطرہ نکال لینے سے کون سی کمی واقع ہو جائے گی۔

اور وہ لڑکی——— اپنے تمام تر معمولی پن کے باوجود——— میرے لئے آفاق کا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے———

اسے دیکھ کر دل دھڑکتا ہے——— اور اس دنیا میں ایک چھوٹی سی دنیا بسا کر نوں سالوں جینے کو جی چاہتا ہے——— تمنا کرنے کو جی چاہتا ہے———

ہو سکتا ہے کسی اور کے لئے اس کا وجود یہ معنی نہ رکھتا ہو——— مگر میرے لئے

وہ کیا شے ہے —— ؟

میں جو عورت کے آگے اپنے آپ کو پہاڑ کا ایک خشک تودہ سمجھ بیٹھا تھا۔
میں ہی اب موم کی مانند پگھلا جا رہا ہوں۔
اور اپنی تپش مجھی سے برداشت نہیں ہوتی ——
آخر آدمی جو کچھ چاہے۔ وہ کر کیوں نہیں سکتا۔
یہ بندشیں غیر ضروری ہیں —— اگر شادی ہی اس معاشرے کا آخری علاج
تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں ——
مگر —— خواہش کرنے والوں کو آگ میں جلایا جاتا ہے۔ اور خود جواخلے
لوگ بر ڈھونڈنے نکل جاتے ہیں۔
اُونہہ!

اس کا دل اُن کے گھر واپس جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے وہ ہوٹل سے
کر مال روڈ پر چہل قدمی کرنے لگا۔

دائیں سے بائیں —— اور بائیں سے دائیں ——
نہ جانے اس نے کتنے چکر لگائے۔ کتنے مناظر دیکھے اور کتنے جوڑوں کو
کر جل اُٹھا۔

چھ بجے، اس نے مال روڈ کے ایک اور خوبصورت ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پی
وہاں اُسے ایک پرانا شناسا مل گیا۔ انہیں گپ بازی کرتے ہوئے وہیں پر آٹھ بج
رات کا کھانا بھی اشتہا کے بغیر ہی اُس نے —— اپنے دوست کے مجبور کرنے پر
ریسٹوران میں کھا لیا۔ اب تقریباً دس بجنے والے تھے۔ اس کا دوست رخصت ہو
بھی ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ ابھی تک اس کا گھر جانے کا موڈ نہیں بنا تھا۔ اس لئے
ہی ایک طرف کو چل پڑا۔ پھر جو سڑک سامنے آئی وہ اسی کی طرف مڑتا گیا۔

چلتا رہا.... چلتا رہا ——

اس عرصے میں ایک سیکنڈ کو بھی اُس نے سگریٹ کو منہ سے نہیں ہٹایا تھا۔ اب تک وہ ڈبیاں پھونک چکا تھا۔ اس کے سینے میں جلن ہو رہی تھی۔ اور تالو اکڑ چکا تھا۔ مگر وہ لگاتار منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑتے جا رہا تھا۔ جب سڑکوں پر چہل پہل ختم ہو گئی —— اور آمد و رفت کا سیلاب سمٹنے لگا —— اور جگمگاتی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔
اس نے گھر کی راہ لی۔

اس کا خیال تھا سب سو چکے ہوں گے۔ کوئی اس سے استفسار نہیں کرے گا۔
اس نے خود کو اس قدر تھکا لیا تھا کہ اس میں مزید سوچنے یا جاگنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ جاتے ہی بے سُدھ ہو کر سو جانا چاہتا تھا۔

ایک گہری نیند ——
جو اُس کے اعصاب کی تھکن اور ذہن کی تپش کو دُور کر دے۔

جب وہ ٹیکسی سے اُترا تو سگریٹ اُس کے منہ میں تھا۔ وہ اس بوسیدہ گیٹ کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا۔ پھر اُس نے دوسرے ہاتھ سے گیٹ بند کر دیا۔ جونہی اُس نے سگریٹ کا بھرپور کش لیا، ننھے سے شعلے کی روشنی میں اُسے سامنے سیڑھیوں پر ایک ہیولیٰ سا دکھائی دیا۔

اُس کی چھٹی حس فوراً بیدار ہو گئی۔
جانے نیند اور تھکن کہاں غائب ہو گئی۔
وہ سگریٹ بجھا کر اس ہیولے کی طرف بڑھا۔
وہ اپنا سر گھٹنوں پر رکھے گویا مراقبے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حماد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا تو وہ چونک گئی۔

"تم.... تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

آمنہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"یونہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں باہر کھلی میں آکر بیٹھ گئی۔"

"سر درد کا بہانہ کیوں کرتی ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم ابھی تک میرا
کر رہی تھیں۔"

"اور اسی لئے عید کے روز آپ گھر سے نکل گئے تھے۔"

آمنہ کے لہجے میں ہزار شکایتیں تھیں۔

"اور کیا کرتا ——؟" حماد برہم ہونے لگا۔ "گھر میں اس قدر ہنگامہ تھا، جیسے
برچی ہو۔ تم عورتوں کے نخرے اٹھاتے میں اس قدر مگن تھیں کہ میرا خیال تک نہ
کتنی دیر بیٹھا کُڑھتا رہا۔ پھر جل کر باہر نکل گیا۔"

"میں کیا کرتی۔ مجبور تھی۔ امی نے بیشمار عورتوں کو مدعو کر لیا تھا اگر سارا کام
تو بڑی خفت اُٹھانا پڑتی۔"

"خیر تمہیں تو خفت نہیں اٹھانا پڑی۔ مجھے ذلت اٹھانا پڑ گئی۔"

"جناب تین بجے تک سب عورتیں چلی گئی تھیں۔ میں آپ کے کمرے میں آ
مگر آپ غائب ہو چکے تھے۔"

یہ دُرست تھا۔

عورتوں کے جاتے ہی آمنہ بے چینی سے حماد کے کمرے کی طرف آئی
اُسے معلوم تھا کہ حماد جان بوجھ کر اسمٰعیل کے ساتھ نہیں گیا۔ آج اس سے خوب
باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے تابی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے وہاں نہ
غسلخانے میں جھانکا۔ برآمدے میں دیکھا۔ بہانے سے سڑک کے موڑ تک بھی
کہ وہ کسی کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے نہ کھڑا ہو۔

تو وہ بھی چلا گیا ——

آمنہ کا دل بجھ گیا۔ اور وہ ساری خوشی بھی مٹ گئی جو عید سے وابستہ ہو گئی تھی۔
میں بھی حیران ہو رہی تھی کہ میری زندگی کی یہ پہلی عید سچ مچ عید بن کر کیسے آ گئی۔؟
میرے مقدر میں عید کی سچی خوشی کہاں۔؟

یہ صحیح ہے کہ اس کی عید ہمیشہ سوگوار گذرتی تھی۔

اس نے کبھی عید کے نئے کپڑے نہیں بنائے تھے اور نہ ہی عام لڑکیوں کی
مانند آخری روزے تک وہ دوپٹے پر کرن ٹانکا کرتی۔ نہ ہی مہندی لگاتی۔ اسے یہ سب
باتیں کھوکھلی لگتیں۔ بھلا یہ سب کس کے لئے کیا جائے۔

زندگی کے مسائل اَن گنت ہوں، تو اِن سارے بے کیف اور بوجھل دنوں میں
سے ایک دن کیوں الگ کر لیا جائے —— اور اس دن کی پیشانی کو جھوٹی خوشیوں اور
بناوٹی مسرتوں سے کیوں سجایا جائے ——؟ ٹھیک ہے گذر جانے دو اس دن
کو بھی —— باقی تین سو پینسٹھ دنوں کی طرح —— یہ ہمارے لئے کون سی انوکھی
خوشیاں لے کر آ گیا ہے ——؟

ایسے ہی ہر سال چلا آتا ہے۔ اور چلا جائے گا۔؟

مہمانوں سے نپٹنے کے بعد وہ کوئی کتاب اُٹھا کر اپنی کوٹھڑی میں چلی جایا کرتی تھی
یا اپنی ڈائری لے کر سارے سال کی روئیداد لکھنے بیٹھ جاتی تھی۔

اور بہت ساری اچھی اور ناخوشگوار باتیں لکھ چکنے کے بعد وہ سب سے آخر
میں یہ شعر ضرور لکھا کرتی تھی۔

اے ہلالِ عید سچ کہہ اپنی کب عید آئے گی
عید کب آئے گی؟ پیغامِ مسرت لائے گی؟

کل شام چاند دیکھنے کے بعد جب حماد نے پہلی نظر آمنہ پر ڈالی تو وہ دُور کھڑی
شرما گئی۔

تم ہی میرے لئے نویدِ عید اور نوید زندگی ہو! حماد کی ہر نظر کہہ رہی تھی۔

اے ہلالِ عید سچ کہہ ......

آمنہ نے باریک سے زریں چاند کی طرف دیکھا ......

ہاں ہاں ....

چاند جیسے معصوم بچے کی مانند مسکرانے لگا۔

تو ہر سال مجھ سے پوچھا کرتی تھی نا؟ میری عید کب آئے گی؟ یہ تیری عید، صرف تیری!

جو تیری زندگی کی گنجلک اور گمنام گتھیوں کا حل لے کر آئی ہے۔ اور عطر بیز سے سجی ایک انوکھی اور حقیقی جنت کی کنجی لائی ہے۔

کیا محبت سے بڑھ کر کوئی حسین شے ہے اس دنیا میں!

اور فنا ہو جانے کے جذبے سے بڑھ کر کوئی لگن نہیں ہے۔

اُس نے مسرور ہو کر دعا مانگی ــــ جانے کیا کیا مانگا ــــ اور کیا سوچا۔

جب اُس نے دعا ختم کر کے منہ پر ہاتھ پھیرا تو حماد زور سے بولا "آمین"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے سب ہنس پڑے اور سب کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔

خوب جانتا تھا کہ اس نے کیا کیا مانگا ہوگا ــــ ؟؟

کل شام چاند دیکھ کر اسے بڑا لطف آیا تھا۔ ورنہ ہر سال وہ یونہی برہم ہوا کرتی تم لوگ بھی بڑے ہنگامہ خیز ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ ہنگامہ برپا کرنے کو چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں اور دوسروں کی توجہ طلب کرتے ہیں۔

زندگی کی یہ ہماہمی اور شور و غل اسے زندگی سے بہت قریب لگا۔

پھر اُس نے صبحِ عید کا شدت سے انتظار کیا۔

اِس عید پر اُس نے نئے کپڑے بھی بنائے تھے۔ صبح اُٹھ کر بڑے شوق سے

بھی ہوئی تھی۔ اور صبح کو وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اور حماد کے پاس بیٹھ کر وہ اس کی نظروں سے داد کے ساغر پینا چاہتی تھی۔ ویسے بھی حماد کی والہانہ نظریں سارا وقت اس کے جذبات میں ہلچل مچاتی رہی تھیں۔ کبھی کبھی زندگی اس مقام پہ آ ہی جاتی ہے۔ جب سجدے کروانے اور پرستش کروانے کو جی چاہتا ہے۔

اس ایک تمنا کے لئے سب کچھ تج دینے کو جی کرتا ہے۔

اسے اگر معلوم ہوتا کہ آج حماد اس کی خوشیوں میں زہر گھول کر چلا جائے گا۔ تو وہ سارے مہمانوں کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے پاس آ بیٹھتی۔ پھر جو ہوتا دیکھا جاتا۔ مگر اس وقت اسے نہ پا کر جس دکھ سے وہ دوچار ہوئی تھی۔ اس نے اس کی ساری خوشی بھسم کر ڈالی تھی۔

بھلا میرے مقدر میں عید کی سچی خوشیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔

اس نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور حسبِ معمول تکیوں میں منہ دے کر سو گئی تھی۔ شام کو سکینہ آپا اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تھیں اُسے سوتا دیکھ کر انہوں نے جگانے کی زحمت نہ کی۔ بلکہ اس کے سرہانے ایک دس کا نوٹ رکھ کر چلی گئیں۔

گویا عیدی صرف نوٹ کا نام ہے۔ ملنا تو کچھ ضروری نہیں۔

"مجھ میں اتنی دیر بیٹھنے کی تاب ہی کہاں تھی" حماد کہہ رہا تھا۔ "جب تمہیں معلوم ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ میرے ہوتے ہوئے تم اور لوگوں کے آگے پیچھے پھرو تم جان بوجھ کر ایسا کیوں کرتی ہو؟"

"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔"

"اگر تھوڑی دیر اور دل پر جبر کر لیتے تو آپ کا کیا جاتا۔ ؟ تین بجے تو میں بالکل فارغ ہو گئی تھی۔"

"چار بجے سنا تھا تمہاری بہن کی سواری بادِ بہاری آ رہی ہے۔ اس لئے چلا گیا۔ دوسرا اسٹیشن تو انتہائی ناقابلِ برداشت ہو گا۔"

آمنہ کو ہنسی آ گئی۔ اتنے میں ریلوے کا ایک بجے کا سائرن چیخ اٹھا۔

آمنہ بولی۔ "اب جاؤں ایک بج گیا ہے۔"

"ایک بجے کی کوئی شرط تھی؟"

"میں آپ کی غلط فہمی دور کر کے سونا چاہتی تھی اور پھر۔۔۔ مجھے آپ کو عید بھی کہنا تھی۔ سو کہہ لی۔" آمنہ آہستہ سے بولی۔

"ابھی کہاں کہی ہے۔ عید ملنے کا سنا ہے ایک الگ طریقہ ہے۔"

آمنہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"وہ تم نے شعر سنا ہوا ہے نا۔۔۔۔" حماد کا سارا غصہ اور بد دلی رفو چکر ہو چکی تھی اور فطری شگفتگی عود کر آئی تھی۔

"اب آپ اسی گھسے پٹے شعر کا حوالہ دیں گے کہ

رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

آمنہ نے جلدی سے کہا۔

"ان شعروں کو گھسا پٹا کبھی نہیں کہتے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ جذبوں کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔۔۔"

"ویسے ——" وہ ذرا سا رک کر شرارت سے بولا۔ "موقع تو خیر اس سے اچھا کبھی آ ہی نہیں سکتا۔"

"اور اب آپ موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔"

"جی میں تو اتنا شریف آدمی ہوں کہ جائز موقع بھی چھوڑ دیتا ہوں۔"

"دیکھ لیں گے —— ؟"

"کب ——؟؟؟" حماد نے اندھیرے میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"جب وقت آئے گا۔" آمنہ کہاں چوکنے والی تھی۔

"ابھی کیوں نہ دیکھ لو۔ شاید اس وقت تمہیں یاد نہ رہے۔" حماد نے جان بوجھ کر ایک قدم آگے بڑھایا۔

"خدا کے لئے اس وقت کوئی تجاوز نہ کیجئے گا۔ میں چلا اٹھوں گی اور سب لوگ جاگ جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے۔ سب لوگ آج گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں گے۔" حماد نے کہا۔

"ہاں۔" آمنہ بولی "گیارہ بجے رات تک تو خوب ہنگامہ رہا۔ اب سب تھک تھکا کر سو چکے ہیں۔"

"اور تم کیوں جاگ رہی تھیں؟"

"جی —— جن کی جان ہو گدڑی میں ساری رات وہ جاگیں ہو۔"

"اچھا تو ذرا چھت پر چلیں گدڑی پوش۔ تھوڑی دیر سکون سے باتیں کریں گے۔" حماد نے آمنہ کا بازو پکڑ کر اس کا منہ چھت کی جانب موڑا۔

یہ ایک نیچی سی برآمدے کی چھت تھی۔ جو گرمیوں میں کبھی کبھار سونے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ اور نیچے لکڑی کی مضبوط اور موٹی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں چھت پر چلے گئے۔ ایک جامن کا اونچا درخت دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ آمنہ اس کے سائے میں منڈیر پر بیٹھ گئی۔

حماد نے آمنہ کو سرتا پا غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم نے کپڑے کیوں تبدیل کر لئے؟"

"بس آپ کے جاتے ہی میں نے غصے میں آ کر کپڑے بدلے اور سو گئی۔"

"بہرحال تم آمنہ آج تو ان کپڑوں میں ساری دنیا سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ میرے ہر تصور سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔۔۔۔ بس مجھے دل پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔"

"اب کہنے سے کیا فائدہ ——؟" آمنہ نے منہ بسور کر کہا۔

"اس وقت سب کے سامنے کیا کہتا اور کیسے کہتا؟" اس نے آمنہ کے
ڈھالے بالوں کو کھینچ کر کہا۔

"اور کیا سب کی موجودگی میں تجھے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیتا؟"

آمنہ نے گھبرا کر سر پیچھے کر لیا۔ اور اُٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑ

"اتنی مشکل سے اپنے دل پر جبر کیا تھا۔ اگر تو نے میرے پاس نہیں بیٹھ
تو ایسے کپڑے پہن کر میرے سامنے مت آیا کر۔"

حماد نے جلدی سے سگریٹ سلگا کر منہ کے ساتھ لگا لیا۔

"تو سنگھار مت کیا کر۔ تو بس ایسے ہی اچھی لگتی ہے۔ میں نہیں چاہتا
علاوہ کوئی بھی تجھے ایسی نظروں سے دیکھے۔ اور پھر مجھے یہ بھی ڈر ہوتا ہے
تجھے دیکھ کر میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھوں اور بعد میں تو مجھ سے جھگڑ

اُفوہ!

آمنہ نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کر اپنا سر دیوار سے لگا لیا اور آسمان کی
تکنے لگی۔

رات خنک ہوتی جا رہی تھی۔

چاند اگرچہ رونمائی کے بعد چھپ چکا تھا۔ مگر تارے اپنے پورے جوبن پر
رہے تھے۔ اور تاروں کا حسن بھی تو اس وقت جادو اثر بن جاتا ہے۔ جب چا
کی محفل میں نہیں ہوتا —— نیم شب کو —— دُور دُور ... بکھرے ہوئے
قطار اندر قطار ٹھہرے ہوئے ... ایک دوسرے کے آگے پیچھے ...
پہلو ... مسکراتے ہوئے ... کھل کھلاتے ہوئے ... اٹھکیلیاں مارتے
—— شوخیاں کرتے ہوئے۔ تارے کس قدر خوبصورت لگتے ہیں۔

اور وہ ان کا دھیما دھیما رُوح کو بیدار کرنے والا نور۔ جو انجانی روشنی بن کر زمین تا
فلک چھایا ہوتا ہے۔ ایک غیر محسوس سا اُجالا۔ ایک اَن دیکھا پرتو۔ دل پر چھا جاتا ہے
تاروں کی روشنی دیکھ کر مدھم اور عطر بیز سرگوشیوں کا خیال آجاتا ہے۔ زندگی کے
اسرار و رموز کھلنے لگتے ہیں۔

ستاروں کی یہ مدھم اور فسوں ساز روشنی' چاند کی بے باک روشنی سے زیادہ جذبات
کو چھیڑتی ہے۔ جب اجالے اندھیرے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی کوشش کر
رہے ہوں۔ تو دل کیسے قابو میں رہ سکتے ہیں۔

آمنہ نے دفعتہً آنکھیں بند کر لیں۔

حماد ذرا فاصلے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ حماد آمنہ کی بند آنکھوں
کو دیکھ رہا تھا.... کہیں

کسی روز میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھوں....

حماد کے یہ الفاظ ابھی تک آمنہ کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ہر روز وہ یہی
الفاظ مختلف طریقوں سے اسے کہتا تھا۔

تو.... تو.... تم ایسی ویسی حرکت کا ارتکاب کیوں نہیں کر لیتے....

جب تمہارا تخیل میرے وجود پر چھا جاتا ہے.... تو اَن جانی سی خواہشیں میرے
دل میں مچلنے لگتی ہیں —— انوکھی سی تڑپ مجھے بیقرار کر دیتی ہے.... جو کبھی سوچا
بھی نہ تھا وہ چاہنے لگی ہوں.... صرف تمہارا قرب —— تمہاری محبت.....
تمہاری دیوانگی اور تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں.... یکلخت زندگی اس ایک نکتے میں
سمٹ آنا چاہتی ہے.... دل تو وہ سب سوچتا ہے جو ناممکنات میں سے ہو....
اور تم میری سوچ کے حصار میں گھس کر تو دیکھو —— ان دیکھے جزیروں کے خواب —
معصوم تمناؤں کی خوشبو... اَن چھوئے پھولوں کا رس.... جذبات کے الاؤ اور

پھولوں کلیوں کی رِم جھم . . . . اور کسی دن تم ـــــ میری بھٹکتی رُوح پر آبِ حیات
کے چھینٹے کیوں نہیں مارتے ـــــ اور کسی دن تم . . . میرے غرور کو سرنگوں کیوں
نہیں کرتے ۔

اور کسی دِن تم . . . . کسی دِن تم . . . . .

کِس دن کا تمہیں انتظار ہے ؟

توبہ توبہ ـــــ آمنہ کو ایک دم جھرجھری آگئی ۔ ہائے یہ باتیں ۔ دل کی باتیں
کبھی اگر زبان پر آجائیں ۔ یا کسی کو معلوم ہو جائیں تو . . . شکر ہے اللہ کا کہ یہ باتیں
سوچ تک محدود ہیں ۔ اور سوچ کو اللہ تعالیٰ نے پردے میں رکھا ہے اور اس اُبھرتے
بپھرتے طوفان کو تو بھی پردے میں رکھ !

عشق میں دیوانی نہ بن ۔ ورنہ تو خود بھی اپنے کو معاف نہ کر سکے گی ۔ توبہ توبہ
معاذ اللہ !

یکایک اسے محسوس ہوا کہ حماد نے دیوار پر اپنے ہاتھ جما کر اس کے ارد گرد بازوؤں کا
حلقہ بنا لیا ہے اور اُس پر جُھکا ہوا ہے ۔

آمنہ کی رُوح کانپ گئی ـــــ (اور سوچ بُری باتیں) خدایا مجھے معاف کر دے
بھٹکنے سے بچا ۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔ واقعی حماد اُس کے اتنا قریب تھا کہ اگر وہ چہرہ
اٹھاتی تو اس کے چہرے سے مس ہو جاتا ۔ اس نے گھبرا کر اپنا منہ موڑ لیا ۔

"اب خود ہی آن پھنسی ہو تو ڈرتی کیوں ہو ۔" حماد نے اس کے کان میں سرگوشی کی

آمنہ کا دِل خوف کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ اس لمحے وہ حماد کی
طرف سے بھی بدگمان ہو گئی ۔ اسے حماد کی نیت پر شک گزرا . . . .

لیکن جُھکا جُھکا حماد ایک دم کھڑا ہو گیا ۔ "منّو ۔ اب تو چلی جا ۔ تو چلی جا

آمنہ کی جان میں جان آئی ۔ اور اسے شرم بھی آئی کہ اس نے ناحق حماد کی نیت
پر شک کیا ۔

اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹے ۔ جو ہوا سے اُڑے جا رہے تھے ـــــ
جب وہ نظریں چُرائے ۔ کچھ کہے بغیر ـــــ جانے کو مڑی تو ـــــ جانے یک بیک
حماد کے دل میں کیا آئی ۔ کہ اُس نے لپک کر آمنہ کی کلائی پکڑ لی ۔

کلائی پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کی سختی کو وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا ۔

آمنہ پر اس کا کیا اثر ہوا ۔ وہ نہ دیکھ سکا ۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس کا گلناری چہرہ
جھکا ہوا تھا ۔ اور اس نے دوپٹے کا ایک کونا انگلی پر لپیٹ کر منہ میں دبا رکھا تھا ۔

آمنہ . . . .

آمنہ . . . . .

حماد کی آواز میں لرزش تھی ۔

آمنہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے ۔ جیسے یہ وہ مقام ہے جہاں احساس کے پَر
جل جاتے ہیں . . . . .

حماد !

آمنہ نے اپنی بھیگی آواز کے ساتھ بھیگی آنکھیں اُوپر اٹھائیں ۔

اُف وہ آنکھیں ـــــ

ایک مقدس اور متبرک نُور کا پرتو لگ رہی تھی ۔ وہ پرتو حماد کو سرتاپا جلا گیا ـــــ
جیسے طور جل گیا تھا ۔

وہ سیاہ ہو گیا ۔ راکھ ہو گیا ـــــ اور جب راکھ اُڑنے لگی ۔ تو اُس نے آمنہ کو اپنے
دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا ۔

ایک دھڑکتا ہوا دِل ۔

ایک لرزتا ہوا گرم گرم پیکر —— اُس کے وجوُد کے ساتھ لگ گیا۔ مگر بہا[ر] کی فضا قائم نہ ہو سکی۔

اُس کے بالوں کی خوشبُو ——

اُس کی سانسوں کی گدگدی آمیز سرسراہٹ ——

اُس کے پیکر کا خمار —— حماد کو بے خوُد کئے ہوئے تھا۔

کتنے لمحے یوُں ہی بیت گئے . . . .

زمین اور آسمان مستی میں گھومنے لگے . . . ستارے اِدھر اُدھر اُڑنے لگے! کہکشاں مُسکرانے لگی . . . . .

بدلیاں وارفتہ ہو گئیں . . . . .

جانے لمحوں کے جادُو نے ان کے کانوں میں کیا پھُونکا ——

"عید مبارک ہو جان!"

حماد نے اپنا چہرہ آمنہ کے بالوں میں چھپاتے ہوُئے دھیرے سے کہا۔ کپکپاتی ہوئی آمنہ نے جیسے ہار مان لی تھی اور خوُدسپردگی کے عالم میں ا[س] کے کندھے پر ٹِکا دیا۔

اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

دل دھڑک رہا تھا۔

ذہن خوف زدہ تھا۔

اور پاؤں اُکھڑ چکے تھے۔

مگر وہ احساس کی زد سے بہت اونچے ہو چکے تھے۔

ان کا وجوُد ایک ہو چکا تھا۔

وہ اپنی سُدھ بدُھ کھو چکے تھے۔

اُن کی روحیں ایک ہو چکی تھیں!

اور ان کے لب سل گئے تھے!

جب آمنہ نے اس کے کندھے پر سر ٹِکایا تو ایک نئی قسم کی خوشبو نے اُسے خوش آمدید کہا۔ یہ حماد کے جسم کی خوُشبو تھی۔ سگریٹ کی خوشبو، اس کی سانسوں کی خوُشبو —— اور اس عطر کی خوُشبو جو کل صبح آمنہ نے اسے لگایا تھا۔ سب خوشبوئیں مِل جُل کر ایک مدہوش کُن تاثّر دے رہی تھیں اور آمنہ کو زندگی میں پہلی بار یہ خوُشبو دنیا کی ہر خوشبوُ سے اچھّی لگی۔

اتنی رُوح پرور ——

اتنی زندگی بخش!

جیسے یہ خوشبو اسے اپنے سے برتر اور ایک عظیم مرد کی لازوال محبّت کا یقین لا رہی ہو —— ؟

خوشبوئیں بھی شخصیّت کا پَرتو ہوتی ہیں۔

اور آمنہ سوچ رہی تھی۔ اس خوُشبو کی چھاؤں میں موت بھی ملے تو ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

دفعتًا حماد کو یوں محسُوس ہوا۔ کہ اس نے ایک اُڑتی چڑیا کو پکڑ لیا ہے۔ اس کی مٹھی میں دبی ہوئی، کانپتی ہوئی۔ تھرتھراتی ہوئی . . . گرم گرم چڑیا ——

اور اپنی ہتھیلی کے اندر وہ اس کے دل کی دھڑکن کو بخوبی محسُوس کر رہا تھا۔

اس دھڑکتی اور کپکپاتی ہوئی چڑیا پر اُسے بے حد ترس آیا۔

لیکن کوئی ایسا جذبہ تھا جس نے مٹھی کھول کر اس چڑیا کو آزاد کرنے سے روُکے رکھا۔ شاید وہ اس گرم مُٹھی سے زندگی کی ساری حرارت حاصل کر رہا تھا۔ یا اس کی اسیری سے لُطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

اور پھر اچانک سہمی ہوئی چڑیا چونک اٹھی۔ اس نے سر اٹھایا جیسے گہری نیند
جاگی ہو۔

اور پھر۔۔۔ کندھا چھوڑ کر سیڑھیوں کی راہ سے غائب ہو گئی۔

آمنہ۔۔۔ آمنہ۔۔۔۔

حماد اسے بُلاتا رہا۔

ہوش میں آتا رہا ——

لمحوں کا اثر دِل میں جذب کرتا رہا۔

لمحے —— جو لافانی ہو گئے تھے۔

زندگی بن گئے تھے۔

دل بن کر دھڑک رہے تھے

کتنی خوشبوئیں تھیں آس پاس۔

کائنات نے اپنا چولا بدل لیا تھا۔ اِک اِک نظارہ زندۂ جاوید ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھیں مخمور ہو چکی تھیں۔ اُس کے وجود پہ ایک لرزتا ہوا پیکر سایہ فگن

ٹھنڈا، میٹھا اور خوشبودار سایا ——

زمین پر خدا کا سایا ——

اور اُس کی مٹھی میں ابھی تک ایک چڑیا کا دل دھڑک رہا تھا۔

پیاسی —— نازک، ڈرپوک چڑیا!

قابلِ رحم چڑیا!

بیدِ مجنوں کی طرح کی ایک لرزیدہ شاخ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے اسے
رکھا تھا۔

اوہ! خدا ——

اُس کا قرب اتنا جان لیوا ہو گا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا ——

اس کو چھو کر میں کوہِ طور بن جاؤں گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اس کا ایک لمحے کا قرب مجھے کئی زندگیاں عطا کر دے گا۔ میں کب جانتا تھا۔

اے زمین و آسمان کے خدا۔

اس کے وجود کو میں کیونکر برداشت کروں گا۔

اس کے ساتھ میں کیسے زندگی بتاؤں گا۔

اسے اپنے برابر کیسے سمجھ سکوں گا؟

اور اے معبود!

اسے چھُونے کی جسارت کیونکر کروں گا؟

اس کے کورے بدن کا خمار کس آبِ زم زم کے چھینٹوں سے توڑوں گا۔

میں تو۔۔۔۔

میں تو۔۔۔۔

عاصی ہوں ——

گنہ گار ہوں ——

ڈال ڈال پہ کلیوں کا رس چوس چکا ہوں۔

بھونرے کی سیاہی اپنے ماضی پر پھیر چکا ہوں۔

میں تو۔۔۔۔

میں تو۔۔۔۔

اے خدا!

میرے اچھے خدا!

اور پھر وہ نہ مل سکی تو کیسے جی سکوں گا۔ اسے کسی اور کا بنا ہوا کب دیکھ سکوں گا۔

میری سانسیں رُک جائیں گی۔

اور اس دُنیا کے لئے میں ایک بڑی لعنت بن جاؤں گا۔

ننگِ انسانیت کہلاؤں گا۔

او خدا۔

او سچے خدا ———

میری سُن!

ان گھڑیوں کو طویل کر دے ـــ

اور مجھے اس کے اہل بنا!

مجھے.....

مجھے.....

اُس نے وہیں گھٹنوں پر اپنا سر ٹیک لیا۔ اور آنکھیں مُوند لیں۔

اس کی آنکھوں سے پانی رواں تھا۔

وہ یہ جگہ چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے ایک پھڑکتی ہوئی چڑیا کا دل
کی مُٹھی میں تھا۔

وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا رہا....

بیٹھا رہا....

حتیٰ کہ صُبحِ کاذب کے جلوے اُبھرنے لگے۔

پھر صبحِ صادق کی پالکی آ گئی...... دونوں سفید پردے اُٹھاتے ———!

جگمگ کرتی.....

پرندوں نے اس کے استقبال میں آشیانے چھوڑ دیئے۔

ہر طرف ایک نشاط آگیں چہکار امنڈ پڑی۔

ہوائیں لہرا لہرا کر اپنے لبادے پھُولوں اور کلیوں کے چہروں پر ملنے لگیں۔

کائنات جاگ اُٹھی۔

کس قدر خُوبصورت تھا۔ طلوع ہوتی ہوئی صُبح کا منظر۔

نُورانی ———

مقدس ———

اور معصُوم ———

(اور ایک چڑیا کا دھڑکتا ہوا دل)

جس کا لمس اب تک اُس کی مُٹھی میں تھا۔

اور دو نُورانی آنکھیں ———

اور دو کورے ہونٹ ———

اور یہ مخمل ایسا چکنا..... تھرّاتا جسم.....

اور صُبح کتنی حسین تھی۔

کیا نوزائیدہ صُبحیں اسی طرح حسین ہوتی ہیں۔ یا چڑیا کے دھڑکتے ہُوئے دل نے
سے اتنا دلآویز بنا دیا تھا۔

وہ وہیں بیٹھا رہا.....

بیٹھا رہا.........

کیف و سُرور کی ایک دُنیا لئے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"کیا بات ہے تمہاری آنکھیں کیوں اس قدر سُرخ ہو رہی ہیں؟" اسمٰعیل جب
سے باہر آیا تو حماد کو چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر پُوچھا۔

"اچھا۔ سُرخ ہیں؟" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کیوں بَن رہے ہو یار! سچ سچ کہو کیا بات ہے۔ رات دو دفعہ میری آنکھ
دیکھا تُم بستر پر نہیں تھے۔ میرا خیال تھا۔ تم رات گئے لوٹ آتے ہو گے۔ مگر اب یوں
رہا ہے تم ساری رات شہر نوردی کرتے رہے ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تقریبًا ایک بجے لَوٹ آیا تھا۔"

"پھر کہاں تھے۔ کیونکہ بستر پر تو میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔ میں تو اس خیال سے
کہ ہو سکتا ہے۔ تم ابھی تک لوٹے نہیں۔"

حماد کا دِل دھڑک اٹھا۔

ایسے مخلص اور آئینے کی طرح شفاف دوست سے کہہ دوں۔ سب کچھ۔ صا
صاف ——

وہ لمحے ——

وہ کیفیت ——

وہ جذب و کیف کا عالم ——

مگر۔۔۔

مگر —— وہ ایک بہن کا بھائی بھی ہے۔ صرف دوست ہی نہیں —— کہیں اُس
کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگے۔ زندگی کا یہ خواب ٹُوٹ نہ جاتے۔ اور ایک چڑیا کا دھڑکتا ہوا
ل۔ اس کی پُہنچ سے دُور نہ کر دیا جاتے۔

وہ اوپری دِل سے مُسکرایا اور بولا۔ دوست! ساری رات میں سو نہیں سکا میں۔۔
ں۔۔۔۔"

حماد نے جھجکتے جھجکتے اسمٰعیل کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں سونے کے لئے اندر آیا تھا
پھر باہر چلا گیا۔"

"کیوں۔ کچھ تکلیف تھی کیا؟ اللہ کے بندے مجھے جگا لیا ہوتا۔"

"نہیں کچھ ایسی تکلیف بھی نہیں تھی۔"

"تو کیا پریشان خواب دیکھا کئے ——" اسمٰعیل نے شوخی سے کہا۔

"خواب ہی سمجھ لو۔" حماد طرح دے گیا۔

"بھئی صاف صاف کہو۔ کوئی ایسی بات تھی تو مجھے کیوں نہ جگایا ——" اسمٰعیل
ھُ کر اس کے قریب آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"پہلے پہر تو خواب ہی دیکھا تھا اور پچھلے پہر اس خواب کے اثر نے جگائے رکھا۔ رات
ر ایک لمحے کے لئے نہیں سو سکا۔"

"یار بڑے ذکی الحس ہو۔ پہلی رات کے خواب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔" اسمٰعیل نے
ش دِلی سے کہا۔

"ایسا نہ کہو اسمٰعیل۔ ایسا نہ کہو۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دفعتاً حماد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پہلو میں کانٹا سا چبھ گیا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ سچّا خواب تھا۔"

اسمٰعیل نے جانا کہ اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے اور ابھی تک اس زیرِ اثر ہے۔

"چھوڑو یار، خوابوں کی باتیں۔ تم ذرا سونے کی کوشش کرو۔"

"میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔" حماد نے پیشانی کو ملتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں چائے کے ساتھ اسپرو لا دیتا ہوں۔ کھا کر سو جاؤ۔ اٹھنے پر طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

حماد سارا دن سوتا رہا۔

کئی بار اسمٰعیل نے اُسے جگانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے اوں آں کر کے بدل لی۔

آمنہ کو بھی آج اسکول سے چھٹی تھی۔

مگر ابھی تک حماد کے سامنے آنے کی اُس میں ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ منگوا بھیجتا وہ چھمّی کے ہاتھ بھیج دیتی۔

اسی طرح تین دن گزر گئے۔

نہ آمنہ حماد کے سامنے آسکی۔ نہ حماد دفتر جا سکا۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا اوڑھ کر سارا وقت چارپائی پر پڑا رہتا۔ جیسے اڑتے اڑتے کسی نے اس کے پر کاٹ کر اسے گرا دیا ہو۔

تیسرے دن بھی اُسے اسی "تارک الدّنیا" والی کیفیت میں دیکھ کر اسمٰعیل چڑ گیا اُنہوں نے تو طے کر کے یہ تین چھٹیاں بہت ہی پُرکیف انداز میں منانے کا پروگرام تھا۔ لیکن حماد کے صمٌ بکمٌ ہو جانے سے ساری چھٹیاں بے کیف گذری تھیں۔ آج

صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں یار! بظاہر اچھے بھلے نظر آتے ہو۔ مگر بیمار بنے پڑے ہو۔"

"بیمار بھی نہیں ہوں۔ اچھا بھی نہیں ہوں۔ ایک درمیانی کیفیّت سے دوچار ہوں۔"

"یہ تھیٹر بازی چھوڑو۔ یہاں کوئی تمہاری ایکٹنگ کی داد دینے والا نہیں ہے۔" اسمٰعیل نے مصنوعی غصّے سے کہا... پھر اس کا کمبل ایک جھٹکے سے کھینچ کر پرے پھینکتے ہوئے بولا۔

"اٹھتے ہو یا ——— کوئی اور طریقہ اختیار کروں؟"

"اچھا پہلے منّو سے کہو۔ گرم گرم کافی یا چائے بنا کر لائے۔ پھر میں اٹھوں گا۔"

وہ آمنہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا صبیح چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ سورج کی پہلی کرن سے وضو کرنا چاہتا تھا۔

وہ اتنے دنوں سے کیوں اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے دیکھے اور محسوس کئے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔

کتنی عجیب بات تھی؟

یہ تین دن اور تین راتیں ——— اس نے آمنہ کے قرب میں فنا ہو کر ——— سو کر رو کر اور کھو کر بسر کی تھیں ——— پھر بھی آج ہوش آنے پر وہ اتنی دُور تھی۔

دُور ——— دُور ——— اور پرے ———

اسمٰعیل نے باہر جا کر آمنہ کو چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

اس وقت چھمّی گھر پہ نہیں تھا۔ رابعہ اور نعیمہ سہیلیوں کے گھر پڑھنے گئی ہوئی تھیں۔

اس لئے اسے خود ہی چائے اندر پہنچانی پڑی۔ وہ چائے کا ٹرے تھامے۔ دھیرے دھیرے جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

جھکی جھکی آنکھیں چہرے پر عروسانہ کیف۔ ہونٹوں پہ بے نام سی سُرخی۔

نگاہوں میں محجوب سی لاج.....

وہ چائے رکھ جانے لگی۔ تو حماد براہِ راست اس سے مخاطب ہُوا۔

"پلیز ایک کپ ——"

وہ جانتی تھی وہ یونہی چائے رکھ کر نہ جا سکے گی۔ وہ جب بھی ان کے لئے چائے لاتی اُسے بنا کر بھی دینی پڑتی تھی۔ وہ دونوں ہی اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیئے بنا گھر سے نکلتے تھے۔ چاہے صبح کو اُسے اسکول جانے کی کتنی ہی جلدی ہوتی۔ ان کے سرہانے ایک پیالی چائے کی بنا کر وہ ضرور رکھ جاتی تھی۔

پھر آج وہ کس طرح دامن بچا سکتی تھی۔

وہ آہستہ سے قالین پر بیٹھ گئی۔ جو

جُھکی جُھکی آنکھوں سے اس نے چائے کی دو پیالیاں بنائیں۔ ایک حماد کو دے دی دوسری اسمٰعیل کو ——

حماد نے دیوار پہ نظریں جما رکھی تھیں اور پھر کھو گیا تھا۔

"ممون۔ تجھے معلوم ہے پرسوں سے حماد صاحب گم ہیں۔"

آمنہ کا دل دھڑک کر حلق تک آ گیا۔

"اچھا ——!" وہ شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔

"کہتا ہے۔ میں نے رات کے پہلے پہر ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اس کے اثر نے مجھے پھر بھی نہ سونے دیا۔ ایک رات کی نیند، یہ تین راتیں اور تین دن لے کر پوری کر رہا ہے۔"

آمنہ نے نظریں جُھکا لیں۔

اُسے وہ لافانی لمحے یاد آ گئے۔

وہ کٹھن ترین لمحے۔۔۔ جب اُس کا دل بے اختیار چاہا تھا کہ وہ حماد کے بازوؤں میں لپٹ کر اتنا روئے کہ پچھلے سارے غم دُھل جائیں۔ پھر وہ دونوں وہیں کھڑے کھڑے زمین میں سما جائیں۔ یا آسمان کی سمت اُڑ جائیں۔

کچھ ایسا ہو کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں سے اپنی الگ راہ بنا لیں۔

اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ——

باری تعالیٰ:

"میری زندگی کی ڈور راہ میں ہی کاٹ دینا۔"

بس وہ کھڑی یہی دعا مانگتی رہی۔

اور جب اُسے ہوش آیا تو وہ وہاں سے بھاگ چکی تھی۔

اپنی کوٹھڑی میں جا کر اگرچہ اس نے اپنی حالت پہ قابو پا لیا تھا۔ مگر نیند اسے بھی نہ آئی تھی۔

محبوب کا قرب بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔

یہ اسے اُس روز ہی معلوم ہوا تھا۔

اور یہ بھی کہ کیوں لوگ محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ ایک انسان کے نام پر اپنی قیمتی جان داؤ پر کیوں لگا دیتے ہیں۔

پہلے تو اسے یہ تمام احمقانہ اور بزدلانہ فعل لگا کرتے تھے۔ آخر یہ لوگ کیوں حوصلہ ہار جاتے ہیں۔

اس روز وہ لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ ہار نہیں جاتے، عشق کو انتہا پر پہنچا دیتے ہیں۔ جب معاملہ "من تو شدی" تک پہنچ جاتے تو پھر جُدائی کہاں برداشت ہو سکتی ہے۔ اور جس دل میں ایک معبود بسا ہوا اُس میں کسی بھی خوبصورت بُت کے لئے جگہ نہیں نکل سکتی۔

یہی محبت کا معاملہ ہے۔

ایک آدمی کو اپنا دین و ایمان سمجھ کر اس کے آگے اپنا مغرور سر جُھکا کر —— اور اس کے سینے پر اپنا تھکا ماندہ سر رکھ دینے کے بعد —— کسی دوسرے مرد کا تصوّر بھی حرام ہو جاتا ہے

یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا ——؟

ہو ہی نہیں سکتا ——

اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بڑا کوئی دھوکا روئے ارض پر نہیں ——
دل کسی اور کے لئے دھڑک رہا ہو۔ اور دل پہ ہاتھ کسی اور نے رکھا ہو۔
آنکھیں کسی اور کو دیوانہ وار ڈھونڈ رہی ہوں اور آنکھوں میں جھانکنے والا کوئی اور
جسم میں انگارے کسی اور نے بھرے ہوں۔ مگر جسم کا مالک کوئی اور ہو۔
نہیں۔۔۔ یہ نہ صرف خود کو دھوکہ دینا ہے، بلکہ اس دوسرے شخص کو بھی۔
اس دھوکے سے نفرت کرنے والے جان پہ کھیل جاتے ہیں۔

تو کیا تم بھی۔۔۔۔۔

اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

شاید ——

شاید کیا۔۔۔ اب تو یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ
گزار سکوں۔

اگرچہ میں اب بھی خودکشی کو ناپسند کرتی ہوں۔

مگر۔۔۔۔۔

خودکشی صرف جان پہ کھیلنے کا ہی نام تو نہیں۔

خود کو دوسری طرح بھی تو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ مرحلہ اس سے زیادہ کٹھن

لیکن اس صبح نہ وہ پریشان تھی نہ اداس۔

اُس کا ڈرپوک دل بے حد خوش تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ محبوب کے دل سے گزرنا کیا
اس صبح اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حماد سے کتنی محبت کرتی ہے اور یہ بھی کہ
کا اس پہ کتنا حق ہے۔

اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ آنکھیں موندے —— وہ حماد کے قرب کو اپنے
میں جذب کر رہی تھی۔ ابھی تک اس کے بالوں اور کپڑوں سے حماد کی چھا جانے والی

آ رہی تھی۔ اور وہ —— تو اس ایک خوشبو پر زندگی لگا دینے کو تیار تھی۔

جب باہر سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ تو وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔
اور پچھلے دروازے سے سڑک پر نکل گئی تھی پہلے بھی، کبھی کبھار وہ اسی طرح چہل قدمی کرنے کو نکل جایا کرتی تھی۔ مگر پہلے —— جس روز بھی وہ علی الصبح گھوم پھر کر واپس آتی۔ اس کا دل ہمیشہ سے زیادہ بوجھل ہو جاتا۔ اصل میں —— گھر سے باہر نکل کر اپنے اردگرد وہ جو کچھ دیکھتی اس سے اس کے حساس ذہن کو بڑی ٹھیس لگتی۔

اُن کے اِردگِرد سبھی نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ جو درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بظاہر آسودہ نظر آتے تھے۔ ان کی صاف ستھری کوٹھیاں الگ نظر آتیں۔ مگر ان چند کوٹھیوں کے ساتھ —— گندے اور بے ڈھنگے کوارٹر —— اُن پر لٹکتے ہوئے بدرنگ کے پردے —— گھر نہیں بلکہ مرغیوں کے ڈربے معلوم ہوتے تھے —— اور ان ڈربوں سے نور کے تڑکے —— تباہ حال دھواں یوں اُوپر کو اٹھتا جیسے اپنی جان کو بچا کر بھاگ رہا ہو۔ ہر گھر سے بچوں کے رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آتیں۔ کچھ غلیظ۔ اور بیمار صورتوں والے بچے صبح ہی صبح منہ لسورتے ہوئے گلیوں میں آ بیٹھتے —— ہر طرف غلاظت کے ڈھیر نظر آتے۔ اس پر "خوانچہ فروشوں" کی آوازیں ——

وہ بھی خوب جانتے تھے کہ شہر بھر کی گلی سڑی اور ناکارہ اشیائے خوردنی غالباً اسی محلے کے لوگ خریدیں گے۔ جبھی تو —— صبح ہوتے ہی —— رس، بسکٹ، مکھن اور ڈبل روٹی والا ہانک لگاتا۔ اس کے پیچھے کئی آوازیں اُبھرتیں —— ان آوازوں کو سنتے ہی میلی کچیلی بوریوں کے پردے سرکنے لگتے ——

بیس پچیس پیسے کی چیزیں خریدتے وقت وہ لوگ اتنی مرتبہ اُن کے گندے صندوق کھلواتے اور بند کرواتے کہ آمنہ کو اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگتی۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے ——

زِندگی نہیں ۔مسخرہ ہے۔

اور یہ سب لوگ مطمئن ہیں۔ کیسے مزے سے جی رہے ہیں۔ خدا سے بھی شاکی نہیں
یہ ڈرہے خدا کی خوبصورت زمین پر اسے بدنما داغ لگتے۔ جیسے خدا نے ان کے ساتھ
مذاق کیا ہو۔

اور وہ جلتی کڑھتی گھر واپس آجایا کرتی تھی۔

مگر اُس صبح جب وہ باہر نکلی تو اسے ہر شے بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے ہر
خیال کا مفہوم ہی بدل چکا ہو۔

گلیوں میں غلاظتیں بکھیرتے ہوئے بچے ——

اور آسمان کی جانب بل کھا کے دوڑتا ہوا —— راندۂ درگاہ دھواں۔

ان سب میں ایک اَن دیکھا حسن تھا۔ یہاں زندگی کی چہکار تھی۔ یہی تو اصل زندگی
اُس نے سوچا۔

ان غلیظ کوارٹروں میں، ان بوسیدہ پردوں کی اوٹ میں کتنی بے شمار زندگیاں بسیرا کیے
اور کتنے عظیم ہیں یہ لوگ۔ جو شکوہ ہونٹوں پر لائے بغیر زندگی کو گذارے چلے
رہے ہیں۔

گلی میں کھیلتا ہوا ہر نیم عریاں بچہ —— اُسے بہت پیارا لگا۔ جن بچوں کے غلیظ
چہروں اور جسموں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ان میں بھی اسے ایک معصوم سا حسن نظر آیا۔

اُس صبح بوریوں کے پردے اٹھا اٹھا کر جب بیس بیس، پچیس پچیس پیسوں کا سودا
ہونے لگا۔ تو وہ ہر گھر کے دروازے کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

یہاں زندگی برہنہ ہے۔

اِن عریاں حقائق میں گھٹن ضرور ہے مگر یہ زندگی سے متنفر تو نہیں کرتے اصلیت یہی
ہے اور باقی سب ملمع سازی ہے —— زندگی کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنا ہو تو

ان کوارٹروں کی طرف چلے آؤ۔

محلوں کی دُنیا ایک مصنوعی اور جھوٹی دُنیا ہے۔ انسان کی اپنی بنائی ہوئی دُنیا ——
مگر یہ اللہ کی بنائی ہوئی دُنیا ہے۔

اور یہ دُنیا اُس دُنیا سے زیادہ حسین ہے۔ وہ کافی دیر باہر چہل قدمی کرتی رہی تھی اور
ہر کمرہ شے میں حسن کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ کر گھر آگئی تھی۔

گھر والے جاگ چکے تھے۔ سب اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ حماد نیچے آچکا تھا۔
اس کا کسی کام میں دل نہیں لگا۔ پھر وہ چھت پر چلی گئی۔

اُسی رات والی جگہ ——

چھت سے بھی باہر کی دُنیا کا نظارہ ہوتا تھا۔ سائیکلوں والے —— ریڑھیوں والے
—— اور خوانچہ فروش —— سبھی آجا رہے تھے۔

وہ جو سائیکل پر گھنٹیاں بجاتا ہوا ایک آدمی روز آیا کرتا تھا —— اس کے میلے کچیلے ڈبے
میں چینی کے رنگ برنگے روئی کے گولے ہوتے تھے —— اور جیسے بچپن میں وہ بھی
بڑے شوق سے کھایا کرتی تھی۔ اور گولوں کو چاند کی بڑھیا کے بال کہا کرتی تھی۔ بچپن کے بعد
اس صبح کو وہ آدمی اُسے ایک خوبصورت حقیقت لگا۔ ورنہ جب بھی اُس کی گھنٹی کی آواز
سُن کر بچے پیسے مانگنے بھاگا چلا آتا تو اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔

غربت انسان کو کمینہ بھی بنا دیتی ہے۔ یہ لوگ بچوں کو دانستہ دھوکہ دیتے ہیں۔
الابلا بنا کر لے آتے ہیں اور ان معصوم فرشتوں کو اُکساتے ہیں کہ وہ ماؤں سے لڑ جھگڑ کر،
اور بعض حالات میں چُرا کر پیسے لے آئیں۔

مگر اُس روز گھنٹی کی آواز سُن کر جب بچے اس کی لے پہ دوڑے تو زمین پر اس
سے سہانا اور کوئی منظر اُسے نہیں لگا۔

اور اُس کے ساتھ ہی کھانڈ کے قوام سے رنگ برنگے طوطے، چڑیاں بنانے والا

بھی نمودار ہو گیا۔

وہ کسی مشّاق فنکار کی طرح تنکوں کی نوک پہ طوطے چڑیاں اور حقّے وغیرہ بنا
کو دینے لگا . . . . تو آمنہ سوچنے لگی۔

کتنے حقیقت آفریں بہلاوے ہیں اُن کے —— اگر غریبوں کی اس بستی ب
فروش اور بہلاوا دینے والے بھی نہ آئیں۔ تو یہ دُنیا کتنی بے رنگ ہو جائے۔

کوارٹروں میں پلنے والے بچے، چونگم، ٹافیاں اور کوکا کولا جیسی چیزیں خرید
استطاعت نہیں رکھتے —— وہ پانچ پیسے میں رُوئی کا رنگدار گولا —— اور د
میں میٹھا حقّہ لے کر مسرور ہو جاتے ہیں۔

ان کی دانست میں یہی بڑی نعمتیں ہیں۔

اور وہ کتنی غلطی پہ تھی۔

اس نے ذہنی طور پر اِن باتوں کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔

آج تسلیم کیا۔ تو ہر بات میں، اور ہر شے میں اُس کو حُسن اور حقیقت نظر آئی
اور تو اور —— اُس صبح پرانے ماڈل کے اس انجن کی چیخ میں بھی اُسے بڑا س
محسُوس ہوتی۔

اُس کا بچپن اسی محلّے میں گذرا تھا۔

یہ محلہ کیا تھا۔ شور و شر کا اچھا خاصا اڈّہ تھا۔ اس پہ طُرّہ یہ کہ ہمہ وقت انجن
اور گاڑیوں کی چھکا چھک کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

ریلوے کی اس بستی سے اگر گاڑیوں کی شنٹنگ کی آوازیں نئے و پرانے انجنوا
ریلوے ساتزن کی جگہ دو زکراہ نکال دی جاتی تو یہ بستی ایک ویرانہ معلوم ہوتی ——

اسی لئے تو ریلوے ملازمین کو یہاں بسایا گیا تھا تاکہ یہ چیخ و پکار انہیں ہا
احساس دلاتی رہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہیں۔

آمنہ کو گاڑیوں کی یہ آمد و رفت۔ اور وقفے وقفے کے بعد کی یہ کوچھک چھک بہت
ی لگتی تھی۔ خصوصاً جن دنوں اس کے امتحان ہوتے۔ وہ ان آوازوں سے عاجز آ جاتی یوں
سوس ہوتا جیسے صدیوں سے گاڑی میں بیٹھے ہیں اور ایک مسلسل سفر کئے جا رہے ہیں
اور بعض اوقات، سوتے سوتے ایسی آوازیں سنائی دیتیں جیسے کہ ٹرین چھک چھک
تی اس کے سینے پر سوار ہو گئی ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

یہ زندگی نہیں، ایک قید ہے۔ جو معیّنہ مدّت تک کاٹنی پڑے گی۔

وہ ہمیشہ دل میں کڑھا کرتی تھی۔

مگر اس روز گاڑیوں کی یہ دِل ہلا دینے والی آوازیں۔ اور انجن کی دلخراش چیخوں میں اسے
رگی رقص کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیسے انجن کی ہر چیخ ایک پُرسوز نغمہ بن گئی ہو۔

دُور —— اسٹیشن کی طرف سے دھوئیں کے مختلف رنگوں کے بادل اُٹھ رہے تھے۔

اس دُنیا پر —— اس نیلے آسمان کے تلے دھوئیں کے گہرے اور کثیف بادل چھائے
ئے تھے اور اِن بادلوں کے تلے ہزاروں نفوس تھے۔ اور اُن میں سے ایک آمنہ بھی تھی۔
جس کو دُھوئیں کے بادلوں میں محیط یہ دنیا انتہائی مجہول اور غلیظ لگا کرتی تھی۔

آج اپنی محبت کو پا کر اور اپنے محبُوب کی دھڑکنوں کو سن کر —— یہی دنیا بڑی رنگیلی،
ری اور مقدّس لگنے لگی تھی ✓

واقعی زندگی ایک حرزِ فکر ہے —— بیمار —— یا صحت مند —— یہ تو خود انسان
نحصر ہے۔ کہ اس کا اپنا نظریۂ حیات کیسا ہے۔

اگر ذہن مایوسیوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہو تو ساری دُنیا بڑی بھیانک نظر آتی ہے۔
ہ ہر میں اگر مایوسیوں کے بادل چھٹ جائیں تو جینے کو، نیا جواز مِل جاتا ہے اور یہی دُنیا
نت نظر آنے لگتی ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ اور ہر معمولی سے معمولی بات ایک
بصُورت حقیقت بن جاتی ہے اور وہ باتیں بھی ایک دم سے جی کو بھانے لگتی ہیں، جن

سے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہم نفرت کرتے ہیں۔

"تو منوں جان! تبدیلی تمہارے ذہن میں آتی ہے۔"

کوئی اگر اُسے یہ کہتا کہ تمہیں حماد کے ساتھ اس شرط پر بیاہ کرنے کی اجازت ہے، کہ تمہیں بقیہ زندگی دُھوئیں کے ان بادلوں کی چھت تلے —— انہی غلیظ کوا... میں گذارنی ہوگی تو وہ جھٹ مان جاتی —— بلکہ دل و جان سے راضی ہو جاتی۔

اس روز اس پر آگہی کے دروازے کھُل گئے تھے اور اُس کے ذہن پر ... کا مینہ برسنے لگا تھا۔

اور ان تین دِنوں میں یہ حقائق اس کے اور بھی قریب آگئے تھے۔ زِندگی ... اور زیادہ اُجلی ہوگئی تھی۔

اُس کے خیالات اور بھی نکھِر گئے تھے۔

اس کی دُنیا اور بھی سنور گئی تھی۔

مگر ——— وہ پھر حماد کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ اُ... نگاہ ملاتے ہوئے اُسے شرم آتی تھی — شرم نہیں آتی تھی۔ بلکہ خوف آتا تھا۔

حماد اس کی نس نس میں سما گیا تھا حماد اس کا قبلہ و کعبہ بن گیا تھا۔

اور وہ اپنی اس کیفیت کی شدت کو کم کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ جذبات معمول پہ آجائیں ... اس کے سامنے جانے سے سارا بھید نہ کھل جائے۔ اسے حماد کی طرف سے بھی خطرہ ...

"مجھ پر جو یہ قیامت گذر رہی ہے، اس کا کیا عالم ہوگا۔"

کہیں وہ بے قابو نہ ہو جاتے۔

کہیں وہ واقعی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔

ہائے مجھے بھی کیسے ظالم ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی سوچ کو بھٹک راہوں پہ لے آتے ہیں۔

اب ایسی باتیں ذہن سے دُور رہنی چاہئیں۔

اب میں تنہائی میں اس سے کبھی نہیں مِلوں گی۔

ہم دونوں کی سوچ انتہا پر پہنچ کر پختہ ہو گئی ہے ——— مگر زمانہ اس پختگی کو کہاں ...نتا ہے؟

اور پھر جذبات کو بار بار چھیڑنے سے کیا فائدہ ——— ؟

یوں حماد کو اس بات کا احساس دلانا بھی مقصود تھا۔ کہ اس نے اس کی جسارت کو ...وس کیا ہے۔

جسارت ہی کیا تھی —— ؟

ننھی سی ——— معصوم سی!

ذرا اُس نے آمنہ کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ اور آمنہ نے مدہوش سی ہو کر اپنا سر ... کے کاندھے پر ٹکا دیا تھا۔

بظاہر تو یہ معمولی سی بات تھی۔

مگر اس معمولی سی بات نے عرفان و آگہی کے کئی ساغر انہیں پلا دیئے اور وہ احساس ... زد سے بہت اونچے ہو گئے۔

اور ایک ایسے مقام کو پا لیا جو پہلے ان کی نظر سے پوشیدہ تھا۔

عشق میں اس مقام کو پانا بھی بہت ضروری تھا۔

اور اب اس مقام کو پا کر سنبھل جانا بھی عین مصلحت تھی۔

اسی لئے تو اُس نے خود کو نہ لعنت ملامت کی تھی اور نہ چھپائی تھی۔ بس مطمئن او... ...شار تھی۔

لیکن حماد کا سامنا اس نے جان بُوجھ کر نہیں کیا تھا۔

آج تین دنوں کے بعد اُسے دیکھا تو وہ اور بھی پیارا اور بھی اپنا لگا۔

بھلا آج کل کی لڑکیاں ایسے درویش صفت مرد کو کہاں پسند کرتی ہیں۔ بو
کپڑے۔ اُڑے ہوئے بال —— شیو بڑھی ہوئی —— گریبان کے بٹن ٹوٹے ہ
میلا کچیلا سا ——

وہ کتنا بھلا لگ رہا تھا۔

اُس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا مردانہ پن تھا۔ وہ جس حلیے میں بھی ہ
مردانہ پن اس پر طاری رہتا۔ اور یہی مردانہ پن آمنہ کو ایک احساس برتری دیتا۔ اس نے
مردوں کو کبھی پسند نہیں کیا تھا جو عورتوں کی طرح بنتے سنورتے تھے۔ بیٹھنے میں سو بار
کی کریز درست کرتے تھے۔ اور اپنے اوپر خوشبوئیں چھڑک چھڑک کر اپنی شخصیت کو م
توجہ بناتے تھے۔

مردانگی تو سات پردوں میں بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور ایسا مرد اُس نے
نہیں دیکھا تھا جو اپنے آپ سے بے نیاز ——

ایک رُوٹھا ہوا بچہ بنا بیٹھا تھا۔

کمبل اس کے اِرد گرد گھیرا ڈالے پڑا تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ وہ کوئی سادھو
دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ چائے کی پیالی پر اُس نے اس طرح نظر گاڑی
جیسے گیان دھیان میں مگن ہو کر کسی معرفت کی منزل پر جا پہنچا ہو۔

دفعتاً چپ بیٹھا حماد —— اپنی پُرسوز آواز میں گانے لگا۔۔۔۔

نمی دانم چہ منزل بُود شب جائے کہ من بُودم
بہر سُو رقصِ بسمل بُود شب جائے کہ من بُودم

اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں —— پیالی اس کے ہاتھ میں تھی۔۔۔
اس کا کانپ رہا تھا۔۔۔ چہرے پر کرب انگیز سوز تھا اور وہ اپنی گہرا
اداس، اور گھمبیر آواز میں فارسی کے یہ شعر گا رہا تھا ——

بہر سُو رقصِ بسمل بود ۔۔۔۔۔۔
بہر سُو رقصِ بسمل بود ۔۔۔۔۔

اُس پر ایک عالم طاری ہونے لگا ۔۔۔۔

پری پیکر نگارے سرو قدِ لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بُودم
سراپا آفتِ دل بود ۔۔۔۔۔
سراپا آفتِ دل بود ۔۔۔۔۔

ہر شعر کو کاٹ کر، ہر مصرعے کو توڑ کر، وہ بار بار گائے جا رہا تھا۔ ایک جنون کی سی
یت میں، گا گیا رہا تھا۔ سماں باندھ رہا تھا۔ جیسے وہ ارد گرد سے بالکل بے نیاز ہے۔

اُسے کسی کی سُدھ نہیں ہے۔

وہ کسی اور ہی مقام پر ہے۔

اسمٰعیل نے ایسے میں اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا، اس کا خیال تھا کہ وہ جب
دل کا غبار نکال نہیں لے گا، نارمل نہیں ہو گا۔ دونوں بہن بھائی خاموشی سے اس
اشعار سنتے رہے۔ وہ اتنے سوز سے گا رہا تھا کہ ان پر دھیرے دھیرے وہی عالم
ی ہونے لگا۔

یکایک وہ گاتے گاتے رونے لگا۔ پہلے اس کے رخساروں پر دھیرے دھیرے
سو گرتے رہے۔ پھر اس کا گلا رُندھ گیا۔

اُس کی آواز خود بخود بند ہو گئی۔

اُس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

اسمٰعیل اور آمنہ چونک گئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر آمنہ نے نظریں

جُھکالیں۔

اسمٰعیل تھوڑی دیر دم بخود بیٹھا رہا۔ پھر خاموشی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

اِسمٰعیل کے اس اقدام پر پہلے تو آمنہ دم بخود رہ گئی۔ پھر اپنے بھائی پر اسے پیار آ گیا۔ کتنا اعتماد کرتا تھا اسمٰعیل اس پر ——— اور کس قدر ذہین بھی تھا ——— اُس کا خیال ایسے نازک لمحوں میں آمنہ ہی حماد کی دلجوئی کر سکتی ہے۔ اور اُسے دلاسہ دے سکتی پہلے تو آمنہ بے سُدھ بیٹھی رہی۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس کا دل چاہا وہ بھی باہر نکل جائے مگر اُس نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اُسے احساس ہوا کہ ایسے میں اسے حماد کی دلجوئی کرنی چاہیئے۔

اُس نے آگے بڑھ کر حماد کے ہاتھ سے خالی پیالی لے لی۔ اور اس کے بازو ہِلا کر اُسے پکارا۔

پھر اس نے ہمت کر کے حماد کا ہاتھ میں حوصلے سے تھام لیا اور بولی۔

"میں سمجھتی تھی آپ میں مجھ سے زیادہ حوصلہ ہے۔ خدا کیلئے دِل کی باتوں کو اتنا نہ کھیجیے!"

"منوں ——" حماد نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔ آمنہ ڈر کر پیچھے ہٹنا چاہی حماد نے اپنے گرم ہاتھوں سے اُس کے دونوں ٹھنڈے پاؤں پکڑ لئے اور

"منوں! میں تیرے قرب میں فنا ہو گیا ہوں۔ میں نے تجھے پا لیا ہے۔ یہ جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی۔ اس لئے میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی ہے!"

آج حماد دفتر سے ذرا جلدی ہی آ گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھا، بڑے زور و شور سے سارے گھر کی صفائی ہو رہی ہے۔ بیگم ابراہیم شلوار کے پائنچے چڑھاتے اکھڑے ہوئے فرش دُھلوا رہی ہیں۔ اور آمنہ سنجیدہ سی شکل بنائے، میلے کچیلے تکیوں کے غلاف بدل رہی ہے۔

ڈرائنگ رُوم کا حلیہ بھی آج بدلا ہوا تھا۔ اس نے پھر وہی "سفید پوشی" اختیار کر لی تھی۔ کھانے کی میز، جو گھر کے اگلے برآمدے میں رکھ دی گئی تھی۔ اس پر بھی آج مہینوں بعد سفید براق سی چادر نظر آ رہی تھی۔ گویا سارا گھر اس غریب لڑکی کی مانند لگ رہا تھا۔ جسے دکھاوے کے لئے خوب سجایا بنایا گیا ہو۔

"خیر تو ہے۔ آج گھر میں کون آ رہا ہے؟" آمنہ جب ڈرائنگ رُوم میں نئی گدیاں رکھنے آئی تو حماد نے پوچھا۔

"آپ کو معلوم نہیں ——؟"

"نہیں۔"

"مہمان خصوصی آ رہے ہیں!"

"ہیں۔ ۔ ۔ ہیں۔ ۔ ۔ کیا کہہ رہی ہو؟" حماد کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"جناب۔ آج سکینہ آپا مع اپنے بچگان و شوہر نامدار، تشریف لا رہی ہیں۔"

"تب تو مجھے اس گھر سے غائب ہو جانا چاہیئے۔"

"نہیں آپ ان سے مل ہی لیں تو اچھا ہے۔" آمنہ نے کہا۔

عجیب اتفاق ہے۔ اب تک سکینہ اور حماد کی براہِ راست مُلاقات نہیں ہوئی دونوں کو ایک دوسرے کی شخصیت اور عادات کے متعلق کافی معلومات مل چکی تھیں۔ یہاں رہائش کے دوران جب بھی سکینہ یہاں آئی وہ دفتر میں ہوتا۔ یا کہیں باہر گیا ہوتا۔ سکینہ جیسی خواتین سے مل کر ہمیشہ کوفت ہوتی تھی۔ کیونکہ اسمٰعیل نے اس کی عادات کے متعلق حماد کو مفصل بتا دیا تھا۔ مبادا کسی روز مڈبھیڑ ہو جائے۔ اس لئے حماد کو اس سے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ وہ فطرتاً تصنع پسند اور نقلی قسم کے لوگوں سے کتراتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ اپنی انتہائی غیر محتاط عادت کی وجہ سے ضرور کوئی جنگلی پن کر بیٹھے گا۔ یا نیچی بات کہہ دے گا۔ جس سے خواہ مخواہ اُس کا اور آمنہ کا معاملہ کھٹائی میں جا پڑے گا۔

لیکن آمنہ چاہتی تھی کہ حماد اور سکینہ آپا کا سامنا ہو ہی جائے۔ کیونکہ اب امی کی کا مسئلہ زیرِ بحث آنے والا تھا۔ اگر سکینہ آپا "ویٹو" استعمال کریں تو اس کی شادی مسئلہ بن سکتی تھی۔

اُدھر کچھ دنوں سے اسمٰعیل نے بھی اشاروں کنایوں سے بیگم ابراہیم کو بتا دیا تھا کہ حماد آمنہ کا اُمیدوار ہے اور اُسے کوئی اعتراض نہیں۔ بیگم ابراہیم سمجھ کر نا سمجھ بن گئی تھیں۔ کی ناگواری کی بیّن دلیل تھی اور یہ خبر انہوں نے جھٹ سکینہ کے گوش گذار کر دی تھی۔ نے اپنا خدشہ یوں ظاہر کر دیا تھا۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی اس رذیل کو گھر میں جگہ نہ دو۔"

آج بیگم ابراہیم نے اسی خاطر سکینہ اور اُس کے شوہر کو بلایا تھا کہ وہ حماد کا امتحان لیں۔ آمنہ کو سمجھائیں۔ اور حماد سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر کریں۔ پھر اس نے رشتے پر بحث مقصود تھی۔ جو کئی مہینوں سے سکینہ کی معرفت آ رہا تھا اور سکینہ اپنے شوہر کا

لے زبردستی ساتھ لا رہی تھی تاکہ اس کو بتا سکے کہ وہ اپنے گھر کی اہم ترین فرد ہے۔ اس لئے لی کی زندگی کا فیصلہ اُس کی منشاء کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے شوہر کا نام یوں تو دلدار احمد تھا مگر وہ اپنے آپ کو ڈِکی کہلواتا تھا۔ اسے یہ بھی گلہ تھا کہ اس کی بیوی کا نام بہت "آؤٹ آف ڈیٹ" ہے اس لئے وہ اسے سیک SACK کہہ کر پکارتا تھا اور وہ بھی اپنے جُثّے سے بالکل گندم کی بھری ہوئی بوری لگتی۔

ان کے بچوں کے نام بھی کچھ ایسے تھے۔ بوبی، ٹونی، مِٹی، ٹینا اور ٹوٹو اور چھٹا جو بھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ اس کا نام سکینہ نے پہلے ہی لکی LUCKY سوچ رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بچہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔ اس کی آمد کی خبر پا کر ڈِکی نے اس سے وعدہ لیا ہے کہ "فراغت" کے بعد اسے بھی یورپ کی سیر کرانے کو لے جائے گا۔

اور آج کا سارا اہتمام کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ آمنہ کو معلوم تھا کہ یہ تیاری کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ مگر وہ اس طوفان کے انتظار میں سولی پر لٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ ہونا ہے، جلد ہو جائے۔ اس لئے وہ حماد کو مجبور کرنے لگی کہ وہ سکینہ آپا سے ضرور ملے۔

"غائبانہ اُن کی ذاتِ بابرکات کے متعلق سُن سُن کر مجھے تو اُن سے ڈر آنے لگا ہے۔" حماد نے کہا۔

"ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے بہنوئی بڑی دلچسپ شخصیت ہیں۔ دو چار سال بعد امریکہ کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ اس لئے انہیں بڑی شدت سے "امریکہ فوبیا" ہوا رہتا ہے اور ہر وہ بات بات میں اپنی امارت کا رعب ڈالتے ہیں۔ زیرِ لب ہماری غربت کا تمسخر بھی اڑاتے جاتے ہیں۔ اور دل توڑنے کے وہ مناظر بھی بڑے حسین ہوتے ہیں۔"

"اور تم لوگ سب کچھ برداشت کر لیتے ہو۔"

"نہ کریں تو اور کیا کریں۔"

"کمال ہے بھئی۔ میرا کوئی رشتے دار ایسا ہو تو میں اس کا گھر میں آنا بند کر دوں"

"ایسا کہنا آسان ہے، کرنا مشکل ہے جناب۔ اور پھر ہماری بہن کون سی کم ہے... کے لئے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ امیروں میں کیا بیاہی ہیں کہ ہم سب کے لئے اچھوت ہو گئے ہیں۔ ان کو تو یہ گھر شہر کا بدترین گھر لگتا ہے۔ اور۔۔۔"

آمنہ کی آواز بھرّا گئی۔۔۔ "اور ہم کبڑے بکوڑے ـــــ"

پھر اس نے اپنی آنکھوں کے امنڈتے دو آنسو آنکھوں کے صحرا میں ہی جذب کر لئے اور آواز کو بشاش بناتے ہوئے بولی۔

"ذرا آپ دیکھئے گا تو سہی ـــــ خدا کی قسم ـــــ بہت پُرلطف باتیں ہوں گی۔ اب مجھے ان باتوں سے اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ میں تو بلکہ لطف لیتی ہوں ـــــ اور ہاں آپ کا انٹرویو ہو جائے تو کیسا ہے ـــــ؟ غائبانہ تو انہوں نے بھی کافی کچھ سُن رکھا ہے"

"اور وہ جو میرے بخیئے ادھیڑنے لگیں تو ـــــ"

"بس اُن کی کمزوری دولت ہے، آپ اپنی فرضی فیکٹریوں اور کارخانوں کا سُنا دیں، امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"خیر یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ مجھے تو ایسے لوگوں کو اذیت دینے میں مزا آتا ہے"

"تو گویا آپ میری بات نہیں مانیں گے۔" آمنہ نے منہ بسورا۔

"اگر تمہارا مشورہ یہی ہے تو کھانے کے وقت آ جاؤں گا۔"

"اور کھانے پر اسمٰعیل بھائی بھی تو آ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے کمک مل جائے گی۔ بندۂ ناچیز حاضر ہو جائے گا"

یہ کہہ کر حماد گھر سے باہر نکل گیا۔

کھانے کی میز پر سبھی لوگ موجود تھے۔ حماد دیر سے آیا۔ اُس کا سب سے تعارف... ایک چوں چوں کرنے والی کرسی گھسیٹ کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا میز پر کئی کھانوں کے ڈش لگے ہوئے تھے۔ سکینہ حسبِ عادت ایک ایک ڈش کو چکھ کر اس کے نقص گنوا رہی تھی اور بیگم ابراہیم بوکھلاتے ہوئے انداز میں ایک ایک ڈش کا ڈھکن اتار کر بڑی انکساری سے وقار صاحب کو پیش کر رہی تھیں۔

"بٹیا! یہ مرغ روسٹ ہے کھا کر تو دیکھو۔"

"نہیں امّی جان۔ مرغ روسٹ کھا کھا کر تو طبیعت اوب گئی ہے۔"

"ارے کچھ بھی تو لو۔"

"بس جی میں نے چکھ لی ہے۔ بادی چیزیں زیادہ نہیں کھاتا۔"

"بٹیا یہ شامی کباب لو ـــــ"

"چکھا ہے یہ بھی۔ قیمے کی مناسبت سے دال زیادہ ہے اس میں۔ کیوں سبک! ہمارا اپنا خانساماں کیسے عمدہ شامی کباب بناتا ہے۔" پھر وہ بیوی کو مخاطب کر کے بولا۔

"ایک شامی کباب ہی کیا۔ وہ تمام کھانے نہایت عمدہ بناتا ہے۔ میرا تو خیال ہے! اس وقت لاہور میں اس جیسا کوئی خانساماں ہی نہیں ہے۔ پھر اُس نے آج تک رئیسوں اور نوابوں کے گھر ہی کھانا پکایا ہے۔ کبھی کسی معمولی گھرانے میں کام نہیں کیا۔"

"پھر وہ آپ کے گھر رہنے پر کیسے رضامند ہو گیا ـــــ" حماد یہ سوال پوچھنے کو مچل رہا تھا مگر اسی لمحے اُس کی نظر آمنہ سے ٹکرا گئی۔ اس کی نظروں کا مفہوم پا کر اس نے یہ فقرہ بھی نوالے کے ساتھ نگل لیا۔

سکینہ آپا ابھی تک ان رئیسوں اور نوابوں کے نام گنوا رہی تھیں۔ جن کے گھروں سے ان کا خانساماں نکل کر آیا تھا۔

"وکی بیٹا۔ فرنی تو لو ـــــ" بیگم ابراہیم پھر اپنی ڈیوٹی دینے لگیں۔

"شکریہ امّی جان! دراصل میں لنچ کے بعد صرف پھل لیا کرتا ہوں۔ اور سویٹ ڈش رات

کو ہی لیتا ہوں۔"

"اچھا تو پھل ہی منگوائے دیتی ہوں۔۔۔۔ اری نعیمہ۔۔۔۔ رابعہ — اِدھر آ"

"امی۔ آپ کو کھانے سے پہلے پھل منگوانا چاہیئے تھے۔ پتہ نہیں آپ نے طریقے اب تک کیوں نہیں بدلے۔" سکینہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

ہائے میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ ایک اکیلی جان، کیا کیا کرتی پھروں سے پہلے مجھے یاد تھا کہ پھل منگوانا ہے۔ مگر بچوں کے شور و غل میں بھول گئی۔" وہ ہوتی باہر نکل گئیں۔

"آمنہ! تم بھی کچھ کیا کرو نا۔" اس نے بیگم ابراہیم کے جانے کے بعد آمنہ کو اس گھر کا تم پر بھی کچھ حق ہے۔ اگر تم گھر کا انتظام ٹھیک نہیں رکھ سکتیں تو تمہاری فائدہ ہوا۔"

آمنہ اس کے نہایت بد تہذیب بچوں کو باری باری کھانا کھلا رہی تھی۔ با اُس نے آہستہ سے اس طرح نظریں جھکائیں جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ حماد کا خیال تھا گی۔ مگر آمنہ خاموش بیٹھی رہی۔

"پتہ نہیں تجھے ایک دم کیا ہو گیا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد تیرے پاؤ ہوتا ہے۔ امی کا ہاتھ بٹانے سے تیری شان میں تو فرق نہیں آجائے گا۔"

"بچاری آجکل عجیب سی اُلجھن میں مبتلا ہے۔ اسے کیوں کچھ کہتی ہو۔" ذکی نے طرف دیکھتے ہوئے طنزاً کہا۔

اب آمنہ کی طرح بڑا گھونٹ بھرنے کی باری حماد کی تھی۔

"امی کا ہاتھ بٹانے سے تو تمہاری شان میں فرق آیا کرتا تھا سکینہ۔" اسمٰعیل جواب خاموش بیٹھا تھا بول اٹھا "تمہیں یاد ہے۔ تم باورچی خانے کا کام اس لئے نہیں کیا کہ تمہیں اپنے لمبے ناخن ٹوٹنے اور ہاتھ کالے ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔۔۔

"اور یہ منوّں — یہ تو بالکل گھریلو قسم کی بچی ہے نا —؟" اسمٰعیل خوش دلی سے ہنسا ہے۔ سارا دن باورچی خانے میں گھسی کام کرتی ہے۔ آج کا سارا کھانا بھی اسی نے پکایا ہے۔"

اتنے میں بیگم ابراہیم پھل کے لفافے اُٹھاتے اندر آئیں۔ انہوں نے اسمٰعیل کی بات سُن لی تھی۔ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"یہ سکینہ — ہاں — اس نے تو کبھی باورچی خانے میں جھانکا ہی نہ تھا۔ اُس کے مزاج کو نفیس کام بھاتے تھے۔ گھٹیا کام اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ پھر جیسی نیت ویسی مُراد — اللہ نے آگے نوکروں سے بھرا گھر دے دیا ہے۔ اس کو کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"جبھی تو — خانساماں چھٹی پہ چلا جائے، بیگم صاحبہ سے کھانا پکانے جیسا گھٹیا کام بھی نہیں ہو سکتا۔ بچے سارا دن بھوک سے بلکتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں بھی اتنے دن ہوٹل سے کھانا پڑتا ہے۔" ذکی نے طنز سے کہا۔

"بڑے نمک حرام ہو ذکی!" سکینہ جھٹ سے بولی۔ "پچھلے مہینے جب خانساماں گیا تھا تو پورا ہفتہ تم رات کا کھانا گھر سے کھاتے رہے تھے۔ —"

"اور پورا ایک ہفتہ رات کے کھانے پر مجھے انڈوں کا آملیٹ ملتا رہا تھا۔"

اس بات پر سب سے پہلے حماد کو ہنسی آئی۔ بعد ازاں سب ہنس دیئے۔ مگر حماد کے ہنسنے پر سکینہ آپا کو بہت غصہ آیا۔

اسی میز پر اسمٰعیل اور حماد بھی بیٹھے تھے۔ مگر ایسے جیسے بھرتی کے آدمی ہوں۔ کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ آیا وہ کچھ کھا بھی رہے ہیں یا نہیں — وقار کے تو خیر یہ شایانِ شان ہی نہیں تھا کہ ان کو بلاتے۔ سکینہ کو بھی حماد پسند نہیں آیا تھا۔ کیونکہ بجائے سوٹ پہن کر آنے کے وہ کرتا شلوار پہن کر چلا آیا تھا (اور ایسا اُس نے دانستہ کیا تھا)

باقی رہ گئیں بیگم ابراہیم تو جب سے اُن کو حماد کا عندیہ معلوم ہوا تھا۔ ان کا رویہ اس کے ساتھ بڑا روکھا ہو گیا تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ واجبی سی بات کرتیں۔ آج تو انہوں نے

اس واجبی سی بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ محض اس لئے کہ سکینہ اور
واضح کر دیں کہ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتیں۔

آمنہ کو تو خیر ویسے بھی اس سارے ڈرامے میں چپ رہنا تھا۔ کیونکہ اس کا
ہی ایسا مل گیا تھا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد سب لوگ باتیں کرنے کے موڈ میں تھے، اور بیگم
طور پر اس "ٹیبل ٹاک" کی شیدائی تھی۔ یوں اس کا خیال تھا کہ سب کے سامنے
دار کر کے حماد کی پگڑی بھی اچھالی جائے گی۔ وہ لوگ ابھی باتوں کے نئے موضوع
ہی رہے تھے کہ حماد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے معذرت کا کوئی فقرہ نہیں کہا۔ بگڑ
ہوا اٹھ کر باہر نکل آیا۔ آج ڈرائنگ روم پر سکینہ آپا کے بچوں کا راج تھا۔ اس لئے
کو یہ دوپہر باہر والے برآمدے میں کاٹنی تھی۔ وہ گنگناتا ہوا ڈرائنگ روم میں گیا
اپنی کچھ ضروری چیزیں اور کتابیں اٹھا کر باہر برآمدے میں جا بیٹھے۔

سکینہ آپا کو تو اس کا اس طرح "ایکسکیوز می" EXCAUSE ME کہے بغیر اٹھ جانا
بُرا لگا تھا۔ کہنے لگیں:

"صرف تعلیم سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک آدمی اچھے ماحول میں نہ رہا ہو
محفل کے "ایٹی کیٹ" نہیں آ سکتے۔"

"ارے تم کس الجھن میں پڑ گئیں سب! وکی بھائی کو یا ہوتے۔ یہ لوگ اس
نہیں ہوتے کہ ان کے متعلق گفتگو کر کے وقت برباد کیا جائے۔"

آمنہ جانتی تھی کہ جلی کٹی کی ابتدا محض اسے سنانے کے لئے ہو رہی ہے
وہ برتن سمیٹنے کے بہانے کھڑی ہو گئی۔

"آمنہ پہلے تو جا کر ڈرائنگ روم میں ایک اور بستر لگا دے۔ وہاں تیرے وکی
آرام کریں گے۔" بیگم ابراہیم نے آمنہ کو حکم دیا۔

"جی اچھا ——" آمنہ نے تابعدار شاگرد کی طرح برتن وہیں رکھ دیئے اور باہر نکل گئی۔
وکی نے ایک صحت مند ڈکار مارا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سیک، بچوں نے سونا ہوا تو ایک اور پلنگ بچھوا لینا۔ ان کو فرش پر مت سلانا۔"
وقار نے سکینہ کی طرف دیکھ کر ایک اور برچھی پھینکی۔

"ارے۔ میرے کمرے میں بھی تو دو پلنگ بچھے ہیں۔ سکینہ بچوں کو وہاں لے جاؤ۔"
بیگم ابراہیم احساس کمتری میں دب کر بولیں۔

"نہیں جی! ہم تو چھمی کے ساتھ کھیلیں گے!" بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"نہیں —— سکینہ نے ان کو ڈانٹا۔ "یہ چھمی کا بچہ ابھی تم کو لے کر کوارٹروں کی طرف
نکل جائے گا اور تھوڑی دیر میں اُس کی طرح غلیظ شکل بنا کر اور اچھے خاصے کپڑوں کا ناس
مار کر آ جاؤ گے۔"

"سکینہ آپا! ہم باہر نہیں جائیں گے۔ کمرے میں بیٹھ کر کھیلنے دیں۔" چھمی نے لجاجت
سے کہا۔

"بکواس بند کر چھمی! اسی لئے میں بچوں کو یہاں نہیں لاتی۔ تو ایک دن میں انہیں گندی
باتیں سکھا دیتا ہے۔"

چھمی شرمندہ سا ہو کر منہ بسورنے لگا۔

مگر سکینہ کے بچوں نے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا کہ وہ سوئیں گے نہیں بلکہ کھیلیں
گے۔ سکینہ نے مجبور ہو کر ہار مان لی اور پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر انہیں دیا۔ اور
بولی۔ چھمی کو بازار بھیج کر ٹافیاں وغیرہ منگوا لو۔ اور اندر بیٹھ کر کھیلو۔"

مگر وہ پیسے پکڑتے ہی باہر کی جانب دوڑے۔ کہ ہم تو آج پتنگ ہی اُڑائیں گے۔

آمنہ جب ایک اور بستر اٹھاتے ڈرائنگ روم میں آئی تو حماد اپنی چیزیں اٹھائے
باہر نکل رہا تھا۔ اس نے دیکھا آمنہ کا چہرہ زرد تھا۔ دکھ کے سائے اس کی آنکھوں میں منڈلا

رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شہنشاہ کی عتاب زدہ کنیز ہے۔ جس نے درگور کر دیئے جانے کی خبر سُن لی ہے۔

حماد کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ اسے یہیں سے اٹھا کر کسی صبا رفتار گھوڑے پر اور کہیں روپوش ہو جائے۔

تھوڑی دیر کے لئے گھر کا ہنگامہ تھم گیا۔ سکینہ آپا اور دِرکی بھائی قیلولہ فرمانے لگے منع کرنے کے باوجود پتنگیں اور ڈور خرید لائے تھے اور اب باہر پیچ لڑا رہے تھے ہال کے ایک میلے بستر پر دراز ہو گیا تھا کیونکہ وہ رات بھر ٹرین میں جاگتا رہا تھا اس لئے ہی سو گیا تھا۔ حماد باہر برآمدے میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

چار بجے کے قریب آمنہ نے چائے بنائی۔ چونکہ سکینہ آپا اور دِرکی بھائی ابھی سو اس لئے اس نے موقع غنیمت جانا۔ اور حماد و اسمٰعیل کے لئے چائے بنا کر برآمدے لے گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اب چائے کی میز پر حماد اور سکینہ ٹکراؤ ہو۔ کیونکہ بارہا اس نے دونوں کی آنکھوں میں دیکھ لی تھیں اور اپنا انجام بھی اسے معلوم ہو گیا تھا۔

"اسمٰعیل بھائی کہاں ہیں ——؟" آمنہ نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر حماد سے پو

"اندر سو رہا تھا۔"

"میں انہیں بھی جگا لاتی ہوں۔" آمنہ جانے لگی تو حماد نے آہستہ سے پوچھا۔ شاہجہا کب جا رہی ہے؟"

"رات کے کھانے کے بعد ——" آمنہ نے آہستگی سے ہی جواب دیا۔

تو اس کا مطلب ہے۔ تم سے مفصل ملاقات کل رات ہی ہو گی۔"

"ہشش ....." آمنہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "سکینہ آپا نے ایسی کوئی بات سُ دِلآرام بن جائیں گی اور میں زندہ درگور کر دی جاؤں گی۔"

"اور کیا —— تم اپنے آپ کو زندہ سمجھتی ہو۔"

"جی —— ہوں تو زندہ مگر —— درگور ....."

"ہم اس گور کو گود بنا دیں گے۔" حماد نے مسخروں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس ت وہ آمنہ کو ہنسانا چاہتا تھا۔ آمنہ ہنستی ہوئی اندر کی طرف چلی۔ ادھر سے سکینہ آپا آ رہی تھیں۔ اُن سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟" انہوں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بابا! ہم غریبوں کی ہنسی پر پیسے تو نہیں لگتے۔" یہ کہہ کر آمنہ اسمٰعیل کے پاس پہنچ گئی۔ اور ں کا کندھا ہلا کر اسے جگانے لگی۔

سکینہ کو شک ہو گیا کہ ضرور حماد باہر بیٹھا ہو گا۔ جدھر سے آمنہ ہنستی ہوئی آ رہی تھی وہ ادھر ہی جانا چاہتی تھی۔ بہانہ کرتے ہوئے بولی "بچوں کا کچھ پتہ ہے تمہیں آمنہ کہ کس طرح ئیل رہے ہیں۔" پھر اس کا جواب سُنے بغیر باہر کی جانب جانے لگی۔

"کمبختوں سے کہا تھا باہر نکل کر غلیظ بچوں کے ساتھ مت کھیلنا، مگر ادھر آنکھ لگی، ادھر غائب ہو گئے۔ اسی لئے تو میں انہیں یہاں لاتی نہیں"..... وہ بڑبڑاتی ہوئی برآمدے آ گئیں۔ حماد بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ نہ وہ احتراماً کھڑا ہوا۔ نہ اُس نے انہیں چائے پیش بس کتاب پر نظر جمائے رکھی۔ وہ غصّے میں بل کھاتی ہوئی گیٹ تک گئیں۔ باہر جھانک رک پر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ پھر منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی واپس یں۔ واپسی پر انہوں نے دیکھا اسمٰعیل بھی حماد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ ان کے قریب ں تو اسمٰعیل نے کھڑے ہو کر کرسی پیش کی۔

"آؤ سکینہ بیٹھو۔"

وہ جلدی سے بیٹھ گئیں۔

اصل میں تو وہ یہاں بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ حماد کی قسم معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ ادی کے لئے لینا چاہتی تھیں۔ مگر وہ تو ان کے ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ بار بار طرح دے جاتا تھا۔

"چائے بناؤں تمہارے لئے؟" اسمٰعیل نے پوچھا۔

"نہیں۔ وِکی اُٹھ جائیں تو ہم اکٹھے ہی چائے پئیں گے۔ ویسے بھی ہم شام کی چائے
بجے پیتے ہیں۔"

"امراء شام کی چائے دیر سے پیتے ہیں۔" اس مرتبہ حماد نے براہِ راست گفتگو میں حصہ

"دراصل ہمارے ملک میں شام کی چائے کا تو کوئی وقت مقرر ہے نہیں۔ اور بہت
بے اصولیوں کی طرح ـــــ جب بھی جس کا دل چاہتا ہے پی لیتا ہے۔" سکینہ نے حماد کی
بالکل محسوس نہیں کیا۔

"یا ـــــ جب جس کو میسر آتی ہے پی لیتا ہے۔" حماد نے پھر کہا۔

اور ہم جیسوں کے لئے تو واقعی چائے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جب میسر آجائے
پی لیتے ہیں۔" اسمٰعیل نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں ـــــ؟" یکایک سکینہ نے ماسٹروں والا انداز اختیار کر لیا۔ گویا وہ
کی تلاش میں تھی، حماد نے ذرا سی بات کر کے وہ موقع فراہم کر دیا تھا۔

حماد اس سوال پر مسکرایا اور اسمٰعیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ
کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جواب میں حماد نے بھی اشاروں میں اسے بتا دیا کہ

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں۔

"جی۔ میں کچھ بھی نہیں کرتا۔" اس نے نہایت معصوم شکل بنا کر سکینہ آپا کی بات کا جواب

"کیا مطلب ـــــ؟"

"جی! میں نے کہا نا، میں کچھ بھی نہیں کرتا۔"

"میرا مطلب آپ کی نوکری وغیرہ سے تھا۔"

"جی۔ وہی میں نے عرض کیا نا کہ میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔"

تعجب ہے۔ پھر آپ کیا کرتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے گذر اوقات کس طرح

"جی ہاں" حماد نے اس کی بات کاٹی۔ "اسمٰعیل جیسے دوستوں کے رحم و کرم پر۔"

اچھا ـــــ" سکینہ آپا نے نفرت سے تیوریاں چڑھا لیں۔ "یہ تو عجیب بات ہے۔ آپ کو
پھر نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہیئے۔"

"کس لئے بھلا ـــــ؟"

"کل کو اگر آپ کی شادی ہو تو ـــــ"

"شادی کے لئے کیا کوئی کام کرنا ضروری ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ میری ہونے والی
بیوی کپڑے اور زیورات وغیرہ کی شوقین نہیں ہوگی۔"

"کوئی بڑی ہی احمق لڑکی ہوگی۔" انہوں نے غصے سے ہونٹ سکوڑے۔

"یہ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔" حماد کا وار کاری تھا۔

سکینہ کو طیش آگیا۔ اس گھر میں آج تک سب اُس کے حکم کے آگے سر جھکاتے آئے تھے
اور یہ معمولی سا آدمی اُس کی ہنسی اُڑا رہا تھا۔ وہ اپنی انگلیوں کی بیش قیمت انگوٹھیاں باری باری
نکال کر دوبارہ پہننے لگی (خواہ مخواہ اِس کمبخت کے منہ لگی) تھوڑی دیر ٹھہر کر بولیں۔

"بعض لوگ باتوں کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ یوں اُن کی روٹی کا سامان تو ہو ہی جاتا ہے۔
چونکہ اس دُنیا میں اسمٰعیل جیسے بے وقوف بھی ہیں۔ آپ کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں سکینہ۔" اسمٰعیل نے مداخلت کی۔ "حماد بہت بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ طبیعت درویشانہ
پائی ہے۔ اگر یہ چاہے تو ہم جیسوں کو خرید کر جیب میں رکھ لے۔"

"ہاں۔ اگر ایسی لچھے دار باتیں اس نے تم سے نہ کی ہوتیں۔ تو تم اب تک اُس کی میزبانی سے
فیضیاب نہ ہو رہے ہوتے۔"

"شکریہ دوست۔ حماد نے مسکرا کر اسمٰعیل کی طرف دیکھا۔ "تمہاری دوست نوازی میری غربت پر
پردہ نہیں ڈال سکتی۔ اور آپا کی نظروں میں میرا سب سے بڑا عیب ہی یہ ہے کہ میں غریب ہوں۔"

"خیر ـــــ مجھے کسی کی ذاتیات سے کیا۔ کوئی غریب ہے تو مجھے کیا نقصان۔ اور اگر امیر ہے

تو مجھے کیا فائدہ؟ میں تو اسمٰعیل تمہاری شادی کی بات کرنے آئی تھی۔ تم نے پھر نجیبہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی تو مجھے سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔" اسمٰعیل نے جواب دیا۔

"کب ملے گی تمہیں فرصت۔ جب لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ پچاس ہزار کا تو جہ رہے ہیں وہ لوگ۔ لڑکی کے نام گل برگ میں ایک کوٹھی بھی ہے۔ ساری زندگی عیش کرو"

"ابھی تو میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔"

"نوکری کرتے رہو گے تو ساری زندگی اسی گھر میں گذارنی پڑے گی۔"

"اس گھر کو کیا ہوا سکینہ۔؟"

"توبہ توبہ تمہیں اس گھر سے وحشت نہیں ہوتی کیا؟"

"یہ وہی گھر تو ہے جہاں تم بائیس تیئیس برس رہ کر گئی ہو۔"

"ہاں۔" وہ خجالت سے بولی۔ "تب کی اور بات ہے۔ جب آدمی کا اسٹینڈرڈ اونچا ہو جا تو اسے اپنے ماضی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دراصل جب سے میں گل برگ چلی گئی ہوں تو ایک رات بھی اس گھر میں نہیں گزار سکتی۔" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

"سکینہ وقار! میرا اسٹینڈرڈ تو ابھی بالکل اونچا نہیں ہوا۔" اسمٰعیل نے اپنا لہجہ پرسکون بنا کہا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں، نجیبہ سے شادی کر لو۔ اس دنیا میں اوپر پہنچنے کے لئے کسی کے کندھوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے ابا اپنا سارا کاروبار تمہیں سونپ دیں گے۔ دراصل داماد نہیں بیٹا چاہیئے۔ اور لڑکی میں بھی کوئی خاص عیب نہیں۔ چونکہ ایک ہی اس لئے لاڈ پیار میں پلی ہے۔ باتیں کرتے میں ذرا سا تتلاتی ہے اور اتنی ڈھیر ساری کے آگے یہ کوئی ایسا عیب نہیں جسے نقص ہی سمجھ لیا جائے۔"

حماد اور اسمٰعیل ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ پھر ا

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں کہتیں انہیں "گھر جنوائی" چاہیئے۔"

"اور گھر جنوائی بننے میں کیا برائی ہے۔ آجکل کے لڑکے تو اسے اپنی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ پیر سسرال ہو تو گھر جنوائی بننے میں بھی بڑی شان ہے۔ یہ آفر بھی تمہیں اس لئے مل رہی ہے تم میرے بھائی ہو۔ وہ لوگ میرے گھر سے بہت متاثر ہیں۔ میں نے سوچا لگے ہاتھوں تمہاری زندگی ادوں۔ ورنہ کیا اس شہر میں کھاتے پیتے لڑکوں کی کمی ہے۔"

"ابھی تو یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب سمجھ میں آئے گا آپ کو بتا دوں گا۔ فی الحال تو شادی کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہوں۔ دو چھوٹے بھائی زیرِ تعلیم ہیں۔ ایک جوان بہن کا فرض ادا کرنا ہے۔ میں تو امیر سسرال میں ٹھکانہ ڈھونڈ کر اپنی شان بنا لوں۔ ان کا بوجھ کون اٹھائے گا۔ وہ میرے خاندان کے بھی کفیل بن جائیں گے۔"

اس بات پر سکینہ آپا خاموش ہو گئیں، کیونکہ اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مگر جاتے جاتے بھی ایک نشتر چبھوتی گئیں۔

"تم دونوں بہن بھائیوں سے بات کرنا اپنا سر کھپانا ہے۔ خبر نہیں تم لوگ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ تمہارے لئے آسمان سے کوئی حور اترے گی۔ یا اس کے لئے کوئی افلاطون کا بچہ آئے گا۔" پھر حماد کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بولی۔ "مجھے تو ڈر ہے کہیں تم آمنہ کو بھی کسی ٹٹ پونجیئے سے نہ بیاہ دو۔ وہ تو خیر ہے ہی ازلی بے وقوف، اسے کیا معلوم زندگی میں سکھ چین صرف پیسے سے ہی مل سکتا ہے....." دونوں میں سے کسی نے بھی ان کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں۔

اسمٰعیل نے کچھ کھسیانہ ہو کر حماد کی طرف دیکھا، جیسے معذرت کر رہا ہو۔

"سب ٹھیک ہے۔" حماد خندہ پیشانی سے بولا۔ "سب چلتا ہے دوست! میں تو خیر بڑا ٹٹ پونجیا آدمی ہوں۔ مجھے کوئی کیا گھسائے گا۔ البتہ تمہیں اپنی بہن کی بات مان لینی چاہیئے تھی۔"

"یہ بات تم کہہ رہے ہو حماد! جیسے تم کچھ جانتے ہی نہیں....."

اسمٰعیل نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔"سات بجے مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے
تیار ہو جاؤں۔"

اسمٰعیل اندر کی طرف چلا تو حماد بھی کھڑا ہو گیا۔ بولا۔"آج میں بھی تمہارے ساتھ چلوں
اسمٰعیل!"

"کیوں ——؟"

"یونہی۔ ذرا دل بوجھل ہے۔ اسٹیشن کے نظاروں سے اسے ہلکا کریں گے۔ اور پھر
گھر پہ ٹھہرنا کچھ مناسب بھی نہیں۔"

"اچھا پھر تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

اسمٰعیل جانتا تھا کہ اس گفتگو کے بعد حماد رات کا کھانا گھر پہ نہیں کھا سکتا۔ اچھا ہی
نے دل میں سوچا۔ اتنی تلخ و ترش باتیں ہو گئی ہیں۔ اب یہ سکینہ کا سامنا نہ ہی کرے تو بہتر
اسمٰعیل کے چلے جانے کے بعد حماد اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ اُس وقت یہ گا
تھا اور تیار ہونے کے دوران اونچی آواز میں گاتے رہنا اس کی عادت تھی۔ اس کی آوا
بڑا سوز اور بڑا رس تھا۔ وہ اگر شاعر ہوتا تو اپنی آواز کے بل بوتے پر ہی مشاعرہ لوٹ لیا کرتا
گانے والوں کی ایک بُری عادت بھی تھی کہ جہاں کسی نے کہا کچھ سنا دو وہ خاموش ہو گیا۔ یا گلا
کا بہانہ کر ڈالا۔ اس لئے اسمٰعیل نے تو فرمائش کرنی چھوڑ دی تھی، لیکن حماد نے موج میں آ کر
نہیں چھوڑا تھا۔

نگاہِ فقر میں شانِ قلندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

وہ بلند آواز میں گائے چلا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ ہی اپنا کام بھی کرتا جاتا۔
سکینہ آپا اور دِدی کی بجائی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور آمنہ حسب
ان کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھی۔ انتہائی تابعدار بن کر —— کھڑکی میں سے یہ نظارہ جا

ی نظر آ رہا تھا۔ اور اس کو یہ بھی اندازہ تھا کہ اُس کی آواز باہر بھی جا رہی ہے۔ اب کے جب آمنہ
لی چیز لے کر سکینہ آپا کے نزدیک گئی تو حماد نے بلند آواز میں یہ شعر گایا۔

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟
خراج کی جو گدا ہو ————

سکینہ آپا نے ناگواری سے ناک چڑھائی اور اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولیں۔
"یہ گھر ہے یا اسٹوڈیو۔ آپ کا کسی پر کنٹرول نہیں ہے۔ ایک تو آپ نے غیر لڑکے کو گھر میں
ٹھہنے دیتی ہیں۔ اس پر ڈھٹائی یہ کہ لفنگوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہا ہے۔ شریفوں کے یہ
ڈھنگ نہیں ہوتے۔ ہماری پرواہ نہ سہی اس گھر میں ہر وقت ایک نوجوان لڑکی رہتی ہے۔
تو آپ کی غیرت کو کیا ہوا ہے امی ——؟"

بیگم ابراہیم غصے میں بھری خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن کا بس چلتا تو ابھی جا کر حماد کا گلا گھونٹ
بیٹیں۔ آج انہیں بڑی شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا (حماد کے گانے کی آواز مسلسل
رہی تھی)

آمنہ نے حالات بگڑتے دیکھے تو فوراً بچوں کو بلانے کے بہانے اندر کو لپکی۔ حماد کے
رے کے آگے سے گزرتے ہوئے اُس نے معنی خیز انداز میں اسے گھورا یعنی
خاموش رہو۔

مگر حماد مسکرا کر ذرا اور بلند آواز میں گانے لگا۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے
نگاہِ فقر میں ————

آمنہ نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ دوبارہ ادھر سے گزرتے وقت آمنہ

لیے دیکھا کہ وہ اپنا بہترین سوٹ پہنے جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اس کی سج دھج کو سکینہ آپا نے بڑا قہر دیکھا۔ وہ جب بچوں کو لے برآمدے میں گئی تو اُس نے سُنا سکینہ آپا بیگم ابراہیم سے کہہ رہی تھیں "اس کو چلتا کریں جلدی سے۔ میں اس گھر میں تب تک قدم نہیں رکھوں گی جب تک یہ رذیل یہاں ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"تم اتنی تھکی تھکی اور اُداس کیوں لگ رہی ہو منّوں؟"

"کچھ بھی تو نہیں ——؟"

آمنہ نے سر اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دو آنسو تھے۔

"دل رو رہا ہے اور مجھ سے چھپا رہی ہو۔" حماد نے پیشانی سے اُس کے بال پکڑ کر اس کا سر اُونچا کر دیا۔ اُس کے دونوں آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

ہائے......

اپنائیت بھی کیا ظالم شے ہے۔ جو دکھ ساری دُنیا کی نظروں سے چھپ جاتا ہے وہ پیار بھری ایک پُکار سے آنسوؤں پر پگھل آتا ہے۔ اس کی آواز میں اگر اتنی اپنائیت نہ ہوتی تو آنکھیں یوں چھلک کر بے آبرو نہ ہوتیں......

آمنہ انگلیوں سے اپنے آنسو اڑانے لگی۔

"اگر نہیں بتاؤ گی تو میں وہ حرکت کروں گا جو تم کو ناگوار گزرے گی۔"

آمنہ سمٹ کر پیچھے ہو گئی۔

"یونہی —— آج کام بہت زیادہ تھا۔ برتن وغیرہ دھوتی رہی ہوں۔ آپا کے ایک دن کے قیام

میں اتنا سازو سامان باہر نکل آیا تھا۔ جیسے پوری بارات آئی ہو۔ آج سارا دن وہی سب کچھ... اب تھک کر چور ہو رہی ہوں۔"

"آخر تم خود پر اتنا بوجھ کیوں ڈالتی ہو۔ مت پرواہ کیا کرو کسی کی۔ تم کوئی پتھر کی سل ہو کہ ہر وقت تم پر مصالحہ رگڑا جائے؟"

"میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ پھر بتائیں میں نہ کروں تو یہ سب کون کرے ——؟"

"اس تمہاری بہن کا یہ فتویٰ ہے کہ تم گھر میں دلچسپی نہیں لیتی ہو۔"

"یہ کہتے رہنا ان کی عادت ہے۔" آمنہ نے بے نیازی سے کہا۔

"اور سُن کر لہو کے گھونٹ پیتے رہنا تمہاری عادت ہے۔" حماد بولا۔

آمنہ ہنسی۔ "اس میں بھی ایک لذت ہے۔"

"جب تک اپنے حقوق کے لئے خود زبان نہیں کھولو گی حقیر سمجھی جاتی رہو گی۔"

"کسی کے سمجھنے سے کوئی حقیر نہیں ہو جاتا۔" آمنہ مغموم سی ہو گئی۔

"اب رونے لگ جاؤ۔" حماد چڑ گیا۔

"آج تو ...... آمنہ رک گئی۔

"کیا آج تو ——" حماد جلدی سے بولا۔

"سچ مچ بہت رونے کو جی چاہ رہا ہے۔ جانتے ہیں آپ کیا ہوا ہے۔"

"کیا ہوا ہے ——؟"

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔"

"مثلاً ——"

PSUEDO CHARACTER

"آپا جب بھی آتی ہیں میرے لئے کسی سوڈو کیرکٹر کا رشتہ لے کر آتی ہیں۔ اور پھر امی کو وہ سبز باغ دکھاتی ہیں کہ امی میرے سر ہو جاتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے تمہاری امی کو تم سے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔" حماد نے جان بوجھ کر آمنہ کو...

"نہیں یہ بات نہیں ہے —— میری امی مجھ سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں۔ آپ نے دراصل بعض وجوہ کی بنا پر اُن کو غلط سمجھا ہے۔ فطرتاً وہ بڑی معصوم اور سادہ دل ہیں۔ بس ذرا کانوں کی کچی ہیں۔ وہ اکثر اپنے دل کی بات بھی صحیح طریقہ پر نہیں سمجھا سکتیں۔ اس لئے لوگ اُن کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن تمہارے مقابلے میں وہ ہمیشہ سکینہ آپا کو ترجیح دیتی ہیں۔"

"سکینہ آپا جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی دانشور بنا کر پیش کرتی ہیں، امی کے سامنے کوئی اور نہیں جس سے اُن کا موازنہ کر سکیں۔ اسمٰعیل بھائی ویسے ہی کم گو ہیں۔ میں فی الحال کسی معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتی۔ اس لئے ان کی چل جاتی ہے۔"

"کم از کم اپنے معاملے میں تو ان کی نہ چلنے دیا کرو۔"

"اصل میں مجھے سکینہ آپا پر بھی رحم آتا ہے۔ ہمیشہ اپنی بات منوا کر انہیں حکومت کرنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ اگر کوئی ان کی ذرا سی بات پر چوں چرا کرے تو انہیں طیش آنے لگتا ہے۔"

"اُن کی اس بُری عادت کے تم لوگ ہی ذمہ دار ہو اور اب تم ہی انہیں ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

"وہ ٹھیک ہونے کی اسٹیج سے گذر چکی ہیں۔ اس اسٹیج پہ اگر ہم انھیں ٹوکیں گے تو وہ سمجھنے کی بجائے دیوانے پن پہ اُتر آئیں گی! اور اُن کے شوہر کی نظر میں ان کی یہ نام نہاد عزت بھی نہیں رہے گی۔"

"خیر —— مجھے اس سے بحث نہیں۔ یہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ تمہاری محترمہ —— درپردہ میرے حق میں انہوں نے تازہ ترین کیا فیصلہ صادر فرمایا ہے؟"

"اس مرتبہ وہ اپنی دانست میں ہمیشہ سے اچھا رشتہ لائی ہیں اور امی پہ زور دیا ہے کہ گھر کے حالات خراب ہونے سے پیشتر میرے ہاتھ پیلے کر دیں۔"

"تم سے پوچھا گیا ——"

"ہاں۔ مجھ سے بس سرسری طور پر پوچھا گیا۔ بلکہ مجھے تو محض سُنایا گیا۔"

"تم نے کچھ نہیں کہا؟"

"جب کہنے کا موقع آئے گا کہوں گی۔ آج تو امی اور سکینہ آپا اُن صاحب کا گھر دیکھنے گئے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں وہ ــــ؟"

"مجھے کون بتاتا ہے۔ سُنا ہے کوئی صاحب ابھی فرانس سے آئے ہیں کوئی بڑی ہی ڈگری لے کر ــــ"

"یہ تمہاری سکینہ آپا کے الفاظ ہیں؟"

"ہاں" دونوں کھِل کھِلا کر ہنس دیئے۔

"ہائے ری اعلیٰ تعلیم ــــ اور تمہاری سکینہ آپا کو باہر سے آتے ہوئے لوگ بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔ خواہ دوسرے ملک کی جیل سے چھوٹ کر آئے ہوں۔ کیوں نہ میں بھی کالے پانی کا ہی ایک چکر لگا آؤں۔"

"آپ چاہے ساری دُنیا گھوم آئیں۔ آپ تب بھی انہیں اچھے نہیں لگیں گے۔"

"کیوں ــ؟"

"آپ نے اُن کی شخصیت کو بُری طرح نظر انداز کیا ہے۔ نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اُن میں گستاخیاں بھی کی ہیں۔ اُن کی انا کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے اب آپ اُن کی نظروں میں نہیں سما سکتے۔"

"تم لوگ مجھے ان سے نہ ہی ملواتے تو اچھا تھا۔"

"ملوانا بھی اشد ضروری تھا۔ آپ ہی انسان بن کر ملتے۔"

"تو گویا میں بھی اپنے اوپر ملمع چڑھا لیتا۔"

آمنہ خاموش ہو گئی۔

"اب کیا کیا جائے؟" حماد نے پوچھا۔

"اب تو صرف ایک ہی علاج ہے کہ آپ ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیں۔ نہیں۔ شاید وہ معاف نہ کریں۔ کیونکہ آپ میں ایک خامی یہ ہے کہ آپ جاہل اور غریب ہونا پسند کرتے ہیں۔"

"اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو۔ تم ہی اپنی بہن سے کھُل کر بات کرو اور منت سماجت کر کے اس کو مناؤ۔"

"دُکھ تو مجھے اسی بات کا ہے کہ میری بہن نے کبھی میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تو ہر طرح اُن کا احترام کرنے کو تیار ہوں۔ آج تک ہمیشہ ہر رشتے کو کسی نہ کسی طرح ٹالا ہے۔ نہ جانے کیوں شادی کی حامی بھرتے ہوئے میرا دل گھبراتا تھا۔ جب بھی سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کرتی کہ کبھی نہ کبھی ایک نہ ایک دن تو ہاں کہنی پڑے گی۔ تو اندر سے آواز آتی نہیں نہیں۔ ابھی نہیں ــــ" اور میں انکار کرتی رہی۔ کہ ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ آج تک میرے انکار کی وجہ نہیں سمجھی جاتی رہی ــــ"

"اور اب؟" حماد نے ٹوکا۔

"اب تو میرے انکار کی وجہ سمجھی جا رہی ہے۔"

"کیا وجہ ہے؟ میں بھی تو سنوں" حماد جھک کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"جی ــ؟ جیسے آپ جانتے نہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ اس انکار کی وجہ میں اور صرف میں ہوں۔ مگر تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ میری انا کے لئے تم ذرا سی بات بھی نہیں کہہ سکتیں۔" حماد غرایا۔

"ذرا سی بات ــــ؟ جس نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔" آمنہ ہنسنے لگی۔ "جناب حماد صاحب! دست بستہ معروض آنکہ من کہ مسماۃ آمنہ ابراہیم آپ کی ذاتِ والا صفات کے سوا دنیا میں کسی بھی ابن آدم سے خواہ وہ تختِ طاؤس کا والی ہو، شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوں گی۔ والسلام۔ فقط۔ آپ کی کنیز۔"

حماد نے ایک پُر لطف قہقہہ لگایا۔ "اب ہوئی نا بات ــــ!" پھر جلدی سے بولا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"منوں خدا کے لئے کوئی ایسی ترکیب کر کہ جلد سے جلد شادی ہو جائے۔"

"اللہ اللہ۔ یہ بیٹھے بیٹھے آپ کو شادی کا دورہ کیوں پڑنے لگا۔"

"بس اب مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہوتا۔ زندگی کے کئی قیمتی سال تو پہلے ہی [illegible] چکے ہیں اب اور وقت ضائع کرنے کی تاب نہیں ہے۔"

"وقت کے ضیاع کا احساس آپ کو بندی سے ملنے کے بعد کیوں ہوا ہے۔ [illegible] رہی تھی تو پہلے شادی کر لیتے۔"

"پہلے نہ تو عمر کے گذرنے کا احساس تھا اور نہ شادی کی تمنا۔ یہ سب تیرا قصور ہے۔ [illegible] دیکھا تھا تو پرواہ نہیں تھی۔ دیکھ لیا ہے، تو صبر نہیں ہوتا۔ میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ منوں! ایک بار شادی کرا دے۔" حماد بچوں کی طرح منت کرنے لگا۔

"اور دوسری بار کیا کروں ــــ؟"

"اپنا سر . . . . ."

"جناب شادی کی درخواست تو اس طرح دے رہے ہیں۔ جیسے میں کوئی جہاں [illegible] مشاطہ ہوں۔ یا شادی بیاہ کا چلتا پھرتا دفتر . . . . . اگر آپ کو بہت جلدی ہے تو کوئی اور گھر دیکھئے۔ میں تو ــــ"

"کیا میں تو ــــ" حماد بات کاٹ کر بولا۔

"میں تو سچ پوچھئے تو میٹھا ہو کی قائل ہوں اور تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ جن کو شادی کا [illegible] ہو۔ چند دنوں میں ہی اُن کا چاؤ بھی بڑا مدھم پڑ جاتا ہے۔ پھر انہیں اپنی حماقت پر خود [illegible] ہونے لگتا ہے۔"

"گویا شادی تمہارے نزدیک حماقت ہے۔"

"میرے نزدیک جلد بازی حماقت ہے۔"

"اچھا۔ ابھی تمہارے نزدیک یہ جلد بازی ہے۔ مختصراً بتاؤ کہ تم کتنے سال کا بن [illegible]

ہی ہو مجھ سے۔"

"یہی کوئی دس بارہ سال کا۔" آمنہ نے شرارت سے منہ دوسری طرف موڑ کر کہا۔ "تاکہ مجھے [illegible] تو اپنی قدر و قیمت معلوم ہو۔ ورنہ تو بات بالکل یوں ہو جائے گی۔ جیسے آپ آئے تو میں تیار [illegible] تھی۔ آپ جیسے بیسویں صدی کے مجنوں بعد میں طعنہ بھی دیا کرتے ہیں۔"

"خدا کی قسم منوں۔ میں زندگی بھر تمہیں ایسا طعنہ نہیں دوں گا۔ اچھا آزمانے کی خاطر تو مجھ سے [illegible] شادی کیوں نہیں کر لیتی۔"

آمنہ زور سے ہنس پڑی۔

"ساون ہو یا بھادوں۔ کوئی جیئے یا مرے۔ آپ کو بس شادی کی پڑی ہوتی ہے۔ کسی بہانے سے آپ کی شادی ہو جائے۔ مجھے تو ڈر ہے۔ کہیں آپ کی یہ آرزو دھری نہ رہ جائے۔ سنا ہے شادی کے شائق لوگوں کی شادی کا معاملہ ہمیشہ کھٹائی میں پڑا رہتا ہے۔"

"تو کیا تمہیں شادی کا شوق نہیں ہے۔" حماد نے معصومیت سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

"کیوں ــــ؟" وہ حیران ہوا۔

"اس لئے کہ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی وقتِ مقررہ پر بڑے سکون سے ہو جائے۔ انتظار کی کوفت اس عرصے کو اذیت ناک نہ بنا دے۔"

اب وہ زور سے ہنسا۔ "دوسرے لفظوں میں تمہیں مجھ سے زیادہ شادی کا شوق ہے۔"

"کچھ بھی کہیں۔ اپنا اپنا طرزِ فکر ہے۔"

"منوں۔ اب تو ہی بتا۔ میں کیا کروں۔" حماد سنجیدگی سے بولا۔ "گھر کا ماحول بڑا کشیدہ ہو رہا ہے اور میں زیادہ دن یہاں کشیدگی کا سبب بن کر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ اسمٰعیل سے بات کرتا ہوں تو وہ مجھے تسلی دے کر ٹلاتا ہے۔ تم ویسے کوئی مدد نہیں کرتیں۔ کتنا اچھا ہو میرے یہاں سے جانے سے پہلے بات پکی ہو جائے۔

"بات پکّی ہو یا نہ ہو۔ آپ میری اجازت کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔" حمّا
آمنہ نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

"اور میں یہاں سے اکیلا کب جانا چاہتا ہوں۔

اگر جانا پڑا مجھ کو ——

تجھے بھی لے کے جاؤں گا

ورنہ اغوا کر کے لے جاؤں گا ——"

ابھی وہ فقرہ مکمّل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ گیٹ پہ ایک رکشہ رُکنے کی آواز آئی۔ آمنہ
سے باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔

وہ واقعی بیگم ابراہیم تھیں۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے حمّاد پر ایک نظرِ غلط انداز ڈال کر آگے بڑھ گئیں۔ اب ا
ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اس سے بہت کم گفتگو کرتیں۔ اور اس میں بھی طنز زیادہ ہو
محسوس کر کے بھی حمّاد ناسمجھ بنا رہتا۔ کھانا اگرچہ وہ برائے نام ہی کھاتا تھا مگر وہ بھی اب
ڈھنگ کا نہ ملتا۔ اُن کا خیال تھا زبان سے کچھ نہ کہنا پڑے اور یہ خود ہی یہاں سے چلا
اور اسمٰعیل بھی کوئی جھگڑا نہ کھڑا کر سکے۔ اور حمّاد نے سب سے بڑی حماقت یہ کی تھی کہ ا
بھی انہیں متاثر کرنے کی کوشش نہ کی تھی اگر وہ بھی اپنا شجرۂ نسب کھول کر ان کے سامنے
نہ مبالغہ آمیز انداز میں اپنے خاندان کی عظمت اور موروثی جائداد کا ذ
تھا۔ اُنھوں نے اگر کبھی اُس کے والدین کے بارے میں کھود کرید
تو وہ طرح دے کر ٹال گیا۔ دیکھنے میں وہ بے حد بے ڈھنگے طریقے سے رہتا تھا۔ یہ
تھا اور کہاں سے آ گیا تھا۔ انہیں تو کوئی فراڈ ہی لگتا تھا۔ اور پھر اُن کی لڑکی پہ بھی ڈورے
ڈال رہا تھا۔ اب وہ اُسے نکالنے کے درپے تھیں۔ وہ اندر آتے ہی دھم سے چارپائی
گئیں اور پاؤں اُوپر کر کے اپنے ٹخنے دبانے لگیں۔ باہر سے آمنہ یوں معصوم شکل بنا

آئی جیسے ابھی اُسے ان کی آمد کی اطلاع ملی ہو۔ آتے ہی بولی:

"بہت جلدی آ گئیں امّی آپ ——؟"

"اور کیا میں بہانے سے اُن کے گھر قیام کرنے گئی تھی؟"

اُن کا رُوئے سخن کس کی طرف ہے۔ آمنہ سمجھ گئی۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھا حمّاد مُسکرانے لگا۔

"بس گھر بار دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ ساجدہ کی موٹر میں گئی تھی۔ اُسے جلدی واپس آنا تھا میں بھی آ گئی۔ وہ تو بہت زور دے رہے تھے کہ رات کا کھانا کھا کر جائیں۔ مگر مجھے تو ایسے بغیر رشتے داری کے کسی کے گھر سے ایک وقت کا کھانا بھی بُرا لگتا ہے۔"

دوسری چوٹ پہ حمّاد پھر مُسکرایا۔

آمنہ میں آگے کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ رہا۔ باہر نکل گئی۔ بیگم ابراہیم بھی لنگڑا کر چلتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

جب آمنہ حمّاد کا کھانا لے کر اندر آئی تو بولی "کل وہ صاحب آ رہے ہیں۔"

"کس لئے؟"

"مجھے دیکھنے۔ ابھی امّی نے بتایا ہے۔"

"تو یہ خوش خبری مجھے کیوں سنا رہی ہو۔"

"تاکہ آپ تیار رہیں۔"

"کس لئے ——؟"

"رسّہ کشی کے لئے ——"

"مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"پلیز حمّاد!"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"میں چاہتی ہوں۔ جب وہ آیا بیٹھا ہو تو آپ بھی اچانک آجائیں۔"

"تمہاری امی کو بُرا لگے گا۔"

"میں سنبھال لوں گی اُن کو۔"

"پتہ نہیں کیوں بچارے کو مروا رہی ہو۔"

معاملہ سارا اس طرح طے ہو کہ میں اِس مرتبہ بُری نہ بنوں۔ سمجھے!" آمنہ نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔

"بڑی ہوشیار ہو اگرچہ معصوم لگتی ہو۔"

"صحبت کا اثر ہے ورنہ بندی کس قابل تھی؟ تو پھر آپ کل آرہے ہیں نا؟"

"کس وقت ——؟"

"وہ گیارہ بجے دن کو آئے گا۔ آپ ساڑھے گیارہ بجے تک آجائیں۔"

"اور سنو..." حماد نے پکارا۔

لیکن وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ بیگم ابراہیم اُسے پکار رہی تھیں۔ بس وہ اتنا کہہ سکی "اس وقت میں زیادہ باتیں نہیں کر سکتی۔"

"اگیا آپ کا طلبگار..."

"اب آیا ہے ——" آمنہ نے شوخی سے جواب دیا۔

"یہ طلبگار ہی نہیں آپ کا شوہر نامدار بھی..."

"خدا کے لئے چپ رہیے" آمنہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آپ کو تو کھلنے کا بہانہ چاہیے"

"صاحبزادہ کہاں ہے؟"

"اندر ڈرائنگ روم میں۔"

"اسمٰعیل آگیا ہے کیا۔؟"

"ہاں۔ بھائی جان ابھی آئے ہیں۔ اور اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"تو جانے دو۔ میں یہیں کھانا کھا لوں گا۔"

"کیوں جناب رقیب رُوسیاہ کو ملنے کا حوصلہ نہیں ہے۔" آمنہ ہنسی۔

"میں نے کہا بخش دو اس بچارے کو ——"

"خدا کے لئے مل لیجئے۔ آپ کے دیکھنے کی چیز ہے۔ اور ذرا کس بل بھی نکال لے گا۔"

"کیوں۔ کونسی قسم کا جانور ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ابھی تک سیدھا منہ کر کے بات نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ تم جاؤ۔ میں اچانک کمرے میں آجاؤں گا۔"

آمنہ چلی گئی۔

ابھی ابھی بیگم ابراہیم مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل کر باورچی خانے کی طرف گئی تھیں۔ حماد بڑی سنجیدہ سی شکل بنائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا صوفے پر ایک سالڑکا بیٹھا تھا۔ جس کے سوکھے مارے چہرے پر بڑی بڑی قلمیں تھیں اور بڑے بڑے شیشوں کی عینک اس نے لگا رکھی تھی۔ گردن اس نے یوں اکڑا رکھی تھی جیسے اس کے گرد کوئی خول ہو۔ حماد کو دیکھ کر اسمٰعیل نے تعارف کرایا۔

"اسے میرا بھائی ہی سمجھئے۔" "ہیلو۔۔۔۔۔"

حماد نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "حماد احمد" حماد نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایچ موزاِل!" اُس نے ٹھیٹھ انگریزی لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھاگئی۔

آمنہ فرش کی طرف دیکھ کر اپنی ہنسی روکنے لگی۔ وہ اس دقت سے کمرے میں آ بیٹھی تھی۔ بس ایک بار چائے رکھنے آئی تھی! اور رکھ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے آج کوئی کپڑے بھی نہیں پہنے ہوئے تھے۔ وہی لٹھے کی اسکول والی شلوار، کاٹن کی پھولدار قمیض اُوپر جالی کا سفید دوپٹہ ــــ چہرہ بھی بالکل سادہ سا تھا۔ تصنّع پسند انسان کے لئے اُس کی شکل میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔

"آپ فرانسیسی نژاد ہیں" تھوڑی دیر بعد سکوت کو توڑنے کی خاطر حماد نے پوچھا۔

"جی نہیں" وہ لڑکا مسکرایا۔ "میں تو خالص پاکستانی ہوں۔"

"میرا خیال ہے آپ کی پیدائش اور پرورش کسی بیرونی ملک میں ہوئی ہے۔"

"جی نہیں۔" وہ پھر انگریزی میں بولا۔ "آپ کو حیرت ہوگی۔ میری پیدائش تو یہیں

"پھر آپ زیادہ عرصہ اپنے ملک سے باہر رہے ہوں گے۔" حماد نے بیوقوف بنتے ہوئے پھر پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے یہ بھی غلط ہے۔" وہ طنز سے مسکرایا۔

"اچھا ــــ؟" حماد مصنوعی خجالت سے بولا۔ "اندازاً آپ کتنے عرصہ باہر رہے ہیں۔"

"یہی کوئی۔۔۔" وہ کچھ بوکھلا گیا۔ اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "کوئی چھ ماہ۔"

"او ــــ چھ ماہ ــــ خیر ــــ چھ ماہ کا عرصہ بھی خاصا طویل عرصہ ہے۔" حماد مصنوعی حیرت سے بولا۔ "آپ کے لب و لہجہ اور نشست و برخاست کو دیکھ کر تو میں یہ سمجھا تھا کہ آپ کم از کم چھ سال تو ضرور باہر رہے ہوں گے۔ آپ انگریزی بہت اچھی بول لیتے ہیں۔"

"شکریہ۔" وہ خوش ہوگیا۔

"مسٹر موسٰی۔۔۔۔ او معاف کیجئے گا۔ میں آپ کا نام شاید بھول گیا ہوں۔" حماد ذہن پر زور دینے لگا۔

"موزاِل ــــ ایچ موزاِل۔۔۔" اُس نے ایک ایک حرف کو چبا کر کہا۔

حماد اور بھی انجان بن گیا۔ اور بولا "معاف کیجئے گا۔ میں انگریزی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ آپ ذرا اپنے نام کے SPELLING بتا دیجئے۔ تو صحیح تلفظ یاد کرنے میں مجھے آسانی رہے گی۔"

وہ تمسخر آمیز انداز میں مسکرایا اور بولا "ایم، یو، زیڈ، اے، ایم، آئی، ایل"

"او ــــ میری کم فہمی دیکھئے کہ میں نے سمجھا آپ کا نام مزمّل ہے۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔" وہ شرمندگی سے بولا۔ "میرا نام ماں باپ نے تو مزمّل حسین ہی کہا تھا۔ مگر یو۔ کے میں سب لوگ مجھے موزاِل کہتے تھے۔ اور پھر موزاِل کے ساتھ حسین مجھے آؤٹ آف فیشن لگا تو میں نے اپنا نام ایچ موزاِل رکھ لیا۔"

"بڑی خوب صورت جدّت ہے بھئی۔ یہ تو آپ جیسے ذہین لوگ ہی سوچ سکتے ہیں۔" حماد جھوٹ موٹ کی تعریف کرنے لگا۔

"جی ہاں۔" اب بچے چپ بیٹھے ہوتے اسمٰعیل نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میرا خیال ہے آپ نے ابتدائی تعلیم کسی انگلش اسکول سے حاصل کی ہو گی۔" مسٹر یونہی سوال کر ڈالا۔

"نہیں جی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے یہ خالص اسلامی اسکول کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر انگریزی زبان میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ کیوں مسٹر..." حماد نے کچھ ایسے تیقن کے ساتھ مسٹر موزائل کی طرف دیکھا کہ اس بے چارے کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

"جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔" اس مرتبہ اس نے اردو میں جواب...

"بھلا کون سے اسکول میں پڑھتے تھے آپ۔؟" حماد سر کھجانے لگا۔ "ایسے لگتا ہے جیسے میں نے اسکول کے زمانے میں آپ کو دیکھا ہو۔"

"جی وہ..... دراصل..... مجھے اسکول کا نام کچھ ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔"

"تعجب ہے۔ آپ کو اسکول کا نام یاد نہیں۔ اور ہمیں اب تک اپنے اسکول کے ماسٹروں کے نام بھی یاد ہیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے آپ کو گریجویشن کیے؟"

اب مسٹر موزائل کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اگر وہ صحیح عرصہ بتاتے ہیں تو ساتھ ہی ان کی عمر بھی ظاہر ہو جاتی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ جتنے سال وہ فیل ہوتے تھے ان کا حساب چکانا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے:

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں چونی منڈی ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔"

"واللہ۔" حماد پھڑک اٹھا۔ "چونی منڈی ہائی اسکول کا تو میں پرانا طالب علم ہوں۔ میں نہ کہتا تھا کہ میں نے آپ کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔"

یہ سن کر مسٹر موزائل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔

"مگر تم تو ____"، اسمٰعیل گھبرا کر کچھ کہنے والا تھا کہ حماد نے اسے آنکھ ماری۔ یعنی بھی میں تین بار میٹرک میں فیل ہو کر تو پرانے اسکول میں نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر نکال دیا گیا اور چونی منڈی میں آ گیا۔"

"تو آپ بھی میٹرک میں فیل ہوتے رہے ہیں۔" مسٹر موزائل نے پہلی مرتبہ خوش دلی سے کہا۔

"جو آدمی میٹرک میں دو چار مرتبہ فیل نہ ہوا ہو وہ خواہ کتنا بڑا آدمی بن جائے، میں تو اس کی ذہانت پر شک ہی کرتا رہوں گا۔ مسٹر موزائل میں اندازاً کوئی سات مرتبہ میٹرک میں فیل ہوا ہوں۔ آپ کو بھی اپنے فیل ہونے یاد ہیں؟ دوسرے الفاظ میں GENIUS جینئس بننے کی تعداد یاد ہے؟"

اُس نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ باوجود گھبراہٹ کے مسٹر موزائل کو ہنسی آ گئی۔

"بس کچھ اچھی طرح یاد نہیں....." وہ کھسیانا ہو کر کافی دیر تک ہنستا رہا۔ اُسے ہنستا دیکھ کر اسمٰعیل اور آمنہ نے کب کی رکی ہوئی ہنسی کو کھل کھیلنے کی اجازت دے دی۔ سب کو ہنستا دیکھ کر مسٹر موزائل ایک بار پھر ہنس پڑا۔ اس نے سمجھا شاید حماد نے کوئی بڑی دلچسپ بات کہہ دی ہے۔

"آپ بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں۔ مسٹر حماد احمد صاحب!" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"شکریہ بہت بہت۔" حماد نے انکساری سے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ کافی ذہین آدمی ہیں۔ تعجب ہے ہم ایک اسکول میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے دوست نہ بن سکے۔"

ITS NEVER TOO LATE اُس نے خوش خلقی سے انگریزی کا پیوند لگاتے ہوئے کہا۔ "ہم اب دوست بن جاتے ہیں۔"

"آج کل آپ کا قیام کہاں ہے؟" اچانک حماد نے موضوع بدل دیا۔

"جی آج کل میں گلبرگ میں رہتا ہوں۔"

"اور وہ آپ کا چونی منڈی والا مکان کیا ہوا؟"

حماد کے اس سوال پر تو اسمٰعیل اور آمنہ بھی چونک اٹھے۔ انہیں شک سا ہونے لگا کہ یعنی

حمّاد اسے بچپن سے جانتا ہے جو ایسے بچی سوال کر رہا ہے! درموزاِل کا جواب سُن کر کا شک یقین میں بدل گیا۔

"جی۔۔۔ جی فی الحال تو خالی پڑا ہے۔۔۔۔ وہ جی —— دراصل ابھی تو خالی پڑا ہے کرائے پر چڑھ جائے گا۔" وہ بوکھلاہٹ میں بولا۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ نے یو۔ کے سے واپس آکر گلبرگ میں شفٹ کیا ہے؟"

"جی۔ یہی کوئی چار ماہ ہوئے ہیں۔"

"بہت اچھا تھا آپ کا وہ مکان۔ کیوں چھوڑ دیا آپ نے اُسے؟"

ایک لمحے کو موزاِل نے خوف زدہ ہو کر حمّاد کی طرف دیکھا۔ جیسے کوئی کسی بھوت کو دیکھتا ہے۔ پھر ذرا دھیمی آواز میں بولا۔

"مکان تو اچھا تھا۔ مگر SURROUNDINGS ٹھیک نہیں تھیں۔ بس LIFE کے لئے وہ جگہ بالکل اچھی نہیں تھی۔ STATUS MAINTAIN کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی POSH LOCALITY میں رہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔" حمّاد نے کہا۔

"مگر آپ کو میرے مکان کا علم کیسے ہو گیا؟" اچانک موزاِل نے پوچھا۔ "کیا آپ نے دیکھا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بچپن میں میں بھی جونی منڈی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس دوران میں اپنے ایک رشتہ کے چچا کے ہاں رہتا تھا۔ وہ آپ ہی کے محلے میں رہتے تھے اور آپ کے والد کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ تبھی تو میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

یہ بات سُن کر موزاِل بالکل خاموش ہو گیا۔ نہ اس نے حمّاد کے فرضی چچا کا نام پوچھا نہ ان کا کاروبار۔ شاید اُسے دھڑکا لگ گیا تھا کہ اب اُس کے باپ کا کاروبار بھی کھل جائے گا

آجائے گا۔ جو تقسیم سے پہلے غلہ منڈی میں لالہ ایشر داس آڑھتی کے پاس منشی تھے اور اب ہسپتالوں میں SUPPLY کے ٹھیکے دار تھے۔ ویسے اگر وہ حمّاد کے چچا کا نام اور کام پوچھ بھی لیتا تو حمّاد اس معاملے میں بھی اُسے طرح دے جاتا۔ کونسی بات تھی جو اُس نے اس سے اگلوا نہ لی تھی۔ حتیٰ کہ باتوں باتوں میں اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ F.B.I. کے اسکالرشپ پر یو کے گیا تھا۔ اور چھ ماہ کے قیام کے عوض اسے پانچ سال کا بونڈ لکھ کر دینا پڑا ہے۔

جب ذرا گفتگو کا زور تھما تو موزاِل نے دلچسپی سے آمنہ کی طرف دیکھا جو ہنستی ہوئی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اور براہِ راست بولا: "آپ بڑی دیر سے خاموش بیٹھی ہیں۔"

ابھی آمنہ کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ حمّاد بول اٹھا۔ "یہ ذرا اونچا سنتی ہیں۔"

"جی!" موزاِل کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔ "مگر مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔" اس سے کوئی بات نہ بنائی جا سکی۔ خود ہی بوکھلا گیا۔

"ایسی باتیں بتائی نہیں جاتیں۔" حمّاد نے سگریٹ کا کش لے کر بے نیازی سے کہا۔

اسمٰعیل کے لئے یہ لمحے بڑے کٹھن ہو گئے تھے۔ اس لئے اس نے چہرہ ہی جھکا لیا۔ جس سے مسٹر موزاِل کو شک گذرا کہ واقعی دال میں کچھ کالا ہے۔

آمنہ زیرِ لب تبسم لئے خاموش بیٹھی تھی۔ دلچسپی کا اظہار کرتی تو حمّاد کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹنے کا ڈر تھا۔ اسی وقت باہر سے بیگم ابراہیم نے آمنہ کو پکارا۔ وہ عادت کے مطابق فوراً اٹھنے لگی تھی کہ ایک دم بیٹھ گئی۔ حمّاد کی بات کو نبھانے کے لئے اُسے تو بہری بن کر دکھانا تھا۔ حمّاد تاڑ کر ——— ذرا چلّانے کے سے انداز میں بولا:

"آمنہ تمہیں خالہ جان باہر بُلا رہی ہیں۔" ساتھ ہی باہر کی طرف اشارہ بھی کیا۔

یہ سُن کر آمنہ چونکی۔ اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

موزاِل ایک دم بڑا بد دل ہو گیا تھا۔ ایک تو اسے اُن کا گھر دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی یعنی اندر سے وہ بھی اس کی طرح کھوکھلے تھے۔ وہ تو سکینہ آپا کی عالیشان کوٹھی دیکھ کر اور اُن کی

لچھے دار باتیں سُن کر سمجھ گیا تھا کہ جلد گھر بن جائے گا۔

اس پر جب اسے پتہ چلا کہ لڑکی اونچا بھی سنتی ہے تو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا
اگر لڑکی بہری نہ ہوتی تو سکینہ آپا کی خاطر ہی وہ مان جاتا۔ کم از کم سسٹر اِن لاء کا STATUS
تو تھا۔ وہ کھانے کے لیے ٹھہرنے پر بھی رضامند نہیں تھا۔ حماد اُس کی دلی کیفیت کو
تھا۔ اس لیے اسے مجبور کر کے روک لیا۔ بیگم ابراہیم حیران تھیں کہ ابھی تو وہ اس لڑکے کو
چھوڑ کر گئی تھیں۔ اب رستے کیوں تڑا رہا ہے۔

طوعاً و کرہاً اسے کھانے پر بیٹھنا پڑا۔ کھانا آج بھی بڑا پُر تکلف تھا۔ اور زیادہ کام آ
رہی تھی۔ اب آمنہ کے چہرے پر رونق تھی۔ اور وہ صبح سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔
وہ صبح والی نظروں سے اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ آمنہ بھی کھانے پر ساتھ ہی بیٹھی
ضرورت کی اشیاء پانی وغیرہ سب کو دے رہی تھی۔ موزامل کا گلاس خالی ہوا تو اُس نے
کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پانی پلیز"

پیشتر اس کے کہ وہ جگ اُٹھا کر پانی ڈالتی مسٹر موزامل کو خود ہی یاد آگیا کہ یہ اونچا
ہے۔ اس نے آمنہ کی طرف دیکھ کر اشارے سے پانی مانگا۔ اسی وقت بیگم ابراہیم کی
موزامل پر جا پڑی۔ اُس نے پہلے گلاس کی طرف اور پھر منہ کی طرف اشارہ کیا۔ بیگم ابراہیم
میں آگئیں کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ انہیں یہ آدمی بڑا بدتہذیب لگا جو پہلی ملاقات میں ہی اتنا
ہو گیا تھا کہ اشارے سے پانی مانگ رہا تھا۔

"عجیب ٹُک ہے ......" خیر وہ کھانے میں مگن ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر اس نے آمنہ کی طرف دیکھ کر اشارے سے پھلکا مانگا......

بیگم ابراہیم جزبز ہو گئیں۔

اسمٰعیل اور حماد دونوں ان کے چہرے پر کشمکش کے آثار دیکھ رہے تھے۔ مگر آمنہ

تینوں بہت سنجیدہ بنے ہوئے تھے۔ اور انہیں یہ بھی تو خطرہ تھا کہ بھانڈہ پھوٹنے پر کیسا
طوفان اُٹھے گا۔

کھانا کھانے کے بعد مسٹر موزامل نے اشارہ کر کے آمنہ سے پوچھا کہ ہاتھ کہاں دھوؤں۔

بیگم ابراہیم بالآخر بول ہی پڑیں۔

"کیا بات ہے بیٹا ——" ان کی آواز میں کافی کرختگی تھی۔

"جی ... جی ... کچھ بھی تو نہیں۔ میں اُن سے باتھ رُوم کے متعلق پوچھ رہا تھا"

اب وہ صاف تو کہنا نہیں چاہتا تھا۔ جلدی سے غسل خانے میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔

"کل تو بالکل اچھا بھلا لگ رہا تھا" بیگم ابراہیم نے اسمٰعیل کو مخاطب کر کے کہا۔

اتنے میں وہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آیا۔ اب وہ ایک پل بھی بیٹھنے کو تیار نہیں تھا اور بیگم ابراہیم
بھی اوپرے دل سے باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں سکینہ آپا کی عقل پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ جس نے اس
آدمی کو پسند کر کے بھیجا تھا۔ کل کچھ تھا۔ آج کچھ ہے۔ خدا جانے کل کلاں کو کیا بات نکلے۔ اس
لیے انہوں نے بھی اپنی روایتی خوش دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور اسے جانے کی اجازت دے
دی۔ اس نے جاتے ہوئے اسمٰعیل اور حماد سے باری باری ہاتھ ملایا۔ جیب سے اپنا کارڈ
نکال کر ازراہِ مروت حماد کو دیا۔ کہ وہ اُسے ملتا رہے۔ حماد نے بھی وعدہ کر لیا۔

اُس نے بیگم ابراہیم کو سلام کیا۔ آمنہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سلام کرنے کے لیے منہ
کھولا۔ مگر کچھ سوچ کر اسے اشارے سے سلام کر دیا۔ پھر اسمٰعیل کو مخاطب کر کے بولا۔

"بھائی اسمٰعیل! اگر بُرا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں"

"ضرور" اسمٰعیل قریب آگیا۔

"اس شہر میں کئی ای۔ این۔ ٹی اسپیشلسٹ ہیں۔ آپ لوگ لڑکی کی طرف سے بے پرواہی
برت رہے ہیں ......" معاً اسمٰعیل نے حماد کی طرف دیکھا۔ اور حماد نے زیرِ لب مسکرا کر نظریں
جھکا لیں۔ مسٹر موزامل گھبرا کر خود ہی ہکلانے لگا۔

"اگر میری مدد . . . . کی ضرورت ہو تو . . . تکلف نہ کریں۔ ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے، میں اس سے آپ کو ٹائم لے دوں گا۔ آپ کل ہی آمنہ کو اس کے پاس لے جائیں یہ کارڈ دکھا دیں۔" اُس نے ایک اور کارڈ پتلون کی جیب سے نکال کر اس پر اپنے دوست ڈاکٹر کا پتہ لکھا اور اسمٰعیل کے حوالے کیا۔ اسمٰعیل نے وہ کارڈ خاموشی سے تھام لیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس بات کے جواب میں کیا کہے۔ اور اگر کچھ کہتا تو بیگم ابراہیم کی ساری بات آجاتی۔ اس خوف سے حماد بھی چپکا کھڑا تھا۔ جیسے وہ ان کی کوئی بات نہیں سن رہا۔ آمنہ البتہ بڑا لطف لے رہی تھی۔ بلا کا معصوم اور بے نیاز چہرہ بنائے تماشا دیکھ رہی تھی۔ بیگم ابراہیم واقعی ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھیں۔ مگر جی ہی جی میں جھنجلا رہی تھیں جو ڈاکٹر اور آمنہ کا ذکر آیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ پیشتر اس کے کہ وہ مسٹر موزل کو آڑے ہاتھوں لیتیں، وہ ایک تیز سا سلام کر کے باہر کی طرف لپکا اور اپنی ود کس ویگن کو اسٹارٹ کر کے دوڑا لے گیا۔

"کم بخت پاگل کہیں کا ــــ" بیگم ابراہیم بڑبڑانے لگیں۔ "کیا بک بک کر رہا تھا؟" انہوں نے اسمٰعیل سے پوچھا۔

"پتہ نہیں امی جان . . . . ." اسمٰعیل سر کھجانے لگا۔

"کچھ تمہارے پلے پڑا حماد ــــ؟" آج عرصہ بعد انہوں نے حماد کو ملائم لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

"جب آپ نہیں سمجھ سکیں خالہ جان۔ تو ہم کیا چیز ہیں۔" حماد نے سعادت مندی سے کہا۔ آمنہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"بھائی جان! صاف صاف امی کو کیوں نہیں بتا دیتے۔"

بیگم ابراہیم کو پہلی مرتبہ آمنہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"امی جان! مسٹر موزل کا خیال ہے کہ میں بہری ہوں اور مجھے ضرور کسی اچھے ڈاکٹر سے

رجوع کرنا چاہیئے۔ اور ازراہِ عنایت وہ بھائی جان کو اپنے ایک ڈاکٹر دوست کا پتہ بھی دے گئے ہیں۔ جو اُن کی وجہ سے مجھ پر خصوصی توجہ دے گا۔ اور میرا بہرہ پن دور کر دے گا۔"

"ہائے ہائے" ـــــ بیگم ابراہیم کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ "یہ اندازہ اس بدبخت کو کیسے ہوا"

"پتہ نہیں جی۔" آمنہ نے معصومیّت سے کہا "شاید وہ کوئی بات کر رہے تھے۔ اور میں کسی اور خیال میں تھی اس لئے اُن کی بات کا جواب نہ دے سکی۔ تو انہوں نے مجھے بہرہ سمجھ لیا۔" آمنہ نے یہ کہہ کر جیسے سب کی مشکل حل کر دی۔

"یہ بھی کوئی بات ہے مردود کہیں کا۔" بیگم ابراہیم کو ایک دم طیش آگیا۔ "اسی لئے تیرے ساتھ ہر بات اشارے میں کر رہا تھا۔"

"جانے دیں امی جان"۔ اسمٰعیل نے بات کو رفع دفع کرنے کے لئے کہا۔

"مجھے تو یہ پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا لگتا ہے۔ میں نے تو کل سکینہ سے بھی کہا تھا کہ ان کے گھر کا طور طریقہ مجھے پسند نہیں آیا۔ عورتیں تو بالکل گنواریوں جیسی تھیں۔ اور اس کا باپ بھی خر خنہ لگتا تھا۔ چلو اچھّا ہوا دفعان ہو گیا۔"

وہ بڑی پژمردگی سے چارپائی پر بیٹھ گئیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنے ٹخنے دبانے لگیں۔

بقر عید آئی۔ اور یونہی روکھی پھیکی سی گذر گئی۔ ویسے بھی بقر عید کے لئے اتنے کون کرتا ہے۔ حالانکہ یہ عید تین دن کی مہمان ہوتی ہے۔ مگر لوگ پہلے دن ہی عید کا پڑھ کر اسے رخصت کر دیتے ہیں اور باقی دو دن بکروں کے "ممیانے" یا "خیر منانے" جاتے ہیں۔ گویا یہ انسانوں کی کم اور بکروں کی عید زیادہ ہوتی ہے۔

مگر اِن لوگوں کی عید تو اس لئے بے رنگ ہو گئی کہ عین عید سے ایک روز حج کے دن سکینہ آپا کے ہاں کی LUCKY پیدا ہو گیا اور بیگم ابراہیم کو گھر بار چھوڑ کر وہاں جانا پڑ گیا۔ سکینہ آپا نے بھی مناسب موقع دیکھ کر چھینک ماری تھی اور اپنی رنگ بھنگ ڈالنے والی عادت کے عین مطابق عید سے ایک روز پہلے اپنے چھٹے بچے دیا تھا۔

عید کے روز بھی اس گھر میں عید آئی نہیں لگتی تھی۔ کیونکہ بکرے کی بد دعائیں ایک عرصے سے نہیں لی تھیں۔ اس محلے میں یوں بھی ایک دو جگہ سے ہی "بکرے سنائی دیتی تھی۔ عرفی اور چھی تو علی الصبح ہی سکینہ آپا کے گھر چلے گئے تھے۔ جہاں عید دنبوں پر دوسری چھری بچے کے عقیقے کی نیت سے پھروائی گئی تھی۔ اگرچہ اُسے پیدا

دوسرا ہی دن تھا۔ مگر انہوں نے عقیقے کی دعوت کا اہتمام آج ہی کر ڈالا تھا۔ آمنہ کو بھی آج اس دعوت میں شرکت کی غرض سے وہاں جانا تھا۔

رہ گئے اسمٰعیل اور حماد ــــــ انہوں نے سوچا آج "عیاشی" کی جائے۔

چنانچہ عید الضحیٰ کے روز جب لوگ گوشت کے ڈھیر دیکھ کر اوب رہے تھے۔ اسمٰعیل اور حماد شہر کے بہترین ہوٹل میں بیٹھے مرغ روسٹ اور متنجن کھا رہے تھے۔ عید جیسے آئی تھی' ویسے ہی اپنا منہ لے کر چلی گئی اور کسی نے اس سے پھر آنے کا وعدہ بھی نہیں لیا کیونکہ ہر ایک کو پتہ تھا۔ یہ ڈھیٹ سال بھر بعد خود بخود ہی آجائے گی اور خرچہ بھی کروائیگی۔ عید ہی کیا۔ ؟ بہار کا موسم بھی یونہی دبے پاؤں نکل گیا تھا گھر کے ماحول میں ان ہی دنوں بہت زیادہ تناؤ آگیا تھا۔ کیونکہ حماد نے مسٹر موزال کے ساتھ جو شرارت کی تھی اس کا کچا چٹھا سکینہ نے بیگم ابراہیم کو سنا دیا تھا۔ انہوں نے حماد کو تو کچھ نہ کہا۔ البتہ اسمٰعیل کو بے نقط سنائی تھیں اور اسمٰعیل لے نے بھی یہ سارا الزام حجبٹ اپنے سر لے لیا۔ بولا۔ "یہ سب تو میں نے از راہ مذاق کیا تھا۔ حماد کو تو اس کا علم بھی نہیں تھا"۔

لیکن بیگم ابراہیم حماد کی طرف سے دل صاف کرنے پر بالکل رضامند نہیں تھیں۔ ایک دن انہوں نے موقع پا کر اسمٰعیل کو صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے اس مفت خورے دوست کو چلتا کرو۔ اسمٰعیل نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ کسی مناسب موقع پر وہ اس سے یہ بات کہے گا ویسے وہ چاہتا تھا اسے بھیجنے سے پہلے اپنی ماں کا دل اس کی طرف سے صاف کردے اور آمنہ سے اُس کی بات بھی پکّی کر دے۔ اس نے اپنے دل میں تو فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آمنہ کی شادی حماد سے ہی کرے گا۔ اس نے سوچا وہ اپنی اتنی مخلص اور بے ضرر بہن کے لئے آج تک کچھ نہیں کر سکا۔ کم از کم اُس کی یہ خواہش ہی پوری کر دے۔ اگر کسی دولت مند گھرانے میں اس کی بات پکّی ہو گئی تو جہیز کے لئے قرض کس سے لے گا۔ اور پھر بڑی بہن کی شادی کے معاملے میں ایک چوٹ کھا چکا تھا۔ اس لئے چاہتا تھا آمنہ کی شادی بڑے سادہ طریقے سے حماد کے

ساتھ کردی جائے۔ مگر بیگم ابراہیم اس بات پر بالکل آمادہ نہیں تھیں۔ اُن کا خیال تھا
خاندان کے متعلق کھُل کر بات نہیں کرتا۔ جانے اس میں کیا بھید ہے؟ اور پھر اپنے گھر
عرصہ رکھ کر اسے لڑکی دے دی تو خاندان میں ناک کٹ جائے گی۔ لوگ کہیں گے
بات تھی جو چھُپ چھُپاتے لڑکی اُس کے حوالے کردی۔

مگر سب سے بڑا فساد تو سکینہ آپا نے برپا کیا ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا، اگر آمنہ کی
معمولی آدمی سے ہوگئی تو سسرال میں ان کی عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہ جائے گی۔ اگر
کے بغیر شادی کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ شادی میں شامل نہ ہوں گی۔

اس گھریلو کشمکش کی وجہ سے آمنہ کچھ سہم گئی تھی — کچھ خاموش ہوگئی تھی۔ تاہم
تھا کہ اسمٰعیل کی پشت پناہی کی وجہ سے بات اسی کی پوری ہوگی۔

مگر ماحول میں جو کھنچاوٹ آگئی تھی۔ اُس کی وجہ سے وہ زیادہ وقت اپنی کوٹھری
وہیں پر کبھی کبھار چھُپ کر اسے حمّاد کا کوئی پرزہ لا دیتا۔ جسے پڑھ کر وہ کبھی ہنس دیتی اور کبھی
یوں وہ بلا ناغہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ بلکہ دیکھے بنا باہر جاتے ہی نہ تھے۔

بہار آئی تو حمّاد پر ایک دیوانگی سی چھا گئی۔

اس سے پہلے بھی اس کی زندگی میں بارہا بہار کا موسم آیا تھا۔ اور لیکن ایسے موسم اس
ہی میں گزار رہے تھے۔

مگر اب کے بہار کچھ نرالے ہی ڈھنگ سے آئی تھی۔ اب اس سے تنہا نہیں
وہ جس طرف نکل جاتا خوشبو کی لپٹیں اور خوش رنگ کلیاں اس کا دامن تھام لیتیں
روش پر نگاہ ڈالتا، وہاں اسے آمنہ ہنستی ہوئی نظر آتی۔ وہ جس پھول کی طرف دیکھتا
کا پرتو بن جاتا۔

آمنہ — آمنہ — ہر جگہ آمنہ ہی آمنہ تھی۔ کئی دفعہ وہ چلتا چلتا
اور چاروں طرف غور سے دیکھنے لگتا۔ ہزاروں کروڑوں صورتیں میں ایک صورت!

۔۔۔بسی تھی۔ مگر وہ ان ساری صورتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک طلسم بن کر ——
اور یہ شہر —— یہ خود بھی توان دنوں طلسمی ہو رہا تھا۔ یہ شہر تو ہے ہی طلسمات کا
—— حمّاد سوچتا تھا ——
ہر موسم میں یہ اپنا چولا بدل لیتا ہے۔ اور ہر چولے میں پہلے سے زیادہ دلکش معلوم ہوتا
ہے۔ سردی ہو —— گرمی ہو —— بہار ہو یا خزاں ہو —— لاہور ہر دم جوان اور
رواں دواں ہے —— اس کے ہنگامے زندہ رہتے ہیں۔ یہ زندہ دلوں کا شہر ہے
شہر جاناں متوالوں کا شہر ہے اور اس شہر نے بہار کے موسم میں اس پر عرصۂ حیات تنگ
کر دیا تھا۔

دل میں اُمنگ اور آنکھوں میں ترنگ لیئے۔ یہاں کا ہر باسی اسے رواں دواں لگتا۔
مگر وہ زندگی کی سُست رفتاری سے تنگ آگیا تھا۔
رینگنا بھی کوئی زندگی ہے۔
وہ تو تیز تر دوڑنے اور بعد ازاں ہانپنے کا عادی تھا۔ آخر لہو کو گرم رکھنے کے لیئے کوئی تو
سامان ہونا چاہیئے۔ مگر انہی دنوں اس کی زندگی کی گاڑی سُست رفتار ہو گئی تھی۔
جن دنوں سارے شہر پر بہار کا تسلط تھا، مرجھائے چہرے خود بخود کھِل اُٹھے تھے۔
۔۔۔ پر جنون طاری تھا۔

وہ لپٹنا جھپٹنا چاہتا تھا۔
زندگی کی منجمد اور پُرسکون سطح سے اسے گھِن آنے لگی تھی۔ کوئی تیزی کوئی تندی اس کے
مزاج میں سما رہی تھی۔ وہ اپنے جنون کو کم کرنے کے لیئے سڑکوں پر نکل جاتا۔ سارا دن آوارہ گردی
کرکے تھک جاتا۔ مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبوئیں سونگھ سونگھ کر اور ان کے دلکش رنگوں سے
متاثر ہو کر وہ عاجز آگیا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا وہ یہ سارے پھول نوچ ڈالے...
کیاریاں تباہ کرے۔ روشوں کو روند ڈالے... اس دنیا کو اتنا سجانے اور بنانے کی کیا

ضرورت ہے ؟ جب انسان اپنی مرضی سے اپنا گھر نہیں بنا سکتا۔ پھر نہ جانے اُ
کہ اس نے ایک اسکوٹر خرید لیا۔ وہ جو تیزی اور تندی چاہتا تھا اُس کی تسکین تو اسکو
ہو گئی۔ ذہن کے لپکتے ہوئے الاؤ بجھانے کے لئے وہ اسکوٹر اٹھاتا اور زن سے
چاہتا نکل جاتا۔ اس کو تیز تر اسکوٹر چلانے میں وہی مزہ آتا جو ایک پائلٹ کو خلا
کرتب دکھانے میں آتا ہے۔

سب دِل تھام لیتے ہیں۔

مگر وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر قلابازیاں کھاتے جاتا ہے۔

کس شان اور کس خود اعتمادی سے۔

آمنہ نے اسے کئی بار منع بھی کیا کہ وہ اتنی تیزی سے اسکوٹر نہ چلایا کرے۔
مگر وہ اُسے ہمیشہ یہی کہتا: "جو لوگ اسکوٹر پر نہ بیٹھے ہوں۔ انہیں ہمیشہ یہ تیز
لگتا ہے۔ تم ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر دیکھو۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔"

"توبہ توبہ ——" آمنہ تو اسکوٹر پر بیٹھنے کے نام سے ہی پناہ مانگتی تھی۔
لیکن حماد کی یہ بہت بڑی خواہش تھی کہ کسی روز آمنہ اس کے پیچھے بیٹھ کر سیر
اس نے تو آمنہ کو یہاں تک لالچ دیا تھا کہ جس روز وہ اس کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ گئی
ذراسی دیر کو —— تو اسی روز وہ یہ اسکوٹر بیچ دے گا۔

مگر آمنہ کو معلوم تھا اسکوٹر پہ کس طرح بیٹھنا پڑے گا۔ اس لئے وہ اس کی بات
آمادہ نہیں تھی۔ وہ تو اب حماد کے قرب سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ پھر اُسے شادی
پہلے اس طرح اُس کے ساتھ لپٹ کر بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر وہ اس طرح بیٹھ
سے پسند کرتی تھی۔ مگر ضروری تو نہیں جو باتیں پسند ہوں ان پر عمل بھی کیا جاتے
کی فضا اس قدر مکدر ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی جس سے
الجھ جائیں وہ زیادہ تر حماد سے دور ہی رہتی ——

لیکن حماد کی بہتر تو کوشش تھی کہ کسی طرح وہ آمنہ کو سکوٹر پہ بیٹھنے پر آمادہ کرلے۔ اسی
ضد کے تحت وہ چھٹی کے وقت کئی بار آمنہ کے اسکول بھی گیا۔ مگر آمنہ باہر نکل کر جب اسے
کھڑا دیکھتی تو اُلٹے پاؤں اسکول کے اندر چلی جاتی۔ اور جب تک وہ کھڑا رہتا باہر ہی نہ نکلتی
حماد تھا کہ ہر روز اسے کسی نہ کسی بہانے مجبور ضرور کرتا۔ کبھی علی الصبح اس کے اسکول جانے
سے پیشتر تیار ہو کر سڑک کے موڑ پہ کھڑا ہو جاتا۔ وہ جب بس پہ چڑھنے کے لئے وہاں سے
گزرتی تو اُسے روک لیتا۔ اور منت سماجت کرنے لگتا! اسی خاطر تو اس نے دو مور یہ پُل کی طرف
سے جانا شروع کر دیا تھا تاکہ آتے جاتے ہوئے یہ بدمزگی نہ ہو۔

ان ہی دنوں ایک اور اتفاق ہوا۔ بیگم ابراہیم نے اپنا خانیوال جانے کا سالانہ پروگرام
بنالیا۔ اصل میں اسمٰعیل کو سال میں دو مرتبہ ریلوے پاس ملا کرتا تھا۔ اب بیگم ابراہیم کا اتنا پھیلا
ہوا کنبہ تو تھا نہیں کہ کراچی یا پشاور تک ہو آتیں۔ اور نہ مالی حالت اس قابل تھی کہ اس پاس
کے آسرے پر اپنے بچوں کو کہیں سیر کرانے لے جاتیں۔ اس لئے "پاس" کو مصرف میں لانے
کے لئے وہ سال میں ایک مرتبہ خانیوال ضرور ہو آتیں۔

اور دوسرا "پاس" وہ کسی نادار سہیلی کو دے کر اُسے خرید لیتیں۔ یوں اپنے سے "چھوٹوں"
پر احسان مند رکھنا اپنی جگہ پر بڑا تسکین دہ فعل تھا۔

عزنی بقرعید کی چھٹیوں پہ گھر آیا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کی چھٹیاں بڑھوالیں اور چھوٹو
عزنی کو لے کر خانیوال سدھاریں۔

آمنہ کے اسکول میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لئے وہ بے حد مصروف تھی۔ اسمٰعیل
کی وہی مسافرانہ زندگی —— ایک رات گھر میں تو دوسری گاڑی میں۔

حماد ان دنوں کافی بور ہو رہا تھا۔ بلکہ زندگی سے ہی اکتایا ہوا تھا اس نے بھی گھر پہ
رہنا کم کر دیا۔ خصوصاً جب اسمٰعیل دورے پہ ہوتا تو وہ رات کو بھی گھر نہ آتا۔ اس لئے کہ سکینہ
نے اس کے پیچھے کافی جاسوس لگا رکھے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ضد میں آکر وہ اس

معاملے کو اور الجھائے ——— پہلے ہی باہمی کشمکش نے معاملے کو طول کر دیا تھا۔ اور اب
میں رسّہ کشی کی ہمت نہیں رہی تھی۔

جب اُسے دیوانگی کا دورہ پڑتا تو اسکوٹر اٹھا کر غیر آباد جگہوں کی طرف نکل جاتا۔

ایک روز اسمٰعیل گھر آیا ہوا تھا۔ آمنہ صبح سے ہی اسکول جا چکی تھی۔ حماد کو آج
اور آج وہ کوئی انوکھی حرکت کرنا چاہتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے اُس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اسمٰعیل سے بولا۔ "اسمٰعیل اگر تمہیں
اعتراض نہ ہو تو واپسی پر میں منّو کو اسکوٹر پہ بٹھا لاؤں۔"

اسمٰعیل نے اپنی ازلی معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور اس کی بات
کوشش کرتا رہا۔

"کیا میں نے کوئی خوفناک بات کہہ دی ہے!" حماد غرّانے لگا۔ اسمٰعیل ہنس دیا
"میں تو حیران اس لئے ہو رہا ہوں کہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں
کبھی بے اعتباری نہیں کی۔ آخر تمہارا اجازت لینے سے مطلب ———؟"

"مطلب مطلب کچھ نہیں ——— میں نے کئی بار منّو کو اسکوٹر پہ بیٹھنے کی پیش
ہے۔ مگر ہر بار وہ انکار کر دیتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار یہ بھی کہا ہے کہ میرے
کر اسکول چلی جایا کرو۔ دوپہر کو آتے ہوئے تمہیں لے بھی آیا کروں گا۔ بسوں کے د
کھاتی پھرتی ہو۔ مگر وہ اللہ کی بندی مانتی ہی نہیں۔ خبر نہیں وہ میری نیّت پہ کیوں
کرتی ہے۔"

حماد کی ساری بات سن کر اسمٰعیل پھر مسکرایا۔ "میرا خیال ہے، آمنہ تمہاری نیّ
نہیں کر سکتی۔ بڑی سیانی لڑکی ہے۔ وہ انکار محض اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر کر
تم نہیں جانتے حماد! میں اپنی بہن کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"لیکن میرا دل رکھنے کو اگر وہ ذرا سی دیر کو اسکوٹر پہ بیٹھ جاتے تو اس کے مورال

نہیں پہنچے گی۔ میں کوئی اسے اغوا کی نیّت سے تو نہیں بٹھانا چاہتا۔"

"دراصل وہ نہیں چاہتی کہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جو
ن پہ الزام بن سکتا ہو۔ ڈرپوک ہے بیچاری۔ اور پھر یہ اُس کا قصور نہیں۔ ہمارے ماحول
ن تمہیں ایسی سینکڑوں لڑکیاں مل جائیں گی۔ حالانکہ جس دن سے تم نے اسے مانگا ہے
ں نے اسے تمہارے ساتھ گھومنے اور باتیں کرنے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے" اسمٰعیل
ے اتنا کچھ کہہ کر حماد کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پھر یوں گویا ہوا:

"دوست تم جیسے کھرے شخص پر بالکل شک نہیں کیا جا سکتا۔" حماد نے ندامت سے
کھیں جھکا لیں۔

"میں تمہارا بے حد ممنون ہوں اسمٰعیل"۔ فی الواقع وہ اس وقت بڑا احسان مند نظر آ
اتھا۔ "تمہاری بلند ظرفی کا تو میں کبھی بدلہ چکا ہی نہیں سکتا۔ جس حوصلے سے تم نے مجھے گلے
یا ہے وہ صرف تمہارا ہی حصہ ہے۔ کاش۔" وہ افسردہ ہو گیا ——— "کاش میں بھی
ارے کسی کام آ سکتا۔"

"کیا یہ حماد بول رہا ہے۔؟" اسمٰعیل نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "دوستی ان باتوں سے
اتر ہوتی ہے۔ دوستی میں تو میں اپنی جان بھی دینا جائز سمجھتا ہوں۔ تم نے تو صرف میری
معصوم اور مظلوم بہن کو مانگا ہے۔"

حماد کا دل شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ اس کے جواب میں اُس سے
کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ جب آدمی حد سے زیادہ احسان مند
تا ہے۔ تو گویائی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

"بتاؤ اب میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں"۔ اسمٰعیل نے اپنے اسی مخلصانہ انداز میں کہا۔

"اسمٰعیل..." حماد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو... کہو"

"تم اگر اسے کمینگی نہ سمجھو تو۔"

"کہو حمّاد۔"

"تم ایک چِٹ پر آمنہ کو لکھ دو کہ گھر پر تم اُس کا انتظار کر رہے ہو۔ وہ فی الفور اسکوٹر پر بیٹھ کر آجائے۔ اسی صُورت میں ہی وہ بیٹھنے پر رضامند ہو سکے گی۔"

اسمٰعیل نے یہ سب کچھ اُسے ایک چِٹ پر لکھ کر دے دیا۔

حمّاد جب آمنہ کے اسکول پہنچا تو وہ بس اسٹاپ کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ تو اس کے قریب جا کر رُک گیا۔ اُس نے غصّے سے حمّاد کی طرف دیکھا تو حمّاد نے اسمٰعیل کی چِٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ چِٹ پڑھنے کے بعد بھی اُس نے بڑے مشکوک انداز میں حمّاد کو دیکھا۔

"اپنے بھائی کی رائٹنگ پہچانتی ہو نا؟" حمّاد نے کہا۔

"آپ سے کچھ بعید نہیں کہ چربہ اُتار لائے ہوں۔"

"تو پھر انکار کر دو۔"

"مگر بھائی جان خیریت سے تو ہیں۔ میرے دل میں وسوسے اُٹھ رہے ہیں۔"

"ہاں بالکل خیریت سے ہیں۔"

"میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔ اگر سب خیریت ہے تو پھر ان کا مجھے اس طرح سے مطلب۔؟"

"یہ تم اُن ہی سے چل کر پوچھ لینا۔ میں اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے کہا یہ چِٹ آمنہ کو دے دینا اُسے بھی ساتھ لیتے آنا۔"

"کو...ں میں آپ کی سازش معلوم ہوتی ہے۔"

"یہی سمجھ لو ـــــ مگر سوچ لو میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔"

اب آمنہ عجیب کشمکش میں تھی۔ نہ پاتے ماندن نہ جاتے رفتن۔ اگر اب بھی جانے سے انکار کرتی ہے تو ممکن ہے بھائی بُرا نہ مانے۔ مگر حمّاد ضرور بُرا مان جائے گا کہ مجھے اس پر اعتبار نہیں وہ حمّاد کو کیا بتاتی اور کیسے بتاتی۔ کہ اس کے جسم کو چھونے کا اُس میں حوصلہ ہی نہیں ہے۔

وہ تھوڑی دیر کھڑی اس چِٹ کو گھورتی رہی۔ . . . اور حمّاد شانِ بے نیازی سے کھڑا رہا۔

راہ گیروں نے ان پر آوازے کسنے شروع کر دیئے تو آمنہ کے لئے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ اور اُس کے سامنے دوسری بس بھی نکل گئی تھی۔ اب گھنٹہ بھر بس کے انتظار میں ٹھہرنا گویا آس پاس راہ گیروں کو مزید آوازے کسنے کی دعوت دینا تھا۔

سو وہ بڑی بے بسی سے لپک کر اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔

حمّاد فتحمندی سے مُسکرایا۔ اور ایک شوخ سی دُھن سیٹی پر بجاتا ہوا اسکوٹر پر سوار ہو گیا۔ اور اسکوٹر اسٹارٹ کر دیا۔

تھوڑی دور جانے پر آمنہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ گھر کی جانب نہیں جا رہا تھا۔

آج پھر آمنہ نے اُس کی نیّت پر شبہ کیا اور دل ہی دل میں کھولنے لگی۔ اس کے بھائی کی لکھی ہوئی چِٹ ابھی تک اس کی مٹھی میں تھی اور وہ اسکوٹر پر اس طرح سکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی جیسے چھلانگ لگانے کا ارادہ ہو۔ اس نے حمّاد کے پہلو سے لگ کر اس کی کمر میں بازو حمائل نہیں کئے ہوئے تھے۔ بلکہ نیچے سے اس کی گدّی کو پکڑا ہوا تھا۔ ہر موڑ پر اُسے خود احساس ہوتا کہ وہ گر جائے گی۔ مگر وہ اسی طرح تن کر بیٹھی رہی۔ دو ایک بار اُس نے حمّاد سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ مگر کچھ تو اسکوٹر کا شور اور کچھ حمّاد نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

دو ایک بار تیزی سے موڑ مڑتے ہوئے اسکوٹر کو اس طرح دھکا لگا کہ وہ واقعی گرتے گرتے بچی۔ اس کا جسم ڈولتے ہوئے حمّاد سے ٹکرایا۔ حمّاد چاہتا تو اسکوٹر آہستہ کر کے اُس کی مدد کر سکتا تھا۔ یا کم سے کم تکلف کی اس دیوار کو ضرور توڑ سکتا تھا۔ مگر وہ تو مغرور فاتح

بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اسکوٹر بھگاتے چلا جا رہا تھا۔ جیسے اس
کوئی ڈرپوک لڑکی نہیں بلکہ ایک گٹھڑی رکھی ہوئی ہے۔ جو لڑھک بھی جائے تو کوئی غم
یہ سب باتیں محسوس کر کے آمنہ کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی۔ کہ کیوں
عرصہ انکار کرتے رہنے کے بعد آج وہ اس کے اسکوٹر پر سوار ہو گئی جو صریحاً اس کو نیچا دکھا
اس نے سارا غصہ اپنے بھائی پر نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ جس نے اُسے خواہ مخواہ چیٹ
دی تھی۔

اُس کے خیالات سے کوسوں دُور حماد پر ایک ہی دُھن سوار تھی۔

"دیکھتا ہوں کب تک یوں الگ تھلگ تن کر بیٹھتی ہے۔"

اسکوٹر سڑکوں پہ تیز تیز بھاگتا جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے کئی سڑکیں آئیں اور
گئیں۔

جب وہ مال روڈ پر پہنچے تو آمنہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مال روڈ پر اس
گویا اشتہار بن جانا تھا۔ اگر کسی واقف کار نے دیکھ لیا تو ساری زندگی کے زہد و تقوے پ
پھر جائے گی! وہ چور بنی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اور وہی ہوا ——

نظر آیا بھی تو کون —— ؟

سکینہ آپا ——

سکینہ آپا اپنی موٹر میں مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ ٹریفک رُک جانے کی وجہ
حماد کا اسکوٹر دوسری طرف رکا ہوا تھا۔ جونہی سکینہ آپا کی موٹر آ کر رُکی ان کی سمت کا ر
ہو گیا۔ سو یہ زن سے ان کی موٹر کے قریب سے گزر گئے۔ انہیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا
تو نہ مل سکا۔ مگر اس ایک جھلک نے انہیں کافی مشکوک کر دیا۔ کیونکہ وہ گردن موڑ کر کافی
انہیں پہچاننے کی کوشش کرتی رہیں۔ البتہ حماد نے ان سب کو —— اچھی طرح

ا اور ذرا آگے جا کر بلند آواز سے آمنہ کو بتایا بھی تھا کہ تمہاری بہن جا رہی ہے۔ مسٹر موزامل
ی ساتھ ہے۔

آمنہ کی رُوح تو پہلے ہی فنا ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر اس بات نے پوری کر دی۔
ہات اس کے مقدر میں یہ حادثہ بھی لکھا تھا۔ بھلا کچھ اور ہو جاتا تو —— اپنی بے گناہی
ر بے بسی کے تصور سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس وقت اسے حماد بھی بُرا لگ
تھا۔ آخر اسے حالات کی نزاکت کا احساس کیوں نہیں ہے۔

اب حماد نہر کے پُل پہ آ گیا تھا۔ اور اس سمت مڑتے ہی اس کا اسکوٹر اور بھی تیز ہو گیا تھا۔
سڑک کے دونوں جانب اُگے ہوئے وہ درخت جو کچھ دن پہلے شعلے برسا رہے تھے
بار جھانے شروع ہو گئے تھے۔ بہار کے قدم یہاں بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ اور ان لرزتے سسکتے
ل کو آمنہ انتہائی خوف سے دیکھ رہی تھی۔ نہر کے کنارے سیر کرنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا مگر
ر کے کنارے مرنے کا اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

حماد کا اسکوٹر تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

اب وہ لوگ وحدت کالونی میں پہنچ چکے تھے۔

یہاں سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ اس لئے حماد کا جس طرف دل چاہتا اُدھر نکل جاتا۔ اسکوٹر گویا
دائیں بائیں کر رہا تھا۔ آمنہ کی اوڑھنی ہوا میں لہراتا ہوا جھنڈا بنی ہوئی تھی۔ اس کا ایک کونا اُس
نے دانتوں میں پکڑ رکھا تھا۔ ورنہ وہ اب تک کسی اور پہ ضرور سایہ فگن ہو چکی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے گدی کا نچلا حصہ پکڑا ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنا توازن
برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ حماد اسکوٹر کو جھٹکے بھی لگا رہا تھا۔

"اگر یہ مجھے مارنے پر تُلا ہے تو یونہی سہی۔"

آمنہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے رُخساروں پر موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔
بند آنکھوں میں اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ساری دُنیا ایک قیامت خیز شور کے

ساتھ گھوم رہی ہے۔

اور وہ کہاں ہے؟

اُسے کچھ معلوم نہیں۔

دفعتاً ایک زور کا دھچکا لگا۔ وہ گرنے لگی تو لاشعوری طور پر اُس نے حماد کو شانے سے پکڑتے ہی وہ کچھ محفوظ سی ہوگئی۔

اور پھر اُس کے جی میں آئی کہ اگر مرنا ہی ہے تو اس ظالم کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر جاؤں۔ پہلے اُس نے حماد کا ایک ہی شانہ پکڑ رکھا تھا۔ دوسرا دھکا لگنے پر اس نے دوسرا شانہ پکڑ لیا۔

اب حماد اسے چھاؤنی کی طرف لے جا رہا تھا۔

کسی طرح اس کا ہاتھ نیچے کھسک آیا اور اس نے کمر پہ سے حماد کی قمیض پکڑ لی۔ چھاؤنی کی ایک کشادہ سڑک پہ آکر حماد کا اسکوٹر پھر تیز ہوگیا۔ اب شانہ ... کر بھی وہ محفوظ نہ رہ سکتی تھی۔

اس نے چلا چلا کر حماد کو پکارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر اُس کے تو جیسے کان بہرے ہو چکے تھے۔

آمنہ کو یقین ہوگیا کہ آج حماد خودکشی کے ارادے سے نکلا ہے اور ساتھ اسے بھی غرق کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں تو حادثے کا ہو جانا عین ممکن تھا۔

بسیں۔ موٹریں۔ رکشا۔ سائیکلیں سبھی کچھ تو سڑکوں پر چل رہا تھا۔ کتنے ... بال بال بچے تھے۔ اس کے زرخیز ذہن نے اس پریشانی میں بھی دُور کی کوڑیاں ... کر دیں۔

یعنی ۔ ۔ ۔ ۔

کل اخباروں میں کچھ ایسی خبریں آئیں گی:

"ایک لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو رہی تھی کہ ان کا سکوٹر ٹرک کی زد میں آگیا۔"

یا ——

"لڑکا عرصے سے اُن کے گھر میں رہتا تھا ایک دن موقع پاکر اُسے ۔ ۔ ۔ "

یا ——

"دونوں والدین سے چوری پکنک منانے جا رہے تھے ۔ ۔ ۔ " وغیرہ وغیرہ ——

آخر اخبار والوں نے تو "اسٹوری" بنانی ہی ہوگی۔

گھر میں کیسا کہرام مچے گا —— لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔ کیسے کیسے الزام اُس کی باعصمت جوانی پہ آئیں گے۔ اس کو کون رد کرے گا؟

سب اُس کے کرتوتوں کو روئیں گے۔

اچھا ۔ ۔ ۔ اب تو جو قسمت میں لکھا ہے۔ ہوگا۔

اگر اس طرح موت لکھی ہے تو کون ٹال سکتا ہے! آخر اس آدمی نے کسی نہ کسی طور تو اسے ختم کرنا ہی تھا۔ یونہی سہی ۔ ۔ ۔ ۔

تھک ہار کر اس نے اپنا سر حماد کی پُشت پہ ٹکا دیا۔ اور اپنے دونوں بازو اُس کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

جب مرنا ہی ہے تو سکون سے کیوں نہ مروں؟ اور جاتے جاتے اُس کی حسرت بھی پوری کرتی جاؤں ۔ ۔ ۔ !

اُس نے حماد کے گرد ہالہ کیا بنایا، گویا حماد کی بھڑکتی ہوئی رُوح کو قرار آگیا۔ اسکوٹر بتدریج آہستہ ہونا شروع ہوگیا۔ حماد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آمنہ کے کانوں میں بھی آواز آرہی تھی اور اُس کے ٹھنڈے ہاتھ بھی اس بے قرار دل کی دھک دھک محسوس کر رہے تھے۔

آمنہ کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا اور حماد کا رُواں رُواں کان بن گیا تھا۔ جانے

کس کا دل کس کے پیکر میں دھڑک رہا تھا . . . دونوں بے خودُ سے بیٹھے تھے
جیسے ایک غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر خودُ بخودُ آہستہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہ جانے
کتنی دُور نکل آتے تھے۔ دونوں ہی پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ پیاس کے مارے
آمنہ کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ لیکن اب اُس نے خود کو حمّاد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا
لئے خاموش بیٹھی رہی۔

آبادی سے دُور۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس چائے اور کوکا کولا کا ایک
وہیں پر حمّاد نے اسکوٹر روک لیا۔ دونوں نیچے اُتر آئے۔ آمنہ کے کانوں میں شائیں شائیں
تھی اور اس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
سفر کر کے لوٹی ہے یا پیراشوٹ کے ذریعے زمین پر اُتر رہی ہے۔ اس کا سارا جسم
تھا عجیب بے تکی حالت ہو رہی تھی۔ حمّاد جب کھوکھے سے کوکا کولا لینے گیا تو آمنہ
اُدھر نظر دوڑائی۔ سامنے ذرا فاصلے پر گھاس کا ایک خالی قطعہ دیکھ کر اس طرف چل دی
دیر کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اطمینان سے جا کر گھاس پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ جو
چکرا رہا تھا۔ حمّاد دو بوتلیں اٹھائے اُسی طرف آگیا۔

اُس نے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اُسے بلایا۔ مگر وہ ٹس سے مس
وہ سامنے آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بوتلیں اُس نے گھاس پر رکھ دیں۔ ابھی
نہ پایا تھا کہ آمنہ نے سر اٹھایا اور بولی:

"آپ نے میری فاتحہ پڑھ لی ہو تو واپس چلیں۔"

حمّاد کھسیانا ہو کر ہنس پڑا۔

"معافی . . . معافی . . . معافی!" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان
کہا۔

"پتہ نہیں آپ کو مجھ سے کس جنم کا بدلہ لینا تھا۔" آمنہ کی آواز میں آنسوؤں کی

میری توبہ جو میں آئندہ ایسی حرکت کروں۔" حمّاد مسخروں کی مانند ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ بوتلیں
ں نے گھاس پر رکھ دیں۔
"اچھا ہوتا اگر کوئی حادثہ ہو جاتا۔ یا میں اڑ کر دُور جا گرتی اور کسی ٹرک کے نیچے آ جاتی۔ زندگی بھر
کے لئے سبق تو حاصل ہو جاتا آپ کو۔"
کوشش تو میں نے بھی بھرپور کی تھی کہ دونوں ایک ساتھ جاں بحق ہو جائیں۔ مگر تم جانتی ہو
قط کے اس دَور میں عاشقوں کو ایک ساتھ موت بھی نہیں آتی۔ ایک ــــ بہرحال شادی
جانے کے لئے بچ جاتا ہے۔"
آمنہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کے سر کے بال بکھر گئے تھے۔ چُٹیا میں سے
کل کر ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ رنگ اس کا زرد ہو رہا تھا اور وہ غصّے
سے تنی بیٹھی تھی۔
"خدا کے لئے اپنا حُلیہ ٹھیک کرو۔ مجھے تم سے ڈر لگ رہا ہے۔" حمّاد شرارت کے
موڈ میں تھا۔
آمنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اپنا دوپٹہ کھول کر سر اور شانوں کے گرد لپیٹ لیا۔
"لو ٹھنڈا پانی پیو۔ ابھی تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔ پیاس سے تمہارے ہونٹ خشک
ہو رہے ہیں۔" اس نے بوتل آمنہ کی طرف بڑھائی۔
اگرچہ آمنہ کو بہت پیاس لگ رہی تھی۔ مگر وہ مارے غصّے کے ضبط کئے بیٹھی تھی۔ ایک
دم کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "آپ کو خیر کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ مگر مجھے ابھی اپنی زندگی اس گھر
میں شریفانہ طور پر گذارنی ہے۔ آپ کو نہیں جانا تو میں ٹیکسی میں چلی جاتی ہوں۔" اس نے
قدم اٹھائے تو حمّاد نے لپک کر اُس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔
"منوں . . . منوں . . . خدا کے لئے خفا ہو کر نہ جاؤ۔ کیوں لوگوں کو ڈرامہ دکھاتی
ہو؟"

"آپ کو معلوم ہے ہم لوگ تین گھنٹوں سے آوارہ گردی کر رہے ہیں۔" آمنہ نے گھو... کر کہا۔

"مجھے سب پتہ ہے۔ تو ذرا میری بات سُن۔ ورنہ میں تجھے زبردستی روک لوں گا... یہ سب لوگ . . . ."

آمنہ جلدی سے بیٹھ گئی۔

"منّوں" حمّاد نے اپنی اسی گہری آواز میں پکارا۔ جس میں صرف پیار ہی پیار تھا ہی خلوص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا وار خالی نہ جائے گا۔

"منّوں خدا کے لئے مجھے معاف کردے۔ میں تیرا گنہ گار ضرور ہوں۔ مگر میں دل... ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔"

"مجبوری کا لفظ صرف عورت کو زیب دیتا ہے۔" آمنہ ویسے ہی تنی ہوئی تھی۔

"منّوں تو پھر تُو نے پہلے ہی کیوں نہ پکڑ لیا تھا۔ میں تجھے سیدھا گھر لے جاتا۔ یہ تو اسی لئے ہوا نا کہ تُو نے غیریت برتی۔"

آمنہ نے نظر اٹھا کر حمّاد کی طرف دیکھا۔ حمّاد کی نظر اُس کی نظر سے ملی تو اس نے ... احمقانہ سی شکل بنالی۔ اور سرتاپا مظلوم بچّہ بن کر بیٹھ گیا۔ آمنہ کو ہنسی آگئی۔ مگر اُس نے ہنسی روک لی۔

"لے تو پہلے پانی پی لے" حمّاد نے اسے ہنستے دیکھ کر بوتل اس کی طرف بڑھائی... آمنہ نے بوتل پکڑ لی۔ وہ اسے ڈرا دھمکا سکتی تھی۔ مگر اُس سے خفا ہونے کا... اُس میں نہ تھا۔ اور پھر وہ جانتی تھی کہ بعض معاملات میں وہ بے تُکی اور غیر ذمہ دارانہ ... کرنے کا عادی ہے۔ ان حرکتوں کی اصلاح شادی کے بعد تو ہو سکتی تھی۔ مگر شادی ... پہلے انہیں صرف برداشت کیا جا سکتا تھا۔

"اور اگر میں بھی ان باتوں کو نہ سمجھوں تو کون سمجھے گا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچ کر نظر انداز...

اُس نے بوتل اٹھائی اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔

"آپ کو معلوم ہے سکینہ آپا نے دیکھ لیا تھا۔"

"ہاں۔" حمّاد بولا۔ "اور ان کے ساتھ تمہارا خواستگار مسٹر موٹا ایل بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اُمید ہے اُس کی عینک کی زد میں تم نہ آئی ہو گی۔"

"اب آپ نتائج کے لئے تیار ہو جائیں۔" آمنہ نے بوتل خالی کر کے میز پر رکھ دی۔ "ابھی وہ پہلا قصّہ ہی کسی کو نہیں بھُولا۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اسمٰعیل کو سمجھا دوں گا۔"

"اور اگر آج بھائی جان بھی بدظن ہو گئے تو۔"

"نہیں۔ اسمٰعیل سے ایسی اُمید نہیں ہے۔ مگر تُو میرے ساتھ بیٹھنے سے کیوں کتراتی ہے۔ اگر پہلے مان گئی ہوتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔"

آمنہ پھر کھڑی ہو گئی۔

"خدا کے لئے چلئے چار بج رہے ہیں۔ کسی کی نرمی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔"

آمنہ جا کر سکوٹر کے پاس کھڑی ہو گئی۔

حمّاد بوتلیں واپس دے کر آیا تو بولا۔ انسان بن کر بیٹھو گی تو سیدھا گھر لے جاؤں گا۔ ورنہ یونہی اشتہار بنا سارے لاہور میں گھومتا پھروں گا۔"

میرا تو خیال تھا کہ میں اس طرح بیٹھی تو آپ سکوٹر چلا ہی نہ سکیں گے . . ." آمنہ نے شوخی سے کہا۔

"مس آمنہ ابراہیم۔ یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ ہمارے ہوش و حواس تو ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں۔ جب چاہیں دیوانگی طاری کر لیں اور جب چاہیں خرد کو گلے لگا لیں۔ وہ تم نے سنا نہیں . . . . دیوانہ بکار خویش . . . ."

"اچھا تو اب تک مجھے یونہی بے وقوف بناتے رہے . . . ." آمنہ پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

حمّاد اسکوٹر پر بیٹھ گیا تھا۔ گردن پیچھے موڑ کر بولا۔ "میں نے جو بات ابھی کہی تھی اُسے دل میں رکھو۔ اگر گھر پہنچنا ہے تو ——— "، آمنہ خاموش ہو گئی۔

"منوں ———" اُس نے پھر اپنے اسی لہجے میں پکارا۔

"اچھا ———" آمنہ نے جل کر جواب دیا۔

"شاباش ——— اچھے بچے بات مان لیا کرتے ہیں۔"

اسکوٹر اسٹارٹ ہو گیا۔ جھجکتے ہوئے۔ شرماتے ہوئے آمنہ نے اپنے بازو حمّاد کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔

اسکوٹر بڑی سُست رفتاری سے چلنے لگا۔ اتنا سُست کہ آمنہ کو پھر غصہ آنے لگا۔

"خدا کے لئے جلدی چلیئے۔ . . . ورنہ میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤں گی۔"

"اور میں تمہارا وہی پہلے والا حشر کر دوں گا۔"

"حمّاد خدا کے لئے کچھ تو خیال کرو۔" آمنہ نے واقعی بے بسی سے کہا۔

"منوں۔ میری جان۔ بس تو ایسے ہی بیٹھی رہ۔ اور گولی مار ساری دُنیا کو ——— دل کے لمحے ہمیشہ جلدی کٹ جاتے ہیں۔"

"حمّاد پلیز۔ . . ." آمنہ اب نرمی پر اتر آئی تھی۔ "آخر آپ اتنا آہستہ کیوں چلا رہے ہیں۔"

"تمہارے قرب کو دل میں جذب کر رہا ہوں۔"

"آپ کو میرے سر کی قسم اگر جلدی نہ . . . ."

آخری تیر نشانے پر بیٹھا اور اسکوٹر تیز ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو چھ بج رہے تھے۔ اسمٰعیل ابھی تک گھر پر ہی تھا۔ اس کو کمرے میں بیٹھا دیکھ کر آمنہ کی روح فنا ہو گئی۔ اس لئے وہ سیدھی اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ حمّاد جب اسکوٹر کو تالا لگا کر کمرے میں آیا تو اسمٰعیل کا چہرہ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ آج اسمٰعیل بھی اُس کی نیّت پر شک کر بیٹھا ہے۔ کیونکہ اس کے آنے پر اُس نے حسبِ عادت گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ کتاب پڑھنے میں منہمک رہا۔

"کونسی کتاب پڑھ رہے ہو۔" حمّاد نے خوش دلی سے کہا۔

بولنے کی بجائے اسمٰعیل نے کتاب اُلٹ کر نام اس کو دکھا دیا۔

"اخاہ! آج ریلوے ٹائم ٹیبل کی جگہ دیوانِ ذوق نے کیسے لے لی؟ تمہارے ہاتھ میں تو وہی اکلوتی کتاب اچھی لگتی ہے۔"

اس مذاق پر بھی اسمٰعیل نہ مسکرایا۔ بلکہ سنجیدگی سے پڑھتا رہا تو حمّاد کا ماتھا ٹھنکا۔

وہ اسمٰعیل کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور افسردہ سی آواز میں بولا۔

"اسمٰعیل شاید میں زندگی میں کبھی بھی تمہاری بدگمانی برداشت نہ کر سکوں گا۔ آج تمہارے دل میں میری طرف سے میل آگیا ہے۔ اس آئینے کے ٹوٹنے سے پہلے بہتر ہے میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

"میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا۔" اسمٰعیل نے اسی بے تعلقی سے جواب دیا۔

"اس سے اچھا تھا کہ کچھ کہہ لیتے۔ نہ کہنا ہی تو درمیان میں دیوار حائل کر رہا ہے۔"

اسمٰعیل چپ رہا۔

"میں جانتا ہوں اسمٰعیل میں نے بہت بُری حرکت کی ہے اور تم سوچ رہے ہو تمہاری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن میں جھوٹ کب بول رہا ہوں۔ تمہاری چیٹ پڑھ کر بھی آمنہ مشکوک تھی۔ اور میرے ساتھ آنے میں ہچکچا رہی تھی۔ جب بمشکل تمام اسکوٹر پر بیٹھی تو یوں الگ تھلگ جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔ اس کا مطلب تھا اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے آندھی کی طرح اسکوٹر اڑایا۔ اور مختلف سڑکوں پر ہوتا ہوا اسے بہت دُور لے گیا۔ میں اسے تب تک گھماتا پھرا جب تک اُس نے مجھے پکڑ نہیں لیا۔ یہ بچاری بہتیرا چلاتی رہی۔ خوفزدہ ہوتی رہی۔ مگر میں بھی ضد میں آگیا تھا۔ اگر پہلے ہی مجھے پکڑ کر بیٹھتی تو مجھے ایسی حرکت نہ کرنا پڑتی۔

تم سمجھتے کیوں نہیں اسمٰعیل۔ آمنہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ آمنہ میری عزت ہے

میری آبرو ہے۔ میرا وقار ہے۔ اب وہ تمہاری کم اور میری زیادہ ذمہ داری ہے۔ میں ا[ن]
کے ساتھ فلرٹ نہیں کرسکتا۔ جھک مارنے کے لئے شہر میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ میں ا[تنا]
گندا نہیں کہ تم دونوں مجھ پر اعتبار نہ کرو۔"

ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ کر حماد خاموش ہوگیا۔

اسمٰعیل پھر حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ اگر آمنہ کا بھائی نہ ہوتا تو اس صاف گوئی پر واویلا
شور مچا دیتا۔ گو حماد کو سمجھنا مشکل تھا۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ بڑا ہی سچا اور تلخ آدمی تھا۔ اس کی بات
پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُس کے دل میں اگر کھوٹ ہوتا تو وہ اسمٰعیل کے سامنے اس کا
تذکرہ یوں نہ کرتا۔ کچھ بھی ہو حماد جیسے آدمی کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے تھے۔ پتہ نہیں اس
کے کردار میں جاذبیت تھی یا اُس کی باتوں میں جادو تھا۔

"اور ہم نے ایک جگہ رُک کر کوکا کولا بھی پیا تھا۔ واپسی پر سیدھے گھر آگئے۔ ساری دنیا
گھومنے میں لگی۔"

حماد نے ایک پٹنے والے بچے کی مانند منہ پھلا کر اعتراف جرم کیا اور پھر منہ پھلا کر
اسمٰعیل کو ہنسی آگئی۔ اُس نے کتاب بند کرکے ایک طرف رکھ دی اور بولا:

"ایک ہی کمی ہے تم میں یار کہ حوصلہ نہیں ہے۔ ورنہ تمہارا جواب نہیں تھا۔"

"تم جانتے ہو میں تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کرسکتا۔"

"تم کچھ بھی برداشت نہیں کرسکتے۔" اسمٰعیل نے اپنائیت سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تم ہی میری اس خامی کو برداشت کرلیا کرو۔"

"کر تو رہا ہوں۔"

"اسمٰعیل ——" ذرا سے توقف کے بعد حماد بولا۔ "میرا خیال ہے میں اب ا[ن]
سے چلا جاؤں۔ حالات نے اگر تمہیں بھی بدگمان کردیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔"

"خیر —— اتنے بددل ہوکر میرے گھر سے تم نہیں جاسکتے۔"

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو اسمٰعیل! کافی عرصے سے میں یہاں پڑا ہوا ہوں اور ——"
اسمٰعیل تہی دست اور فاقہ مست ضرور ہے۔ مگر خلوص کا تجربہ بے پایاں ہے۔ تم بے سبب
سے مایوس ہوکر نہیں جاسکتے اور —— جب تک تم سچائی کی زبان میں گفتگو کرسکتے
دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے بدگمان نہیں کرسکتی۔"

"اسمٰعیل میرے بھائی۔ میری عدم موجودگی میں شاید تم اپنی امی اور بہن کو منا سکو۔"

"میں انہیں عنقریب مناؤں گا۔ اور اگر وہ نہ بھی مانیں تو میں نے سوچ لیا ہے۔ ایک مہینے
اندر اندر میں تم دونوں کا نکاح کردوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"اسمٰعیل۔ آج پھر غضب ہوگیا۔" حماد جلدی سے بولا۔ "سکینہ آپا نے ہم دونوں کو مال پر
دیکھ لیا تھا اور اُن کے ساتھ مسٹر موزائل بھی بیٹھا ہوا تھا۔"

"تو کیا ہوا۔" اسمٰعیل جل کر بولا۔

"وہ خالہ جان کو بھڑکائیں گی۔"

"اب ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کہہ دوں گا میں نے خود بھیجا تھا۔"
آمنہ تو انہیں دیکھ کر یوں ہوگئی جیسے فرشتۂ اجل دیکھ لیا ہو۔

اسمٰعیل خاموش رہا۔

"میرا خیال ہے وہ آجکل مسٹر موزائل پر بہت مہربان ہورہی ہیں۔"

"ہاں۔ ان کا خیال ہے۔ اس دن ہم نے ایک مشترکہ سازش کے تحت ان کی توہین
کی تھی۔ اس لئے اب آمنہ کی بات اس سے پکی ہونی چاہیئے۔ ورنہ سسرال میں اُن کی
سُبکی ہوجائے گی۔"

"کیا مسٹر موزائل سے وقار صاحب کی کوئی رشتے داری ہے؟"

"ہاں۔ دور کی قرابت ہے۔ اور ان ہی کے توسط سے تو یہ رشتہ آرہا ہے۔ اور اس
لئے تو سکینہ آپا نے اپنے وقار کا سوال بنالیا ہے۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو ——

جب حشر کا وقت آئے گا

اس وقت دیکھا جائے گا۔"

اسمٰعیل نے پھر کہا۔"میں تو دوپہر کا جلا بُھنا بیٹھا ہوں۔ اب زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"بُھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" حمّاد جلدی سے بولا۔

"منّوں ——" اسمٰعیل نے بلند آواز سے آمنہ کو پکارا۔

وہ ڈری —— سہمی —— چور بنی —— دروازے میں آکر کھڑی ہوگئی۔

"بٹیا کھانا گرم کر کے لاؤ ہم دونوں کے لئے ——"

آمنہ جلدی سے باہر کو لپکی۔ آج بھائی کے اندازِ تخاطب سے ہی اس نے اندازہ لگایا کہ بدگمانی کے بادل چھٹ گئے ہیں۔

آج میری سالگرہ ہے۔ اور تم نے کوئی تحفہ نہیں دیا۔"

تو آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اس موقع پر تحفے بھی دیئے جاتے ہیں۔"

پھر اب تم اتنی نادان بھی نہیں ہو۔ یوں کہو میرے اتنے پہلے بتانے کے باوجود تمہیں

یں رہا۔"

بر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں جناب ——"

آپ کی بے حسی تو یہی ظاہر کرتی ہے۔" حماد کو سچ مچ غصہ آگیا۔

میں بھی اتنے دن سوچتی رہی ہوں کہ آپ کو اس موقع پر کیا دیا جائے۔ بالآخر میں اس

پہنچی —— " وہ جان بوجھ کر رُک گئی۔

کس نتیجے پر ——" حمّاد جلدی سے بولا۔

اگر میں آپ کو تحفہ دے ہی نہیں سکتی۔"

کیوں ——؟"

میری حیثیت ہی کیا ہے بھلا ——"

تحفوں کے لئے حیثیت نہیں' جذبات پرکھے جاتے ہیں۔ تم چاہتیں تو کاغذ کا ایک

پرُزہ بھی دے سکتی تھیں۔"

"میں بھی تو اپنی کم مائیگی کا رونا رو رہی ہوں۔ تحفہ اگر جذبات کا ترجمان ہوتا ہے! ا
جذبات ہی اُسے قبول بھی کرتے ہیں۔ وہ کاغذ کا پرُزہ ہو یا کوئی دوسری شے۔"

حمّاد نے ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

"حمّاد! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں آپ کو کبھی کوئی تحفہ نہیں دے سکتی۔"

"کیوں ــــ کیوں ــــ آخر کیوں ــــ ؟ کیا میں اتنا گیا گذرا ہوں؟"

"نہیں ــــ یہ بات نہیں ــــ" آمنہ کے چہرے پر کرب اور اُلجھن کے آثا
ہوئے۔ جیسے اپنے خیالات کو زبان دینے کے لئے اسے مناسب الفاظ نہیں ا
تھے۔ یا اپنے جذبات کو زبان پر لا کر وہ اُسے بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"دیکھئے نا ــــ" اُس نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"اگر... میرا مطلب ہے ــــ ساری زندگی... میں آپ کو کوئی تحـ
کے طور پر نہیں دے سکتی۔ اگر... اگر میں آپ کی ہو جاؤں.... تب بھی
... اس صورت میں بھی نہیں ــــ"

"یہ تمہارا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" اب حمّاد کو اُس کی انوکھی منطق میں د
ہو چلی تھی۔ "میری بیوی بننے کے بعد بھی نہیں۔"

"نہیں ــــ"

"کیوں ــــ ؟"

"کچھ فضول سا لگتا ہے۔ کمائی آپ کی۔ سب کچھ آپ کا۔ اور اس میں سے!
آپ کو ــــ ؟"

"انتہائی احمقانہ دلیل ہے۔ تو کیا جو بیویاں خاوندوں کو تحفے دیتی ہیں، وہ ال
خود کمانے جاتی ہیں؟"

نہیں جی۔ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اور آپ خواہ مخواہ اُلجھ رہے ہیں۔"
تو جی۔ آپ سمجھانے کی کوشش فرمائیں۔ محترمہ ذہانت بیگم صاحبہ۔" حمّاد نے اس کی نقل اُتاری۔
دراصل تحفہ دینا شوہر ہی اچھا لگتا ہے۔ بیوی اس کے سامنے بہت چھوٹی لگتی ہے
کا تحفہ یہی ہے کہ وہ بیوی کی خوشی اور سرور سے اطمینان حاصل کرے۔"
بچت کی اچھی اسکیم نکالی ہے تم نے ــــ مگر بات دل کو لگی نہیں۔ آخر خاوند کا بھی
ا چاہتا ہے۔ جس محبت اور پیار سے وہ بیوی کے لئے تحفہ لاتا ہے اسی طرح بیوی بھی
ی موقع پر تحفہ دے... کچھ دے کچھ کیوں ــــ ؟"
جب بیوی اپنا آپ اور بچے شوہر کو دیتی ہے تو اُس کے آگے ایک معمولی سا تحفہ کیا
لگتا ہے۔"
تو پھر شوہر کے لئے کیوں ضروری بن جاتا ہے کہ وہ بیوی کی سالگرہ پہ ــــ ہر برس
کے روز ــــ اور عیدین پہ بیوی کے لئے تحفے لاتا پھرے ــــ جب وہ کماتا ہی
کے لئے ہے ــــ اور اس کا سب کچھ بیوی کے لئے ہوتا ہے۔"
یہ لین دین اور طرح کا ہے جناب۔ اور حضور کے "بھیجے" میں نہیں سماتے گا۔"
کوشش کیجئے ــــ" حمّاد چڑ گیا۔
اللہ تعالیٰ بندوں کو وقتاً فوقتاً انعامات سے نوازتا ہے نا ــــ ؟"
ہاں جی ــــ"
بندے تو اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ کوئی انعام یا تحفہ نہیں دے سکتے۔"
ہرگز نہیں۔"
بندے اس کے جواب میں شکر ادا کرتے ہیں۔ اور خلوص دل سے عبادت کرتے ہیں۔"
ٹھیک ہے۔"
اپنے جذبات کے اظہار کا یہ بھی تو طریقہ ہو سکتا ہے۔

"سمجھ گیا!"

"تو بیت سے حضور! میں تحفے کے جواب میں عبارت کی قائل ہوں۔ یچی ادھ

"اور جن کو خراج صرف عبادت کر کے پیش کیا جا سکتا ہو۔ اُن کو مادّی تحفہ پ

سکتا ہے۔"

"آمنہ ——" حمّاد نے لپک کر آمنہ کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔

"آمنہ . . . . آمنہ . . . . خُدا کے لئے کوئی لمحہ تو ایسا چھوڑ دو کہ میں تیرے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہ روز بد دیکھنا بہرحال ۔ آمنہ اور اسمٰعیل دونوں کے مقدر میں رقم تھا۔ گو دونوں کے جذبات

ں انداز میں مجروح ہوتے تھے۔ مگر صدمہ دونوں کو ایک جیسا پہنچا تھا۔ آمنہ کو تو جیسے

ا لگا تھا کہ اُس کی تیرہ بختی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ وہ جو انجانے میں اس نے خوبصورت

بل کے سینکڑوں سپنے دیکھ ڈالے تھے، اُن کی تعبیر کچھ بھی نہ تھی۔ خواب تھے۔ بکھر گئے۔ دل

تھا۔ ٹوٹ چکا۔ ایک روگ لگنا تھا۔ لگ گیا۔ اب تو کچھ بھی ہونا باقی نہ تھا۔

لیکن اسمٰعیل جس دُکھ سے دوچار تھا اس میں نہ صرف اُس کے اپنے دل کی آہیں اور

ں کے آنسو شامل تھے۔ بلکہ اس سے زیادہ اُسے اپنی دوستی کے پامال ہونے کا صدمہ تھا۔

ں نے سوچا تھا، وہ پھولوں اور سہروں کے جلو میں اپنے دوست کو گھر سے رخصت کرے گا

اُس کی ماں نے اس کی عدم موجودگی میں جس طرح اس کے دوست کو رخصت کر دیا تھا،

سے عام لفظوں میں بے آبرو کر کے نکالنا کہتے ہیں۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا

جائے گا۔

یوں تو پچھلے ایک ماہ سے بیگم ابراہیم کا رویہ حمّاد کے ساتھ بڑا تلخ ہو گیا تھا۔ وہ بات

بات اسے صلواتیں سُناتیں بخصوصًا جب اسمٰعیل موجود نہ ہوتا تو بڑے لیکے قسم کے جملے بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کہہ جاتیں۔ اگر وہ شیو کے لئے پانی منگواتا تو گھنٹوں اُسے انتظار میں رکھتیں۔
پر بیٹھتا تو طنز کی بوچھاڑ کر دیتیں .... پتہ نہیں کہاں سے رُلتے کھُلتے چلے آتے ہیں
آگا نہ پیچھا۔ نہ حویلی نہ خاندان۔ اور پھر اکڑ دیکھو۔ مجھے تو ایسے لوگوں کی ذہنیت
ہے۔ جو دوسروں کے گھروں میں جا کے اس طرح اینٹھتے ہیں جیسے باپ دادا
انہوں نے کسی کے مہینے لگا رکھے ہوں۔ یا لاکھوں کی جائداد کسی کے نام لگانے والے
"پتہ نہیں لوگ باہر نکل کر اپنی اوقات کیوں بھُول جاتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔
حماد یہ سب سُن کر۔ سمجھ کر انجان بنا رہتا۔ چُپ چاپ ناشتہ زہر مار کرتا
باہر نکل جاتا۔

کچھ تو اسمٰعیل جیسے صاف دل اور پُرخلوص دوست کا پاس تھا اور کچھ ان
کا۔ جو ایسے میں لدے بادلوں کی طرح بوجھل ہو جاتیں۔ ان میں ہلکی سی نمی آجاتی
میں بجلیوں کی چمک پیدا کر دیتی۔ وہ اداس۔ بھیگی بھیگی۔ مجبور و بےبس آنکھیں
میں سے۔ دُور دُور سے اُسے جھانکتیں۔ جیسے التجا کر رہی ہوں کہ "نہ جاؤ۔
چھوڑ کر نہ جاؤ ——

ہمارا اس میں کیا قصور۔
ہم تو اتنی مجبور ہیں کہ جھلک بھی نہیں سکتیں۔
اور قہر تو یہ ہے کہ تمہاری دُوری بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

جتنی دیر تک آمنہ گھر رہتی، اس کی باوضو آنکھیں حماد کا طواف کرتی رہتیں
کی بوچھاڑ میں اُس کی آنکھیں التجاؤں سے بوجھل رہتیں۔ اس کا رواں رواں
خواہ رہتا۔

دل کی آنچ اُسے موم کی مانند پگھلائے جاتی۔
اور اس موم کو پگھلتے ہوئے دیکھنا حماد کو بہت تکلیف دہ لگتا تھا۔ اس

جاتا۔ بنا رہتا۔ ان باتوں کو مذاق میں اُڑا دیتا۔ اور آمنہ سے کہتا۔ تم کیوں محسوس کرتی ہو۔
مجھے ذرا سا بھی ملال نہیں ہے۔ یہ تو ان کی عادت ہے۔ اور مجھے یہ باتیں تمام عمر
شت کرنی پڑیں گی۔

اس روز اسمٰعیل ایک ہفتے کے دورے پر کراچی گیا ہوا تھا۔ اور آمنہ علی الصبح ہی اسکول
گئی تھی۔ چھٹیاں ہونے والی تھیں اور یہ اس کا اسکول میں آخری دن تھا۔ بہت سے کام
نے کے لئے اسے جلدی جانا تھا۔ اس لئے وہ حماد سے ملے بغیر ہی چلی گئی۔
اور اسی روز بیگم ابراہیم کو بھی ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ ہوا یوں کہ۔ حماد کو ناشتے پر دیر ہو
وہ صبح سے کچھ ضروری کام کر رہا تھا۔ جب وہ میز پہ آیا تو اس کا ناشتہ ٹھنڈا ہو چکا تھا
نہیں بلکہ بلی دودھ کا بھرا جگ گرا چکی تھی۔ چینی ساری گیلی ہوتی پڑی تھی۔ ایک پیالی بھی
ٹ گئی تھی۔

زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اور گرم گرم چائے کی طلب
مجبور ہو کر اُس نے دوبارہ چائے بنوانے کے لئے برتن باورچی خانے میں بھجوا دیئے
لے۔ اب اُس کو کیا معلوم تھا کہ آج اُس کا ستارہ گردش میں ہے اور ذرا سے قصور کی
اتنی بڑی سزا ملنے والی ہے۔ جُونہی برتن باورچی خانے میں پہنچے بیگم ابراہیم بپھری
شیرنی کی طرح دوڑی آئیں اور آکر اس کے سر پہ کھڑی ہو گئیں۔

"میں کہتی ہوں جناب حماد صاحب! کیا یہ تمہارے ناشتے کا وقت ہے۔ میں
عرصے سے تمہارے نخرے اٹھا اٹھا کر تھک چکی ہوں۔ تمہیں اگر کوئی گھر کرائے
نہیں ملتا تو ہوٹلوں کے دروازے تم جیسے بے خانماں لوگوں کے لئے ہر وقت کھُلے
ہتے ہیں۔ مہربانی کر کے یہ بوریا بستر آج ہی گول کرو۔"

حماد حیرت سے ٹکر ٹکر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے بالکل یہ اُمید نہ تھی کہ بیگم
براہیم اتنی بے مروت بھی ہو سکتی ہیں کہ منہ پر اُسے اتنا کچھ کہہ دیں۔

اُسے خاموشی سے یوں اپنی طرف دیکھتا پاکر انہیں اور بھی غصہ آگیا۔

"میں نے شریف اور بے آسرا سمجھ کر تمہیں گھر میں جگہ دی تھی مگر تم نے دکھائی کہ میری ہی بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے ک بھوکے ننگے آدمی سے میں اسے بیاہ دوں گی تو یہ غلط فہمی ہمیشہ کے لئے دل سے میں اُسے زہر دے کر مار دوں گی مگر تمہارے حوالے کبھی نہ کروں گی۔"

حماد اب بھی گم صُم بیٹھا تھا۔ اس کے حواس معطّل ہو رہے تھے۔ اس کا ہو رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ دلی تکلیف کے باعث اُس کی زبان گئی تھی۔

مگر جب آمنہ کا نام آیا تو اُس کا دل بھر آیا۔ . . .

او آمنہ ———

او میری سجدہ گاہ!

میں، تجھ پر حرف کیسے آنے دوں گا؟

میرے کئے کی سزا تم کیوں پاؤ گی؟

میں چلا جاؤں گا ———

چلا جاؤں گا ——— اِن فضاؤں سے ——— اِن گلیوں سے ——— اس سے ——— دُور . . . . . بہت دُور . . . .

"اور اگر تم نے اب بھی ڈھٹائی دکھائی اور گھر چھوڑ کر نہ گئے تو میں دو دن کے اندر کا نکاح پڑھوا دوں گی۔ رشتوں کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ اور یاد رکھو کہ اسمٰعیل انتظار نہیں کروں گی۔ جس کی عقل پر تم نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پردہ ڈال رکھا تمہارے رشتہ دار کو بھی ہم سے ٹکر لینے کا مزہ مل جاتے گا۔ پھر دیکھوں گی کہ تم کیسے جاتے۔ ۔ ۔؟

حماد تو اچنبھے میں آکر ساکت ہو گیا تھا۔ مگر وہ اس خاموشی کو ڈھٹائی سمجھ کر آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ اتنی باتیں سُن کر حماد کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ وہ چونک پڑا جیسے اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ اور جسے وہ خواب سمجھ رہا تھا۔ وہ تو ایک تلخ حقیقت تھی۔ اُسے اپنی خاموشی پر بڑا غصہ آیا۔ بھلا اُس نے ایک دم فیصلہ کیوں نہ کر لیا۔ اور انھیں اتنی باتیں کرنے کی مہلت کیوں دی۔؟

"خالہ جان . . . . آپ خفا نہ ہوں۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں آپ مجھ سے اس قدر نفرت کرتی ہیں" اُس کی آواز لرز گئی "میں اب تک اس گمان میں تھا آپ مذاق کر رہی ہیں ——— آپ کی تمام تر عنایات کا شکریہ۔ میں نے واقعی اس میں ڈیرہ جما کر آپ کو بہت تکلیف دی۔ اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔" وہ ناشتہ کئے بغیر ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"سُن ———" وہ جاتے جاتے رُکا۔

"کیا ہے؟" بیگم ابراہیم نے تنک کر پوچھا۔ ان کے دل میں پھر خدشے نے سر اٹھایا۔

اُن کے اس کھُردرے لہجے سے حماد اور بھی بددل ہوا۔ لجاجت سے بولا۔

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ میرا اس گھر میں مزید ٹھہرنا حالات کو خراب کر دے گا۔ میرا چلے جانا ہی مناسب ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا اسمٰعیل کا انتظار کر لوں گا۔ لیکن اب میں اس کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ آئے تو اُس سے کہہ دیں میں اپنی خوشی سے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں اُن کا شکریہ اس لئے ادا نہیں کر سکا کہ میں پیدائشی بے مروّت اور طوطا چشم ہوں۔ بھلا چاہنے والوں کے ساتھ بھی میں بھلا نہیں کر سکتا۔"

اُس کی آواز بھرا گئی اور آواز درست کرنے کی خاطر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا جانے بیگم ابراہیم کے دل پر ان الفاظ کا اثر ہوا تھا یا وہ اس کی باتوں کو کامیاب اداکاری سمجھ رہی تھیں۔ تاہم وہ ماتھے پر بل ڈالے زمین کی طرف دیکھتی رہیں۔

"میں ایک آخری گذارش آپ سے یہ کرنی چاہتا ہوں کہ جب تک میں کوئی ٹھکانہ لوں میرا سامان یہیں پڑا رہنے دیں۔ گھر ڈھونڈتے ہی میں سامان لے جاؤں گا۔"

بیگم ابراہیم نے صریح بے اعتباری سے حماد کی جانب گھور کر دیکھا اور بولیں۔

"یہ چال اب کامیاب نہ ہو سکے گی حماد صاحب! میں جانتی ہوں تم سامان یہیں کیوں چاہتے ہو۔"

"خدا کے لیئے اتنی کٹھور نہ بنیئے خالہ جان!" حماد جیسے رو دیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ لینے بھی خود نہیں آؤں گا۔ کسی کو بھیج کر منگوا لوں گا۔ اس وقت مجھے دفتر میں اشد ضرور ہے۔ سامان اٹھائے اٹھائے کہاں پھروں گا۔ اور دفتر میں کہاں رکھوں گا۔"

"اچھا ——" بیگم ابراہیم نے بے دلی سے کہا۔ "کسی کو بھیج کر سامان منگوا لی تم اپنے وعدے پر قائم نہ رہے تو میں اسمٰعیل کو بھی اس گھر سے نکال دوں گی۔"

حماد کے چہرے پر ایک سوگوار اور دل شکن مسکراہٹ ابھری اور وہ باہر جانے لگا۔

آج اُس کے قدموں میں تھکن تھی۔ لڑکھڑاہٹ تھی اسے اپنے لٹنے کا شدید تھا۔ کس قدر مجبور کر دیا گیا تھا وہ آج۔ بہر حال اُسے کوچۂ جاناں چھوڑ کر جانا تھا۔ اور آج اور سلگتی ہوئی آنکھیں بھی کسی اوٹ سے نہیں جھانک رہی تھیں۔ جن کی التجا اس کے پا زنجیر بن جاتی اور ہمیشہ کی طرح وہ اس بے عزتی کو امرت کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتا اور پھر قدموں میں پڑا رہتا۔

اسمٰعیل کا خلوص بھی کوسوں دور تھا۔ جو ہاتھ باندھ کر اس کی راہ کی دیوار بن جاتا۔

آج روکنے والا کوئی نہ تھا اور ہر شئے کہہ رہی تھی۔ جاؤ —— جاؤ ——

نکل جاؤ یہاں سے ——

یہ سامان لے جاؤ اور پرانی یادیں چھوڑ جاؤ۔

نہیں ——!

میں یہ سامان یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ اور سب یادیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

اِس گھر کی یادیں ہی تو میری زندگی ہیں۔ یہاں میں نے سب کچھ پایا ہے۔ کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اور یہ سامان —— چند تنکے —— یہ تو اک ذریعہ ہے، سوچ کو یہاں منسلک رکھنے کا۔ میں کیسے برداشت کر سکوں گا کہ میرا تعلق اِس گھر سے بالکل ٹوٹ جائے —— میں اِس آس پر ہی زندگی بتا دوں گا کہ میرا سامان اُس کی چوکھٹ پر پڑا ہے۔ ہر صبح وہ میری اک اک شئے بڑی محبت سے جھاڑ پونچھ کر رکھا کرے گی —— مایوسیوں کی گرد جھاڑ کے انتظار کی لو لگایا کرے گی اور پھر میرے تکیوں میں مُنہ دے کر اوندھی لیٹ جایا کرے گی —— بیتی گھڑیوں کی یادیں اُس کے ہونٹوں پر تبسم بکھیر دیں گی —— اور جُدائی کے کرب انگیز لمحے اِن منتظر آنکھوں کو بھگو جایا کریں گے۔ ہر صبح وہ ایک نئی لگن کے ساتھ میری راہ تکا کرے گی۔

اور میں یہ سامان یہیں چھوڑ جاؤں گا۔

اور اسے لینے تب تک نہ آؤں گا جب تک ہمارے درمیان اٹھنے والی معاشرے کی ہر دیوار نہ ٹوٹ جائے گی۔

اور یہ ہم دونوں کے درمیان ایک کڑی ہوگا ——

واسطے کی ایک کڑی ——

اور اس کو ایک مرکز بنا کر ہم تصور میں ہر روز ایک دوسرے سے ملا کریں گے۔

قسمت کی ما[illegible]ی آمنہ اُس روز اسکول سے پانچ بجے شام لوٹی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسکول گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند ہونے والے ہیں۔ سبھی نے سارا کام آخری دن پر چھوڑ دیا تھا۔ آخر یہ سب آخری ہفتے میں ہی تو ہو سکتا تھا۔

آمنہ تھک کر چور ہو گئی تھی اور ساری راہ یہی سوچتی آئی تھی۔ تاہم اس نظام کہنہ کا اس کے اختیار میں تو نہ تھا۔ اس وقت تو اُسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ دوپہر کا [illegible] نے نہیں کھایا تھا۔ صُبح اُسے جانے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے ناشتہ برائے نام سا ہی کیا تھا۔ حماد سے اُس نے ایک رات پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کل صُبح وہ اس سے ملے بغیر ہی چلی جائے گی۔

"کیوں تمہاری مجھُ سے منگنی ہو گئی ہے ؟" حمادّ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کے ایسے نصیب کہاں" —— آمنہ نے برجستہ کہا تھا۔

"تمہارے تو ایسے نصیب ہیں نا ؟" حمادّ دکھی ہو گیا تھا۔

"ہاں میرے تو ہیں ——"

"تو پھر میری تم سے منگنی ہو گئی ہے کیا ——؟"

آمنہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"اسمٰعیل کہہ رہا تھا۔ اگلے مہینے وہ ہماری شادی کر دے گا۔ ویسے پہلے منگنی ہو جاتی تو اچھا تھا —— مجھے منگنی کی رسم بڑی پُر کیف لگتی ہے —— بڑا رومانس ہوتا ہے اس پیریڈ میں۔"

"اور جناب آجکل منگنی بہت جلد ٹوٹ جاتی ہے۔ بلکہ منگنی تو اس زمانے میں صرف ٹوٹنے کے لئے ہوتی ہے۔" آمنہ اُسے ستانے لگی۔

"اچھا اب اپنی منحوس زبان کو روک لو۔ کافی بدشگونی کی باتیں کر چکی ہو۔ کوئی اچھی سی بات بتاؤ۔"

"باتیں تو بہت سی ہیں مگر بتاؤں گی کل ——"

"آج کیوں نہیں ؟"

"آج مجھے اسکول کا کچھ کام ختم کرنا ہے۔ کل جی بھر کر باتیں کریں گے۔"

"کل کیا ہے ؟"

"توبہ ہے میری، آپ تو بال کی کھال اتارنے لگتے ہیں۔ یہ مجھے صحافیوں والی کھود کرید ایک آنکھ نہیں بھاتی —— کہہ تو رہی ہوں۔ کل اسمٰعیل بھائی دَورے پر جا رہے ہیں اور امّی کو بھی رات کو سکینہ آپا کے ہاں "مشاورتی کونسل" کا اجلاس طلب کرنے جانا ہے۔ پھر ہم رات گئے تک بیٹھے باتیں کریں گے۔"

"کتنا عرصہ بیت گیا ہے منوں ہم نے ڈھیر ساری —— پیاری پیاری باتیں نہیں کیں ——" حمادّ حسرت سے بولا۔

آمنہ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"بس حالات ہی موافق نہ رہے ......" حمادّ خود ہی بولا ... "بڑی ظالم ہے یہ دُنیا —— اب احساس ہوتا ہے —— ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہ اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا —— اور تو بھی تو بزدل ہے نا! پاس بیٹھتے ہوتے بھی ڈرتی ہے۔"

"اس لئے ڈرتی ہوں کہ دنیا ہمیشہ کے لئے پاس بیٹھنے سے محروم نہ کر دے۔"

"ارے ہاں ــــ تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کل سکینہ آپا کے ہاں کیا میٹنگ ہوئی ہے ... کچھ ہمارے مقدّر کا فیصلہ بھی ہوگا ــــ"

"ہاں ــــ" آمنہ اُداسی سے بولی۔ "کیونکہ اسمٰعیل بھائی نے تو امی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں اگلے مہینے حمّاد اور آمنہ کا نکاح کر دوں گا۔"

"سچ منوں ــــ؟" حمّاد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "پھر میں تجھے یہاں سے بہت دور لے جاؤں گا... بہت دور ان لوگوں کو تیری پرچھائیاں بھی نہیں دکھاؤں گا.... ایک بار تو میری ہو جا ــــ؟" حمّاد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تجھے ساری دنیا سے چھپا کے یہاں رکھ لوں گا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے۔

اس وقت آمنہ کو اپنی قسمت پر بہت رشک آیا۔ لمحہ بھر کو اس نے تصوّر میں سب کچھ دیکھ بھی لیا ــــ اور کیا وہ سارے رشتوں کو اُس کی خاطر ٹھکرانے کو تیار نہیں تھی۔

"ہاں تم نے کبھی میری اس بات کا جواب نہیں دیا کہ ہم ہنی مون منانے کہاں جائیں گے۔ میں تو شادی کے بعد بس تیرے پہلو سے لگا بیٹھا رہوں گا۔ اور کم از کم چھ ماہ تک تو جہان کا کوئی کام نہیں کروں گا۔ میں نے اتنے پیسے جمع کر لئے ہیں اس وقت کے لئے" اس نے اشارے سے بتایا۔

"شیخ چلی۔" آمنہ ہنسنے لگی۔

"کیا تمہیں یقین نہیں ہے ــــ؟" حمّاد نے پوچھا۔

"حمّاد ــــ" آمنہ نے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ "کبھی کبھی یقین نہیں آتا اپنی خوش قسمتی پر۔ سوچتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں کہ کہیں...."

"بس اب تم ان وہموں میں گرفتار رہو نا ــــ چھوڑو دو ــــ کافی تڑپ چکے ہیں ہم قدرت کو ہم پر ترس آ گیا ہے اب۔"

دل ہی دل آمنہ نے کہا ــــ "خدا کرے" ــــ پھر وہ اُٹھ کر جانے لگی۔

"کل کی بات پکّی ہے نا؟" حمّاد نے اس کا پلّو تھام کر کہا "اور کل ہم چھت پر اُسی جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" حمّاد نے ایک آنکھ بند کر کے کہا "اور کل چودھویں کی رات بھی تو ہے"

"کل تو آنے دیجئے۔" آمنہ نے شرماتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

رات اُس نے ڈھیر ساری باتیں سوچ لی تھیں۔ سارا دن بھی اس کے تصوّرات پر آنے والی رات کے سائے منڈلاتے رہے تھے۔ وہ حمّاد کے ساتھ بیٹھ کر مستقبل کے پروگرام بنانا چاہتی تھی۔ وہ اُس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ سچ مچ زندگی کو کھینچتے کھینچتے تھک گئی ہے لہٰذا اُسے جلدی اِس دنیا کی نظر سے بچا کر کہیں دُور لے جائے۔

لیکن جب وہ تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تو ایک وحشت ناک سنّاٹا گھر پر مسلط تھا سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ در و دیوار رو رہے تھے۔ وہی ہنستا بستا گھر ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں گھر میں داخل ہوتے ہی آمنہ کے دل کو ٹھیس لگی۔

اُس نے اضطرابی کیفیت میں ہر کمرے کو جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ حمّاد کا سامان جُوں کا توں پڑا تھا۔ اس کا سامان اپنی جگہ پہ دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی ــــ!

پھر کیا کھو گیا ہے ــــ؟

کیا ہو گیا ہے ــــ؟

دل کیوں اس طرح ماہئ بے آب بن رہا ہے ــــ؟

آمنہ نے گھڑی دیکھی شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اب تک حمّاد کو آجانا چاہیئے تھا۔

اُس کا دل ایک دم حمّاد کے لئے تڑپنے لگا۔ اُسے حمّاد کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ جی چاہا وہ سامنے آجائے تو یہ سارے حجاب بالائے طاق رکھ کر اُس کے سینے میں اپنا سر چھپا لے اور ساری اُداسی، تھکن اور مایوسی دور ہو جائے۔ اُس سے لپٹ کر وہ جی بھر کر رو دے جَھم جَھم۔

کے دُکھ آنسوؤں کی راہ سے نکال دے۔

جی بھر کے تو رو لے گی۔ مگر اُس کا سینہ نصیب نہ ہوگا۔ جیسے ہر شے کھو...
بیگم ابراہیم بھی اس وقت گھر پر نہیں تھیں۔ اس نے سوچا۔ امی رات کے کھا...
کو ہی سکینہ آپا کے گھر چل دی ہوں گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جلدی انہیں اس لئے...
حماد کو نکال دینے کا مژدہ سکینہ آپا کو جلد از جلد سُنانا چاہتی تھیں اور حماد کیوں آج دیر...
اس بے کلی میں اُس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے...
گھنٹے۔ اور انتظار کرتے کرتے آٹھ بج گئے۔

آٹھ بجے اس کا دل اور بھی گھبرانے لگا۔ جیسے کوئی بُری گھڑی آنے والی ہو۔ وہ گھبرا...
خانے میں چلی گئی۔ وہاں رابعہ اور نعیمہ بیٹھی جھگڑ رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ بیگم ابراہیم...
سکینہ آپا کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔

وہ بے تابی سے ٹہلتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ سامنے چھمی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا
اُس نے آواز دے کر اُسے بلایا وہ قریب آ گیا۔ "رات ہو گئی ہے۔ گھر چلو۔ اس وقت
نہیں کھیلتے۔"

چھمی ہاتھ چھڑا کر اُس سے آگے چل پڑا۔

کمرے میں پہنچ کر اُس نے چھمی سے پوچھا۔ "چھمی دوپہر کے کھانے پر حماد آئے تھے؟"

"نہیں تو۔۔۔۔ وہ تو۔۔۔۔ وہ تو چلے گئے"

"کہاں؟"

"وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ امی کہہ رہی تھیں"

"چھمی، میرے بھیا۔ سچ سچ بتا دے کیا ہوا تھا۔؟"

"پتہ نہیں جی" وہ معصومیت سے بولا۔ "بس جب اسکول سے آ رہا تھا تو وہ کہیں جا
رہے تھے مجھے بلا کر انہوں نے پیار کیا۔ اور بولے۔ منوں آپا کو میرا سلام کہنا۔ میں اب...

...آؤں گا۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیوں مگر انہوں نے نہیں بتایا۔ اور منوں آپا وہ رو بھی
رہے تھے۔ خدا کی قسم ۔۔۔" چھمی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے
آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا تھا۔ منی آپا۔ کیوں چلے گئے حماد بھائی ۔۔۔؟"

کیوں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ ؟

آمنہ کا سر چکرانے لگا اور وہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔ کیوں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ ؟

...ں ۔۔۔ ؟

وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا ۔۔۔

میرا دل توڑنے کی اُس میں ہمت نہیں ہے۔

اب تو ہر بات طے ہو گئی تھی۔

آج رات مجھے تفصیل سے بات کرنی تھی۔

وہ میرے دل کی سب باتیں سنے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔

کبھی نہیں ۔۔۔

کبھی نہیں ۔۔۔

اگر وہ سچ مچ گیا ہوتا تو یہ سامان چھوڑ کر نہ جاتا۔ یہ سامان کہہ رہا ہے۔ وہ یہیں ہے اِس
...یا میں ہے۔ وہ یہاں ضرور آئے گا۔

حماد ۔۔۔

حماد ۔۔۔

اُس کے جسم کا ایک ایک رُواں چیخنے لگا۔

خدا کے لئے لوٹ آؤ۔

دیکھو تم مجھے کس قدر مجبور اور اپاہج بنا گئے۔

سوچو!

تمہاری صورت دیکھے بغیر تو میں سانس بھی نہیں لے سکتی۔ اتنا حوصلہ تم میں
آ گیا کہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔ . . .

رو ———

رو ———

جی بھر کے رو ———

در و دیوار اُس کے قریب سمٹنا شروع ہو گئے۔

اُس کا دم گھٹنے لگا۔

وہ دوڑ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اُس کی ہچکیوں
اپنا جسم سوراخ شدہ کشتی کی مانند ڈولتا رہا۔ اور اُس کی آنکھیں رو رو کر پکا ہوا پھوڑا
لیکن پھر بھی اُس کے دِل میں اُمیدوں کے دیئے جلتے رہے۔ رہ رہ کر اُسے یہی خیال
ابھی حماد مسکراتا ہوا اُس کے کمرے میں داخل ہو گا اور اُس کے بالوں کو جھنجوڑ کر باہر
گا۔ وہ ڈر کے مارے زیادہ دیر تک اس کی کوٹھری میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ بس اُس کو اپنے
کی اطلاع دے کر بھاگ جایا کرتا تھا۔

بیگم ابراہیم جب آئیں تو اُس نے اپنے آپ کو سوتا ظاہر کیا۔ وہ سمجھیں آج اُ
تھک ہار کر آئی ہے اِس لئے بے سُدھ ہو کر سو گئی ہے۔ خود ہی گرمی لگے گی تو باہر
گی۔ مگر نہیں کیا معلوم تھا۔ انہوں نے اسے ایک نہ بجھنے والی آگ کے الاؤ میں گرا
وہ تمام عمر اِس آگ میں اپنا آپ جلاتی رہے گی اور رفتہ رفتہ اس کی حالت جلی ہوئی
ہو جاتی گی۔

اور وہ پگلی نہ جانے کس آس پر کوٹھری میں گھس کر پڑی ہوئی تھی۔ جیسے ابھی
کے لاشعور میں یہ آس ہو کہ رات کے کسی پہر حماد طلسمی ٹوپی پہن کر سب سے چھپتا چھپاتا آ
اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

جُدائی کی پہلی رات قاتل ہوتی ہے۔

جب جسم دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹتا ہے۔ اور رُوح بار بار سُولی پر چڑھتی ہے۔ ذہن
ں حادثے کو قبول نہیں کرتا۔ مگر تصور بار بار جُدائی کی گھڑیوں کو سامنے لے آتا ہے یقین
رنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر یقین کئے بغیر چارہ کوئی نہیں ہوتا۔

دِل کہتا ہے سینے میں کوئی شے پھونک کر زندگی کا فانوس ایک دم ہی بُجھا دو۔ مگر
ں رات جُدائی کا خنجر بار بار کلیجہ چھلنی کرتا ہے۔ بار بار مرنا اور بار بار جینا پڑتا ہے۔ آنکھوں
یں انگارے بھر جاتے ہیں۔

نیند قریب آتے ہوئے ڈرتی ہے۔

مگر ایک لمبی نیند سو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی نیند جس کا بیداری سے کوئی تعلق
نہ ہو۔

ہونٹوں سے بار بار آہ نکلتی ہے۔
تو سن تصور تیز گام ہو جاتا ہے۔
ذہن میں اتنی بجلیاں ٹوٹ کے گرتی ہیں کہ ماضی کی اِک اِک بات۔ اِک اِک واقعہ یوں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ترتیب وار آنکھوں کے سامنے آنے لگتا ہے۔ جیسے مقابلے میں شریک ہرنے
اپنی بے بسی پر غصہ آتا ہے۔
مگر اپنی بے بسی کی زنجیر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو دل چاہتا ہے۔
جُدائی کی پہلی رات ——
دو دھاری تلوار ہے۔ جو دونوں جانب سے کاٹتی ہے۔ ایک ایسا پُل صراط
جس کے نیچے جہنّم کے شعلے زبانیں نکالے تلوے چاٹنے کو بے قرار نظر آتے ہیں۔
جُدائی کی پہلی رات —— آہستہ بہ بھی بھاری آتی تھی۔ تمام وقت وہ انگارں پہ
نہ اِس پہلو قرار تھا نہ اُس پہلو ——
بس بار بار یہی خیال آتا ——
ہائے یہ سب کیوں ہو گیا —— ؟ زمین و آسمان سے کیا کچھ زیادہ طلب کیا
میں نے ——
حمّاد تم بھی مُجھے چھوڑ کر چلے گئے ——
ہائے حمّاد —— تم بھی . . . . .
تم جو میرے سب کچھ تھے —— تم جو ایک سائبان بن کر مجھ پر چھا گئے تھے
دُنیا کی کڑی دُھوپ سے بچانا چاہتے تھے —— جلتے تپتے صحرا میں یہ تنہا چھوڑ
دیتے ہو کہ سراب کے اس ریگستان میں، میں بوند بوند کو ترس کر مر جاؤں —— چیخ چیخ
حمّاد ——
تم ——
جو میرے سب کچھ بن گئے تھے ——
میری سوچ —— میری فکر —— میرا طریق، میرا طرز —— میرا چلن، میرا جیون
سب کچھ بن کر —— دامن جھٹک لیا ——

اب جینے کا تصور کیسے ہو گا —— زندگی کو بہلایا اور کیسے منایا جائے گا ——
تمہارے بغیر کیسے جیا جائے گا ——
دل جیسے بالک نے تو آنکھ کھول کر ایک ہی کھلونا دیکھا تھا۔ ایک ہی کھلونا مانگا تھا۔
اب وہ بدنصیب کیسے بہلے گا۔ ؟
بہت سارے دُکھوں کی ایک ہی تو دوا مانگی تھی۔
اب زندگی کا زہر کیسے پیا جائے گا ——
خُداوندا ——
او خُداوندا ——
بہلا دے دے کے چھین کیوں لیتا ہے۔
اور اے بھولے بھٹکے —— آوارہ اور بے خانماں راہی ——
جب یہ تیری منزل نہ تھی —— تو یہاں پڑاؤ کیوں ڈالا ——
اور اے بدنصیب جوگن ——
اتنی جلدی تو نے ایک مُسافر کی خاطر کیوں جوگ لے لیا —— تیرے تن من کی
مالا —— بیچ راہ میں بکھری پڑی ہے —— دانہ دانہ کراہ رہا ہے —— اور دل کا کشکول
دو ٹکڑے ہو چکا ہے ——
پا پیادہ —— بھُوکی پیاسی . . . جنم جنم کی ترسی ہوئی جوگن . . . کیسے زندگی
سے نباہ کرے گی تو —— تیرے آنسوؤں نے تو راہ دکھانے والی مشعل بجھا دی ہے۔
کہاں سے روشنی مانگنے جائے گی —— ؟
سوچ سوچ کر . . . اور رو رو کر جب اُس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی —— تو وہ
تھک کر باہر آ گئی۔ ذرا سی دیر میں اس کی حالت مُردوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ اُسے ایسے
محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ برسوں کی بیمار ہے —— وہ ایک سایا ہے۔ بارُوح ہے

جو اپنے جسم کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ گھر کے سارے فرد گہری نیند سوئے ہوئے تھے
بھی علم نہیں تھا کہ اُس کے دِل پر کیا بیت رہی ہے؟
باہر چودھویں کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہی چاندنی جو ہمیشہ سحر آلود چادر
دنیا پر بچھ جایا کرتی تھی۔ آج سفید رنگ کی ایک بھیانک جادوگرنی لگ رہی تھی
بڑی اور خوفناک آنکھیں کھولے۔ ساری دُنیا پر کالا منتر پھونک رہی تھی۔
دُنیا ساکت اور بجھی بجھی سی تھی۔
چاند ڈوب جائے ـــــ چاندنی کو اندھیرا نگل لے۔
خدایا ـــــ خدایا ـــــ
آمنہ نے اپنا دل تھام لیا۔
آج کی رات اپنی یہ خوبصورت قندیل بجھا دے۔
آج اس کے جوبن کو آگ لگا دے۔
آج یہ ہمیشہ کی طرح کیوں مُسکرا رہا ہے....
اس کو معلوم نہیں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟
میری تو دُنیا ہی زیر و زبر ہو گئی ہے۔ مگر اس دُنیا کے چلن میں کوئی فرق نہیں
ہر شے جوں کی توں ہے۔
ذرہ برابر بھی تو کسی نے میرے دِل کے ٹوٹنے کا ماتم نہیں کیا۔ اور نہیں تو اس
چاند کو ہی سیاہ بدلیاں اپنی لپیٹ میں لے لیتیں ـــــ کوئی تو میرے مقدر پہ بھی آنسو
پہلے تو وہ ایک ناکام تمنا کی طرح سارے گھر میں منڈلاتی پھری۔ جب چین نہ آیا
چھت پر چلی گئی۔
چھت پر یہ نظارہ اور بھی قیامت خیز تھا۔
چاند اُس کے سر پہ آگیا تھا۔ اور چاندنی اتنی اُجلی تھی جیسے دُودھ کی نہر میں نہا
اور اس دُودھیا چاندنی نے اس کے ذہن میں ماضی کے کئی دریچے کھول دیئے تھے۔

وہ رات....
جو زندگی کی سب راتوں سے حسین تھی۔
جب رات حماد نے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹیک کر اُسے پہلا سجدہ کیا تھا....
پھر اس کے بعد تو اُس کی سرکش تمناؤں نے بھی ہار مان لی تھی۔
حماد کے علاوہ اُس نے کبھی کچھ نہیں سوچا تھا۔

حماد ـــــ

حماد ـــــ

اس نے بچوں کی مانند چاروں طرف بلک بلک کر اُس کو صدائیں دیں... بُلند آواز
بار بار اُس کا نام لیا۔
لوگ کہتے ہیں دِل سے نکلنے والی صداؤں میں اثر ہوتا ہے۔
لوگ کہتے ہیں سچی تڑپ رائیگاں نہیں جاتی۔
لوگ کہتے ہیں۔ دِل سے جسے یاد کرو وہ بھی بے چین ہوئے بغیر نہیں رہتا۔
لوگ تو جھوٹ کہتے ہیں.... سب من گھڑت باتیں ہیں.... آکر دیکھو تو ـــــ
میں سراپا ایک صدا ـــــ ایک پُکار ـــــ ایک آہ اور ایک کراہ بن چکی ہوں۔
سانس کی جگہ بھی میرے مُنہ سے حماد ہی نکلتا ہے۔ میری رُوح صلیب پہ لٹکی ہوئی ہے
کیا تمہیں میری فریاد نہیں تڑپا رہی....
کیا میری آواز محض در و دیوار سے ٹکرا کر دم توڑ رہی ہے ـــــ
کیا میری محبت میں کھوٹ ہے؟
بولو ـــــ کہاں ہو تم ـــــ کہاں ہو ـــــ؟ ـــــ کہاں ہو ـــــ؟
کیا گزرے ہے ہوا اس وقت ـــــ کیا گزر رہی ہے تمہارے دل پر ـــــ ایک بار آکر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بتاجاؤ — کیا مجھ سے بھی دگرگوں حالت ہے تمہاری — یا تمہیں کچھ احساس…
ہم نے تو مل جل کر ایک دوسرے کے دکھ اٹھانے کا عہد کیا تھا — پھر تم اپنے…
سمیٹ کر الگ کیوں ہو گئے —

ابھی تو ہم دونوں کے کندھوں پر ان کہے دکھوں کا بوجھ تھا۔ ابھی تو انا کی…
دلوں میں ہی تھا۔ خوش آیند وقت کے لئے ہم نے تو دکھ بھری بانسریاں چھیڑی…
کہ جدائی کا موڑ آ گیا —

کیوں — کیوں — کیوں آخر — ؟

تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا — حماد —

تم کو ایسا نہ کرنا تھا —

ساری دنیا منہ پھیر لیتی — ایک تم نہ میرا ساتھ چھوڑتے۔ لوگ تمہارا…
دیتے — تم سے سب کچھ چھین لیا جاتا — ننگے پاؤں تمہیں گرم ریت پر…
یا بیچ چوراہے میں لٹکا کر تمہیں گرم سلاخوں سے داغتے — تم تب بھی مجھے…
حوالے نہ کرتے — ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے دل میں چھپا لیتے —

پر ایسا تو کوئی موڑ بھی نہ آیا — اور تم مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چل دیئے
مجھے بے رحم دنیا کے سپرد کر دیا تم نے — کوئی اور ظلم ڈھا لیتے ایسا…
— میں تو وہ اندھی ہوں جسے اس دنیا میں صرف تم ہی تم نظر آتے ہو — تم…
لاٹھی ہو — تم ہی میری روشنی ہو — اور تمہارے سوا مجھے کچھ سجھائی نہیں…
تمہارا ہاتھ تھامے بغیر میں کس طرح چل سکوں گی۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھاؤں گی
گروں گی — چوٹ کھاؤں گی — اور لڑکھڑاتی جاؤں گی —

لیکن کیا تمہارے بغیر میں جی سکوں گی — ؟

مجھ پر تو آج کی رات بھاری ہے —

صبح تک اگر تم نہ آئے تو —

تو ...... تو ......

نئی صبح تمہارے بغیر کیسے ہوگی بھلا — ؟

میں تو تمہارے بغیر جینے کا انداز ہی بھول گئی ہوں۔ تم سامنے نہیں ہو گے تو اس دنیا
کو میں کیسے دیکھ سکوں گی —

پھر سب کے ساتھ کیسے چلا جائے گا —

کیسے جیا جائے گا — ؟

خود کو فریب کیسے دیا جائے گا — ؟

آجاؤ — حماد لوٹ آؤ — شاید میں تمہارا انتظار کرنے سے پہلے دم توڑ…

دل —

حماد — حماد —

دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے وہ روتی رہی۔ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی —
یوں تو اس گھر میں وہ بات بے بات روتی تھی — اور رونے کی جیسے اسے عادت
سی پڑ گئی تھی۔ مگر آج کا یہ سیلاب جو اس کی آنکھوں سے زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ خود اسے
بھی حیران کئے دے رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اتنا رو لینے کے باوجود اس کی آنکھوں
میں ابھی اتنا پانی باقی ہے۔ جو وہ زندگی بھر بہا سکتی ہے۔ آج رات اس نے اپنی زندگی
کے سارے آنسو بہا دینے کا تہیّہ کر لیا تھا۔

جن کے قدموں پر اس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ہر خواہش نچھاور کر دی تھی —
آج اسی کی یادوں کو وہ زندگی کے سارے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔
بارہا یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے سرگوشیاں کی تھیں اور کبھی آمنہ نے سوچا بھی نہ تھا
کہ کبھی وہ یہاں تنہا بیٹھی اس کے قدموں کے نشان ڈھونڈ رہی ہو گی ....

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

زندگی ہے یا کسی کا انتظار . . . .

دُور کہیں ریڈیو بج رہا تھا۔ اُس کی ہچکیاں ذرا کبھی تو نغمے کی صدا اُس کے کانوں سے ٹکرائی ——

زندگی ہے یا کسی کا انتظار . . . .

زندگی ہے یا کسی کا انتظار . . . .

انتظار . . . . انتظار . . . . . اوّل تا آخر انتظار . . . .

آنے والوں کا انتظار —— چھوڑ کر جانے والوں کا انتظار ——

خوابوں میں ستانے والوں کا انتظار ——

انجانے مہانوں کا انتظار ——

زندگی کا انتظار —— اور موت کا انتظار ——

واقعی —— زندگی صرف انتظار ہے ——

سکھی ری نہیں آئے سجنوا موے . . . .

جانے کب پہلا گیت ختم ہوا تو دوسرا شروع ہو گیا —— شاید کسی اسٹیشن پر پرانے گیت بج رہے تھے۔ اور شب کے سناٹے میں ہوا اِک اِک بول اُڑا کر آمنہ کے پاس لا رہی تھی۔

یہ گیت آمنہ کا پسندیدہ گیت تھا۔ حماد کے آنے سے پیشتر بھی۔ وہ یہ گیت بجا کر ریڈیو کے پاس آ جایا کرتی تھی۔ اور تنہائیوں میں بھی اکثر یہی گانا گنگنایا کرتی تھی۔ اُس نے اس گیت کو ہمیشہ کسی اور ہی دُھن میں سنا اور سراہا تھا۔ مگر آج جن حالات میں وہ یہ گانا سن رہی تھی۔ اُس نے گانے کا مفہوم اس پر واضح کر دیا تھا۔

جھوٹے تھے سب وعدے اُن کے جھوٹی قسمیں ساری تھیں

بیت گئے ہیں بھول گئے وہ اُلفت کی سب رسمیں

یاد کریں اکھیاں برسیں سینے سے اُٹھت ہے شور!

سکھی ری نہیں آئے ——

ہائے ——

آمنہ نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر دل میں اٹھتی ہوئی درد کی لہر کو روکا۔

گیت اتنے سچے ہوتے ہیں کہ دل کے ٹکڑوں کو بار بار زخمی کرتے ہیں۔

گیت زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

گیت ہمارے بے زبان جذبات، اور گونگے احساسات کی مُنہ بولتی تصویر ہوتے ہیں آہیں اور کراہیں جو کیفیات بیان نہیں کر سکتیں وہ گیت کا ایک ایک بول عیاں کر دیتا ہے . . . .

پھر نیا گیت شروع ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی آنسوؤں کا تازہ دم ریلا آمنہ کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

اُوہ ——

آمنہ سر اِدھر اُدھر پٹخنے لگی۔ آخر دُنیا میں خوشی کے گیت بھی تو گائے گئے ہیں۔ جن میں ملن کی آس اور اُمید کی روشنی ہوتی ہے ——

یہ آج ساری دُنیا کو کیا ہو گیا ہے —— دہکتے انگاروں کو کون ہوا دے رہا ہے —— اور پُرانے گیتوں کے بول برچھیاں بن کر دل میں لگ رہے ہیں۔ خُدارا کوئی ریڈیو بند کر دو ——

اتنی اداس فضا —— اتنی دم بخود چاندنی —— سسکتا ہوا چاند —— ایسے میں مایوس کُن گیت۔ نہیں نہیں۔ آمنہ زار و قطار پھر رونے لگی . . . . گیت کا اِک اِک بول اُسے صاف سنائی دیتا رہا اور تڑپاتا رہا —— اور پھر تنہا میں ایک ایسے پُر سوز اور رُوح میں اُتر جانے

والے نغمے کی صدا گونجی کہ آمنہ کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا —— کبھی کبھی گیت
ماحول کو کس قدر افسردہ اور بوجھل بنا دیتے ہیں۔ یہ اُس کو آج ہی احساس ہو رہا تھا۔

تم تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا
لوٹ آؤ میرے پردیسی بہار آئی ہے

آج رات گیت بھی اُس کے دشمن بن گئے —— سینکڑوں بار سُنے ہوئے
اس پہ کیسی قیامت توڑ رہے تھے —— اُس کا دِل چاہ رہا تھا گریبان تار تار کر
دیواروں سے ٹکرا کر مر جائے ——
جانے والے کبھی لوٹ کر بھی آتے ہیں —— یا زندگی اُن کو پکار پکار کر تھک
ہے ——

لوٹ آؤ میرے پردیسی .....
لوٹ آؤ ——————
لوٹ آؤ ——————

کائنات کا ذرہ ذرہ ایک صدا بن گیا تھا —— نہ جانے اُس کا دِل کہاں ڈ
رہا تھا —— اُسے تو زمین و آسمان سے التجائیں سنائی دے رہی تھیں —— ا
کی التجائیں ——

بند کر دو یہ آواز خدارا ——
خاموش ہو جا مغنیہ ——
خدا کے لئے خاموش ہو جا ——

وہ دیوار سے سر ٹکرا کر نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں ڈھیر ہو گئی۔

اُس روز کے بعد آمنہ چارپائی پر ایسی پڑی کہ کوئی اُس کے مرض کی تشخیص نہ کر سکا۔
اصل میں وہ گذشتہ شب —— ساری رات چھت پہ بیٹھی روتی رہی تھی۔ جب
صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو اسے محسوس ہوا، اُس کا سر ہی نہیں سارا جسم بھی دُکھ رہا تھا۔ بمشکل
خود کو گھسیٹ کر وہ اپنی کوٹھڑی تک گئی اور بستر پہ بے سُدھ ہو کر گر گئی۔ اُس کی آنکھ تب
کھلی جب سارے گھر والے اُس کے گرد کھڑے اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر
رہے تھے۔

گھر والوں کو بھی گیارہ بجے کے قریب اس کا خیال آیا۔ صبح سے وہ کسی کو نظر نہیں
آئی تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ اِس لئے وہ حسبِ عادت اپنی نیند
پوری کر کے اُٹھے گی۔

وہ تو اتفاقاً بیگم ابراہیم کو کوئی چیز لینے کے لئے کوٹھڑی میں جانا پڑ گیا۔ دیکھتی ہیں کہ
سر پائنتی کی طرف ہے اور ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹک رہی ہیں۔ پنڈا سارا تپ
رہا ہے۔ انہوں نے ماتھے کو چھو کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی انگارے کو چھو لیا ہو۔
گھبرا کر انہوں نے سب گھر والوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور محلے کے ڈاکٹر کو بھی بلا بھیجا۔ ڈاکٹر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے آ کر پہلے اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ پھر ٹمپریچر لیا تو وہ ۱۰۵ ڈگری
ہدایات دے کر اور نسخہ تجویز کر کے ڈاکٹر چلا گیا۔ بیگم ابراہیم نے دراہنوں کے ساتھ
کو بھی بلوا بھیجا۔ اور اس کی اچانک بیماری کی وجہ معلوم کی جانے لگی۔

بیگم ابراہیم کو خدشہ تھا کہ اُس نے حمّاد کی جدائی کو محسوس کیا ہے۔ لیکن سکینہ کا
تھا، گرمی میں ساری رات اندر پڑی سڑتی رہی ہے اس لئے اتنا تیز بخار آگیا ہے۔

تمام دن اُس نے آنکھ نہیں کھولی نہ کسی سمت دیکھا۔ اُس کی طبیعت میں ہیجا
بار بار ہاتھ پاؤں بھنچتی رہی۔ سارا دن اس کے سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی جا
تب کہیں رات گئے اس کا بخار ہلکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے بے تحاشا کمز
گئی مُردوں کی طرح چارپائی پہ پڑی تھی۔ نہ کسی کو پہچانتی اور نہ کسی کی بات کا جواب
زبردستی اُس کا مُنھ کھول کر دوائی انڈیل دی جاتی۔ غذا تو بالکل نہ لے سکتی
کے ساتھ اگر دودھ کا پیالہ یا جوس کا گلاس لگایا جاتا تو دوسری طرف سے بہہ جاتا

دوسرے دن اُس کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر بیگم ابراہیم بہت ہراساں ہو گئیں
اُنہوں نے سکینہ کی کسی بات پر کان نہیں دھرا بلکہ دو تین بڑے بڑے ڈاکٹروں کو
دوائیں بار بار بدلی گئیں۔ مگر ایک ہفتہ تک اُس کی یہی کیفیت رہی۔ ایک دفعہ
اگر کم ہو جاتا تو دوسرے وقت پھر تیز ہو جاتا۔ گلوکوز کے ذریعے اس کے جسم میں توانائی
جانے لگی۔ ڈاکٹر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ بخار کیوں اور کس وجہ سے ہوا
اس ضمن میں ڈاکٹروں میں اختلافِ رائے تھا۔ تاہم متفقہ طور پر انہوں نے ایک نسخہ
کر دیا تھا۔ اور ان کی رائے تھی کہ جلد از جلد اُسے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے۔

مگر بیگم ابراہیم اسمٰعیل کے آنے سے پہلے کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھیں۔

آٹھ دن یوں ہی گزر گئے۔ آٹھویں دن اسمٰعیل بھی آگیا۔ آمنہ کی پُراسرار
بیگم ابراہیم اتنی متوحش تھیں کہ انہوں نے اسمٰعیل کو حمّاد کے نکال دینے کے با

کچھ نہ بتایا۔ بلکہ اُس کے پوچھنے پر اتنا ہی کہا۔

"خدا معلوم کہاں گیا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ مجھے چند دنوں کے لئے کہیں جانا ہے واپسی کا کچھ پتہ نہیں۔"

اسمٰعیل کو اس بات میں کوئی کھوٹ نظر نہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ حمّاد سیلانی آدمی ہے اس سے پیشتر بھی دو چار ہفتوں کے لئے اپنے کام سے باہر جایا کرتا تھا۔ سو اسمٰعیل نے سوچا خود ہی آجائے گا۔

پھر آمنہ کی شدید علالت اور ذہنی گم شدگی نے اس کو بھی حواس باختہ کر دیا۔ اس لئے وہ حمّاد کے بارے میں زیادہ نہ سوچ سکا اس نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور بہن کی تیمارداری میں مگن ہو گیا۔ وہ ہسپتالوں کے حالات سے واقف تھا۔ اس لئے اسے ہسپتال نہیں بھیجتا تھا۔ اس کا خیال تھا اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو گھر پہ بلا کر علاج ہو سکتا ہے۔ جب خدانخواستہ معاملہ حد سے باہر ہوا تو ہسپتال کی سوچیں گی۔

وہ ڈاکٹروں کے ہاں چکّر لگاتا رہتا۔ اس کی دوائیں لاتا رہتا۔ یا اس کے پاس بیٹھ کر اُسے دوا کھلاتا۔ خدا خدا کر کے رفتہ رفتہ اُس کا بخار بالکل نارمل ہو گیا۔ اُس کے بعد اُسے دودھ اور سوپ بھی ہضم ہونے لگا۔ اس اثنا میں اُس نے ایک بار بھی آنکھ کھول کر کسی سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ اُف کیا نہ ہائے۔

یوں بے سُدھ ہو کر لیٹے اُسے پُورے پندرہ روز ہو گئے تھے۔ اُس روز دوپہر کے وقت اسمٰعیل جب اس کی دوائیں لے کر آیا تو اسے چت لیٹا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ نہ جانے اس کی پیاری بہن کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ پلنگ کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ آمنہ کی پیشانی پر رکھ دیا۔

"منّوں۔۔۔ منّوں۔۔۔" اُس نے بڑے پیار سے آمنہ کو بلانا شروع کیا۔ اُس کے سر کو اِدھر اُدھر ہلایا اور اس کے رخساروں کو تھپتھپایا۔ اس میں زندگی کے کچھ آثار

پیدا ہوئے۔

اسمٰعیل پھر اسے پکارنے لگا "منوں۔ منوں۔ میری بیٹی آنکھیں کھولو۔ آنکھیں کھولو بیٹیا۔"

اتنی پیار بھری آواز سُن کر آمنہ کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"آنکھیں کھولو۔ شاباش آنکھیں کھولو۔ میں ہوں تمہارا بھائی اسمٰعیل۔"

دھیرے دھیرے آمنہ کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ وہ سُرخ خون آلودہ آنکھیں اسمٰعیل کے چہرے پر ٹک گئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پانچ دس منٹ تک وہ غور سے اُسے دیکھتی رہی۔ اور اسے پہچان کر اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ میں ذرا سا فرق آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا ارتعاش جیسے اُس نے زیرِ لب "بھائی جان" کہا ہو۔

اُس کے فوراً بعد اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر حماد کے کمرے کی طرف جا کر اس کی نظر رُک گئی۔ اس کے کمرے کو اُس کے وجود سے خالی پا کر یکایک اس کے چہرے پر بادل کے بادل چھا گئے . . . . رنج والم کا ایک سیلاب اس کی آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ اس نے اپنی مٹھی میں اسمٰعیل کی کلائی پکڑ لی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایسے تڑپ تڑپ کے روتی کہ اسمٰعیل کو اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ اُسے تھپکیاں دے دے کر چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا . . . لاکھ جتن کرتا رہا . . . مگر وہ پاگل لڑکی روتی رہی . . . روتی رہی . . . حتّٰی کہ بے ہوش ہو گئی۔

اپنی زبان سے اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اسمٰعیل جانتا تھا وہ اپنے دل کا درد چھپائے

کچھ کہے ——

مگر کہاں —— ؟

وہ تو پھر بے دم ہو کر مُردوں کی طرح اُس کے سامنے پڑی تھی۔

اُس نے اپنی ماں کو آواز دی۔ انہیں اُس کے پاس بٹھا کر ڈاکٹر کی طرف دوڑا . . . پھر وہی والا سلسلہ شروع ہو گیا . . . .

رات کو تھک ہار کر جب اسمٰعیل اپنے بستر پر لیٹا تو وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

آمنہ کی بیماری ایک معمّہ بنتی جا رہی تھی۔

اور حماد گھر سے غائب تھا۔

کہیں اِن دونوں کی لڑائی تو نہیں ہو گئی۔

ہو سکتا ہے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔ اور وہ رُوٹھ کر چلا گیا ہو۔ اگر اُسے گھر سے جانا ہوتا تو اپنا سامان لے کر جاتا۔ یہ تو یوں لگتا ہے۔ جیسے بیٹھے بیٹھے اُٹھ کر چلا گیا ہو۔

صبح اُس کے دفتر سے پتہ کروں گا۔ تعجّب ہے مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔

اگر آمنہ اپنے حواسوں میں ہوتی تو وہ اس سے ساری بات اُگلوا لیتا۔

خیر۔ صبح دیکھا جائے گا۔

صبح دفتر سے اُسے جو خبر ملی، اُسے سُن کر اُس کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ حماد کئی دنوں سے پُراسرار طور پر غائب تھا۔ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا —— ؟ دفتر کے کسی آدمی کو کچھ علم نہ تھا۔

وہ تو ہمیشہ سے ایک جوگی تھا۔ اُس کا کوئی پتہ اور ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کہیں ایک جگہ نہ ٹکتا تھا۔ کوئی اُس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ کوئی اس کا کھوج نہ لگا سکا تھا۔ سب اُس کے کسی دن اچانک برآمد ہونے کی توقع لئے بیٹھے تھے۔

اسمٰعیل کا دل بیٹھنے لگا۔

خدا نخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو —— اگر وہ ٹھیک ٹھاک ہوتا تو جہاں بھی ہوتا۔ انہیں اطّلاع ضرور دیتا۔

مگر وہ چلا کیوں گیا تھا۔؟

وہ یہ سوچتا ہوا گھر کی طرف چلا . . . .

پھر اچانک اُسے آمنہ کا ہوش میں آنا یاد آگیا . . . .

اسمٰعیل کو پہچان کر اس کا چاروں طرف مضطربانہ دیکھنا۔ پھر حمّاد کی طرف جا کر اُس کی نظر کا ٹھہر جانا۔ مغموم ہونا اور پھر بلک بلک کر رونے لگنا۔

بات کچھ اور اُلجھتی جا رہی تھی۔

ایسا تو نہیں کہ میری امّی نے اُسے کھڑے کھڑے نکال دیا ہو . . .

بھی بعید نہیں . . . . اور صدمے کی وجہ سے آمنہ نڈھال ہو گئی ہو . . . .

وہ تیز تیز گھر کی طرف دوڑا ———

گھر آتے ہی وہ اپنی ماں کے سر ہو گیا۔

"آخر آپ سچ سچ کیوں نہیں بتاتیں امّی جان! حمّاد کیوں چلا گیا۔"

بیگم ابراہیم نے چونک کر اسمٰعیل کی طرف دیکھا۔ اور اُس کے چہرے پر تشکّر کے سائے نظر آئے۔ نظریں جھکا کر بولیں۔

"تمہارا دوست تھا۔ تمہیں معلوم ہو گا۔ میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں۔"

"میں نے اُس کے دفتر سے پتہ کیا ہے۔ مگر وہ دفتر سے بھی لاپتہ ہے۔ وہ

کہاں چلا گیا ہے؟"

اسمٰعیل تھوڑی دیر رُکا۔

بیگم ابراہیم بھی خاموش رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"تمہارا خیال ہے میں نے اُسے دفتر چھوڑ دینے کے لئے کہا تھا؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے آپ نے اُسے گھر چھوڑ دینے کو کہا ہو گا؟" اب

کا لہجہ خاصا دُرشت تھا۔

"اسمٰعیل! ہوش میں رہ کر بات کرو۔" بیگم ابراہیم نے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا انداز اختیار

کر لیا۔ "اپنے دو پیسے کے دوست کے لئے تم ماں کے ساتھ بدگمانی کر کے اُس کی توہین کر

رہے ہو۔ یاد رکھو میں تمہیں کبھی مُعاف نہیں کروں گی۔"

"میں صرف آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے اُسے کیا کہا تھا۔"

"میں کیوں ایسے چور اُچکوں کے منہ لگتی۔ چلا گیا ہو گا۔ جہاں اُس کے سینگ سمائے —

وہ ایک جگہ ٹِک کر رہنے والا کہاں تھا۔؟ ایک دن رُلتا کھلتا تمہارے یہاں آگیا تھا۔ اب کوئی

اس سے اچھا ٹھکانہ مِل گیا ہو گا۔"

آپ کی ان باتوں میں سے نہ تو میں کوئی ماننے کو تیار ہوں اور نہ سننے کو — وہ جو کچھ

تھا میں اُسے خوب جانتا ہوں۔ البتہ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے کہ آپ نے ہی اُسے

گھر سے نکالا ہے۔" اسمٰعیل نے بڑے اعتماد اور متانت سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ اب تو تم مجھے الزام دو گے ہی۔ وہ اچکّا ایسا وفادار ہوتا تو تم سے مل کر جاتا۔

تمہیں سب کچھ بتا کر جاتا۔ گولی تو اُسے میں نے ہی ماری تھی۔ مگر تم نے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

یہ سچ تھا۔ اسمٰعیل سوچ میں پڑ گیا۔

اُس کو خاموش دیکھ کر بیگم ابراہیم پھیل گئیں۔ ایک تو اِن کی خدمتیں کرو۔ اپنے منہ کا

نوالہ نکال کر دو۔ اپنے بچّوں کے دسترخوان سے اٹھا کر دو۔ اس پر اُن کی بے مروّتی ملاحظہ ہو۔

کمبخت ایسے نِکل گیا جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ جب تک گھر میں رہا . . . گھر میں دانتا کِل

کِل ہوتی رہی — چلا گیا تو بوڑھی ماں پر الزام لگوا کر — شریف آدمی ہوتا تو یہ صلہ دے

کر نہ جاتا — جانا چاہتا تھا تو جاتا — ہم اُسے زبردستی پکڑ کر تو نہ بٹھا لیتے —

پرایوں کے لئے کیا رونا ———

جو اپنی سگی ماں کا نہ ہو سکا۔ وہ کسی کی ماں کا کیا احترام کر سکتا تھا۔

میں گھر پر بھی کچھ مجھے ہی بتا کر جاتا۔ اور نہیں تو مُوا اپنا سامان ہی لے جاتا۔ بلکہ — جاتے جاتے

بھی اپنی بدباطنی کا مظاہرہ کر گیا ہے۔"

"امّی آپ تو ناحق بولے جا رہی ہیں۔" بالآخر اسمٰعیل بول اٹھا۔"کسی کے متعلق اتنی بدگ
اچھی نہیں ہوتی۔"

"اور تم جو خواہ مخواہ اپنی ماں کی طرف سے بدگمان ہو رہے ہو۔"

"امّی آخر آپ حالات کی نزاکت کا اندازہ کیوں نہیں کرتیں۔" اسمٰعیل نے زچ ہو

"کیا حالات۔ اور کیسی نزاکت ——— ؟" بیگم ابراہیم بھی چڑ کر بولیں۔"اس کے جا
ہی حالات تو خود بخود ہی ٹھیک ہو گئے ہیں۔"

اُس کا کھوج نہ ملا تو آپ کو اپنی لڑکی کی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" اسمٰعیل
آہستہ سے کہا۔

"کیا کہا ——— ؟" بیگم ابراہیم اُس طرح بولیں جیسے کسی نے انہیں فلیتہ دکھا دیا

"خبردار جو اِس قسم کی بکواس کی تو ——— شرم نہیں آتی تجھے یہ کہتے ہوئے۔ بلکہ
مردود کو اور شہ دے رہا ہے۔ اوّل تو اس کی بیماری اتفاقیہ ہے۔ اسے تو بیمار ہونے
علم ہی نہیں تھا کہ حمّاد ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔ اور اگر واقعی وہ یہ ڈھونگ رچا
تو میں اچھی طرح اس کے دماغ سے عشق کا بھوت نکال دوں گی۔ اسمٰعیل میاں، تم کسی
میں مت رہنا۔" وہ بپھر کر کھڑی ہو گئیں۔" یہ شریفوں کا گھر ہے ——— سمجھے! فلمی
نہیں ہے ——— کہ لڑکیاں جان سے گزرنے کی دھمکی دے کر من مانی شادیاں کر لیں
تو۔ ۔ ۔ ۔"

"امّی جان۔ ۔ ۔" اسمٰعیل چلّایا۔

"میں تو لیلیٰ مجنوں بننے والوں کو مزہ چکھانا خوب جانتی ہوں۔ سمجھے! اب مجھے
ہے کہ یہ بے ہوشی کے دورے۔ کیوں اس کو پڑ رہے ہیں۔ کوئی بیماری نہیں۔ یہ س
ڈھونگ ہے۔ شادی کر دوں گی۔ دماغ ٹھکانے آجائے گا۔"

امّی جان! خدا کے لئے آہستہ بولئے۔ اتنی جذباتی نہ بنئے۔ خدا کے لئے میری بات
تو سُنئے۔" اُس نے ماں کا راستہ روک لیا۔ مگر وہ اسے جھٹکا دے کر آمنہ کے کمرے کی طرف
چلیں۔

"خبردار اب مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہ کرنا۔ اور نہ میں کچھ سُننے کو تیار ہوں۔ یہ جو ڈرامہ
تم دونوں بہن بھائی مل کر کھیل رہے ہو۔ میری سمجھ میں آگیا ہے۔ اب میں وہی کروں گی جس
کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

وہ الٹی میٹم دے کر چلی گئیں۔ اور اسمٰعیل اپنا سر تھام کر رہ گیا۔
کیا کرنے آیا تھا۔ اور کیا ہو گیا۔ ؟
وہ اپنی ماں کی ضد سے واقف تھا۔ اور پھر وہ سکینہ آپا کے ساتھ مِل کر جو کچھ بھی کر گذریں بعید
نہیں تھا۔

وہ حمّاد کے جانے کا معمّہ تو حل نہ کر سکا تھا۔ البتّہ اُس نے نئی اُلجھنیں ضرور پیدا کر لی تھیں
حالانکہ اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ حمّاد کو اس کی ماں نے ہی گھر سے نکالا ہے۔

مگر پھر بھی وہ سوچتا ——— مجھے اطلاع دینے میں کیا حرج تھا۔ میں اِس وقت
گھر نہیں تھا۔ مگر وہ مجھے خط تو لکھ سکتا تھا نا ——— ؟ لیکن خیر ——— یہ تو بعد میں سوچنے والی
بات تھی۔ واقعی!

حمّاد بھی پُراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اُسے حمّاد پر غصّہ آنے لگا۔
ایسا سیانا ہو کر کیسی فضول حرکت کی ہے۔ آخر رُوپوش ہونے کی بھی کوئی تُک ہے!
کبھی اُس کا دل چاہتا کہ اخبار میں اس سے التماس کرے ——— مگر یُوں اُس کے
اور اپنے تعلقات کو مشتہر کرنا اسے اچھا نہ لگا۔
اُس نے دِل میں سوچا۔ وہ شہر کا چپّہ چپّہ چھان مارے گا۔ مگر اُسے ڈھونڈ کر لے
آئے گا۔

اس روز ایک طویل عرصے کے بعد یعقوب آگیا۔

آمنہ کو بیمار ہوتے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ وہ اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ خود اُٹھ کر بیٹھ
سکتی تھی۔ تین ہفتے تک تو اُس نے کسی کے ساتھ بات تک نہیں کی۔ ڈاکٹروں کا
تھا کہ کسی اچانک صدمے سے اس کی حالت ایسی ہو گئی ہے۔ مگر اب دواؤں کے
استعمال اور اسمٰعیل کی تشفیوں سے اُس کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ مگر
وہ گھر میں کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔ سارا دن گم صُم لیٹی رہتی اور پھر گھر
کون جس کے ساتھ وہ بات چیت کرتی۔

جب تک اسمٰعیل گھر پر رہتا، سو طرح سے اُس کی دلجوئی کرتا۔ اُس کے ساتھ زیادہ
زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا جن کا وہ عام طور پر ہوں ہاں میں جواب دیتی رہتی
اس کے جانے کے بعد تو گھر پر ایک رُوح کش سناٹا چھا جاتا۔

جب سے بیگم ابراہیم کو آمنہ کی بیماری کی اصل وجہ معلوم ہوئی تھی وہ اس
ساتھ اور بھی تن گئی تھیں۔ اُن کا خیال تھا، خاموش رہ کر، اور کھانا پینا چھوڑ کر وہ
پر دھونس جما رہی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر ہم اُس

...ادی ... سے کردیں گے۔ مگر وہ اُس کی کسی بات میں نہیں آئیں گی، بلکہ اُسی کو اُن کے آگے
جھکنا پڑے گا۔

وہ دانستہ اُس کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کرتیں۔ سامنے آتیں تو تیوریوں پر بل ڈال لیتیں
...ں سے ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کی بجائے اُس پر گاہے گاہے طنز کرتیں....
...سے کھانے پینے کے لئے مجبور نہ کرتیں۔

اور یہ سب کچھ سکینہ آپا کے مشورے سے ہو رہا تھا۔ سکینہ آپا تو پہلے بھی کم آتی تھیں۔
...ب تو اور بھی آنا کم کر دیا تھا۔ ہر وقت اپنی ماں کو مجبور کرتیں کہ وہ جلد از جلد آمنہ کی شادی
...ردیں۔ شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

آج کل وہ دونوں سر جوڑ کر اس کی شادی کے بارے میں مشورے کیا کرتیں۔
...ن کا خیال تھا کہ دیر کرنے سے معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

آمنہ کی زبان بند تھی۔ مگر آنکھیں تو سب کچھ دیکھتی تھیں اور سمجھتی بھی تھیں۔ وہ
دعا کرتی کہ کاش یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں تاکہ جو کچھ ہو رہا ہے.... وہ
نہ دیکھ سکے.... اور انتظار کی وہ آگ جو اُس کی آنکھوں میں جل رہی ہے....
بجھ جائے۔

بیماری کیا تھی ——؟

بس پلنگ پر پڑے پڑے وہ اپنا آپ کھائے جاتی۔

کوئی آیا تو اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"منی آپا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ دھیرے سے آمنہ کے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا
"کوئی تو آ گیا ہے ——؟" آمنہ کے مُردہ چہرے پر رنگ سا آ گیا۔ "اچھا کیا کہ تو
آ گیا...." وہ سوگواری سے ہنسی۔ "تجھے دیکھنے کی حسرت کہیں قبر میں میرے
ساتھ نہ جاتی۔"

"منی آپا ——" کھردا سا کوبی تڑپ اٹھا۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ... کیا کرے۔ اس مرتبہ وہ ایسے بکھیڑوں میں اُلجھا رہا کہ اپنی بہن کی خبر نہ لے سکا۔ اس نے وعدہ بھی تو کیا تھا کہ اب وہ کوئی کام کر کے ہی آئے گا۔ اس لئے بیچارا کام سیکھتا رہا۔ آج تو وہ اپنی بہن کو خوش خبری سُنانے آیا تھا۔ یہاں آکر جو اُس کی حالت دیکھی تو سناٹے میں آگیا۔

"مگر منی آپا۔ میں پوچھ رہا ہوں۔ تجھے کیا ہوگیا ہے؟" اُس نے بے قراری سے۔۔

"بس دیکھ لے۔ کیا ہوگیا ہے؟" آمنہ نے کروٹ بدلی۔ شاید اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ چھپانا چاہتی تھی۔

"تو اتنی کمزور ہوگئی ہے منی آپا۔ کیا تو بہت بیمار رہی ہے۔ پچھلی دفعہ جب آیا تھا تو تو اچھی بھلی تھی"۔

"حالات بدلتے دیر نہیں لگتی کوبی۔ اِس دُنیا نے مجھے بڑے دُکھ دیئے ہیں" یہ کہہ کر آمنہ رونے لگی۔

کوئی ہمدرد نظر آجائے تو رُکے ہوئے آنسو زبان بن جاتے ہیں۔

"ہم نے چند بُرا چاہنے والوں کا نام دُنیا رکھ چھوڑا ہے۔ دُنیا کسی کو دُکھ نہیں دیتی، دُکھ صرف اپنے ہی دیتے ہیں"۔ بدتمیز، بیہودہ اور راندۂ درگاہ کوبی نے بڑے پتے کی بات کہہ دی تھی۔ آمنہ اور زور سے رونے لگی۔

"نہ رو۔۔۔ منی آپا نہ رو۔۔۔" اکھڑ سے کوبی کو چُپ کرانا بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اُسے چمکار رہا تھا۔ اس سے اپنی بہن کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔۔۔ وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر چُپ کرانا چاہتا تھا۔۔۔ مگر خود اُسے کسی نے سینے سے نہ لگایا تھا۔ اُسے کیا معلوم یہ کیسے کرتے ہیں۔۔۔ اور پھر یہ درست ہے یا نہیں۔۔۔

بس آمنہ روئے جا رہی تھی اور اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھتا جا رہا تھا۔

"آپا تجھے پتہ ہے۔۔۔" بالآخر اُس نے بات بدلی۔ "میں نے نوکری کر لی ہے"۔

"سچ؟" آمنہ نے آنسو بھری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

"ہاں آپا۔ میں جس ورکشاپ میں کام سیکھ رہا تھا۔ اب وہیں پر مجھے دو سو روپے ماہوار پر نوکری مِل گئی ہے۔ آج مجھے اپنی پہلی تنخواہ ملی ہے۔ اور میں تجھے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں تیرا اُدھار چکانے آیا ہوں"۔

آمنہ روتی روتی مُسکرائی۔

"بڑا اچھا کیا بھیا۔ خود کمانے میں بڑی عزت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ بات کان میں پڑ گئی"۔

"کیسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہو آپا۔؟ لے۔۔۔ تو اپنے پیسے لے لے"۔۔۔ جیسے بچوں کو بہلاوہ دیتے ہیں۔ ایسے یعقوب نے جیب سے بٹوہ نکالا اور سو سو کے دو نوٹ آمنہ کے آگے رکھ دیئے۔

تم جیتے رہو بھیا۔ خدا کرے دو سو سے دو ہزار اور دو ہزار سے دو لاکھ بناؤ۔ میں انہیں لے کر کیا کروں گی۔ رکھ لو اپنے بٹوے میں"۔ اُس نے نوٹ اٹھا کر کوبی کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

مجھے معلوم ہے منوں آپا —— تیرا قرض اس سے زیادہ ہے۔ فی الحال یہ رکھ لو۔ آہستہ آہستہ سب اُتار دوں گا"۔

"پگلے"۔ آمنہ سوگواری سے مُسکرائی۔ "بہنیں بھائیوں کو دیتے ہوئے پیسے کبھی واپس نہیں لیتیں۔ قرض کہہ کر تو میں اس لئے دیتی تھی کہ تجھے فکر رہے اور تو کوئی کام کرنا شروع کر دے۔ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمائے۔ تاکہ تجھے پیسے کی قدر معلوم ہو۔ بس میرا مقصد حل ہوگیا ہے۔ تجھے کمانے کی عادت پڑ گئی ہے اور پھر اب مجھے پیسے لے کر کیا کرنا ہے۔

میری تو کوئی ضرورت ہی نہیں . . . ."

"مُنی آپا۔ اگر تم نے یہ پیسے واپس کر دیئے تو میں سمجھوں گا تو بھی مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتی ؟" کوبی نے منہ پھُلا لیا۔

"کوبی۔ میرے بھیا! تجھے بھی تو ضرورت ہو گی پیسوں کی۔ اگلی تنخواہ میں سے لوں گی۔ فی الحال یہ پیسے لے جاؤ . . . ."

"اگر تم نے ایسا کہا تو آئندہ میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔"

"اچھا یوں کر لو۔ ایک سو مجھے دے جاؤ اور ایک سو تم لے جاؤ۔"

"کیوں آپا —— ؟"

"تم سارا مہینہ کیا کرو گے ؟"

"اگر مجھے ضرورت ہوئی تو مُنی آپا تجھ ہی سے اُدھار لے جاؤں گا۔"

آمنہ ہنس پڑی۔

"لے لے . . . . ہاں . . . . لے لے . . . ." بے ڈھنگے پن سے کوبی نے اُٹھا کر آمنہ کی مٹھی میں دے دیئے۔

"قرض لینے کی عادت تو چھوڑنا نہیں چاہتا . . . . ہے نا ؟" آمنہ نے مجبوراً لے لئے اور انہیں اپنے تکیئے کے نیچے رکھ دیا۔ "میں تو تیری یہ عادت چھڑوانا چاہتی"

"یہ بھی چھوٹ جائے گی آپا۔ بس تو دیکھتی رہ۔ اب تیرا یہ نکھٹو بھائی بڑا سنجیدہ ہو گیا ہے۔" وہ سینہ پھُلا کر بولا۔

"تو واقعی بڑا اچھا ہو گیا ہے کوبی۔"

"تو کہا کرتی تھی نا آپا کہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو جا۔ اب میں بڑی محنت سے کام کرتا ہوں۔ میرا مالک مجھ سے بہت خوش ہے۔ وہ کہتا ہے اگر میں اسی لگن اور محنت سے کام کرتا رہا تو وہ مجھے الگ ورکشاپ بنا دے گا۔

جب میں اپنا الگ ورکشاپ بناؤں گا۔ تب میں تمہیں اپنے پاس لے جاؤں گا۔"

وہ آمنہ کو اور خوش کرنے لگا۔ "یہاں تجھے سب تکلیف دیتے ہیں۔"

"تیرا گھر —— تیرا گھر کہاں ہے پگلے ؟"

"اپنا ورکشاپ بناتے ہی خدا کی قسم اپنی بہن کے لئے ایک شاندار کوٹھی بناؤں گا۔" وہ اونچی آواز سے بولا۔

"اللہ وہ دن بھی ضرور لائے گا۔ میں تو تیرے لئے ہر دم دُعا کرتی ہوں کوبی۔" آمنہ نے کمزور آواز میں کہا۔

کوبی کی بلند آواز سُن کر بیگم ابراہیم بھی اُسی طرف آ گئیں۔

دونوں کو یوں آپس میں گھل مِل کر باتیں کرتے دیکھ کر انہیں بہت طیش آیا۔

یعقوب تو ویسے بھی ہمیشہ اُن کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ پھر اُس کا کبھی کبھار دھڑلے سے آجانا اور آمنہ کو مِل کر چلے جانا انہیں ہمیشہ بُرا لگتا تھا۔ اپنی ماں سے اُس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی اُسے دیکھتے ہی کوسنے اور گالیاں دینے لگتیں۔ پہلے پہل وہ ان کوسنوں کا ڈھٹائی سے جواب دیتا تھا۔ مگر اب کچھ عرصے سے وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ ویسے اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ جب بھی وہ آمنہ سے مِلنے گھر آئے اُس کا ماں سے سامنا نہ ہو۔

کیا فائدہ —— ؟

وہ کبھی بٹیا کہہ کر اُسے کلیجے سے نہ لگائیں گی۔ اور وہ کبھی جھک کر انہیں آداب نہ کر سکے گا۔

آج —— اس وقت کوبی کو یہاں دیکھ کر انہیں اُس کی تمام تر گستاخیاں اور کردہ و ناکردہ گناہ یاد آ گئے۔ یوں بھی جب سے انہوں نے آمنہ کے ساتھ زیادتیاں شروع کی تھیں، انھیں یوں لگتا تھا کہ ہر آئے گئے سے آمنہ بس اُنہی کی شکایتیں کرتی رہتی ہے حالانکہ

وہ غریب تو آہ بھرنے کے لئے بھی منہ نہیں کھولتی تھی —— زبان کھول دیتی
ہی کیوں آتی —— ؟

اس وقت بھی انہوں نے یہی سمجھا کہ یعقوب جیسے نڈر اور بے حیا آدمی کو
اُن کے خلاف ایک محاذ بنا رہی ہے۔ اس لئے آتے ہی —— آؤ دیکھا نہ تاؤ
اُس پر برس پڑیں۔

"او ناخلف —— ناہنجار —— بدنصیب لڑکے —— تو پھر اس گھر میں گھس آیا
ہے۔ میں نے تجھے سو دفعہ یہاں آنے سے منع کیا ہے۔ تو ہمارے لئے مر گیا
تیرے لئے —— آخر تو اپنا کالا منہ لے کر بار بار ادھر کیوں آ نکلتا ہے۔ تیرے بغیر
سب بڑے چین سے جی رہے ہیں۔"

کوبی نے سر جھکا لیا۔ اور خاموش بیٹھا رہا۔

آمنہ کے چہرے پر دلی کرب اور دُکھ کے آثار نمودار ہوتے۔ پر آج تو اسے
رہنا تھا۔ ورنہ ہمیشہ وہ کوبی کی حمایت میں بولا کرتی تھی۔ لیکن اب تو وہ اپنے حق
بھی دستبردار ہو چکی تھی۔ اُس کی حمایت کرنے کی جرأت کہاں سے لاتی —— ؟

دونوں کو خاموش دیکھ کر بیگم ابراہیم کا دل تھوڑا سا پسیجا۔ مگر وہ اپنی ارمانوں
میں سے نہیں تھیں۔ اسی رفتار سے دوبارہ شروع ہو گئیں۔

"یہ گھر ہے۔ آوارگی کا اڈہ نہیں ہے۔ تم لوگوں نے گھر کو کیا سمجھ رکھا ہے؟
چاہا تو آ گئے —— دل نہ چاہا تو دفعان ہو گئے۔ تمہارے دیکھا دیکھی —— ہر
بور اُچکا دندناتا چلا آتا ہے۔۔۔ کم بختو۔ تم شرافت سے رہو تو کسی دوسرے کو
کرنے کی جرأت کیوں ہو —— ؟"

آمنہ کے دل میں کانچ کی کرچیاں چبھیں اور خون کے قطرے اُس کی آنکھوں
ٹپکنے لگے۔ یہ صریحاً اُسے سنانے کو کہا جا رہا تھا۔

اور جب تیرا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں تو تو یہاں کیا کرنے آتا ہے —— کیوں
یہ منحوس شکل دکھا کر ہماری طبیعت خراب کرتا ہے —— یہی اگر تیری کچھ لگتی ہے تو
اس کو بھی ساتھ لے جا —— اس گھر سے نکلنے کے لئے تو اُس نے پہلے ہی ڈھونگ
رچا رکھا ہے۔ شرافت سے اس گھر میں نہیں رہنا تو دفعان ہو جاؤ اور کسی دوسری
جا کر اپنے دل کا زہر نکالو۔"

یکایک کوبی کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ آمنہ کی پوزیشن بھی خراب کر رہا ہے۔ وہ
کھڑا ہو گیا۔ الوداعی نظروں سے اُس نے آمنہ کو دیکھا اور سر جھکاتے جانے کو مڑا۔

اُس کی یہ بیگانگی بیگم ابراہیم کو اور بھی جلا گئی۔

"خبردار جو تو نے اب اس گھر میں قدم رکھا۔ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا" انہوں نے
زی برچھی پھینکی۔

اور آمنہ کو یوں محسوس ہوا، روشنی اور ہوا کا ایک اور روزن بند ہو گیا ہے۔ اُس کا
دم گھٹنے لگا اور اُس پر پھر بے ہوشی کا دورہ پڑنے لگا۔

آمنہ کو چُپ لگے اور بیمار ہوئے پُورے دو مہینے ہو گئے تھے۔ گھر کی فضا میں کا
نہیں آئی تھی۔ وہی کھنچاوٹ اور وہی تلخی۔

ہاں دو باتوں کی پُرزور کوشش کی گئی تھی۔ ایک تو اسمٰعیل نے حماد کو ڈھونڈنے
کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے پُرانے و نئے پتوں پر اُسے ڈھونڈا تھا۔ اُس کے
اقارب کے پاس گیا تھا۔ اُس کے دوست و دشمن سب کا درچھان مارا تھا۔ جہاں بھی
چلتا کہ اُس کا کوئی رشتے دار یا دوست رہتا ہے۔ وہ وہاں جا پہنچتا۔ جہاں بھی جا
لئے پیغام چھوڑ کر آتا۔ کہ دوست جیسے بھی ممکن ہو جلد آکر مجھے مِلو۔

اور پھر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔

ہر دفعہ جب وہ اُس کا پتہ کرنے جاتا۔ آمنہ کو تسلّی دے کر جاتا۔ اگرچہ آج تک
نے اپنے مُنہ سے اسمٰعیل کو کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر اُس کی بولتی نگاہیں ——— ہر لمحہ
اسمٰعیل سے کر رہی تھیں۔ اسمٰعیل اُسے کیسے ٹھکرا سکتا تھا؟ وہ جاتے ہوئے
الفاظ میں اُس کی ڈھارس بندھاتا۔ "میرا خیال ہے آمنہ! آج حماد کا پتہ ضرور
اور ہو سکتا ہے کہ آج کل میں وہ خود بھی آجائے۔ مجھے بھی اُس سے کئی ضروری

لیکن جب چند دِنوں بعد اُس کی وہ مہم بھی ناکام ہو جاتی تو آکر کہتا "ہم بھی تھک کر
نہیں بیٹھیں گے۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب اُس کا رنج دُور ہو گا۔ تو وہ خود ہی
آجائے گا۔ مجھے یقین ہے۔۔۔"

دو مہینے ——— آس اور یاس کے گھروندے بناتے اور ڈھاتے گذر گئے تھے۔

اور اب آمنہ نے ہر آس توڑ دی تھی۔

وہ بھی کٹھور نکلا ——— اپنی آن پیاری رکھی۔ کسی کی جان جانے سے اُسے کیا۔

اور پھر اُس نے صبر کر لیا۔ کہ جب وہ ہی ساتھ چھوڑ گیا پھر اوروں سے کیا شکوہ؟ اور کس
برتے پر ———؟

اپنوں سے ناطہ توڑ کر، بیگانے کو اپنا بنایا تھا۔ وہ بیگانہ ہی نکلا ———؟ اس میں
اپنوں کا کیا قصور ———؟ اور اُن کی زیادتیوں کا کیا گلہ ———؟

اور پھر ایک دن اُس نے اسمٰعیل سے بھی کہہ دیا کہ ——— بھائی جان! آپ کیوں ہلکان
ہو رہے ہیں۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیجئے۔ جن کاموں کو سنورنا ہو وہ بگڑتے نہیں۔۔۔
یونہی ہونا تھا ہو چکا۔۔۔

یہ تو اسمٰعیل جانتا تھا کہ اُس کے اِن الفاظ میں کتنے گلے اور شکوے رو رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ ———

بیگم ابراہیم اور سکینہ نے آمنہ کا رشتہ مسٹر موزاِل سے ٹھہرا دیا۔ سکینہ تو دِل سے
چاہتی تھی کہ موقع ملے اور وہ اپنی بات منوا کر اُن سب کو نیچا دکھائے۔ جنہوں نے اُسے
بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ پھر لڑکی ان لوگوں کی دیکھی بھالی تھی اور اُنہیں
پسند بھی آئی تھی۔ اب کسی نئی جگہ رشتہ طے کر کے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں دکھانا چاہتے تھے۔
سکینہ نے اپنی ماں کی تسلّی یہ کہہ کر کرا دی تھی کہ اِن لوگوں کو بتا دیں گے کہ شادی سے
پہلے آمنہ کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ رُقعے چھپ چکے تھے۔ اس لئے

تاریخ بدلی نہیں جا سکتی۔ کچھ دن میں اُس کی کمزوری دُور ہو جائے گی اور یہ ٹھیک ہو
جائے گی۔ اور شادی کے بعد جب گھر میں اُسے اچھا کھانے اور پہننے کو ملے گا تو وہ
ٹھیک ہو جائے گی۔

چنانچہ لڑکے کے لئے انگوٹھی اور ببس سیر لڈو اُن کے گھر بھجوائے جا چکے تھے۔ اُنہوں
نے بھی جواب میں ایک ساڑھی اور ایک من مٹھائی بھجوا دی۔ گویا بات پکّی ہو گئی۔
منگنی کی رسم باقاعدہ ادا نہیں کی گئی تھی۔ لڑکے والوں سے کہا گیا تھا چونکہ ہم شادی
کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اِن فضول رسموں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بات طے
ہو چکی ہے۔ شرفا کا یہی قول ہوتا ہے۔ اب شادی کی تیاریاں کریں۔

اُس کے بعد طرفین نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور سکینہ آپا کی گرا
بنی دونوں طرف کے لوگوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کر رہی تھیں۔ اُدھر سارا اہتمام
کرنے کے بعد بات پکّی کر کے بیگم ابراہیم نے اسمٰعیل کو بتا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اپنا سر پیٹ
کر رہ گیا۔ اور کیا کر سکتا تھا۔؟ حماد کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ورنہ وہ یہ سارے بندھن ایک پل
توڑ دینے کا قائل تھا۔ اب سوائے خاموش رہنے کے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ ویسے اُس
نے تہیہ تو دل میں کر رکھا تھا۔ کہ اگر شادی سے ایک دن پہلے بھی حماد کا پتہ چل گیا تو وہ یہ شادی
ہونے دے گا۔ ورنہ مقدر کا لکھا سمجھ کر صبر کر لے گا۔

البتہ آمنہ کو کسی نے یہ بات بتانی مناسب نہ سمجھی تھی۔ شادی بیاہ کی تمام باتیں
طور پر ہو رہی تھیں۔ یہ تو اللہ بھلا کرے چھمی کا۔ ایک دن مٹھائی کھاتا ہوا۔ ماں کے کمرے
نکلا اور سیدھا آمنہ کے پاس آ گیا۔ اور بولا۔

"منّی آپا۔ مٹھائی کھائے گی؟"

"نہیں"۔ آمنہ نے سر کے اشارے سے انکار کر دیا۔

"واہ۔ کیوں نہیں کھائے گی۔؟ یہ تو تیری منگنی کی مٹھائی ہے"۔ وہ اٹھلاتا ہوا بولا

چھمی ——"۔ آمنہ کا لہجہ نرم ہو گیا۔ اُس نے اسے چمکار کر پاس بُلایا۔ "اِدھر آ بھیّا۔ یہ تو
بتا امی اور سکینہ آپا کیا کر رہی ہیں؟"

"اندر کمرے میں بیٹھی مٹھائی تقسیم کر رہی ہیں جی!"

"کہاں کہاں بھیج رہی ہیں؟"

"سارے محلے میں"۔

"اور کیا باتیں کر رہی ہیں"۔ اس کا دِل دھڑکا۔

"اور ... اور ..." وہ ہتھیلیاں چاٹتا ہوا بولا۔ "نعیمہ سے کہہ رہی تھیں محلے میں
سب سے کہنا کہ آمنہ کی منگنی ہو گئی ہے۔ اس لئے یہ مٹھائی بھیجی ہے"۔

آمنہ نے لاچاری سے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری اور اس طرح گردن ڈال
دی۔ جیسے اس میں قوتِ مدافعت نہ رہی ہو۔

تھوڑی دیر وہ گم صُم پڑی رہی۔ اس کے سرہانے پڑا ہوا پانی کا گلاس چھمی غٹ غٹ
کر کے پی گیا۔ اُس کا دِل چاہا کہ وہ چھمی کو بہت زیادہ پیار کرے۔ کتنا معصوم سہارا تھا چھمی
اُس کا ——

"چھمی"۔ اُس نے اُسے پیار سے پکارا۔

"جی آپا ——"

"تجھے معلوم ہے چندا منگنی کیا ہوتی ہے؟"

"نہیں جی —— ہاں جی ——"

اُس کے جواب پر آمنہ کو ہنسی آ گئی۔

"یہ نہیں جی اور ہاں جی کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں جی ... میرا مطلب تھا ہاں جی ہاں!"

"پھر بتاؤ کیا ہوتی ہے منگنی ——؟"

لیکن اُس روز بھی نعیمہ کو پھُسلا کر اُس نے پتہ کر لیا تھا کہ باہر کون آیا ہے۔ یوں اُس
اپنے جی میں اندازہ تو کر لیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔؟

اور اب ——

دُکھ کیا —— ؟

جو میں چاہتی تھی وہ ہو نہ سکا۔ اب جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔ وہی ہونے دُوں ——

اور دیکھوں خدا کو کیا منظور ہے۔؟

یوں بھی اُسے تسلّی سی ہو گئی کہ شکر ہے اُس کی قسمت مسٹر موزائل کے ساتھ وابستہ کی
ہی تھی۔ جو انتہائی احمق انسان تھا۔

اتنی گہرائیوں میں کہاں جائے گا کہ ایک لاش اٹھا لایا ہے۔

ہم تو راضی برضا ہیں۔ اب کون سی چال چلے گا مقدّر! البتہ اسمٰعیل کے پاس اتنا حوصلہ
نہ تھا کہ وہ آمنہ کو یہ خبر سُناتا یا اُسے صبر کی تلقین کرتا۔

وہ چور بنا۔ اُس کے پاس جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا —— اور اُٹھ جاتا ——

آمنہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ مگر خاموش تھی۔

سمندر کی طرح سُن اور ویران ——

دِن پر دِن بیت رہے تھے۔

اور شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

سکینہ آپا نے کہا تھا۔ شادی سے ایک ہفتہ پیشتر شادی کی تاریخ آؤٹ کریں گے۔
یا نہ ہو کہ کہیں سے اِطلاع پا کے حماد ٹپک پڑے۔ اور رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔

آمنہ ہر وقت کسی غیر متوقع حادثے کی منتظر رہتی۔ یا پڑی ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ یوں
معلوم ہوتا کہ اُس کے جسم سے کسی نے رُوح کھینچ لی ہے اور دِل کی جگہ برف کی سِل لٹکا
دی ہے۔

"منگنی شادی سے چھوٹی ہوتی ہے۔"

"کتنی چھوٹی؟"

"جتنا چھوٹا میں ہوں۔"

آمنہ ہنس پڑی۔

"پھر تیری منگنی کیوں نہیں ہوئی؟"

"نہیں آپا منگنی تو صرف لڑکیوں کی ہوتی ہے۔" وہ بڑائی سے بولا۔

"اور لڑکے کیا کرتے ہیں؟"

"لڑکے شادی کرتے ہیں۔"

بہت دِنوں بعد آمنہ بے اختیار ہنسی۔ اور خوب ہنسی . . .

آخر رونے کا یہ بھی تو ایک طریقہ ہے۔

اُسے پہلے کیوں نہ سمجھ آئی۔

اب اُسے ہنس ہنس کر رونے کا سلیقہ آیا تو اس خبر کا سوا گت ہنس کر کیوں نہ
مگر ایک خلش باقی تھی۔ اُس نے چھُٹی کو پھر سے کریدا۔

"چندا! تجھے پتہ ہے۔ میری منگنی کس کے ساتھ ہوئی ہے۔؟"

"ہاں جی۔" وہ سینہ پھُلا کر بولا "میں جانتا ہوں۔ مسٹر موزا کے ساتھ . . ."

ایک بار پھر آنسو ہنسی کی شکل میں یوں پھُوٹ پڑے . . . .

اوہ . . . تو اُس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ کئی دِنوں کی کھُسر پھُسر سے —
والے خطرے کا اندازہ لگا رہی تھی۔ پھر ایک دن مسٹر موزائل کے گھر سے کچھ خواتین
تھیں۔ وہ تو آج کل یوں بھی کسی کے سامنے نہیں آتی تھی۔ مگر اِس دن بطور خاص
بستر کوٹھڑی میں لگا دیا گیا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا سا کپکپاتا ہوا ٹیبل فین لگا دیا گیا
کی آواز زیادہ اور ہوا کم تھی۔ بڑھاپے میں یوں بھی توانائی کہاں رہتی ہے!

اِتنی اندھی ——————

اِتنی گونگی ——————

اِتنی بہری۔ تو وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔

کبھی کبھی ڈھیر سارے نقاب گرا کر کتنا لُطف آتا ہے۔

پردوں کے اندر چھُپ جانے سے بھی تسکین مِل جاتی ہے۔

جب موت سامنے نظر آرہی ہو۔ تو اُس کے متعلق خوف زدہ ہو ہو کر آدمی تھک جاتا ہے۔ آخر میں وہ اس کے اعصاب کو اس طرح شل کر دیتی ہے کہ اس کا مارا ہوا رہتا ہے اور وہ بے حسی اور پژمردگی کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

اِسی طرح شادی کے تصور نے بھی آمنہ کو نیم مُردہ اور بے حِس کر دیا تھا۔ آج

.... جیسے وہ موت کی چاپ سُن رہی ہو۔

اس دِن وہ ایک مدت کے بعد ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ جیسے ایک ہلکا ہلکا زرد پھُول تالاب کی سُبک لہروں پر ہوا کے نازک اشاروں پر رواں ہو۔

اُس کی زرد رنگت پر نِکھار سا آیا ہُوا تھا۔

اور وہ بار بار سکینہ آپا کے بچّوں کو اپنے پاس بلا کر اُن سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھی۔

شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ رقعے تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ اس روز جمعہ تھا۔ اتوار کو اُس کی بارات انتہائی کروفر کے ساتھ آنے والی تھی۔ بقول سکینہ آپا۔

وہ خود بھی اپنے چھ بچّوں سمیت ایک ہفتہ پہلے ادھر آگئیں تھیں۔ دکی بھائی دن کے وقت آجاتے اور شام کو گھر چلے جاتے۔ یوں اُن کے ذِمّے بیگم ابراہیم نے ڈھیروں کام ڈال رکھے تھے جو اُن کے خیال میں اسمٰعیل جیسا گدھا ہرگز انجام نہ دے سکتا تھا۔

اسمٰعیل خود بھی کسی کام میں بڑھ چڑھ کر حِصّہ نہیں لے رہا تھا بلکہ اُس کی شادی کو ایک ہونے والا حادثہ سمجھ کر گم صُم ہو گیا تھا۔

گھر میں خوب ہنگامہ رہتا جیسا کہ شادیوں پر ہوا کرتا ہے۔ انتظامات پر سیر حاصل بحث ہوتی مگر اس ہنگامے میں آمنہ کی شرکت یا اُس کے مشوروں کو ضروری نہ سمجھا جاتا۔ وہ اپنی

کوٹھری میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی چلتے پھرتے ہوئے اُن کا
اپنی ماں اور بہن کی گفتگو پڑ جاتی۔

اور اگر اُن کی گفتگو سُن کر اس کا دل بھر آتا تو وہ چھت پر چلی جاتی۔ چھت اُسے
کی سزا پانے والے مجرم کی طرح بے حس اور ویران لگتی۔ لیکن گھنٹوں وہ چھت پر
کے کوارٹروں کا نظارہ کرتی رہتی۔

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ذرا سی بارش کے بعد حبس اور گرمی بڑھ جا
میں بے کلی پیدا ہوتی۔

یہ موسم شادی کے لئے انہیں خوب سوجھا ہے۔

شادی کے لئے یا بربادی کے لئے ——

بربادی کے لئے تو کسی بھی موسم کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ بربادی کو ہر موسم خو
قبول کر لیتا ہے۔

یہ گھر گھر کر آنے والی گھٹائیں آمنہ کو ہمیشہ سے پسند تھیں۔

مگر بارش کے بعد اِس علاقے میں جو گندگی اُبھر آتی اُس سے ہمیشہ اُسے کوفت
برسات کے موسم میں یہ کوارٹر اور بھی غلیظ، اور بھی ملگجے لگتے۔ اس ماحول میں برسا
جیسے آشوب چشم کی ماری ہوئی لڑکی پر جوانی آتی ہے۔ جس پر بے اختیار نظر تو اٹھ
مگر دوسری مرتبہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

وہی برساتیں اُسے خون رُلانے کے لئے پھر آگئی تھیں۔ اور اب کے سال
اُس کی بارات بھی آرہی تھی۔ بارات ——

اُوہ! کتنی گہرائی اور گمبھیرتا ہے۔ اس ایک لفظ میں۔ شعور میں آتے ہی ہر لڑ
اس ایک لفظ کے گرد سینکڑوں بلکہ ہزاروں خواب بنتے ہیں۔

بارات کا تصور ہر لڑکی کے لئے ایسے اچھوتے سپنوں کی وادی کے در وا کرتا

اور اس روز کے انتظار میں ——

اور اس گھڑی کے لئے ——

کیا کیا دل دھڑکتا ہے .....

اور کیا کیا جی میں آتی ہے۔

اور آمنہ چھت پہ بیٹھ کر ہر روز تصور ہی تصور میں وہ نظارا دیکھا کرتی۔

سامنے موٹروں کی قطار نمودار ہوگی۔

ایک کے سوا سب موٹریں مانگی ہوئی ہوں گی۔

اور اس ایک موٹر پہ پھولوں کی چادر پڑی ہوگی ——

پھول ——

جو جنازے پہ بھی ہوتے ہیں۔

اسی موٹر میں مسٹر موزامل سہرا باندھے بیٹھا ہوگا۔

بار بار اپنی عینک ٹھیک کر کے چہرے کا پسینہ پونچھے گا۔

گھبراہٹ کے مارے زبان ہونٹوں پر پھیرے گا۔

بارات آجائے گی۔

شور مچ جائے گا ——

نکاح کی رسم ادا ہوگی ——

لوگ مبارکبادیں دیں گے ——

مصنوعی خوشبوؤں سے چہرے کھلکھلا اُٹھیں گے ——

اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو شامیانے کے اندر چھا جائے گی ——

پھر ——

اُسے دلہن بنایا جائے گا ——!

زِندگی میں صرف پہلی بار اور آخری بار ———

اور وہ اپنے جسم میں نہ ہوگی ——— ریشم و کمخواب کی تہیں ہوں گی صرف روح نہ ہوگی ——— سونے کے زیورات کی چکاچوند ہوگی ——
اور . . . . .

زندگی بھر سُلگنے کے لئے اُسے ——— آزاد دُنیا کے زنداں میں ڈال دیا جائے

شاید مسٹر موزال اپنی جیت پر پھُولا نہ سمائے۔

مگر وہ . . . . .

وہ ——— کہاں ہوگی . . . . ؟

وہ تو خود فراموشی کی اُن منازل کو چھُو لے گی۔ جہاں آدمی اپنے وجود سے بھی نا آشنا ہو جاتا ہے ———

بہر حال۔ وہ روز حشر بھی آکر ٹل جائے گا ———

پُل صراط ایسی خوفناک رات بھی گذر جائے گی ——— خواہ وہ سہم سہم کر پاؤں

یا اپنے ناکردہ گناہوں کے بوجھ سے جہنم میں جا گرے ———

پھر ———

پھر اُس کے بعد کیا ہوگا ———

کیا ہوگا ——— ؟

کیا ہوگا ——— ؟

گرتے پتوں کی طرح اس کے خیالات . . . . . یونہی اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے

جنہیں وہ سمیٹنے کی ہرگز کوشش نہ کرتی ———

گرتے پتوں کی بھلا کیا وقعت ہوتی ہے ؟

مگر آج ———

اُس کی سوچیں ہار گئی تھیں۔ وہ اِس طویل قنوطیت اور یاسیت سے تنگ

تھی۔ وہ کوئی ردِ عمل چاہتی تھی۔

اُس کی موت میں دو دن باقی تھے۔

کل رات مہندی کی رسم ادا ہونی تھی۔

اور پرسوں شادی!

آج میرا اپنا ہے۔ آج کو میں کیوں نہ مصرف میں لاؤں۔

اُس روز اُس نے خود ہی اُٹھ کر غسل کر لیا۔ اپنی الماری کھول کر سب پُرانے کپڑے کھول کر دیکھے۔ اور پھر اُنہیں دوبارہ ٹھیک طرح تہہ کر کے رکھا۔ اور ہلکے جوگیا رنگ کا سُوٹ جو حماد کو بہت پسند تھا، پہن لیا۔ وہ جب بھی یہ سُوٹ پہنتی تھی حماد پنجابی زبان کے ٹپے گُنگنانے لگ جاتا تھا اور جدھر جدھر وہ جاتی اُس کی گمبھیر آواز اُس کا پیچھا کرتی

اک پھُل منگیا سارا باغ ہوا لے اُٹھیے

اور جب وہ اسے ان حرکتوں سے باز رہنے کو کہتی۔ تو وہ کہتا۔ میں نے سو مرتبہ کہا ہے یہ سوٹ شادی کے بعد پہننا۔ اگر کسی روز مجھ سے گُستاخی سرزد ہو گئی تو مجھے اِلزام مت دینا۔!

"جی۔ میں سمجھی نہیں۔ کیسی گُستاخی۔؟" وہ انجان بن کر کہتی۔

لیکن جب وہ سوٹ اُتار دیتی۔ تو حماد مُنہ پھُلا لیتا۔ "او ظالم۔ مجھے گھر سے نکل جانے دیا ہوتا۔ آخر جلدی کیا تھی کپڑے بدلنے کی ———"

وہ اُس کی اُن باتوں سے جل جاتی۔

"میں اس سوٹ کو کسی روز آگ لگا دوں گی۔"

"اور مجھے ہی کیوں نہیں آگ لگا دیتیں۔"

"آپ کو تو بھسم کر چکی ہوں!" وہ معنی خیز انداز میں کہتی۔

اور جب وہ اپنی نگاہ میں پیار کی مستی بھر کر اُس کی طرف دیکھتا تو وہ چپکے سے گھڑ
اُس نے آج دانستہ وہی سوٹ پہنا تھا۔ جو حمّاد کو مجنوں بنا دیتا تھا۔ ویسے ہی
بنائے تھے۔ جو اُسے پسند تھے۔ اپنے کپڑوں والی الماری کے علاوہ اُس نے اپنی
دراز بھی صاف کی تھی۔ اپنی پُرانی ڈائریوں کو ایک بار پھر پڑھا تھا۔ حمّاد نے اپنے قیام
گھر میں ہی اسے جتنے خط اور چٹیں لکھی تھیں، انہیں اُس نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ا
کو بار بار پڑھا۔

پھر گذرے ہوئے واقعات کو ترتیب وار اپنے ذہن میں دُہراتی رہی۔ جیسے آج
یادوں اور پُرانی نشانیوں سے گلے مل کر رخصت ہونا چاہتی تھی۔

حمّاد کے جانے کے بعد وہ اتنی کم حوصلہ ہو گئی تھی کہ نہ تو اُس کا نام لے سکتی تھی اور نہ
کے خیالوں کو ذہن میں جگہ دیتی، بیتی باتیں جُونہی بے خیالی میں اُس کے ذہن میں آنے لگتیں
اُسے چیخنے چلّانے کا دَورہ پڑ جاتا۔ اور وہ بے ہوش ہو جاتی۔

وہ جب بھی اپنی اس الماری کے قریب آتی جس میں حمّاد کی یادگاریں رکھی تھیں
کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا۔

اُس کے خط اُس کے دیئے ہوئے تحفے۔ اُس کی دی ہوئی کتابیں جن کے پہلے
پر وہ عجیب و غریب فقرے لکھ دیا کرتا تھا۔ مثلاً ——— "تا دمِ زیست میری آمد کے
——— !" وغیرہ وغیرہ۔

اُس کی نشانیوں کو چھیڑنے کی اُس میں ہمّت نہیں تھی۔ وہ اپنے ذہن و دل کے
بند کر دینا چاہتی تھی۔ مگر اُس کا تصوّر کہیں نہ کہیں سے روزن ضرور نکال لیتا تھا۔ اور یہ
ہوئے بھی کہ اس گھر کے دروازے حمّاد کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ وہ آنکھیں موندے
موہوم سی آس پہ اُس کی چاپ کی منتظر رہتی ———
ابھی آیا . . . . . .

ابھی آیا . . . . . .
کہتے کہتے جیسے صدیاں گذر جاتیں۔ ذہن میں وہ اُس کی اچانک آمد، سو طرح کے
واقعات سے منطبق کرتی . . . .
شاید . . . کسی روز . . . . اچانک . . . . کسی وسیلے سے . . . . یوں . . . . . وہ
سامنے آ کھڑا ہو۔

مگر جب وہ ہوش میں آتی تو بھائیں بھائیں کرتا ہوا سنّاٹا اُس کی ہنسی اڑاتا اور وہ بلک
بلک کر رونے لگتی۔ پھر جگر خراش ہچکیاں لے لے کر ڈوبتی ہوئی کشتی کی مانند خوب ہچکولے
لیتی۔

لیکن اُس روز وہ اپنی مرضی سے اپنی کوٹھڑی میں آئی تھی۔ کتنے دِنوں کے بعد اُس کا
جی خود بخود اچھا ہو گیا تھا۔ یا جیسے . . . . . پھر حمّاد کے آنے کی اُمید بندھ گئی تھی۔
یکایک اُس میں زندگی بیدار ہو گئی تھی۔

اُس نے مُسکرا مُسکرا کر حمّاد کے پُرانے خطوط پڑھے ——— اور پڑھ پڑھ کر مُسکرائی
——— اُن پرزوں کو بار بار آنکھوں سے لگایا جو کبھی اُس نے اُس کی خفگی پہ یا بیماری میں
لکھے تھے۔

اُس نے دِل میں اُٹھنے والے درد کو دبا دبا کر اِک اِک بات کو یاد کیا ——— پُرانی باتوں
کو ——— مُلاقاتوں کو ——— راتوں کو ——— دِنوں کو ——— لمحوں کو ———
پھر اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے حمّاد اُس کی رُوح میں حلول ہو گیا ہے وہ
اسے کھو کر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔
کتنی بے وقوف تھی وہ!
اب تک اُس نے احتجاج کئے رکھا۔
یہ ایک عامیانہ روش تھی ———

حمّاد اُس کی نس نس میں اس طرح سرایت کرچکا تھا کہ اگر اُس کے سارے جسم کی جاتی تو بھی۔۔۔ اسے اُس سے جُدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ تو اب اُس کی یادوں کے سہارے زندگی کے کڑے کوس طے کرسکتی تھی

تو کیا ہے ——— ؟

اگر یہ لوگ مجھے کسی اور کے حوالے کر رہے ہیں۔ میں جہاں بھی رہی۔۔۔ حمّاد کی ہو کر رہوں گی ——— حمّاد کی بن کر جیئوں گی ——— اور اُسی کے تصوّر میں مر جاؤں گی

مگر آہ حمّاد ———

کاش ایک بار وہ آجاتا ——— تو۔۔۔۔

تو۔۔۔۔۔۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ واقعی وہ آجاتے ——— یہ شادی رُک جائے۔ معجزہ رُونما ہو جائے۔۔۔

مگر کہاں ———

یہاں تو سارے انتظامات مکمّل ہو چکے ہیں۔ رقعے تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

لیکن خیر ———

وہ اس موضوع پر اب زیادہ نہ سوچنا چاہتی تھی۔ اُس نے آنے والے دنوں کے لئے اس قدر سوچ لیا تھا کہ اب بے حس ہو گئی تھی۔ اب اگر شادی کی کوئی بات اُس کے کان میں پڑتی تو یوں جیسے ——— کسی اور کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔

بلی کو سامنے دیکھ کر جس طرح کبوتر آنکھیں موند لیتا ہے۔ اسی طرح وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

جب اُس نے اپنے کمرے کی ساری چیزیں سنوار کر ترتیب سے رکھ لیں۔ اور اپنی تمام تر پیاری یادوں کو گلے سے لگا لیا تو وہ اُٹھ کر ہال کمرے میں آگئی۔

وہاں آرام کرسی کی پُشت پر سر ٹیک کر وہ نیم دراز ہو گئی۔

اُس کے لمبے بال ابھی گیلے تھے۔ جن میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

اُس کے چہرے پر آج بڑی رونق تھی۔ آنکھوں کے حلقے بھی معدوم تھے۔ گو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی تھی۔ مگر اب بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔

ہائے وہ حسن کہ پامال ہو کر بھی جاذب نظر رہا۔

اُس نے تو آج آپا کے سب بچّوں کو باری باری پاس بُلا کر پیار کیا تھا۔ یوں بھی جب سے وہ بیمار ہوئی تھی۔ سوائے بچّوں کے کسی سے کھل کر ہنستی بولتی نہ تھی۔ جب وہ بچّوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی تو سکینہ آپا نے معنی خیز نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں بُنیا کے عشق کا بخار اُتر ہی گیا نا آخر ——— ؟

اور ماں کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ سا آگیا۔ یوں انہیں بھی اس بات کا بہت ملال تھا کہ وہ اس حالت میں بیٹی کو گھر سے رخصت کر رہی ہیں۔ آمنہ کے چُپ ہو جانے اور صبر کر لینے سے اُن کی مامتا جاگ اٹھی تھی اور ان کا دل اُس کے لئے پسیجنے لگ گیا گیا۔ پہلے وہ ایسے غصّے کے آمنہ سے بات نہ کرتیں۔ وہ خود سے اگر کوئی بات کرتی تو یہ منہ پھیر لیتیں۔ لیکن اب انہوں نے آپ ہی آپ بیٹی کو بلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے تو کسی قسم کا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ——— آہ دبکا نہیں کی تھی ——— شادی کے خلاف واویلا نہیں مچایا تھا۔ بلکہ جب اُن لوگوں نے تاریخ ٹھہرا دی تو خاموشی سے گردن ڈال دی۔ ان کی لاج رکھ لی ——— اور وہ یونہی خوفزدہ تھیں کہ کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ ——— مگر اب ——— بیٹھے بیٹھے۔۔۔ وہ پچھتانے لگتیں۔۔۔ اور سوچتیں ———

کہیں میں اپنی بیٹی پر ظلم تو نہیں کر رہی ———

کچھ ایسا بُرا بھی نہ تھا حمّاد ———

اگر اس نے اس دُکھ کو کلیجے میں چھپا کر اپنی جوانی کو کوئی روگ لگا لیا تو کیا ہوگا ——— ؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

شادی کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ ——

مگر ایسے میں سکینہ آپا اُن کے وسوسوں کو دُور کر دیتیں ......

"سب ٹھیک ہو جائے گا امّی —— لڑکیوں کی ہِندلس شادی کے بعد ... ہے۔ اس کے بعد وہ نئی زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ ہم کوئی اُس کے ساتھ بُرا تو نہیں ... اچھی جگہ رشتہ طے کیا ہے۔ اب اگر لڑکیاں عاقبت نااندیشی میں کنوئیں میں چھلانگ لگا... چاہیں تو اُن کو اجازت دے دینا کوئی عقل مندی نہیں —— ہم بہرحال اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ یونہی ذرا وہ حساس ہو گئی تھی۔ اور اب تک ڈاکٹر بھی کوئی مہلک ... نہیں کر سکے خواہ مخواہ اتنے پیسے اس کے علاج پر ضائع کئے۔ ان سے اور بہت سی ... سکتی تھیں۔ خیر۔ ... آپ دیکھئے تو سہی —— شادی کے بعد بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔ اور یہ بھی زیور کپڑے پہن کر ہنستی کھیلتی نظر آئے گی۔"

آج اُسے خوش دیکھ کر سکینہ آپا بھی سمجھ رہی تھیں کہ اُن کی جیت ہو گئی ہے۔ ... دماغ جلدی ٹھکانے آگیا ہے۔ اتنی سی بات نے بیگم ابراہیم کے احساسِ جرم کو مدھم کر دیا تھا۔

وہ دونوں پھر جوش و خروش سے شادی کے انتظامات میں لگ گئیں۔

ساری دوپہر آمنہ بچوں کے ساتھ گپ بازی اور ہنسی مذاق کرتی رہی —— جب سائے لمبے ہونے لگے۔ تو اُس نے تھکن محسوس کی —— اس کا دل کچھ عجیب طرح ... لگا۔ تو وہ آکر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

اصل میں سکینہ آپا اور بیگم ابراہیم نے جوش میں آکر جہیز کا سامان اس کے کمرے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ آمنہ کے سامنے اُس کی فہرستیں بنالیں ... اسی بہانے سے یہ بھی اپنی سب چیزیں دیکھ لے گی۔

مگر اپنے قریب —— گوٹے کی چمک دمک —— سُرخ و نارنجی کپڑے دیکھ کر آمنہ کو اختلاج ہونے لگا جس حقیقت کو اس نے اپنی دانست میں تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ایک بھیانک خواب بن کر اس کے اعصاب پر منڈلانے لگی۔ وہ تو سمجھی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ابھی کچھ ایسے کٹھن مرحلے باقی ہیں جو اُس کی رُوح کو بار بار جھنجھوڑیں گے۔

جانے اور کتنی موتیں باقی تھیں۔

اس میں اس چمک دمک والے عروسی سامان کو دیکھنے کی ہمت بالکل نہیں تھی۔

اس لئے وہ وہاں سے اُٹھ کر ڈرائنگ رُوم میں چلی گئی۔

حماد کی چارپائی ابھی تک وہاں تھی اور اس پر اُس کا بستر بھی لگا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے اُس کی چارپائی پر لیٹ گئی۔ جیسے زندگی کی صعوبتوں سے تھک کر وہ ایک پیار بھری گود میں پناہ لینا چاہتی ہو۔

اُس کی ماں اور بہن اندر باہر۔ شور مچاتی پھر رہی تھیں۔ چیزیں اٹھانے اور رکھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آمنہ کو درست حالت میں دیکھ کر اُن کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے اس دانشمندانہ اقدام پر اپنے آپ کو خود ہی سراہ رہی تھیں۔ اس لئے ہدایات بلند آواز میں سنا کر کی جا رہی تھیں ..... اُن کو یہ بھی احساس نہ رہا کہ آمنہ یہاں سے اُٹھ کر چلی گئی ہے اور جاتے جاتے درمیان والا کمرہ بھی بند کر گئی ہے۔

آمنہ کا دل قیدی پرندے کی مانند آپ ہی آپ پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا ——

ایک رات ——

بس ایک رات اور باقی ہے ——

اس کے بعد کیا ہوگا —— ؟

یہ سب، کیسے ہوگا ——— ؟

کیوں کر ہوگا ——— ؟؟

آج اس کا دل اور بھی طرح ڈوب رہا تھا۔ اُسے خود بھی سمجھ نہیں آرہی
کیا ہونے والا ہے۔

اچانک لیٹے لیٹے۔ آمنہ کو ڈرائنگ رُوم کے باہر مانوس سے قدموں کی چا
سُنائی دی۔

ایک عرصے بعد وہی چاپ ......

تو ......

تو ...... معجزہ رُونما ہو گیا۔

اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر باہر کی جانب دیکھا......

اسمٰعیل اپنی وردی میں ملبوس ادھر آرہا تھا......

اور وہ تنہا تھا ———

انسان مایوسیوں سے کتنا تھک جاتا ہے کہ خود بخود فریب کھانے پر آ
جاتا ہے۔

آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔

وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ ———

آج بھی اسمٰعیل بھائی اکیلے آرہے ہیں......

وہ جانے کہاں چلا گیا ہے ———

وہ میرا کون ہوتا تھا ———

اُسے میرا کیا احساس ———

میں سکرات کے عالم میں بھی اُس کی راہ تک رہی ہوں......

وہ جانے کس دُھن میں ہوگا ———

پیت کا سودا جھوٹا تھا۔

اُس کا کچھ نہ گیا اور میں لُٹ گئی......

وہ...... وہ...... ہائے ———

آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

"منوں تجھے کیا ہوا ہے ———" اسمٰعیل بھاگ کر اس کے قریب آگیا۔

آمنہ کو کافی دنوں کے بعد آج پھر چیخنے چلانے کا دورہ پڑگیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر
ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو
گئے تھے...... اور وہ بے سُدھ سی ہو کر سر پٹکنے جا رہی تھی۔

"تجھے شاید پھر دورہ پڑا ہے۔ ٹھہر میں ڈاکٹر کو بُلا لاؤں"

"نہیں بھائی جان! مجھے چھوڑ کر نہ جائیے" آمنہ نے بھائی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ ہمسایوں کا اسکوٹر مانگ کر جاؤں گا" اُس نے
کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جائیے"

"میں کسی کو تمہارے پاس بٹھا جاتا ہوں"

"نہیں...... نہیں......" آمنہ چلانے لگی "خدا کے واسطے کبھی آپ کو احساس
نہیں۔ میری تو خیر پرواہ نہیں ہے"

"میری اچھی بہن! تو بدگمان کیوں ہو رہی ہے۔ تیرے لئے ہی تو میں ڈاکٹر کو بلانے
جا رہا ہوں"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے بھائی جان! اس وقت مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے مجھے
تنہا چھوڑ کر نہ جائیے ———"

"ارے ۔ گھر میں اتنے لوگ ہیں ۔ تجھے پھر بھی ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں بھائی جان ـــ یہ گھر بالکل خالی ہے ۔ اور اِک اِک شے مجھے ڈرا
مجھے کسی بے رحم کے آسرے پر نہ چھوڑ کے جایئے .... ورنہ آپ کو پچھتا
آمنہ کے اِن الفاظ نے اسمٰعیل کو بے بس کر دیا ....

وہ آمنہ کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"بھائی جان .... بھائی جان ....؟"

آمنہ کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھ

"جوس پیئے گی میں بنا لاؤں؟"

"نہیں ـــــ" آمنہ نے اسمٰعیل کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تاکہ وہ

"کیا بات ہے منوں ۔ میری بیٹی ـــــ" اسمٰعیل اُسے چمکارنے لگا۔ ا
سمجھا۔ چونکہ شادی میں ایک دِن باقی رہ گیا ہے اس لئے آج یہ پھر دل برداشتہ
ہے۔ اُس کی یہی حالت رہی تو شادی کیسے انجام پا سکے گی۔ اسمٰعیل کا دل چاہا
دیواروں میں سر دے کر ٹکریں مارے۔

"حوصلہ کرو، میری بہن! تم تو بڑی صابر ہو!" اسمٰعیل اُس کے بال سہلانے لگا

"بھائی جان! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیں ....
چھوڑیں نہیں ـــــ"

"منوں .... منوں ....؟" اسمٰعیل نے اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے

"بھائی جان! مجھے ایسے لگ رہا ہے۔ جیسے میری جان نکل رہی ہے؟"

"منوں ـــــ" اسمٰعیل گھبرا گیا "کیسی فضول باتیں کر رہی ہے؟"

"آپ میرا سر اپنی گود میں رکھ لیں ـــــ رکھ لیں نا؟ ـــــ" آمنہ نے
سے کہا۔

اسمٰعیل فوراً اُٹھ کر اُس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔
لیکن اُس کے اضطراب اور بے کلی میں بالکل فرق نہ آیا۔ وہ پارے کی طرح تھرک
رہی تھی۔

"بھائی جان .... بھائی جان ....؟" اُس نے بے چین نظروں سے اسمٰعیل کی
طرف دیکھا۔

"جی۔ میری بیٹی۔ میری منوں۔ کیا بات ہو گئی ہے۔ حوصلے سے کام لو؟"

"بھائی جان .... اگر اب وہ آئے تو .... تو اُسے کہہ دیں .... میں مجبور تھی۔
.... بہت مجبور ....؟"

اسمٰعیل بجھ گیا۔ اُسے اس کے اضطراب اور بے کلی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے اس
سر گود سے اُٹھا کر سرہانے پر رکھ دیا اور خود گلوکوز بنا کر اُسے پلانے لگا۔
گلوکوز پینے کے بعد۔ تھوڑی دیر وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ پھر اُس نے اپنی بند
آنکھیں کھولیں۔ اور گھبرا کر اپنا مُنھ اسمٰعیل کے ہاتھوں میں چھپا لیا اور چلانے لگی ـــــ

"بھائی جان .... بھائی جان .... مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے ـــــ
مجھے کہیں چھپا لیجئے ـــــ خدا کے لئے کہیں چھپا دیجئے ـــــ اور ان ظالموں کے
حوالے مت کیجئے ـــــ بھائی جان۔ مجھے مضبوطی سے پکڑ لیجئے ـــــ"

وہ اتنی زور سے چلائی کہ ساتھ والے کمرے سے بیگم ابراہیم اور سکینہ آپا بھی
دوڑی آئیں ـــــ

"اسے کیا ہوا ہے اسمٰعیل ـــــ؟" بیگم ابراہیم نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اسے بس موت آنی باقی ہے۔" اسمٰعیل کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

آمنہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ زرد چہرہ ـــــ اور نیلے ہونٹ ـــــ اس کی نبض
بہت آہستہ چل رہی تھی۔ اور اس وقت وہ بالکل مُردہ لگ رہی تھی۔

نہ جانے کھڑے کھڑے بیگم ابراہیم کو کیا ہوا۔ کہ زمین پر بیٹھ گئیں اور اپنی بچی
کے نیم جان چہرے کو بار بار چومنے لگیں۔

"اسمٰعیل میری بچی کو ہوش میں لاؤ ——

اسمٰعیل ہوش میں لاؤ میری بچی کو —— میں اپنے ہر ظلم کی تلافی کر دوں گی۔
اگر اس کو بچانے میں میری زندگی بھی کام آئے تو دیر نہ کرو۔

اسمٰعیل —— ؟" انہوں نے گم صم اسمٰعیل کو زور سے جھنجوڑا ——

اب اسمٰعیل کو حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ ورنہ وہ تو پتھر کا بُت بنا کھڑا تھا۔
ایک دم کھڑا ہو گیا —— باہر کو دوڑا —— پھر اندر آ گیا۔ اور سکینہ سے بولا۔

"تمہاری کار کھڑی ہے سکینہ ——"

"نہیں" وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔ "ابھی وکی لے گئے ہیں"

"تم جلدی سے تانگہ، ٹیکسی یا رکشہ کوئی شے پکڑ لاؤ نا۔ ہم اسے لے کر ہسپتال جاتے
ہیں" بیگم ابراہیم نے بے تابی سے کہا۔

حُسنِ اتفاق سے، جونہی اسمٰعیل باہر نکلا سڑک پر ایک خالی تانگہ جا رہا تھا۔
اس کو غیبی امداد سمجھا۔

آمنہ کو گود میں سمیٹ کر بیگم ابراہیم آگے بیٹھ گئیں۔ اور مضمحل سا اسمٰعیل پیچھے
اور تانگہ ریلوے ہسپتال کی سمت چلا۔

ریلوے کوارٹرز سے لے کر ریلوے ہسپتال تک اگرچہ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ مگر ان
بیگم ابراہیم نے اتنے آنسو بہائے کہ بے ہوش آمنہ کا چہرہ دُھل گیا۔

اپنی کس کس زیادتی پر وہ نہیں روتیں —— اور کس کس ظلم کو یاد نہیں کیا۔
اِک اِک آہ کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں اس کی زندگی کی دُعائیں مانگیں۔
اگر انہیں سامنے کہیں حمّاد کھڑا ہوا نظر آ جاتا تو اپنی بیٹی کی جان کی بھیک وہ ان

ہوں پر گر کر بھی مانگ لیتیں۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا۔

ہسپتال میں بھی جتنی دیر تک ڈاکٹر اندر اس کا معائنہ کرتے رہے، باہر بیگم ابراہیم
سولی پر ٹنگی رہیں۔ چند لمحوں کے اندر اندر کوئی بھی خبر آ سکتی تھی۔

زندگی یا موت ——

وہ آنے والے لمحوں کے تصور سے لرز رہی تھیں۔ مگر وقت کے ٹھہراؤ پر بھی انہیں
جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس نتیجے کے انتظار میں کہیں اُن کی جان نہ نکل جائے۔
یہ جان دینا بھی انہیں منظور تھا۔ اگر وہ ایک بار۔ صرف ایک بار اپنی بیٹی کو ہوش
میں دیکھ لیتیں۔

ہائے کیسے کیسے چرکے انہوں نے اپنی معصوم بیٹی کے دل پر لگائے تھے۔
کوئی یوں اپنی پیٹ جائی کو اذیتیں دے کر مارتا ہے۔

اری
تیری ممتا کہاں سو گئی تھی۔
او بدنصیب!

پرسوں جب شادی کی بجائے تیری بیٹی کا جنازہ اُٹھے گا۔ تو ان روایات کا بھرم رکھ
اور خوشی کے شادیانے بجانا —— اچھا۔
کس قدر صبر سے اس نے تیری زیادتیوں کو سہا ہے۔
تعصب نے تجھے اندھا کر دیا تھا۔
زندگی بھر تو اندھی رہی ——
تیرا سرتاج بھی تجھے یہی بات سمجھاتا رہا۔ مگر ہار کر چلا گیا۔
اب بیٹی بھی جا رہی ہے۔
ایک عرصے بعد انہیں مرحوم ابراہیم کا خیال آیا تھا۔

جیسے وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے سامنے کھڑے ہوں اور کہہ رہے
آمنہ کی ماں! یہ تو نے کیا کیا ——— ؟ میں نے تجھے منع کیا تھا کہ میری
ظلم نہ ڈھانا۔ پر ہمیشہ کی طرح تو نے میرا کہا نہ مانا۔ اب بھگت اپنا کیا
نہیں . . . . نہیں . . . . بیگم ابراہیم منہ میں دوپٹے کا پلو دے کر زار و قطار رونے
لگیں۔

تصور ہی تصور میں جیسے وہ ابراہیم کے قدموں میں گر گئیں۔ اپنے کئے دھرے کی
معافی مانگ کر جیسے آمنہ کی زندگی کی بھیک مانگنے لگیں۔

وہ منہ ہی منہ میں کیا کہہ رہی ہیں۔ اور کس سے کہہ رہی ہیں۔ انہیں کچھ ہوش نہ
اس سے تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر انہیں بھی کمرے میں جانے کی اجازت دے دیتا۔
کھڑی وہ دکھے دل کے ساتھ بیم و رجا کے تانے بانے بُن رہی تھیں۔

اس وقت سے تین ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر۔ ڈی۔ ایم۔ او کے کمرے میں
تھے۔ جب بھی کوئی اندر سے نکلتا وہ بھاگ کر جاتیں اور ملتجیانہ انداز میں اپنی بچی کا
پوچھتیں۔

مگر تمام ڈاکٹر و نرسیں اس دن انہیں کٹھور لگ رہے تھے۔ کیونکہ سب ہی
چہرے کے ساتھ ایک ہی جواب دیتے۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا"

کچھ دیر بعد ایک لیڈی ڈاکٹر اس کے کمرے سے باہر آئی۔ بیگم ابراہیم پاگلوں کی
طرح اس کے پیچھے دوڑیں۔ اُس نے ایک ٹھہری ہوئی سرد نگاہ اُن پر ڈالی اور بولی
"ابھی تو فزیشن صاحب دیکھ رہے ہیں"
اور ٹھک ٹھک کرتی چلی گئی۔

او بیدرد!

ماں کی سلی ہو کرائی جا۔ خواہ جھوٹی ہو۔
انہوں نے پھر دروازے پر نگاہیں جما دیں۔
اب کے دونوں ڈاکٹر ایک ساتھ باتیں کرتے ہوتے باہر آرہے تھے۔
ڈاکٹر صاحب . . . . . .
ڈاکٹر صاحب . . . . . . وہ ہانپتی ہوئی اُن کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔
بچ گئی میری بچی ———"
ڈاکٹر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ خبر نہیں وہ نفی میں تھا یا اثبات میں۔ بیگم ابراہیم
کچھ نہیں آئی۔
اُنہیں قریب پاکر وہ دونوں انگریزی میں گفتگو کرنے لگے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اُن
آہستہ روک کر کھڑی ہو جائیں۔ اندر سے اسمٰعیل مایوس سی شکل بنائے انہیں آتا دکھائی دیا
"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اسمٰعیل۔ ؟" انہوں نے دیوانوں کی طرح اس کا کندھا تھام کر پوچھا۔
ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ———" اسمٰعیل نے بڑی اُداس آواز میں کہا۔
ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ ہم اسی وقت اسے "مینٹل ہاسپٹل" میں لے جائیں

نظم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اِتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر بپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

فیض

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

۲۱-۲۲ جولائی کی درمیانی شب اُس کے لئے روزِ قیامت بن گئی تھی۔ اتنی طویل اُ
ی بھاری اور اتنی اذیت دہ کہ بیان سے باہر ہے۔ آج شب نیند اُس سے کوسوں دُور
ا گئی تھی۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے تسلّی دینے کی کوشش کرتی۔ خوبصورت
نیدیں اُسے مستقبل کے سُہانے خواب دِکھاتیں۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتی، ہوا
لے دوش پر اُڑتی۔ اس کا معصوم سا ذہن اُسے بڑی سہانی تسلّیاں دیتا۔ تھپک تھپک
ر سُلانے کی کوشش کرتا۔

مگر ———

اِک اضطراب تھا۔ اِک ولولہ انگیز بے چینی تھی جو اُسے بیکل کئے ہوتے تھی۔ اُس
ا دل چاہتا جلدی سے صبح ہو جائے۔ بس ایک پل میں! ہائے امتحانوں کے دوران
ا راتیں کتنی چھوٹی ہو جایا کرتی تھیں۔ ایسے معلوم دیتا تھا ابھی پلک لگی ہے اور ابھی
ز بلا کا دن چڑھ آیا ہے۔

اور آخر کی یہ رات کس قدر طویل ہو گئی تھی۔
بات دراصل یہ تھی کہ صبح میٹرک کا رزلٹ آنے والا تھا ——— اُس کی زندگی کے

پہلے امتحان کا نتیجہ ——— ؟

یوں تو اُسے یقین تھا کہ وہ پاس ہو جائے گی۔ پاس ہی نہیں۔ اُس نے اَو...
سے شرط لگائی تھی کہ اُس کی فرسٹ کلاس آئے گی۔ اور اسی شرط پر اُنھوں نے اُسے...
کے کسی کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی تھی۔ ورنہ اُن کے گھر میں تو کوئی بھی...
کے حق میں نہ تھا کہ وہ لاہور جیسے شہر میں تنہا پڑھنے کے لئے جاتے۔

اصل میں وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا...
تو کوئی میٹرک سے آگے پڑھ گئے تھے۔ بلکہ دو ایک نے وکالت تک پاس کرلی تھی...
بات ہے کہ زمینداری کی لت یا تن آسانی کے باعث نہ کوئی نوکری کرتا اور نہ کوئی...
گاؤں میں اُونچے اونچے کشادہ مکان بنوا کر رہتے تھے۔
فصل کی فصل نئی کاریں لے آتے تھے۔ اور عیش سے رہتے تھے۔
لڑکیوں میں بھی مڈل سے آگے کوئی نہیں پڑھی تھی۔
اُس کی دو بہنیں بمشکل مڈل پاس کرسکی تھیں۔ پھر اُن کی شادیاں بڑے بڑے
زمینداروں سے ہو گئیں۔

سجّو کی بات ہی اور تھی!

وہ بچپن ہی سے اُونچے اُونچے خواب دیکھا کرتی۔ شہروں کی بڑی بڑی عمارتیں...
کے تصور کو آگے بڑھنے سے روک دیتیں۔ اخباروں اور رسالوں میں وہ شہروں کے...
میں نت نئے قصے پڑھتی اور دعا کرتی کہ وہ جلد از جلد میٹرک پاس کرلے تاکہ شہر...
اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکے۔ اور پھر اس تیز رفتار دنیا کا ساتھ دے کر نام پیدا کرے۔ ا...
معلوم اسے یہ احساس کیوں ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دینے کے...
پیدا ہوئی ہے۔ وہ کارنامہ ——— جس کے بغیر دنیا ابھی تک اُدھوری تھی۔ اور...
طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتی تھی۔ جس میں اُسے شہرتِ دوام ملے۔
شاید اُس کی یہ سوچ اُس کی عمر کا تقاضا تھا۔

بہرحال اسی تقاضے نے اُسے کتابوں کا کیڑا بنا دیا۔ مڈل تک اسکول اُس کے گاؤں میں ہی تھا۔ اس کے بعد اس کے بابا نے اُسے شہر کے ایک ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔
وہاں اُس کے گاؤں کی اور بھی دو چار لڑکیاں تھیں۔ سب مل کر ایک ہی کمرے میں رہتیں۔
بلکہ وہ ان سب سے زیادہ امیر تھی۔ اس لئے اس کی شان ہی اور تھی۔

جمال پور مظفر گڑھ کے نواحی گاؤں میں سے تھا۔ اصل میں سجّو کے پردادا سید جمال الدین ہاشمی نے اس بنجر و غیر آباد علاقے کو آکر آباد کیا تھا۔ ظاہر ہے بعد ازاں اس چھوٹے سے قصبے کا نام جمال پور کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ تین پشتوں سے یہی گھرانہ اُس گاؤں کا حاکم اور امیر ترین گھرانہ چلا آرہا تھا۔ سجّو کے آباء و اجداد کو گاؤں والے پیر و مرشد مانتے تھے۔

اور سجّو اس خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے امسال میٹرک کا امتحان دیا تھا۔

اور ساری برادری کی نظریں اس پر لگی تھیں۔ آیا وہ ان کی لاج رکھتی ہے یا نہیں۔ اور اُس کے بابا نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر اس کی فرسٹ کلاس آگئی تو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُسے لاہور بھیجیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سجّو کے بابا کو کامل یقین تھا کہ سجّو کی فرسٹ ڈویژن نہیں آئے گی۔ اُن کے خیال میں عورت ذات غبی اور کُند ذہن ہوتی ہے پھر اس کے خاندان کی لڑکیاں جنہیں سونا پہننے اور بچے جننے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

بھلا سجّو کیسے اُن سے مختلف ہو سکتی ہے؟

بالفرض اگر یہ پاس ہو بھی گئی تو اس کی تھرڈ ڈویژن آئے گی اور وہ اپنا دامن صاف بچالیں گے۔

اُنھیں کیا خبر تھی کہ اُن کی لاڈلی ہر رات خواب میں اُونچی عمارتوں پر پرواز کرتی ہے۔
اور یہی خواب، دن رات اُسے کتابوں سے قریب کر رہے ہیں۔

دس بجے تک وہ سجّو کے ساتھ تبادلۂ خیال کرکے سوگئے تھے۔ سجّو بھی کھلکھلا کر انہیں بار بار اُن کا وعدہ یاد دلاتی رہی تھی۔ اور وہ ہر بار ہنکارہ بھر کے اُس کی بات کہہ دیتے جیسے اس سے کہہ رہے ہوں۔" ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ صبح تم میرا وعدہ یاد دلاتی ہوئی شرماؤ گی۔"

مگر ——— اس شبِ طولانی کی جب سحر ہوئی تو ——— وہ سجّو کی فرسٹ ڈویژن کا مژدہ لائی۔ نہ صرف فرسٹ ڈویژن ہی بلکہ وہ اسکول بھر میں اوّل آئی تھی، اور وظیفے کی حقدار بھی ٹھیری تھی۔ یوں سجّو نے خاندان بھر کی ناک اونچی کر دی تھی۔ شاہوں کی لڑکی فیل ہو جاتی تو گاؤں بھر میں سبکی ہو جاتی۔ اُن کی رعیّت اُن کے بارے میں کیا سوچتی۔

مگر سجّو نے تو —— نہ صرف خاندان کی لاج رکھ لی تھی بلکہ عورت کے ناقص العقل اور غبی ہونے والے اُن کے خاندانی مقولے کی بھی نفی کر دی تھی۔

"ہائے اللہ۔ سچ مچ لاہور کتنا خوبصورت ہے ——— سچ کہتے ہیں۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ دنیا میں نہیں آیا۔" سجّو آج ایک گھِسے پِٹے محاورے کی صداقت پر ایمان لے آئی تھی۔ آج اُس کے کالج کی لڑکیاں گورنمنٹ کالج ڈبیٹ سننے آئی تھیں۔ واپسی پر بس نہیں ملی تھی۔ اس لئے وہ چلتی ہوئی مال روڈ تک آگئی تھیں۔ تاکہ ریگل کے بس اسٹاپ سے بس پکڑ سکیں۔ چلتے چلتے اگرچہ وہ تھک گئی تھیں۔ مگر اس تھکن میں بھی انہیں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ہنستی، کولہے ہلاتی اور پرس جھلاتی۔ وہ سڑک پر نہیں چل رہی تھیں بلکہ بہت سی نظروں کو دعوتِ نظارہ ٹکی ترغیب دے رہی تھیں۔ ایسے میں پاؤں کتنے ہی تھکے ہوئے کیوں نہ ہوں چہرے بشاش ہوتے ہیں۔

اب وہ بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ یہ فلمی ہیروئن کی طرح ہر وقت بنی ٹھنی مال روڈ۔ اور اس پر دوڑتی ہوئی خوب صورت کاریں ——— کاروں میں اِٹھلاتے بے نیازی سے بیٹھی ہوئی حسینانِ شہر ——— اور اُن کے پہلوؤں میں انکساری کے مجسمے بنے ——— اُن کے شوہر۔ بھائی یا . . . . اس سے آگے اُس کی سوچ جواب دے گئی۔ سوچ ہی کیا۔ ؟ بڑی بڑی عمارتوں اور سجے ہوئے شوکیسوں نے اُس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

جب بھی وہ مال پر سے گذرتی اِک اِک شے کو بڑے غور سے دیکھتی۔ اُسے کالج

میں داخل ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا —— لڑکیوں کے ساتھ وہ کئی مرتبہ مال
آ چکی تھی۔ چھٹی تو وہ شاپنگ کی ہی بیتی تھی۔ مگر ضروری نہیں کہ انہیں شاپنگ
ہوتی۔ وہ ذراسی بال پنوں کی خریداری کے بہانے مال پر آجاتیں۔ مختلف دوکانو
گھوم پھر کے نئے ڈیزائن اور نئی مصنوعات کا جائزہ لیتیں۔" ونڈو شاپنگ"
توآلو چھولے کھاتیں۔ پھر اِک اِک کوک پی کر ہوسٹل چل دیتیں۔

پہلے پہل وہ بے چاری شاپنگ کو آتی ہی نہ تھی۔ ہر بدھ کو جب لڑکیاں
عرضیاں لکھ کر وارڈن کو دینے جاتیں تو اس سے بھی پوچھ لیتیں "سجیلہ تمہیں کچھ
تو چلو۔ ہم مال پر جا رہے ہیں۔"

" نہیں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیئے۔" وہ گھبرا کر کہتی۔

لاہور آنے کی خوشی میں اُس نے بے تکے کپڑوں کے تین بکس بنا لئے تھے۔
کپڑوں کے علاوہ اور کون سی چیزیں ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں' وہ نا
تھی۔

اور اُن کے جاننے میں اُسے زیادہ عرصہ بھی نہ لگا۔

یہاں بعض لڑکیاں ہر مہینے ہیئر ڈریسر کے پاس جاتی تھیں اور نت نئے فیش
بال ترشوا کے آتیں۔ درزی کے پاس جانا تو ہر ہفتے کا معمول تھا۔ ذرا قمیض کی تراش
خراب ہوتی، جھٹ قمیض لے جا کر درزی کے منہ پر مارتیں۔ بار بار فیتے سے ناپ
دیتیں اور جب قمیض کی تراش اُن کے انگ انگ کی چغلی کھانے لگتی تب کہیں
چین آتا۔

اس کے علاوہ بھی ڈھیروں چیزیں وہ شاپنگ میں خرید کر لاتیں۔ مثلاً بال
کے شیمپو، ہاتھوں اور چہرے کو لگانے والے لوشن۔ رات کو لگانے والی اسکن
کولون، پرفیوم، نیچرل کلر لپ اسٹکیں۔ اور بیوٹی ٹریٹ منٹ کے نت نئ

یہاں ہر طرف رنگ و نور بکھرا ہوا تھا۔ خوشبوؤں کے قافلے قہقہوں کو جلو میں لے
کر اِس چوکھٹ سے اُس چوکھٹ تک رقص کرتے نظر آتے۔ پیاری پیاری اسمارٹ سی لڑکیاں
اُن کے جسم اتنے خوب صورت تھے اور چلتے میں وہ یوں لہراتیں کہ بے اختیار انہیں
باندوں میں لے کر چوم لینے کو جی چاہتا۔

ہائیڈروجن لگا کر بعض لڑکیاں چہرے کو خستہ بسکٹ کی طرح بھورا کر لیتیں۔ بالوں
کے نت نئے اسٹائل سے اپنے چہروں کو مزین کرتیں۔ ان کے سجے سجائے بالوں سے
اُٹھتی ہوئی ہیئر اسپرے HAIR SPRAY کی خوشبو اُن کی شخصیت کو باغ و بہار
بنائے رکھتی۔

اور پھر وہ کیسے خوب صورت انداز میں اور کس آزادی سے گفتگو کرتیں۔ البتہ صحیح
اردو یا پنجابی اُس نے کسی کے منہ سے نہیں سُنی تھی ہر تیسرے جملے کے ساتھ ہاتے
میں لپٹا ہوا کوئی اُردو کا یا انگریزی کا جملہ اُس کے کانوں میں پڑ جاتا۔ وہ دُنیا کے ہر
موضوع پر بلا تکان گفتگو کرتیں۔ سیاست ہو۔ کھیل ہوں یا فیشن کی دُنیا ——

اور فلموں کے بارے میں تو اُن کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ سجو منہ کھولے انہیں
دیکھتی رہ جاتی۔ کئی بار اس کا دِل چاہتا کہ وہ ان سے پوچھے کہ اِن فلمی خاندانوں سے اُن
کا کوئی رشتہ ہے۔

لنڈا جانسن کے رُومانس سے لے کر جولی نکسن کی شادی تک کا ذرّہ ذرّہ حال
انہیں معلوم تھا۔

وہ جانتی تھیں کہ ملکہ فرح کتنے بچے پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اور اب تک اُس کا کتنا
سکور ہوا ہے۔

وہ جیکولین کینیڈی کی درونِ ملک سرگرمیوں سے واقف تھیں اور ان افواہوں
پر سیر حاصل تبصرہ کرتی تھیں جو اُس کی دوسری شادی سے پہلے اور بعد میں اُڑا کرتی

تھیں۔ شہزادی مارگریٹ کے پہلے اندوہناک رُومانس کی رُوداد اُنہیں حرف بحرف یاد
تھی۔ اور انہیں ملکہ الزبتھ کے چہرے کی جھرّیوں کو چھپانے والے میک اَپ کا مکمل علم
ہیلینا روبنسٹن اور الزبتھ آرڈن کے کریم لپ اور دوسری لوازمات ہر وقت
کے پرسوں میں رہتیں۔

وہ الویس پریسلے، لز ٹیلر اور بی بی کی دیوانی تھیں۔

وہ "ہپیز" HIPPIES کو خوش آمدید کہنے ہر ہر وقت آمادہ رہتیں۔

اسکوڈا، ٹیوٹا کرونا، مزدا، ڈاٹ سن بلیو برڈ۔ الفا رومیو، وولز لے جیسی کاروں کے
نام، ماڈل اور قیمتیں اَز بر تھیں ——— وہ "اسپورٹس" کار پہ آنے والے کسی شہزادے
کے لئے دل ہتھیلی پہ لئے پھرتی تھیں۔

وہ رات کو ٹی وی سیٹ آن کر کے کلاس کے نوٹس لکھنے بیٹھ جاتیں۔ اور پھر
ٹی وی کے پروگراموں پر بھرپور تنقید کرتیں۔

وہ کبھی کبھی تبدیلی کی خاطر پاکستانی فلمیں بھی دیکھتی تھیں۔ مگر انہیں شکوہ تھا
پاکستانی ہیروئنیں وقت سے پہلے ڈھل جاتی ہیں۔ اوّل تو شہرت پاتے ہی وہ
رچا لیتی ہیں۔ ورنہ خوشی سے پھول کر کُپا ہو جاتی ہیں اور یہاں کے ہیرو تو کسی کام کے
نہ تھے۔ دو ایک کے علاوہ سب کے جسم بے ڈھب ہو گئے تھے اور جب اسکرین پر
سامنے آتے تو یوں معلوم ہوتا کہ انہیں ساتواں مہینہ ہے۔

انہیں محمّد علی کلے سے خاص ہمدردی تھی اور ان میں کئی لڑکیوں نے شرط
رکھی تھی کہ جب کلے پاکستان آئے گا تو ضرور ان پر فریفتہ ہو جائے گا۔ اگرچہ انہیں
ہم قوم سے شادی کی خبر سے انہیں مایوسی ہوئی تھی۔ مگر انہیں بُرا نہیں لگا تھا۔
اپنے مستقبل کے پروگراموں میں ساری دُنیا کی سیاحت کی شق انہوں نے
نمبر ایک پہ رکھی ہوئی تھی۔

شادی کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ والدین کی وساطت سے ہی ہونی چاہیئے۔ مگر
شوہر کے انتخاب میں اُنہیں پُوری آزادی ملنی چاہیئے۔
شادی کے ساتھ ہی ہنی مُون، کار، بنگلہ اور خدّام وہ لازم و ملزوم جانتی تھیں۔
تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ سبھوں کی خواہشیں کچھ ایک جیسی ہی تھیں۔
کتنی بُلند حوصلہ، بے باک۔ اور خوش نصیب تھیں یہ لڑکیاں . . .

آزاد خیال ——— آزاد منش ———
ہنس مُکھ، لااُبالی ———
خُوبرو، خوش لباس لڑکیاں ———

ایسا معلُوم دیتا کہ یہ دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں
ہے۔ اُن کے والدین نے اُنہیں جنم دے کر اس کرۂ ارضی کی نعمتیں سمیٹنے کے لئے
ہوسٹلوں میں بھیج دیا ہے۔ ماہ بہ ماہ پیسے آجاتے تھے۔ کبھی کبھی کاروں میں والدین بھی
ملنے آجاتے تھے۔

کتنی خوبصورت زندگی ہے یہاں ———؟
یہ لڑکیاں نہیں الف لیلوی دیس کی شہزادیاں ہیں ——— آسمان کے نیلے کناروں
کو چھونے والی اپسرائیں ہیں ——— جو تصویرِ کائنات میں رنگ بھرنے کو، زمین پر
اٹھلاتی، لہراتی۔ چہکتی۔ مچلتی پھر رہی ہیں۔

وہ یہاں آکر بڑی مسرُور ہو گئی تھی۔
سچ مچ بڑے شہروں کے لوگ بڑے خُوش قسمت ہوتے ہیں۔ وہ دُنیا کی بے شمار
نعمتوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ رنگ بدلتی دُنیا کے اس قدر قریب ہوتے
ہیں کہ اپنے رنگ بھی جلد جلد بدل لیتے ہیں۔ اُن کے لئے کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی۔
وہ محض قیاس کے گھوڑے نہیں دوڑاتے ———

نہ خیالوں کی پالکی لئے پھرتے ہیں . . .

وہ تو بس دِل کی ہر خوشی پوُری کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں . . . مسکراتے ہیں

عیش کرتے ہیں ——

اور زمانے کے ساتھ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔

اور کہاں وہ ——؟

ایک گھورے میں پڑی ہوئی تھی۔

ایک اندھیرے کونے میں ——

لاہور اور جمال پوُر میں زمین و آسمان کا فرق تھا اِس دُنیا میں اور اُس دُ

کتنے فاصلے تھے۔

گاؤں میں اُن کا محل نما اونچی برُجیوں والا خوبصورت سا مکان تھا۔ آس پاس آم اور
ے کے باغ تھے۔ اس کے بھائیوں کی ذاتی کاریں تھیں۔ اُس کے باپ کا ایک پُرانا
انگہ بھی تھا جو اکثر مہمانوں کو لانے اور چھوڑنے اسٹیشن تک جایا کرتا تھا۔ دو صحت مند
ئے سواری کو تھے۔ اور گائے بھینسوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔

اس کے علاوہ اُس کے بابا نے شہری سہولتیں فراہم کرنے کی کما حقہٗ کوشش کی
۔ اُن کا گاؤں چونکہ بجلی سے محروم تھا اِس لئے اُس کے بابا نے ایک جنریٹر خرید رکھا
ا جو گھر میں بجلی فراہم کرتا۔ پنکھے چلتے۔ اور گرمیوں میں کولر بھی چلتا تھا۔

شہر کے اسکول میں تو اُس کی اَمارت کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر موسم میں وہ
پھلوں کے ٹوکرے منگوا کر اُستانیوں اور سہیلیوں کو "تحفۃً" دیتی۔ کبھی کبھی اپنی کلاس کو پکنک
کے لئے اپنے گاؤں لے جاتی۔ سب لوگ اُس کے اتنے بڑے گھر اور نوکروں و نوکرانیوں
کی فوج سے بہت متاثر ہوتے۔ اس طرح اُس کی اَنا کی بڑی تسکین ہوتی۔

مگر یہ لاہور والی بات —— رونق اور رنگ و نور وہاں کہاں تھا؟ وہاں گلیوں
میں جگہ جگہ گوبر پڑا ہوتا۔ سڑکیں تمام کچی تھیں۔ اگر موٹر میں بھی کہیں جانا ہوتا تو واپسی پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مٹی کے بھوت بن کر آتے۔

غلیظ بچے، بے محابا ننگ دھڑنگ پھرتے رہتے تھے۔

لوگوں کو اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ جہاں بیٹھتے وہیں گلا کھنکار کر

لوگ ہی کیا اُس کے گھر کے سارے افراد اسی قسم کے تھے۔

ذراسی بات کو دُودھ کی لسی کی طرح بڑھاتے ہی چلے جاتے تھے۔ معمولی معمولی

کے لیے فساد پہ آمادہ ہو جاتے تھے۔

تنگ نظر ایسے کہ عورتوں کو گھر کی چاردیواری میں بند کر کے رکھتے۔ لیکن خود

ساری رات مجرا سُنا کرتے۔

باہر سے ہر روز نئے جھگڑوں کی اطلاعیں آتیں۔ آج فلاں نے پانی روک لیا

آج پانی کے جھگڑے میں فلاں کا سر پھٹ گیا ہے۔ آج اس کی بھینس اُس نے

کل اُس کی گائے کوئی اور کھول کر لے گیا۔

توبہ ——

وہ تب بھی اِن باتوں سے عاجز آجاتی تھی۔

جب بھی اس کے دونوں بڑے بھائی غلام غوث اور غلام فرید حقّے لے کر

پاس نیم کے درخت تلے آکر بیٹھتے۔ تو اُس کا مزاج اندر ہی اندر اُبلنے لگتا۔

پہروں وہ گاؤں کی سیاست پہ لایعنی بحث کرنے لگتے۔ لوگوں کو ڈرانے، دھمکانے

اور دھونس جمانے کے نئے نئے گر وضع کرتے، آخر میں اپنی فصلوں کا حساب لگا

خود بھی بٹوارے پر جھگڑ پڑتے۔

بھلا اُن کے گھر کا کوئی بھی کام آج تک جھگڑے کے بغیر ہوا تھا۔؟ اُسے یاد

نہیں تھا۔

شادی ہو یا عقیقہ —— موت ہو یا چالیسواں —— بچے کی پیدائش ہو

…خودداری —— خاندان میں کچھ لوگ جھگڑا کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ ہر موقع پر ایک

…ی ٹھ کھڑا ہوتا، ہنگامہ ہوتا —— تو تکار ہوتی —— مرنے مارنے کی دھمکیاں دی

…اتیں —— بول چال بند ہو جاتی۔ بالآخر بہزار خرابی وہ کام انجام کو پہنچتا۔ پھر چار دن

…ف خاموشی چھا جاتی۔

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ برادری والے کسی "خاص موقعے" پر ہی ہنگامہ آرائی کیوں

…رتے ہیں اور تو اور اُس کے لاہورد اخلے پر بھی ایسا ہی ایک ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔

اِس مرتبہ ماموں فیروز دین نے لٹھ بازی کی تھی۔

شاید انہیں زعم تھا کہ اُن کا لڑکا بی اے پاس ہے اور انھوں نے سجّو کو مانگ

…لکھا ہے۔

تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

میں نے بھی بی اے کر کے نہ دکھایا تو نام نہیں۔

وہ اپنے گاؤں سے —— عزیز و اقارب سے —— وہاں کے ماحول سے

شدید نفرت کرتی تھی —————— مگر یہ نفرت اُس کے لاشعور میں رہتی تھی۔

لاہور میں آکر —— آسمان پر تیرتے بادلوں اور رنگ برنگ پھولوں پر اُڑتی تتلیوں

…لو دیکھ کر اُس کا مافی الضمیر اُبل آیا تھا۔

وہ یہاں خوش تھی —— بہت خوش ——

اِک اِک شے کو غور اور محبّت سے دیکھتی۔ گویا وہ اس خاک کی بچھڑی ہوئی جنگی تھی

…اور اب اس میں آکر مل گئی ہے۔ یہاں اُسے مال روڈ سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔

لاہور کی مال اُسے روشنیوں کی وہ راہ گزر لگتی جس کے آگے سب ستارے

…ماند ہو جاتے ہیں۔

خوبصورت، چمک دار، بارونق ——

شیشوں ۔۔ دشینیوں سے گندھی ہوئی مال ــــــ جیسے ہردم سولہ برس کی
کوئی حسینہ ــــــ کوئی شہزادی ــــــ

لاہور میں مال روڈ کی حیثیت "مس یونیورس" کی سی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ
ہرسال نئی لڑکی ہوتی ہے مگر مال ہرسال بہ نفسِ نفیس۔ بن ٹھن کر مقابلے پر آئی
ہوتی۔ لاہور کی باقی سڑکوں میں سے کسی اور میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ مال کے مقابلے پر آتی
اور اس کا اعزاز اس سے چھین لیتیں۔

دراصل لاہور کے اربابِ اقتدار کا دل جس طرح اس نورِ مجسم پری جمال پر آتا تھا
اور سڑک پر نہیں آتا تھا۔

اسی لئے تو آئے دن اس میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ اور تو اور جب
سے کوئی بڑا مہمان آتا تو اسی "بت طناز" کو اس کی پذیرائی کے لئے رنگ و نور کا پیراہن
دیا جاتا۔ پھر تو اس کی سج دھج میں چار چاند لگ جاتے۔

اسے انارکلی بازار بھی بہت پسند آیا تھا۔ وہ بازار ہجوم کا ایک سیلِ رواں لگتا۔ جہاں
عورتیں ہر موسم میں خرید و فروخت کرتی نظر آتیں ــــــ یوں لگتا جیسے انہیں سوائے شاپنگ
کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ یا پھر ہر گھر میں ایک شادی رچی ہوتی ہے۔ وہ حیران
ہوتی کہ عورتیں شاپنگ کرتی نہیں تھکتیں۔ شدید سردی ہو یا گرمی۔ برسات ہو یا بہار
کوئی دن نہ ۔۔ جب بازار میں عورتوں کا ہجوم نظر نہ آتا۔ خدا جانے ان کی ضروریات
اتنی بڑھی ہوئی تھیں یا ان کے لئے پیسے کو سنبھال کر رکھنا مشکل امر تھا۔

اس کے ہوسٹل کی لڑکیوں کو انارکلی بازار کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ اگرچہ وہ چھپ چھپا
کر خرید و فروخت تو وہیں سے کر لاتیں۔ مگر ذِکر مال کی ہر دکان کا کرتی رہتیں۔
بالآخر یہ ساری باتیں ہولے ہولے اس کے دماغ میں سمانے لگیں۔ اس کی ۔۔
وسیع نہ تھیں۔

وہ فیشن کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی۔ اس کے پاس انگلش میگزین بھی نہ آتے
۔۔ سویٹروں اور کوٹوں کے نئے نئے ڈیزائنوں پر بحث کر سکے۔ یوں بھی لاہور
۔۔ اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ جس کا حوالہ دے کر وہ لاہور کے متعلق حیرت انگیز انکشافات
۔۔ انگریزی فلمیں اب اس نے اپنی ہم جولیوں کے ساتھ مل کر دیکھنی شروع کر دی تھیں
۔۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ اپنی سہیلیوں کی گفتگو میں برابر کی شریک ہونے کے لئے
۔۔ کے پاس کوئی حربہ نہ تھا۔

چنانچہ اس نے بھی ایک ذریعہ نکال ہی لیا۔ وہی گر جو اس نے اپنے شہر کے اسکول
۔۔ آزما رکھا تھا۔

وہ جانتی تھی شہری لڑکیاں دیہاتی زندگی کو ایک نعمت تصور کرتی ہیں۔ ان کا خیال
ہے زمینداروں کے پاؤں تلے دولت رقص کرتی ہے اور زمین کے سینے سے پھوٹتے
الی تمام نعمتوں سے یہ فیض یاب ہوتے ہیں۔

ویسے بھی اس کے بے حد قیمتی کپڑوں اور ماہ بماہ ایک کثیر رقم کے منی آرڈر نے لڑکیوں
کو کافی مرعوب کر رکھا تھا اور اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ کسی بہت بڑے رئیس
کی بیٹی ہے۔

اب وہ موقع دیکھ کر اپنے گاؤں۔ اپنے باغات اور اپنے محل نما گھر کا ذکر چھیڑ دیتی۔
وہ اپنے مرغی خانے، اگائے بھینسوں، تانگے و موٹروں کا حوالہ دینا کبھی نہ بھولتی۔
کبھی کبھی ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے وہ بڑی رعونت سے کہتی "مجھے تو
ناسپتی گھی کے کھانے کی عادت ہی نہیں ہے۔ جب سے ہوسٹل میں آئی ہوں۔ میرا
۔۔ خراب ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں تو اس زمانے میں بھی دیسی گھی پانی کی طرح بہایا
جاتا ہے۔"
۔۔ کھاتے ہوئے وہ الگ ناک بھوں چڑھاتی۔

تو یہ: سُنا تھا لاہور مالٹوں کا شہر ہے۔ مگر مجھے آج تک اچھے قسم کے نظر نہیں آئے۔ ہمارے باغ کے بلڈ ریڈ مالٹے اور کِنوں اس قدر لذیذ اور رسیلے ہیں کہ آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جاتے۔

یا پھر ——————

"ہائے یہ آم ہیں جو تم کھا رہی ہو۔ خُدا کی قسم اِس قسم کے آم تو ہم اپنے مزارعوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔"

اور جب اس کی فرمائش پر گھر والوں نے موسمی پھلوں کے ٹوکرے ہوسٹل میں بھیجنا شروع کر دیئے تو لڑکیوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔

HOW LUSTROUS
HOW BEAUTIFUL

"ہائے سجّو! اللہ تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ سچی . . . میں نے اتنے سیاہ اور اتنے لمبے بال آج تک کسی کے نہیں دیکھے۔"

کوئی لڑکی اس کی کولہے تک لمبی چوٹی کو ہاتھ میں پکڑ کر کہتی "خدا کی قسم چلتی ہوئی بڑی گریس فُل لگتی ہو . . . "

اور سچ مچ وہ اپنی نئی چال میں چلتی ہوئی بڑی شاندار لگتی تھی۔ اُس نے ابھی تک بال نہیں کٹوائے تھے۔ مگر بالوں کو تیل لگانا بند کر دیا تھا۔ اور دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی شیمپو استعمال کرنے لگی تھی۔ ورنہ پہلے تو وہ آنولوں اور سکاکائی سے سر دھوتی تھی اور یہی راز تھا اُس کے لمبے سیاہ اور چمکیلے بالوں کا۔

مگر یہاں ہر غسل خانے میں کسی غیر ملکی شیمپو کی بھینی بھینی خوشبو رچی دیکھ کر آخر اُس نے دقیانوسی طریقِ کار ترک کر دیا۔

شیمپو کرنے سے واقعی بال ریشم کی طرح نرم اور پھُولوں کی طرح ہلکے ہو جاتے اُس نے سیدھی مانگ کے بجائے اب بال اُلٹے کرنے شروع کر دیئے تھے اور خُشک بالوں کو ذرا سا BACK COMBING سے پھُلا لیتی اور کانوں پر سے لے جا کر پیچھے لمبی چٹیا بنا لیتی۔

اُس کے گول مُلتانی چہرے اور بیٹھے ہوئے سر پہ یہ انداز بہت بھلا لگتا۔

ویسے اس پر سیدھی مانگ بھی خوب جچتی تھی۔ دو سیاہ پہاڑوں میں دُور تک جاتی دودھیا سٹرک۔ کئی بار لڑکیوں نے اُسے کہا بھی کہ اُسے سیدھی مانگ بہت اچھی لگتی ہے اور یہ بھی کہ —— اب پھر سیدھی مانگ اور چپکے ہوئے بالوں کا فیشن آگیا ہے۔

کیونکہ فیشن کو بہرحال چند سالوں کا وقفہ ڈال کر پھر ضرور آنا ہوتا ہے۔ اب تاریخ کو اپنے مشہور و معروف مقولے میں اتنی جدت ضرور کر لینی چاہیئے کہ: "تاریخ اور فیشن آپ کو ضرور دہراتے ہیں۔"

مگر سجو چونکہ بچپن سے سیدھی مانگ نکالتی آئی تھی اس لئے وہ اسے جدید ترین سمجھ کر ہرگز اپنانے کو تیار نہ تھی۔ اُسے بغیر مانگ کے چھوٹے چھوٹے بال بڑے اچھے لگتے تھے۔

اس بات پر تو وہ اکثر کڑھتی تھی کہ اُس کے بال اتنے لمبے اور گھنے ہیں کہ ڈھنگ کا کوئی جوڑا بھی نہیں بن سکتا۔ کٹے ہوئے بالوں میں مصنوعی بالوں کا جوڑا لگا کر لڑکیاں اتنے خوبصورت ہیئر اسٹائل بناتیں کہ وہ بس دنگ رہ جاتی اور پھر جب لڑکیاں اُس کی لمبی سیاہ چُٹیا کو ہاتھوں میں لے کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتیں اور ادا سے کہتیں۔ "او گاڈ۔ اتنے لمبے اتنے خوبصورت بال۔ اور سچ مچ کے۔"

تو اُس کی انا کی تسکین ہوتی۔ سارے کالج میں بس اُسی کی تو اتنی لمبی چُٹیا تھی۔ اس لئے لڑکیاں اُسے "کالج کوئین" کہنے لگی تھیں۔

ویسے بھی وہ "کالج کوئین" کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ کیونکہ اُس کا میک اپ سے بے نیاز چہرہ ہمیشہ چمکدار اور شگفتہ رہتا۔ وہ کئی لڑکیوں کی طرح ہر روز صبح بیوٹی ٹریٹمنٹ نہ کرتی تھی۔ مگر بچپن سے اب تک جو اُس نے گھر کا خالص دودھ اور مکھن کھایا تھا۔ وہ اُس کے ہر دم تازہ دم چہرے سے حُسن بن کر جھانکا کرتا۔ اور جب وہ جدید طرز کی قطع برید میں ملبوس

ہو کر لڑکیوں کے ساتھ بازار جا نکلتی تو کئی لڑکے اُس کا پیچھا کرتے اور دُور تک ساتھ جاتے۔ اُن سے وہ انجان بنی رہتی۔ مگر اندر ہی اندر ایک سرشار آگیں غرور اُس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔ اس کی گردن اور بھی تن جاتی اور چال میں مزید مستانہ پن آجاتا۔

کتنی عجیب بات ہے۔ مرد جب عورت کے اندر سوئے ہوئے احساسِ حسن کو بیدار کر دیتا ہے تو عورت کے حُسن میں اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے —— وہ جوں جوں اپنا رویہ عاشقانہ بناتا جاتا ہے، عورت کی اداؤں پہ جوبن آتا جاتا ہے خواہ عورت کو تسخیر کر لینے کے بعد وہ اُسے دو کوڑی کا بھی نہ چھوڑے بہرحال مرد کی ایک والہانہ نظرِ انتخاب ایک کم رو عورت کو بھی ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔ سجو تو پھر بھی خوبصورت کہلائے جانے کی مستحق تھی۔

اصل میں اس کا مشرقی چہرہ جدید طرز کے فیشنوں میں بہت کھِل اُٹھتا تھا۔ گویا یہ سب فیشن اسی کے لئے ایجاد کئے گئے ہوں۔ یا پھر وہ جدید فیشنوں کے سانچے میں ڈھال کر بنائی گئی ہو۔

تاہم جب وہ اپنی اونچی ایڑی والے جوتوں کی ٹک ٹک کی تال پر کولہے مٹکا مٹکا کر اور چُٹیا لہرا لہرا کر چلتی تو سڑک پر چلنے والے لڑکے بے اختیار "ناگن ناگن" پکار اُٹھتے۔ وہ اپنی آنکھوں میں ہزاروں بجلیاں بھر کر انہیں گھورتی۔ مگر اپنی چال کا وقار برقرار رکھتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی آنکھوں میں حیا تھی۔ وہ پارسائی کی زندگی پسند کرتی تھی۔ اُسے لڑکوں کا دُور دُور منڈلانا ہی اچھا لگتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے عقیدے میں گناہ تھا۔

وہ جب گاؤں میں تھی تو اُس کے عقائد لوہے کی مانند مضبوط تھے۔ لڑکوں کا یوں منڈلانا اور آوازے کسنا بھی اُسے بُرا لگتا تھا۔ اخبار میں جب کبھی وہ کوئی ایسا واقعہ پڑھ لیتی کہ کسی لڑکے نے راہ چلتی کسی لڑکی کو چھیڑا ہوتا تو اُس کا خون کھول اُٹھتا۔ اگر میں وہاں ہوتی تو اُلو کے پٹھوں کو مزہ چکھا دیتی۔"

مگر اب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اِن اُلّو کے پٹھوں کو مزہ چکھانا آسان کام نہیں۔ درصل وہ اتنے زیادہ تھے کہ اُن سے نمٹنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر وہ سڑکوں پر ٹڈی دَل کی مانند بکھرے رہتے۔ اور راہ چلتی لڑکیوں و عورتوں پہ بلند آواز میں تنقید کرنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔

ذرا لڑکی نظر آئی اور وہ پھُدکے ——————

نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آوارگی اور لڑکے لازم و ملزوم ہیں۔ اور کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ سے آگے بڑھ جانا ہی زندگی کو قوسِ قزح بنا دیتا ہے۔ اور پھر جب جوانی بھی زندگی میں ایک ہی بار آتی ہو۔ تو اس کو یادگار کیوں نہ بنا لیا جائے۔

ذرا سوچیئے تو۔ لڑکے اگر سڑکوں پر مولانا بن کر چُپ چاپ جا رہے ہوں...... باتیں کسی لڑکی پر نہ تاڑیں.. کسی کو آنکھ مار کر اشارہ نہ کریں..... نہ مکھی اُڑانے کے بہانے سلام کریں تو دُنیا کا کاروبار بدرنگ ہو جائے۔ اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر حدیث و فقہ کی دقیق کتابوں میں اپنی جوانی گم کر دیں۔

چھی... چھی..... لڑکوں کا سڑکوں پہ باوضو ہو کر، نماز کی نیت باندھ کر چلنا اب تو کے تصوّر کو بھی نہ بھاتا تھا۔ بس یہ بھونرے تو کلیوں پر منڈلاتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ بھلا دُور دُور سے منڈلانے میں کسی کا کیا چھین لیتے ہیں۔ اگر یہ اس طرح منڈلانا چھوڑ دیں تو فسانۂ دنیا کی دُنیا خودکشی کر لے۔

یہ فلسفہ بھی اُسے بہت دن بعد سمجھ میں آیا تھا۔

پہلے پہل تو وہ خود لاہور کی سڑکوں پر باوضو چلا کرتی تھی۔ سر کو دوپٹے سے ڈھکے بچ بچ کے سنبھل سنبھل کے۔ اپنے سامنے راستے کے علاوہ کسی طرف نہ دیکھتی چھیڑ چھاڑ کا جائز فائدہ اٹھا کر اگر کوئی راہ گیر اُسے کسی مخصوص جگہ پہ کہنی مار جاتا تو اُسے جہنم کے شعلے یاد آ جاتے۔ کتنی دیر تک اُس کے جسم کا وہ حصہ انگاروں کی طرح جلتا رہتا اور دل ہی دل میں راہ گیر کو زمانے بھر کی بددعائیں دے ڈالتی۔ مگر یہ دیکھ کر اُسے تعجب ہوتا کہ اس کی ہمجولیوں پر ان باتوں کا بالکل اثر نہ ہوتا۔ گویا وہ گھر سے ہی دھکے اور کہنیاں کھانے کا تہیہ کر کے نکلتیں۔ یا پھر وہ احساس کی ہر زد سے بالا ہو گئی تھیں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ جن کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ بلکہ محض بکواس کہہ کر ٹال جاتیں۔ مگر ہفتوں بجّو کے ذہن پر ان باتوں کا اثر رہتا۔ وہ درصل ایک چھوٹے سے قصبے سے آئی تھی۔ اس لئے اس کا ذہن اتنی جلدی شہر کی لڑکیوں کے ذہنوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ——————

وہ پانچ چھ لڑکیاں —————— گُل بَرگ سے بس میں سوار ہوئیں۔ جیل روڈ کے بس سٹاپ سے کچھ لڑکے بھی بس میں سوار ہو گئے۔ اتّفاق سے اُس دن بس نیم خالی تھی۔ خواتین کی تمام سیٹیں پُر تھیں۔ مردوں کی کئی نشستیں خالی پڑی تھیں۔ دو چار لڑکیاں تو عورتوں کے ساتھ گھُس کر بیٹھ گئیں۔ باقی نے سوچا کہ یہ جو خالی نشستیں پڑی ہیں، کھڑے رہنے سے بہتر ہے کہ ان پر بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھ گئیں۔ اُن کے بیٹھتے ہی بس بھی بھر گئی۔ وہ لڑکے اگر اُن کے سروں پہ کھڑے ہو گئے اور لگے طرح طرح کی باتیں بنانے۔

"یار لڑکیاں ہماری سیٹ پہ بیٹھی ہوئی ہیں۔" ایک نے کہا۔ "کنڈکٹر سے بات کرو۔" "ہمارے حقوق پہ ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"جب سے یہ حسینائیں اعلیٰ تعلیم کے بہانے گھروں سے نکل آئی ہیں، انھوں نے ہماری سیٹوں پر ہی نہیں۔ ہمارے دلوں پہ بھی زبردستی قبضہ جما لیا ہے۔" تیسرے نے بجّو کے کان کے قریب مُنہ لے جا کر کہا۔

بجّو نے بڑی بے بسی سے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا۔ اور بولی: "خالی کر دیں اِن کی سیٹیں؟"

"انہیں بکواس کرنے دو۔ اور چُپ چاپ بیٹھی رہو۔" وہ لڑکی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے جناب۔ اکیلے ہی فیصلہ صادر کر دو۔ پھانسی ہے یا عمر قید کا۔" پہلا لڑکا اُن کی کھسر پھسر کے بعد پھر گویا ہوا۔

اس مرتبہ بس ایک جھٹکے سے رُکی اور وہ ایک لڑکا جان بُوجھ کر لڑھکتا ہوا سجّو کی گود میں آن گرا۔

"ایڈیٹ ——" وہ بپھر اُٹھی۔

"سوری محترمہ۔" لڑکا بمشکل کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ "حضور ڈرائیور کا قصور ہے ورنہ مجھے کچھ آپ کا شیر خوار بننے کا شوق نہیں تھا۔"

(اُلّو کا پٹھا) سجّو دل ہی دل میں جل کر رہ گئی۔

"اوئے تجھے ماں تو یاد نہیں آ رہی۔" دوسرے نے کہا۔

"ماں تو نہیں البتہ ساس یاد آ رہی ہے۔" اُس نے سجّو کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

سجّو کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو ہنسی آ گئی۔ سجّو کو اور بھی غصّہ آیا۔

"تم لوگ ہنس کر انہیں لِفٹ دیتی ہو۔" اُس نے مُنہ پُھلا لیا۔

"اور کیا رو دیں۔ کم بخت باتیں ہی ایسی کرتے ہیں۔ اچھا تم بھی اپنا منہ پھیر لو۔ بکواس کر کے چُپ ہو جائیں گے۔"

سجّو نے تنگ آ کر ایک کتاب کھول لی۔

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی —— بس چلتی —— پھر کچھ بد بدلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

شاید وہ اس کی کتاب کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک لڑکے نے جُھک کر کتاب کا نام پڑھنا چاہا۔ وہ سجّو کے کندھے پر اس قدر جُھک آیا کہ اُس کے منہ کا بھبکا اُسے اپنے نتھنوں میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے اُبکائی سی آ گئی۔

بیخ پا ہو کر اُس نے جھٹ کتاب بند کر دی۔

"تعلقات خراب ہو گئے ہیں یار۔ اتنا قرب بھی اچھا نہیں ہوتا۔" اسی لڑکے نے بلند آواز سے کہا۔

اب وہ رو ہانسی ہو چکی تھی۔ جب بھی بس کھڑی ہوتی کوئی نہ کوئی لڑکا جھٹکا کھا کر اُس پر گرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی اُس کے گھٹنے سے مس ہوتا۔ کبھی اُس کے کندھے سے رگڑ کھاتا۔ جب بھی کسی سواری کو اترنا ہوتا وہ اس طرح کا زاویہ بنا کر اسے جگہ دیتے کہ کسی نہ کسی طرح سجّو کو جو کنارے کی طرف بیٹھی تھی اُن کا جسم چُھو جائے۔

کتنے ذلیل ہیں یہ لوگ۔ وہ دل ہی دل میں کھولتی۔ کچھ خدا کا خوف نہیں اُنہیں۔ ان کی مائیں بہنیں بھی تو اسی طرح بسوں میں سوار ہوتی ہوں گی۔ جوانی نے تو اُن کی غیرت کا جنازہ ہی نکال دیا ہے۔ توبہ!

مگر وہ بالکل نہ جانتی تھی۔ کہ یہ تمام الفاظ اور فقرے اتنی مرتبہ دہرائے جا چکے ہیں۔ کہ اپنے معانی کھو چکے ہیں۔ ان فقروں کو تو یہ پیار کا ایک انداز سمجھتے ہیں اور ایسی جھڑکیوں کو "صلائے عام" کہتے ہیں۔

اُسے اپنے مقدّس جسم سے نامحرموں کے مَس ہونے کا الگ قلق تھا۔

یہ خوبصورت کنوارا جسم۔ غلافوں میں لپٹا ہوا۔ یہ تو مذہب کہتا ہے۔ کسی ایک محرم کی ملکیت ہوتا ہے۔ اپنے مجازی خدا کے لئے وہ اس جسم کو ہر نگاہِ بد سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ وہ تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی اُلّو کا پٹھا اسے بھولے سے بھی چُھو لے ——

اور کہاں یہ مسلسل دھکم پیل ——

اُس نے اپنی سہیلی سے کہا اب وہ یہ بیہودگی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اُٹھ کر آگے عورتوں کی سیٹوں میں کھڑی ہو جائے گی اتنے میں کمرشل بلڈنگ کا اسٹاپ آ گیا۔

اُنہیں یہیں اُترنا تھا۔ وہ سب ایک دم کھڑی ہوگئیں۔

باہر نکلنے کو کافی جگہ تھی۔ مگر ان کم بختوں نے اس طرح باہر جانے کا راستہ روکا
انتہائی احتیاط کے ہر لڑکی اُن سے رگڑ کھا کر ہی باہر نکل سکی۔

"کمینے کہیں کے ——؟" سجّو نے نیچے اُترتے ہی اپنی قمیض کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

"پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کم بختوں کا ہمیشہ یہی رویہ ہے۔" ایک بولی۔

"پرواہ کیسے نہ کریں۔ وہ بڑے ثواب کا کام کرتے ہیں۔" سجّو چڑ گئی۔

"اور تم کیا کر سکتی ہو۔؟" دوسری نے پوچھا۔

"ایک جوتا اُتار کر مرمت کرنی چاہیئے تھی۔"

"کیا فائدہ۔؟ بات بڑھ جاتی۔ ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ کل اخباروں میں خبر آ جاتی۔ لوگ ہمیں کو باتیں بناتے —— اور آئندہ باہر نکلنے پر بھی پابندی لگ جاتی۔"

"ایسی ہی باتوں نے تو انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔" سجّو بولی۔

"یہاں سب ایسے ہی چلتا ہے۔ تم نئی نئی آئی ہو نا؟ اس لئے زیادہ محسوس کرتی ہو"
سجّو بڑبڑانے لگی۔ "آخر لڑکیاں یہی بات کہہ کر کیوں ہمیشہ اُسے خاموش کرا دیتی ہیں"

"رفتہ رفتہ تم بھی اِن باتوں کی پرواہ نہیں کرو گی۔" ایک اور نے کہا۔ "پرواہ کرنے کا مطلب ہے ہم انہیں لفٹ دے رہے ہیں۔"

"میں تو کہتی ہوں یہ بس کی سواری ہے ہی ذلیل۔" سجّو نے اپنا غصہ بس پر نکالا۔ "شریف عورت کو کبھی بس میں سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک تو کپڑوں کا کچومر نکل جاتا ہے" کھسیانی سی ہو کر ہاتھوں سے اپنی قمیض کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔

اس واقعے کے علاوہ کئی اور واقعات بھی اس عرصے میں رونما ہو چکے تھے۔ جنہوں نے شہری لڑکی بننے میں سجّو کی مدد کی تھی۔ اس کی ذہنیت میں نہ صرف نکھار پیدا کر دیا تھا

انداز فکر ہی بدل دیا تھا۔

بعدازاں اُسے اپنی "دقیانوسیت" پر خود ہی شرمندگی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ واقعی بڑے شہروں میں رہنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ اب ایسے چھوٹے موٹے واقعات کو سجّو بھی جی بھر کر ENJOY کرنے لگی تھی۔

وہ کیا کسی سے کم تھی ——؟

دس بارہ لڑکیوں کے گروپ میں وہ ہمیشہ ہی نمایاں نظر آتی۔ اُس کا حُسن روز بروز نکھار کامل ہو رہا تھا۔ لاہور کی آب و ہوا اس کے چہرے پر گُل و گلزار کھلا رہی تھی۔ بغیر بازو کے تنگ قمیض میں وہ ایک دم شہر کی طرحدار اور شوخ و شنگ کالج کی لڑکی لگتی۔ جوانی میں اتنا بڑا اعزاز مل جانا ہی بڑی بات ہے۔

اور پھر جب لڑکے خواہ مخواہ اُس کی جانب متوجہ ہوتے اور اُن کی پیاسی نگاہیں ہر موڑ پر اُس کا تعاقب کرتیں تو اُس میں خود پسندی کے اوصاف کیوں نہ پیدا ہوتے۔

وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے سڈول کندھے ایک خاص ادا سے اُچکاتی اور چونچم بالی ہوئی آگے نکل جاتی۔

اُس روز وہ سب خاص طور پر بانو بازار کی چاٹ کھانے گئی تھیں۔ ورنہ انارکلی میں انہیں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بانو بازار میں داخل ہوتے ہی انہیں اچانک کئی ضروری چیزیں یاد آ گئیں۔ جو انھوں نے وقت کی تنگی کا عذر دے کر وہیں سے خرید لیں —— گول گپے چکھنے کے بعد وہ سب ایک چاٹ والے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

چاٹ والے نے جو اِک "ہجومِ مہ رُخاں" دیکھا تو جلد از جلد صبح کا کترا ہوا پھل پلیٹوں میں ڈالنے لگا۔ اپنے پتلے تُلے ہاتھوں سے موسمی پھلوں کی ایک ایک قاش اور چند اُبلے ہوئے چنے پلیٹوں میں ڈال کر اُس نے مصالحے کے متعلق لڑکیوں سے پوچھا۔

"تیز ——؟" اُنہوں نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ اپنی اپنی پلیٹ تھام کر بنچوں پر بیٹھنے والی تھیں کہ لڑکوں کا ایک غول ان کے سروں پر آکر کھڑا ہوگیا۔ کئی لڑکے تو اتنے بے باک نکلے کہ اُن کے آگے پڑے ہوئے بنچ پر دھم سے بیٹھ گئے اور چاٹ کا آرڈر دینے لگے۔

کچھ لڑکیاں بیٹھ گئیں۔ باقی کھڑے ہو کر کھانے لگیں۔

"یار چاٹ کی 'چاٹ' بُری ہوتی ہے۔"

اب لڑکے اپنی عادت پر اُتر رہے تھے۔

"بڑے بڑے اکڑفوں لوگوں کو بھی چاٹ کو چاٹتے دیکھا ہے۔" دُوسرے نے

اب کئی لڑکیوں کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا اور وہ ملازم لڑکے کو پانی لانے کا آرڈر دے رہی تھیں۔

"بھئی اگر یہ حوّا کی ماڈرن بیٹیاں اسی طرح روزانہ سینکڑوں روپیہ چاٹ پر برباد کریں تو تم ایک روز گلبرگ میں کوٹھی بنا لو گے۔" ایک لڑکے نے چاٹ والے سے پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔

"جب بھی یہاں آؤ۔ چاٹ کی دوکانوں پر مکھیوں سے زیادہ لڑکیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ خدا معلوم ان بیچاریوں سے گھروں میں روزے رکھوائے جاتے ہیں۔" ایک اور لڑکے نے چاٹ کی دوسری دوکان پر لڑکیوں کی بھیڑ کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں کہا۔

"نہیں یار۔ گھروں میں تو بے چاریاں 'سلیمنگ' کرتی ہیں۔ مگر اپنا کوٹہ بانو بازار میں کر لیتی ہیں۔"

اب چاٹ والا بھی مُنہ پھیر کر مُسکرانے لگا تھا۔

لڑکیاں اب اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں۔ جہاں چاٹ اور اُن کے درمیان تیکھی مرچیں حائل ہوگئی تھیں۔ پلیٹیں ختم ہونے کو تھیں۔ زبان دہائی دے رہی تھی۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے ناک پونچھتی جاتیں۔ اور

دوسرے ہاتھ سے کھاتی بھی جاتیں۔

پچاس پیسے کی ایک پلیٹ میں سے وہ ایک دانہ بھی بچانا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ اور بات کہ مرچوں کی تندی زائل کرنے کے لئے ایک ایک کوک پینا پڑ رہا تھا۔

"یار جب گلبرگ میں کوٹھی بنا لو گے تو کیا وہاں بھی چاٹ کی دوکان کھولو گے؟" ایک شریر سے لڑکے نے چاٹ والے کا زیرِ لب تبسم دیکھ لیا تھا۔ اس لئے براہِ راست سوال کر ڈالا۔

"کیوں مذاق کرتے ہو بابو جی۔" چاٹ والے نے کھجور کے پتوں کا مورچھل ہاتھ میں لے کر مکھیاں اُڑاتے ہوئے کہا۔

"یار اتنی تو تمہاری روز کی کمائی ہے۔ تم لوگوں کی ہر دلعزیزی دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ اس دفعہ اگر پھر امتحان میں فیل ہوگیا۔ تو یہیں کہیں میں بھی چاٹ کی ایک دوکان کھولوں گا۔"

"بابو جی یہ دھندا تو ہم غریبوں کے لئے ہی رہنے دیں۔ صاحب لوگوں کو تو دفتروں میں باعزت نوکریاں مل جاتی ہیں۔ یہ کام ہم جیسے ان پڑھ لوگوں کے کرنے کے لائق ہیں۔"

"اجی۔ تمہیں کیا معلوم دفتروں میں باعزت نوکریاں باعزت طریقوں سے نہیں مل سکتیں۔"

"اچھا سچ سچ بتاؤ۔ روزانہ تمہیں کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟" ایک اور لڑکا جھٹ بول اُٹھا۔ "میرا خیال ہے سو روپے روز تو کما لیتے ہوگے؟"

"توبہ۔ توبہ بابو جی! اتنی کمائی ہونے لگے تو میں کوئی ہوٹل نہ کھول لوں۔ ہاں جب اتنے چاٹ والے نہیں تھے تو اچھی کمائی ہو جاتی تھی۔ اب تو ——————" اُس نے غصّہ سے دُوسرے چاٹ والوں کی طرف دیکھا۔ "ہر کنجڑا قصائی چاٹ والا بن بیٹھا ہے۔"

"کیا تم نے سب سے پہلے چاٹ کی علّت پالی تھی؟" لڑکوں نے پوچھا۔

"ہاں جی ————" چاٹ والا سینہ تان کر بولا۔ "جی۔ ابھی بانو بازار بنا بھی نہیں تھا جی۔ جب میں وہاں سیڑھیوں پر چھابڑی لگایا کرتا تھا۔ تب بھی میرے بے شمار گاہک تھے۔"

مگر اب دیکھ لیجئے اس چھوٹے سے چوک میں کتنے آ بیٹھے ہیں۔ گاہک بڑھ گئے
کئی مرتبہ تو پورا خوچہ بھی نہیں نکل سکتا۔"

"گاہک تو بلکہ زیادہ ہو گئے ہیں، چاٹ والے"۔ ایک لڑکی نے پلیٹ واپس دیتے
کہا۔"اب تو لڑکیوں کے برابر لڑکے بھی چاٹ کھاتے ہیں۔ میں تو جب بھی آؤں لڑکیوں
زیادہ لڑکوں کی ٹولیاں چاٹ والی دوکانوں پر براجمان ہوتی ہیں۔ اور لڑکے اس طرح
پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جیسے پتہ نہیں کیا ——— "

آخری فقرے اُس نے اپنی سہیلیوں کی طرف مُنہ کر کے کہے۔

اب لڑکیاں کوک پی چکی تھیں۔ اور مرچوں پہ ایک حد تک انہوں نے فتح پالی تھی
لئے اپنی سُرخ ناکوں کے ساتھ بڑی شگفتہ نظر آ رہی تھیں۔

"پتہ نہیں آج کل کے لڑکے اتنی چاٹ کیوں کھانے لگے ہیں"۔ بڑی دیر بعد ہوا
یاد آیا۔ اداتے بے نیازی سے پلیٹ واپس کرتے ہوئے بولی۔

"ہمارا دِل کچّا پکّا ہوتا ہے"۔ ایک لڑکے نے سجّو کی طرف دیکھتے ہوئے برجستہ
جواب دے دیا۔

لڑکیاں بے اختیار قہقہے لگا کر ہنس پڑیں۔

لڑکوں کے حوصلے زیادہ ہو گئے۔

لڑکیاں اُٹھنے لگیں تو لڑکوں نے التجا کی: "پلیز ایک ایک پلیٹ اور کھائیے"

"جی نہیں۔ شکریہ . . . "

"ہماری خاطر سہی۔ پلیز"۔ لڑکے کھڑے ہو کر انہیں روکنے لگے۔

"جی بس ——— اور کھانے کی گنجائش نہیں ہے"۔ لڑکیوں کی طرف سے جواب

"ہمارے پاس تو صرف کرانے کے پیسے بچے ہیں"۔

"پیسوں کی فکر نہ کیجئے۔ دعوت تو خاکسار دے رہے ہیں"۔

"ایک ایک پلیٹ اور بناؤ"۔ انہوں نے چاٹ والے سے کہا۔
لڑکیاں بادِلِ ناخواستہ بیٹھ گئیں۔ ایک ایک پلیٹ اور کھائی۔ اور سارا بِل لڑکوں
نے ادا کر دیا۔ چلتے ہوئے سب نے بڑی ادا سے مُسکرا مُسکرا کر "تھینک یو سو مچ" کہا۔
اس ایک مسکراہٹ پہ لڑکوں نے اپنا جیب خرچ لٹا دیا۔
یہی نہیں۔ ایک بار اس سے بھی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اُس روز شہر میں "سایونارا"
چل رہی تھی۔ ان کا گروپ ویسے بھی "جاپانی بیوٹی" کا دیوانہ تھا۔ اس لئے انہوں نے
ہوسٹل وارڈن سے اجازت لی۔ پکچر اتوار کو مارننگ شو میں، صرف ایک دن کے
لئے لگی تھی۔ اس لئے ٹکٹوں پر بڑا رش تھا۔
یوں بھی اتوار کی صبح کو کسی فلم کا اسپیشل شو لگا کر اہلِ سینما ان لوگوں پر بڑا کرم کرتے
ہیں جنہیں چھ دن کے بعد اتوار بڑا بور لگتا ہے۔ اس دِن کوئی رنگین شغل نہیں ہوتا۔ دکانیں
بند۔ اور سڑکیں سنجیدہ۔ بھلا کوئی مارا مارا پھرنے کے لئے نِکلے بھی تو کہاں جائے؟
ایسے میں اتوار کا مارننگ شو بڑا سنبھالا دیتا ہے۔ ایک تو دوپہر کے کھانے تک وقت
اچھا گزر جاتا ہے۔ دوسرے لڑکیاں سہیلیوں کے گھر جانے کا بہانہ آسانی سے بنا سکتی ہیں۔
کیونکہ کئی والدین مارننگ شو سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور جب وہ پکچر دیکھ کر ڈھائی تین بجے
گھر آجاتی ہیں تو ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو پاتا کہ وہ فلم دیکھ کر اور بنٹیو چیپس کھا کر آئی ہیں۔
ٹکٹ گھر کے باہر لمبی سی دو قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ اور اِن میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ یوں
لگتا تھا۔ اس قطار میں شامل ہو جانا ہی ہر نووارد کی زندگی کی معراج ہے۔
عورتوں کی قطار الگ تھی۔ جو نسبتاً چھوٹی تھی اور جس میں تقریباً سبھی کالجوں اور اسکولوں
کی لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔
جہاں مردوں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی، وہاں عورتوں کی گل رنگ قطار چھوٹی ہوتی جا
رہی تھی اور تمام مرد اُن کو حسرت سے تک رہے تھے۔ پچھلوں کو تو خاص طور پر اس بات کا

افسوس ہو رہا تھا کہ اگر عورتیں سب اندر چلی گئیں تو کھڑکی تک پہنچنے کا عرصہ وہ کس طرح گذار سکیں گے۔

اب سجّو کے گروپ کی لیڈر لڑکی کھڑکی تک پہنچ چکی تھی۔ باقی لڑکیاں پروانۂ عام لینے کی خوشی میں دُور ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ اچانک دو شریف صورت لڑکے اُن کے آئے اور بوکھلائے ہوئے انداز میں گویا ہوئے:

"پلیز آپ ہمیں بھی ٹکٹ لے کر دے دیں۔"

"جی۔ ٹکٹ۔" سجّو نے حیرت سے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ آپ خود لے لیجیے

"وہ جی۔ دراصل ہماری لائن بہت لمبی ہے۔ اور جب تک ہماری باری آئے گی فل ہو چکا ہوگا۔ آپ کی قطار تو ختم ہونے والی ہے۔ آپ کی بڑی نوازش ہوگی اگر آپ پانچ ٹکٹ لے دیں۔"

معاملہ اب سجّو کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ سینما ہال کے باہر لڑکے اُن کے آگے سوالی بنے کھڑے تھے۔

سجّو پیسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ باقی نخوت سے زیرِ لب مُسکرا رہی تھیں۔

"پلیز آپ کا احسان ہوگا۔" لڑکے نے انگریزی میں انکساری سے کہا۔ ساتھ ہی کا نوٹوں والا ہاتھ بھی آگے بڑھا۔

"کوئی ہرج نہیں۔" نوشی نے انگریزی میں کہا۔ "لے لو سجّو اور انہیں ٹکٹ لا دو۔ کسی کی مدد کرنا بُری بات نہیں ہے۔"

سجّو نے اپنی گوری انگلیوں کے پوروں میں نوٹ پکڑ لئے اور کھڑکی کی طرف بڑھی۔ تزئین بقایا ریزگاری گن رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ٹکٹ لے چکی ہے۔ مڑ کر اپنی ہمجولیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ارے تو جلدی سے تزئین کے پیچھے کھڑی ہو جا۔ اب اس کو ٹکٹ نہیں ملیں

پہلے ہی چار ٹکٹ لے چکی ہے۔" نوشی نے آگے بڑھ کر سجّو کو تزئین کے پیچھے دھکیل دیا۔

"پانچ ٹکٹ۔" سجّو نے اپنا گداز ہاتھ کھڑکی کے اندر ڈالا۔ باقی دو چار عورتیں اُس کی اِس سینہ زوری پر چیں بجبیں ہو رہی تھیں۔ مگر ٹکٹ والا پیسے تھام چکا تھا۔ ٹکٹ دیتے وقت اُس نے جھک کر اس سنگِ مرمر کے بازو والی کا چہرہ دیکھا... آواز کی طرح چہرہ بھی شرابی کر دینے والا تھا۔

پکچر شروع ہونے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی بقایا ریزگاری اور ٹکٹیں لڑکوں کے حوالے کیں اور سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

جب وہ ہال میں داخل ہوئیں تو گھُپ اندھیرے میں ٹارچ کی ننھی سی لَو سب کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ سب بھی بعافیت اپنی سیٹوں پر پہنچ گئیں۔ اور اطمینان کا سانس لیا۔

انٹرول تک وہ بے سُدھ ہو کر بیٹھی رہیں۔ انٹرول کی روشنی ہوتے ہی انہوں نے تجسس سے اپنے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کہ عام طور پر لوگ ڈھونڈنے والے انداز میں اجنبی صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب نئے چہرے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا انہیں سب سے اگلی قطار میں سیٹیں ملی تھیں۔ پیچھے گردن گھما گھما کر انہوں نے دُور تک نگاہ دوڑائی۔

عورتیں ـــــ مرد ـــــ لڑکیاں ـــــ بچے ـــــ

چہروں کا سیلِ عظیم تھا۔

وہ ابھی اپنے بال دُرست کرتی ہوئی مضطربانہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھیں کہ ایک بیرا چائے کے دو سیٹ لئے اُن کے قریب آیا۔

"یہ کیا ـــــ؟" لڑکیاں حیران رہ گئیں۔

"ہم نے تو چائے نہیں منگوائی۔"

"جی آپ نے تو نہیں منگوائی۔ مگر اِن صاحبوں نے بھیجی ہے۔" بیرے نے دائیں طرف

اشارہ کیا۔

سب لڑکیوں نے بیک وقت ادھر گردن گھمائی۔

اس طرف وہی لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، جنہیں کچھ دیر پہلے انہوں نے ٹھکرا دی تھیں۔ اب وہ ہاتھوں اور اشاروں سے التجا کر رہے تھے کہ رکھ لیجئے۔ ہمارا آپ کے ہاتھ میں ہے۔

"بُری بات ہے۔" سجّو نے کہا۔

"اور پھر وہ خواہ مخواہ لفٹ لے جائیں گے۔" نونی بولی۔

"اس میں حرج کیا ہے۔ ہماری اتنی منّت کر رہے ہیں۔" نوشی کو غالباً بھوک لگ رہی تھی۔

"جی۔ جلدی فیصلہ کیجئے۔ مجھے اور جگہ بھی چائے پہونچانی ہے۔" بیرا بولا۔

"واپس کر دو۔ نوشی!" سجّو نے بڑی رعونت سے کہا۔

اِتنے میں پکچر دوبارہ شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ ستاروں کی طرح ہال کی یکے بعد دیگرے ماند ہونے لگیں۔

"جی۔ میں جاؤں؟" بیرے نے بیزاری سے کہا۔

اب لڑکوں کی طرف سے "پلیز، پلیز۔ اور "فار گاڈز سیک" کی آوازیں آ رہی تھیں چائے والے خوانچوں سے سموسوں اور شامی کبابوں کی اشتہا انگیز خوشبو نکل رہی تھی کے کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اور اس عمر میں بھوک کو دبانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

"رکھ دو۔" نونی نے آہستہ سے کہا۔

بیرا اُن کے زانوؤں پر دونوں ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ انہوں نے مزے لے لے کر پی۔ پیسٹری اور کباب کھاتے اور پکچر کا خوب لطف اُٹھایا۔

خالی پیٹ تو شاید جنّت بھی بھلی نہ لگے۔

جب پکچر ختم ہوئی تو وہ بھی انسانوں کی اِس طغیانی کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ لڑکوں کا وہ گروپ اُن کا پیچھا کر رہا تھا۔

"اب مزہ لے لو چائے پینے کا۔" سجّو نے دوپٹہ سر پہ جماتے ہوئے غصّہ سے کہا۔

"پرواہ مت کرو۔ چُپ چاپ چلتی جاؤ۔ خود ہی راہ بدل لیں گے۔"

ٹیکسی اسٹینڈ پہ کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ ایک جگہ رُک کر انہوں نے دو رکشے لئے۔ لڑکے کہیں پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

جب اُن کے رکشے دوڑنے کے لئے پھڑپھڑائے تو لڑکوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر "سایونارا" "سایونارا" — کہنا شروع کر دیا۔

لڑکیاں ایک دم کھلکھلا اُٹھیں۔ کہ اب تو وہ تہہ دام نہ تھیں۔ مآل بہ پرواز تھیں۔ وہ اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ جواباً انہوں نے بھی اپنے صندلیں اور گورے بازو رکشے سے باہر نکال کر انہیں "سایونارا" کہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہوسٹل پہنچ کر سجّو نے حسبِ عادت پھر اس بات کو کُریدا "بھئی مجھے تو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی۔"

"تمہیں ساتھ لے جا کر ہم لوگ ہمیشہ بور ہوتے ہیں۔ خُدا کی قسم تم تو بال کی کھال اتارتی ہو" ایک بولی۔

"سجو بی! تم ابھی تک بڑی کنزرویٹو ہو۔" دوسری نے کہا۔ "تمہیں اپنے خیالات بدلتے ہوئے کافی دیر لگے گی۔"

"خیر جو بات بُری ہے۔ میں تو ہمیشہ اُسے بُری کہوں گی۔ نامحرموں کو اس حد تک لفٹ نہیں دینی چاہیئے۔" وہ غصّے کو دباتے ہوئے بولی۔

"ایک تو تمہارے اس "نامحرم" نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔" نوشی نے بیزاری سے کہا۔ اس لفظ کا انگریزی میں کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ ورنہ خدا کے لئے یہ لفظ کہنا بند کر دے

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تو "اہرامِ مصر" یا "چاہِ بابل" جیسا بوسیدہ لفظ ہو!
ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔

"اس بے چاری کو گھر والوں نے صرف "محرم" اور "نامحرم" کے چکر میں رکھا ہے! غریب کو بھی نہیں معلوم کہ "نامحرم" کا لفظ کب استعمال میں لاتے ہیں۔" نوئی چہکی۔

"اب تم خواہ مخواہ بجو اس کئے جاؤ تو تمہاری مرضی۔" سجو روہانسی ہو گئی۔ "میں تو پرایا سے لے کر کھانے کو گناہ کہتی ہوں بلکہ حرام۔"

"ایسے لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟" تانی بولی۔

"جن سے ہمارا کوئی رشتہ نہ ہو۔ یہ تو اپنے آپ کو بیچنے والی بات ہوئی۔ مسکرا کر ادائیں بیچ کر کھانا بھی، معاف ہی رکھیں۔ میں تو پیشہ سمجھتی ہوں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" سب لڑکیوں نے مل کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"بے چاری لڑکی۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"سچ کہتے ہیں۔ گاؤں کی لڑکیاں بڑی بھولی بھالی ہوتی ہیں۔"

"محترمہ بیگم اسلامیات صاحبہ! پھر آپ کیا کرنے آئی ہیں۔ دینیات کی اُستانی نہ بن گئیں۔"

سب مختلف انداز میں اُس پر طنز کے تیر برسانے لگیں۔ اور سجیلہ باقاعدہ رو دی۔

آخر لڑکیاں ہمیشہ اُسے "دقیانوس" کہہ کر اس کا مذاق کیوں اُڑاتی ہیں؟

"دیکھو نا؟ سجو ڈارلنگ ——" تزئین نے سجو لیش کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "موجودہ سوسائٹی میں ان باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم نے ان لوگوں کو ٹکٹ لے کر دیئے تھے۔ دیئے تھے نا؟ ——"

"ہاں ——"

اگر ہم اس آڑے وقت میں اُن کے کام نہ آتے تو بے چارے آج پکچر نہ دیکھ پاتے

سجو جواب دینے کے بجائے اُس کا مُنہ تکنے لگی۔

اس لئے وہ ہمارے شکر گزار تھے۔ اور شکریہ ادا کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔ تقریب اگر کچھ کہنے سننے کا تو ہم انہیں موقع نہ دیتے۔ اپنے جذبات کا اظہار انہوں نے چائے پیش کر کے کیا۔

ہم نے انہیں ٹکٹ لے کر دیئے۔ انہوں نے ہمیں ٹریٹ TREAT دی ٹریٹ مہمان نوازی کی ایک قسم ہے۔ بتاؤ اس سے ہمارا کیا بگڑا اور انہیں کیا ملا ——؟ وہ بھی دُور رہے اور ہم بھی —— ہمارے فرشتوں کو علم نہیں وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ نہ انہیں ہمارا نشان و پتہ معلوم ہے۔ ہم ان کو بھول جائیں گے اور وہ ہمیں...
زندگی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کو اپنی خوب صورت یادوں میں رکھ لینا چاہیئے اور بس —— ایسی بے ضرر سی باتوں اور معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کر اگر ہم اپنی زندگی اجیرن کریں تو جانتی ہو۔ کیا ہوگا ——؟

اگلے زمانے کی طرح ہم پر پابندیاں لگا دی جائیں گی۔ نہ والدین ہم پر اعتماد کریں گے اور نہ اُستاد —— اس لئے —— اُس نے ایک آنکھ بند کرتے ہوئے کہا۔ گول کر دو ان فضول بحثوں کو —— جینے کا نیا طریقہ سیکھو۔ جوانی کو مذہبی کتاب نہ سمجھو۔ اور پھر تمہیں معلوم ہوگا تم بھی دُنیا میں آئی ہو۔

واقعی ——

اب اصل بات اُس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے دقیانوسی ماحول کی پرچھائیاں بھی ساتھ لے آئی تھی! اور ہر موقع پر تنگ نظری اور حماقت کا ثبوت دیتی تھی۔ آج اُس نے دل میں تہیہ کیا کہ اپنے قلب و نظر کو وسعت دے گی اور آج کے بعد کوئی ایسی حرکت نہ کرے گی۔ جس سے وہ اپنی ہم جولیوں میں پھر نکو بن جائے۔

لیکن جو احسانِ عظیم "گل افشاں" نے سجو پر کیا تھا۔ اُسے تو سجو تاحیات فراموش
کر سکتی تھی۔

گُل افشاں نے سجو کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔؟

"گل افشاں" نے سجو کو سنہری پر عطا کئے تھے۔ جن کے زعم پر وہ اُڑ سکتی تھی۔ بلند
پر پرواز کر سکتی تھی۔

سُنہری، چمکدار ——— اور خیرہ چشم پر ۔ ۔ ۔ ۔

ذوقِ پرواز ——— جس نے اُس میں خود اعتمادی۔ خود زعمی اور خود نمائی
کر بھر دی تھی ———

اب وہ گیس کا بھرا ہوا غبارہ تھی ——— ذرا ڈور چھوٹی اور اُڑ گئی —
اُوپر ہی اُوپر۔ آسمانوں کے قریب ——— بلندیوں کے پہلو میں —
سے دُور ۔ ۔ ۔ کچے گھروندوں اور مٹیالی گلیوں سے دُور ۔ ۔ ۔
پستیوں سے وہ کبھی کی دُور ہو چکی تھی۔
اُس کے خیالات بلند ہو گئے تھے ——— بلندی ہی نہیں اُن میں نکھار بھی آ

اب اُس کا آئیڈیل بھی تھا۔
اور آئندہ زندگی کا پُورا فلسفہ اُس کی گوری مُٹھی میں تھا۔
وہ وقت کی لگامیں پکڑ کر کسی بھی طرف موڑ سکتی تھی۔

"گُل افشاں" نے آگہی کے کتنے دروازے اُس پر کھول دیئے تھے ۔ ۔ ۔ پُراسرار جنگلات کی اندھیری راہوں میں چراغاں کر دیا تھا۔ اس خاک کی پتلی کو دھڑکنے والا دل ——— اور جانے والا پیکر عطا کر دیا تھا۔ اُس کی مُسکراہٹوں کی چاندنی کو جگر سوزی بخش دی تھی۔ اُس کی نگاہوں کے نُور میں قیامت خیزی بھر دی تھی۔

اُس کی دقیانوسیت کو جدید پیراہن پہنا دیا تھا۔
اُسے جمیلہ بانو ہاشمی سے سجو رانی بنا دیا تھا۔

سجو!

محبّت کی آنچ پر پگھلا ہوا پہلا قطرہ ———
بارش کی پہلی پھسلن ———
دلوں کا گداز اور رُوح کا چین ———
اس کائنات کی ایک حقیقت ———

بھلا وہ "گل افشاں" کے احسانات کو بھول سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں
اگر لاہور کا دل گلبرگ ہے ——— تو گُل افشاں کو سارے گلبرگ کا دل ہونا چاہیئے۔

"گل افشاں" میں اُس کی آمد و رفت ڈولی کے توسّط سے شروع ہوئی تھی۔ اور ڈولی سے اُس کی دوستی اچانک ہی انتہا کو پہنچ گئی۔

ڈولی بھی تو اُس کی کلاس فیلو ہی تھی مگر کالج میں بہت کم نظر آتی۔ چھوٹے سے قد کی گول مٹول ڈولی غالباً کسی کی توجّہ کا مرکز نہ بنتی اگر وہ مختلف کاروں اور اسکوٹروں پر کالج آیا کرتی۔ کبھی کبھار وہ اپنی سائیکل پر بھی آ جاتی تھی۔ لیکن کوئی کار اُس کے انکل کی تھی۔ کوئی

بھائی کی اور کوئی کزن کی ——

بس سائیکل اُس کی اپنی تھی۔ جب کوئی اُسے کار میں لفٹ نہ دیتا۔ تو وہ
کے پیڈل گھماتی کالج آجاتی۔ ایک نمایاں بات اُس میں یہ بھی کہ کلاس ختم ہو جاتی
وہ گپ بازی کے لیئے کالج میں کبھی نہ ٹھہرتی۔ یوں لگتا جیسے کالج سے باہر اُس
زیادہ رنگین ہیں۔ جبکہ اُس کی ہم جماعت لڑکیاں زیادہ سے زیادہ عرصہ کالج میں
گپ بازی کرنا چاہتی تھیں۔

"وہ جس کی بہت سی کاریں ہیں" لڑکیوں نے اُس کی یہ نشانی بنا رکھی تھی۔ وہ
وہ بہت اسمارٹ تھی۔ جدید ترین فیشن کا ایک ماڈل تھی۔ اگرچہ کلاس کی لڑکیوں سے
دوستانہ مراسم برائے نام تھے۔ مگر وہ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتی
میں آکر اس محبت سے ہیلو کہتی جیسے سب پہ جان چھڑکتی ہو۔ جاتے ہوئے گڈ
کو خدا حافظ کہہ کر جاتی۔

ایک دن سرِراہے اس کی مُلاقات سجو سے ہو گئی۔ سجو ہوسٹل میں رہتی تھی
کی لڑکیوں کی بہت کم دوستی ڈے اسکالرز سے ہوتی ہے۔ ان کا اپنا ایک الگ
ہوتا ہے۔

مگر سیدھی سادھی سجو کو ڈولی کا طرحدار انداز بھا گیا۔ اس کی ہیلو کے جواب میں
رُک کر اُس سے باتیں کرنے لگی۔ اور جب اُس کے انکل کی کار نے باہر ہارن دیئے
کئے تو ڈولی باقی باتیں کل کرنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

یوں بھی اور لڑکیوں کی طرح سجو اُس کی ڈھیر ساری کاروں اور خوبصورت کپڑوں
بہت متاثر ہوئی تھی۔

پھر اپنے ازلی احساسِ کمتری کی وجہ سے اُسے شوخ و شنگ اور بے باک لڑ
پسند آتے تھے۔

دیکھتے دیکھتے اُس کی ڈولی سے اتنی گاڑھی چھننے لگی کہ وہ اپنے پُرانے گروپ سے
دور نکل آئی۔

اب لڑکیاں اکثر ان دونوں کو اکٹھے دیکھتیں۔ وہ ایک جیسے کپڑے بھی پہننے لگی تھیں۔
جس روز ڈولی کلاس میں نہ آتی۔ سجو اُس کے لیئے نوٹس بنا کر رکھتی۔ رفتہ رفتہ سجو اور ڈولی
لازم و ملزوم بن گئے

ایک بار ڈولی نے سجو کو اپنے انکل سے بھی ملوایا تھا۔ جن کی کار میں وہ اکثر آیا کرتی تھی۔
ویسے بھی ڈولی نے اپنی پوری فیملی کا غائبانہ تعارف سجو سے کرا رکھا تھا۔ اُس کے گھر کی اور
بہن بھائیوں کی باتیں سُن سُن کر سجو کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ جاتا۔ دِل ہی دل میں سجو کو ڈولی کے
گھر جانے کا بڑا ارمان تھا۔ مگر ڈولی نے کبھی دعوت ہی نہ دی تھی۔ پھر بھلا وہ کیسے جا سکتی تھی؟

ایک دن اُس کی مراد بر آئی۔ ڈولی نے اُسے آکر بتایا کہ اتوار کو اُس کی باجی کا نکاح ہے
اور وہ سجو کو ضرور ساتھ لے جائے گی۔ سجو کو بھی اُس سے بہتر کوئی موقع نہ لگا۔ مگر سوال اجازت
کا تھا۔ اُس کا تو لاہور میں کوئی رشتے دار نہ تھا۔ اس لیئے اُسے سوائے شاپنگ پر جانے کے،
کہیں اور جانے کی چھٹی نہ مل سکتی تھی۔ تاہم اتوار میں ابھی بہت دن تھے۔ دونوں نے بیٹھ کر
ایک ترکیب لڑائی ——

یعنی سجو نے اپنی تحریر بگاڑ کر اپنے والد کی طرف سے وارڈن کو خط لکھا۔ کہ اتوار کے روز
میرے ایک عزیز ترین دوست کی بیٹی کا نکاح ہے۔ میں علالت کے باعث نہیں آسکتا۔ اس
لئے میری بیٹی کو شرکت کی اجازت دی جائے۔"

یہ خط لفافے میں بند کر کے اُس نے ڈولی کو دے دیا۔ کہ وہ کہیں سے اُسے پوسٹ کرا
دے۔ یُوں بھی اپنے ضروری کاغذات پر وہ خود اپنے والد کی طرف سے دستخط کیا کرتی تھی۔
کیوں کہ اس کے بابا انگریزی تو بالکل نہ جانتے تھے اور ان کا اُردو رسم الخط بالکل ایسے تھا۔
جیسے کسی نے تختی پر لکھنے کی مشق کی ہو۔ اس لئے وہ اُن سے خط و کتابت نہیں کرتی تھی۔

بلکہ اپنی چھوٹی بہن نبیلہ کی معرفت اپنی خیر و عافیت انہیں بھیجا کرتی تھی۔

اتوار کی شام کو سجو جی جان سے تیار ہوئی۔ اُس نے اپنا نیا اور بہترین سوٹ پہنا
کی قمیص بازوؤں کے بغیر تھی۔ اپنے لمبے لمبے بالوں کو کنگھی سے سیدھا کر کے کمر پر
چھوڑ دیا۔ ہلکا ہلکا میک اَپ کیا۔ آنکھوں پر بڑی صفائی سے پنسل چلائی۔ کیونکہ
تقریب میں جانا تھا۔ وہ بھی امراء کے ہاں ——— جہاں شہر کا انتہائی فیشن ایبل طبقہ
کر رہا تھا۔ سجو کو اندر ہی اندر ایک اختلاج بھی ہو رہا تھا۔ اور ایک گونہ خوشی بھی۔

خدا خدا کر کے پانچ بجے اور ڈولی انکل کی کار میں آئی۔ سجو گیٹ پر انتظار کر رہی
اُسے مِل گئی۔

"ہائے ———؟" اُسے دیکھتے ہی ڈولی نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو بوسہ دے
فضا میں لہرایا ———

"خدا کی قسم قتل کر رہی ہو۔"

سجو کو خوشی بھی ہوئی اس ریمارک پر۔ مگر وہ تھوڑا سا جھینپ گئی۔

"اور اپنی طرف دیکھو جامنی ساڑھی میں کس قدر اسمارٹ لگ رہی ہو۔" اس سے
سجو کو نہ رہ سکے۔ ڈولی کے بھرے بھرے جسم پر ساڑھی خوب جچتی تھی۔ اس کے ساتھ
اُونچی ایڑی کے سینڈل پہن لیتی۔ اور بالوں کو سر سے اُونچا کر کے غصہ در بلی کی مانند پھیلا لیتی
اس سے اس کا چھوٹا قد درمیانہ لگنے لگتا۔ چلنے میں اُس کے جسم کے تینوں حصے الگ الگ
لہراتے۔ بلاشبہ وہ بھکنے پر آمادہ کرتی تھی۔

مگر سجو غریب کو ان باتوں کا کہاں پتہ تھا۔ اُسے تو ڈولی ساڑھی میں بہت اچھی
اور اُس نے تعریف کر دی۔

"میرا خیال تھا تم بھی آج ساڑھی پہنو گی۔" ڈولی نے اس کا بازو تھام کر آگے باہر
جاتے ہوئے کہا۔

کیا ساڑھی پہننا ضروری تھا۔ اپنے تمام تر ظاہری فیشن کے باوجود سجو کو کھلا گئی۔ "اب
بدل آؤں۔ میرے پاس ہے ایک ساڑھی۔"

"ارے نہیں سجو ڈارلنگ۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" ڈولی نے کلائی کی گھڑی دیکھتے
ہوئے کہا۔ "پانچ بج چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بارات آنے والی ہوگی۔ میں تو پہلے ہی لیٹ
ہو گئی ہوں۔ مجھے چار بجے آنا چاہیئے تھا۔ مگر پتہ ہے۔ آج ساری کاریں اتنی مصروف تھیں
انکل آ گئے تو میں اُن کو لے کر تمہاری طرف دوڑی ———"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں کار کے قریب آ گئیں۔ ڈولی نے جب آگے کا دروازہ
کھولا تو سجو نے خود بخود پیچھے کا دروازہ کھول لیا۔

"ارے آگے آ جاؤ۔" ڈولی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آگے ہم تینوں کیسے بیٹھ سکیں گے۔"

"بیٹھ جائیں گے۔" ڈولی نے کہا۔

"مگر تمہارے کپڑے جو خراب ہو جائیں گے۔"

"نہیں ہوتے بابا۔ تم آؤ تو سہی۔ ہم لوگ تو اس سیٹ پر چار چار بیٹھنے کے عادی ہیں"
اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

ناچار سجو کو آگے بیٹھنا پڑا۔ ڈولی سمٹ کر پرے ہو گئی۔ اور اُس نے سجو کے لئے مناسب
جگہ چھوڑ دی۔

سجو نے کچھ زیادہ ہی زور سے دروازہ بند کیا۔ اور پھر بولی "تسلیم انکل"۔

"اچھی تو ہو؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی۔" وہ پہلی دفعہ انکل کو قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اور اُن کی اصل عمر کا اُسے کوئی اندازہ
نہیں ہو رہا تھا۔ سر کے بال سیاہ۔ جسم توانا اور مضبوط۔ مگر چہرہ ۔۔۔۔ وہ عمر کا آئینہ لگ رہا
تھا۔ تو کیا ہو گی اس شخص کی عمر ۔۔۔۔

"انکل آپ کو کار چلانے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟" اُس نے انکسارانہ
"ہرگز نہیں۔ میں تو بلکہ ہمیشہ سے اچھی موٹر چلاتا رہا ہوں۔"

"ویسے بھی کوئی حُور شمائل پہلو میں بیٹھی ہو تو انکل بڑی خوبصورتی سے موٹر چلاتے

ڈولی نے انکل کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر زور سے قہقہہ لگایا۔

سجو سُرخ ہوگئی۔ چچا بھتیجی کی بے تکلفی نے اُسے بہت متاثر کیا۔

سارا راستہ ڈولی اپنی خوش خلقی کے چھینٹے اُڑاتی آئی۔

سجو کو "گل افشاں" دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اور وہاں پہنچنے کی بہت جلد
جب کار "گل اُفشاں" کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ تو اُس کا دل دھڑک اٹھا۔ باہر خوبصورت
پیتوں کے بڑے بڑے دروازے بنے ہوئے تھے۔ اندر لان میں رنگ برنگ شامیانے
ہوئے تھے۔ بیشمار کاریں اور اَن گنت مہمان نظر آ رہے تھے۔ انکل نے انہیں دو
گیٹ پر اُتار دیا اور خود کار پیچھے لے گئے۔ ڈولی نے نیچے اُتر کر اپنی ساڑھی درست کی
حیران سی سجو کا ہاتھ پکڑ کر بولی ——— "آؤ"

راستے میں اُس نے کئی خوش لباس لڑکوں کو ہیلو کہا اور ساتھ ہی سجو کا تعارف
کراتی گئی۔

NICE TO MEET YOU تقریباً سب نے ایسے ہی فقرے کہے۔

مگر سجو کوئی جواب نہ دے سکی۔ سوائے ایک مُسکراہٹ کے۔ جو اکثر اوقات گھبرا
اور بوکھلاہٹ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

ڈولی اُسے لے کر عورتوں کے پنڈال کی طرف بڑھی۔

پنڈال کے پھولوں بھرے گیٹ پر بہاں خوش آمدید لکھا تھا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس
ایک خاتون ہنس ہنس کر مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔

"آپا یہ میری نئی سہیلی سجیلہ ہے" ڈولی نے قریب جا کر کہا۔

"اور یہ میری پیاری راضی آپا ہیں" اُس نے سجو کو بتایا۔

آپا" اُس کے دونوں ہاتھ تھام کر راضی آپا اس طرح خوش ہوئیں جیسے دو بہالوں کی
ن نظر آگئی ہو۔ پھر اُسے بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ اور بولیں۔ "واقعی بڑی حسین ہے
ن پہلی۔ دھیان رکھنا۔ آج اس کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آج کی محفل میں یہ سب سے
خوبصورت لڑکی ہے۔"

ڈولی نے فخر سے اُس کی طرف دیکھا۔ تو سجو نے مسکرا کر نظر جھکا لی۔

یہ آج لوگ اس سے کیسی باتیں کر رہے ہیں،

"لے جاؤ اُسے اندر بٹھاؤ۔ میں مہمانوں کو بھگتا کر ابھی اس کے پاس آؤں گی۔" راضی
نے کہا۔ اور آنے والی کچھ اور خواتین کی پذیرائی کو آگے بڑھ گئیں۔

ڈولی نے سجو کو لا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اور بولی۔ "تم ذرا یہاں بیٹھو میں اپنی سہیلیوں
ابھی آؤں۔ کہیں وہ میرے اس طرح غائب ہو جانے سے ناراض نہ ہوگئی ہوں۔"

ڈولی نے استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ "بور نہ ہونا؟"

"نہیں نہیں۔" سجو خوش دلی سے بولی۔ "بھلا بور ہونے کی کیا بات ہے۔"

"ابھی آئی" کہہ کر ڈولی غائب ہوگئی۔

کچھ دیر تو سجو احمقوں کی طرح اکڑ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اسے کچھ اس قسم کا احساس ہو رہا
تھا جیسے محفل میں سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ——— شاید اس کے ماتھے پر کوہ نور
جڑا لگا ہے۔ مگر ذرا دیر کے بعد اُس کی غلط فہمی دُور ہوگئی۔ کوئی اس کی طرف نہیں دیکھ
رہا تھا۔ بے شمار ——— لاتعداد ——— فیشن ایبل اور طرح دار عورتیں کرسیوں پر براجمان
تھیں۔ ہر رنگ کی چمکدار ——— بنارسی ——— منقش ساڑھیاں۔ اور ننگے بازو ———
ن پُر ان ترات کے خوبصورت زیورات ——— میک اپ میں تو جیسے ہر کوئی بڑھ
چڑھ کر تھی۔

ہر عورت دوسری سے محوِ گفتگو تھی۔ اور یہ گفتگو ہونٹوں سے ــــ ہاتھوں کے اشاروں سے ــــ اور آنکھوں سے ہو رہی تھی۔

کوئی کسی کو متاثر کر رہی تھی ــــ اور کوئی جان بوجھ کر متاثر ہونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

کوئی اپنی امارت کو کسرِ نفسی کی سادگی میں لپیٹ کر اپنی بڑائی کئے جا رہی تھی۔ اور کوئی سب کچھ سمجھ کر یوں سر ہلا رہی تھی۔ جیسے اُلّو بنانے کی اس سے اچھی کوئی ترکیب نہ ہو۔ کوئی اپنی غیر ملکی اشیاء کی لسٹ سُنا رہی تھی۔ اور کوئی اپنی نئی کوٹھی کے غسل خانوں کا نام پڑھ رہی تھی۔ کوئی اپنے بے شمار بیرونی سفروں کی داستان بیان کر رہی تھی اور کوئی کے جدید ناموں پہ بحث کر رہی تھی کوئی ساس نند کو دُور رکھنے کے نئے فارمولے کا ذکر کر رہی تھی۔ اور کوئی بِدکے ہوئے شوہر کو قابو میں لانے کی ترکیبیں بتا رہی تھی۔

غرض جتنی خواتین جمع تھیں اتنے ہی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

جہاں تک سجّو کی نظر اور کانوں نے کام کیا۔ اُس نے اُن کا جائزہ لیا۔

اُس کی نظریں پھر راضی آپا کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ کچھ مہمان عورتوں کو لا کر خالی کرسیوں پر بٹھا رہی تھیں۔ اور اُن کے ساتھ بڑے خوبصورت انداز میں انگریزی بھی بول رہی تھیں۔ یوں دیکھنے میں راضی آپا بالکل سیدھی سادھی گھریلو خاتون لگتی تھیں۔ سفید ساڑھی سا جوڑا۔ بہت ہلکا سا میک اَپ۔ اُن کا گہرا سانولا رنگ ہر قسم کی شگفتگی اور دلکشی سے عاری تھا۔ ایک چیز جو اُن کے چہرے پہ نمایاں تھی اُن کے بڑے بڑے دانت تھے۔ ہنستی تھیں تو وہ بالکل کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار لگتی تھی اور تعجب کی بات ہے وہ ہمیشہ ہنستی رہتی تھیں۔ دُور سے اُنہیں ہنستا دیکھ کر تو سب سے پہلے اُن کے سفید دانتوں پہ نظر پڑ جاتی تھی۔ اور وہ خاصی عمر کی بھی لگتی تھیں۔ تاہم وہ ڈولی جیسی لڑکی کی بہن بالکل نہیں لگتی تھیں۔

اُس کی نظر سامنے لان میں کھڑی ہوئی لڑکیوں کے ایک گروپ کی طرف اُٹھتی ہوئی اُٹھ گئی۔ حالانکہ بے شمار کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ مگر لڑکیاں نہ جانے کیوں راستے میں جا کھڑی ہو گئی تھیں۔ پرلی طرف مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ہر آنے والا نیا مہمان اُن کے قریب سے ہو کر گذرتا تھا اور بعض اوقات منتظم لڑکے بھی آتے جاتے ہوتے انہیں کوئی شوخ فقرہ کہہ جاتے تھے۔

سجّو انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

محفل میں تقریباً سبھی عورتوں نے ساڑھیاں پہنی ہوتی تھیں۔ مگر لڑکیاں زیادہ تر شلوار قمیض یا مختلف قسم کے پاجاموں میں ملبوس تھیں۔ اور اچھی بھی لگ رہی تھیں بال تقریباً سبھی نے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

ایک تنگ پاجامے والی لڑکی اُسے بہت پیاری لگی۔ سب لڑکے بار بار اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اُسے پتہ بھی تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک بھرے بھرے جسم والی گوری سی لڑکی تھی۔ جس نے اپنے سر پہ پگڑی کی طرز کا بڑا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ وہ بار بار اپنا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔ خاص طور پہ جب کوئی لڑکا یا مرد پاس سے گذرتا تو وہ اپنے اچھے خاصے دوپٹے کو سینے سے ہٹا کر دوبارہ ٹھیک کرنے لگتی۔ اور ٹھیک کرتے میں وہ زیادہ سے زیادہ دیر اپنا "گداز" دکھانے میں لگاتی۔ مگر بظاہر بے نیاز سی بنی رہتی۔

اُس کے بالکل سامنے ایک دُبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کا حساب اُلٹا تھا۔ اُس نے ذرا سا دوپٹہ کھول کر شانوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ تاکہ اُس کے جسم کی بدصورتی چھپی رہے۔ ذرا اُس کا دوپٹہ اپنی جگہ سے سرکتا تو وہ اُسے فوراً ٹھیک کر لیتی۔

سجّو اِن دونوں کا موازنہ کرنے لگی۔

اتنے میں کہیں سے ڈولی آ ٹپکی۔

"ٹھیک ہو سجّو؟"

"ہاں ٹھیک ہوں"

"جانے میری سب سہیلیاں کہاں کہاں جا بیٹھی ہیں۔ اُس وقت سے ... کر رہی ہوں" وہ سجو کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے چاروں طرف گردن گھمائی۔ اور بولی:

"ارے تم فیضی آپا سے ملی ہو؟"

"نہیں ——"

"آؤ۔ میں ملواؤں!" اُس نے اُسے بازو سے پکڑا اور سامنے بیٹھی ہوئی نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک خاتون کے پاس لے گئی۔

اپنے جائزے کے دوران سجو نے اس خاتون کو بار بار دیکھا تھا۔

یہ خاتون بھی بہت طرحدار تھی۔ نیلے رنگ کی کامدانی ساڑھی میں اُس نے ... میک اپ کر رکھا تھا۔ اور آنکھوں پر نیلا ہی آئی شیڈو لگا رکھا تھا جس سے اُس کی ... بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس خوبصورتی سے بیٹھی ہوئی تھی کہ نیلے پانیوں کی ... لگ رہی تھی۔ قریب جا کر اُس نے دیکھا۔ اُس نے نیلے پتھروں کے زیور بھی پہنے ہوئے تھے۔

پھر جس بات نے سجو کو چونکا دیا تھا وہ اُس کی سگریٹ نوشی تھی۔ جب سے وہ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اور کتنا خوبصورت تھا اس کا سگریٹ پینے کا انداز۔

اُس کے ... دو غیر ملکی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں جن کے ساتھ وہ مسلسل انگریزی ... کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ باتوں کے دوران انگلیوں کو جھٹکا دے کر اس خوبصورتی سے ... جھاڑتی کہ سجو دیکھتی رہ جاتی۔

اس طرح تو غیر ملکی خواتین بھی سگریٹ نہ پی رہی تھیں۔ اُنہوں نے تو ... پی کر شکریہ کہہ دیا تھا۔

"فیضی آپا! یہ میری سہیلی ہے سجیلہ" ڈولی نے قریب جا کر تعارف کرایا۔

سگریٹ کی راکھ جھٹک کر انہوں نے سجیلہ کی طرف دیکھا اور کہا HOW SWEET اور ایک کش لے کر بولیں۔

میں اُس وقت سے اِس لڑکی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، کتنی پیاری لڑکی ہے اور ہمارے ہاں غالباً پہلی دفعہ آئی ہے۔ اس لئے میں اُسے پہچان نہیں رہی۔

"ہاں آپا۔ یہ پہلی دفعہ آئی ہے۔ وارڈن کو ہم نے کس طرح چکمہ دیا ہے یہ آپ کو پھر کبھی بتائیں گے۔"

"یہاں بیٹھو گی یا اپنی سہیلیوں کے پاس چلو گی؟" ڈولی نے سجو سے پوچھا۔

ویسے تو سجو دل و جان سے فیضی آپا کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ مگر دو انگریز عورتوں کو دیکھ کر گھبرا گئی اور بولی اپنی سہیلیوں کے پاس لے چلو۔

ڈولی اُسے لڑکیوں کے اُس گروپ کے پاس لے گئی جو عورتوں اور مردوں کے درمیان دیوار کا کام دے رہا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے ڈولی جس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"یہ میری نئی سہیلی ہے۔" ڈولی نے سب سے اُس کا تعارف کرایا۔ پھر دو چار اور تیکھی باتیں کیں جن سے محفل زعفران زار بن گئی۔

پھر جیسے اچانک اس کو کوئی بات یاد آگئی۔ لڑکیوں سے بولی۔ "بھئی میری اس سہیلی کو بور نہ ہونے دینا۔ میں ذرا اندر والے مہمانوں کی خبر لے آؤں۔" تب سجو کو احساس ہوا کہ اندر بھی کچھ مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ باہر ہی لاتعداد لوگ تھے۔ جانے انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں لوگ بلائے ہوئے تھے۔

ڈولی کے جاتے ہی لڑکیوں نے سجو کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"کون سے کالج میں ہیں؟"

"کس کلاس میں؟"

"کون سے مضامین لئے ہیں؟"

"اور لاہور کیسا لگا؟"

اس کے مختصر جوابوں کے بعد لڑکیوں نے جیسے اپنا فرض ادا کر دیا اور پھر آپس میں سے ایک دُوسرے سے گفتگو کرنے لگیں۔ سجّو نے دو ایک بار کوشش کی کہ ان کی گفتگو میں شامل ہو کیونکہ جن لیکچررز کے بارے میں وہ باتیں کر رہی تھیں وہ سجّو نے بھی دیکھی تھیں مگر اس ڈر سے اُس نے زبان نہ کھولی کہ مبادا پھر کوئی بودی بات کر بیٹھے اور ان کو پتہ چل جائے کہ یہ موضع جمال پور کی لڑکی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بور ہونے لگی۔ وہ چلی جاتی اگر ایک تسلی نہ ہوتی۔ کرمزاب پاجامے والی لڑکی کے بجائے اُسے گھور رہی اور گرے سُوٹ میں ملبوس ایک خوش وضع آدمی نے تو اُس پر سے نظر ہی نہیں ہٹائی

اتنے میں محفل میں ہلچل مچ گئی۔ معلوم ہوا بارات آگئی ہے۔ بینڈ بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مگر آج رُخصتی تو نہیں ہے صرف نکاح ہے اور یہ لوگ نکاح پر بھی بینڈ لا رہے ہیں۔ سجّو نے اپنے دل میں سوچا۔ اسی وقت اُس نے سنا ایک لڑکی دوسری سے کہہ رہی تھی۔ بینڈ کا انتظام لڑکی والوں نے کیا ہے۔ کیونکہ جبینی باجی کہتی تھیں کہ بینڈ بغیر رونق نہ ہوگی۔ لڑکے والے نہیں لا سکتے تو ہم خود انتظام کریں گے۔"

"ہاں میں نے دیکھا تھا۔" دوسری لڑکی بولی۔ "یہ لوگ شامیانے کے اُس طرف ہوتے تھے۔ اب بارات آئی ہے تو اس میں شامل ہو گئے ہیں۔"

بارات آگئی۔ پھر تو ایسی ہڑبونگ مچی کہ ساری تنظیم دھری کی دھری رہ گئی۔ بڑے بچے۔ سب اپنی جگہ سے ہل گئے۔

جمیلہ کو بھی جدھر ریلا بہا لے گیا۔ بہہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب سکون بحال ہوا تو اُس نے دیکھا وہ اُسی گروپ کے ساتھ گیٹ کے پاس کھڑی تھی اور بہت سے لوگ اُسے نظروں میں اُتار رہے تھے۔ اس مرتبہ اُسے کچھ عجیب سا لگنے لگا —— دُولہا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دُولہا تو لگ ہی نہیں رہا تھا گلے میں چند پھولوں کے ہار تھے۔ اُس نے بڑا شاندار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بار بار رُومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ گورا چٹا۔ لال سُرخ۔ بڑا تگڑا جوان تھا۔ اس کے ساتھ چند اور نوجوان تھے۔ بس دو کاریں ہی تو آئی تھیں۔

اور ان کا شاندار استقبال ——؟

پھر نکاح کا شور بلند ہوا۔

اور جانے کب نکاح بھی ہو گیا.....

پھر ہر طرف خوشی کی ایسی پھکار منڈ پڑی جیسے حاضرینِ محفل میں سے سب کے سر سے کا بوجھ اُتر گیا ہو۔

مُبارک سلامت کے شور کے بعد کھانے پینے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ایک لڑکے نے بے شمار بوتلوں سے بھرا ہوا ٹرے اُس کے آگے کر دیا۔ اور بولا۔ "پلیز اِک ——؟"

گھبراہٹ میں اُس نے جلدی سے کوکا کولا کی بوتل اُٹھائی اور جھٹ مُنہ سے بھی لگا لی۔

تھوڑی دیر بعد شور بلند ہوا کہ دُلہن آ رہی ہے۔

دُلہن کو دیکھنے کا اُسے بھی بڑا شوق تھا۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ دلہن تھی بلکہ ڈولی کی دو باجیاں تو دیکھ چکی تھی اب تیسری کو دیکھنا چاہتی تھی۔

دُلہن نے بڑا شاندار کمخواب کا غرارہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ تمام زیور پہنے ہوئے تھے۔

حتیٰ کہ پیچ والی نتھ بھی ناک میں ڈالی ہوئی تھی اور وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ وہ دلہن خوشبو کی لپٹیں چھوڑتی اس کے پاس سے گذر گئی تو وہ بھی اس ریلے کے پیچھے چل دی۔ ہال میں ایک ہجوم نے دُلہن کو گھیر لیا۔ وہ بچتی بچاتی ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

عورتیں اُٹھ اُٹھ کے دُلہن کی طرف جا رہی تھیں۔

اور وہ کھڑی سوچ رہی تھی۔ تعلیم اور تنظیم کا اُس سے کوئی تعلق نہیں وہ جمال پور کی عورتیں ہوں یا گلبرگ کی۔ دُلہن کو دیکھ کر کہاں بس میں رہ سکتی ہیں۔ تھوڑی سی بدنظمی آپا دھاپی تو ضرور ہوتی ہے۔ وہ ناحق ان بیچاریوں کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ غالباً دلہن کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جانا انسانی فطرت ہے۔

"دولہا آ رہا ہے"۔ کسی نے صدا لگائی۔

شکر ہے خدا کا ذرا مجمع چھٹنے لگا۔ سامنے دیکھا تو سچ مچ دُولہا آ رہا تھا۔ ہنستا جھومتا جھامتا۔ ایک جیتے ہوئے شہسوار کی مانند۔ اس کے پیچھے لڑکوں کی ایک ٹولی تھی جو اسی بہانے محلسرا میں گھسے چلے آتے تھے۔

عورتوں میں پھر نظم و ضبط عود کر آیا۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔

کتنے ہی کیمرے روشنیاں پھینکنے لگے۔

دُولہا مسکراتا ہوا دُلہن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

سلامیاں ہوئیں۔ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ ہنسی ٹھٹھا ہوا۔ پل پل کی تصویریں اُتری رہیں۔ ہر شے پُرانی ہو گئی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔ سوائے دُولہا اور دلہن کے۔ اب دُولہا دُلہن صاف نظر آ رہے تھے۔ لیکن سب اتنی دفعہ دیکھ چکے تھے کہ دیکھنے کی ہوس باقی نہ رہ گئی تھی۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ کچھ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔

مگر سجو ابھی تک دُولہا دُلہن میں کھوئی ہوئی تھی۔

کس پیار سے دُولہا دُلہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دُلہن بھی مُسکرا مُسکرا کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور کس قدر پیاری لگ رہی تھی۔ واقعی بڑی شاندار جوڑی ہے۔ ڈولی ٹھیک کہتی تھی۔ چاند اور سُورج کی جوڑی ہے۔ لڑکا کتنا وجیہہ اور شاندار ہے اور ڈولی کی یہ بہن سب بہنوں سے زیادہ حسین ہے۔

تب ہی تو ان کی لو میرج ہوئی ہے۔ ڈولی نے بتایا تھا کہ دونوں لاء کالج میں پڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔

"میرے ممی ڈیڈی تو مان گئے ہیں۔ مگر سُلطان بھائی کے والدین نہیں مانتے۔ وہ پٹھان ہیں کٹر پٹھان ہیں اور غیر خاندان میں شادی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ مگر اب سُلطان بھائی اپنی مرضی سے نکاح کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے شادی تک وہ اپنے والدین کو منا لیں گے یہ بھی ہوتے تو کیا۔ نکاح تو ہو ہی جائیگا"

تب ڈولی کے منہ سے یہ باتیں سُن کر اُسے بہت تعجب ہوا تھا۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔ اور اب وہ آنکھیں پھاڑے ان دونوں کو محفل کے روبرو راز و نیاز کرتے دیکھ رہی تھی۔ اب تو وہ باقاعدہ باتیں بھی کر رہے تھے، کوئی ان کا نوٹس نہیں لے رہا تھا۔

تبھی... تبھی... اُس کے والدین ساتھ نہیں آئے۔ کوئی بھی تو بزرگ ساتھ نہیں تھا۔ صرف اُس کے دوست ساتھ تھے۔ پر نکاح تو ہو گیا نا؟ ———

ہاں ہو ہی جانا چاہیئے تھا۔ لگتا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ ہائے اگر جمال پور میں یہ شادی ہوتی۔ توبہ... توبہ... وہاں تو لڑکی کو قتل کر دیا جاتا۔

جانے وہ کب تک اپنے ذہن کو منوانے میں اُلجھائے رکھتی کہ اچانک ڈولی نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اور تو نہیں ہوئیں؟"

"نہیں تو۔ مگر ڈولی اب مجھے ہوسٹل پہنچا دو۔ آٹھ بجے ہیں۔ دس بجے گیٹ بند ہو جاتا ہے۔"

"ارے ابھی سے" ڈولی نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"ابھی تو ہنگامہ ہوگا۔ رونق لگے گی۔ اور پھر تمہیں کھانا کھلائے بغیر کیسے بھیج دوں"

"مگر کئی لوگ تو چلے گئے ہیں" سجو نے کہا۔

خاص خاص لوگوں کو کھانے کے لئے روک لیا گیا ہے۔ ویسے تو دعوت ... چائے کے ہی تھے ---- اچھا تم میرے ساتھ اندر آجاؤ۔ وہاں تمہارا دل لگ جائے ... کھاتے ہی میں تمہیں چھوڑ آؤں گی۔"

"اندر کیا ہو رہا ہے؟" سجو نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے معصومیت سے کہا

"اندر چل کر دیکھ لینا" ایک شوخ تبسم ڈولی کے ہونٹوں پر اُبھرا۔

"ارے" چلتے چلتے سجو کو یاد آگیا "میں تمہاری امی سے تو ملی نہیں"

"اچھا" ڈولی بولی۔ "ہماری برادری کی کچھ دقیانوسی خواتین بھی آئی ہوئی ہیں۔ ممی ... والے ڈرائنگ رُوم میں اُن کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ جلوان سے ملاقاتی ہوں ...

پھر وہ خود ہی کہنے لگی۔ "میں نے تو ممی سے بہت کہا تھا اب چھوڑ دو ان رشتہ ... کو۔ مگر ہماری ممی، بس ابھی ان چکروں سے نکلنے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔ خواہ ... کرتی ہیں۔"

ڈرائنگ رُوم کے باہر وہ لوگ کھڑی ہو گئیں۔ شیشے کی بڑی بڑی دیواروں ... خوبصورت ریشمیں پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرہ عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ... ڈولی وہیں رک گئی۔ "اندر جا کر خواہ مخواہ ایک ایک کو سلام کرنا پڑے گا اور ... اور غیریت کے طعنے بھی سننے پڑیں گے۔ اس لئے نہیں جاتے۔ ہیں؟"

"اچھا" سجو نے فرماں برداری سے کہا۔

"ادھر دیکھو۔ وہ سامنے صوفے پر۔ ہاں وہ۔ نسواری پھولوں والی قمیض میں وہ بڑی امی ہیں۔ بس اب دیکھ لو۔ تعارف پھر کرا دوں گی۔"

سجو نے ایک موٹی سی عورت دیکھی۔ ابھی اگر وہ بچپنے کی حدود میں ہوتی تو اُسے پانچ ... کی دھوبن سے ضرور تشبیہ دیتی۔ سانولا رنگ۔ ناک میں کیل۔ پھنسے پھنسے کپڑے۔ بھدا سا جوڑا۔ مانگ سے بال اُڑے ہوئے۔ وہ کوئی ناٹکہ لگ رہی تھی۔

ڈولی سجو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک اور کمرے میں لے گئی۔ وہاں روشنی نسبتاً ہلکی تھی۔ ہلکی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ ننھی ننھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی ... لائی گلاس تھا۔ ایک طرف صوفے پر بے شمار لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ گروپ کی شکل میں کھڑے تھے۔ لڑکیاں بھی وہاں نظر آرہی تھیں۔ فرش بڑا خوبصورت تھا۔ ایک طرف کاؤنٹر بنا ہوا تھا اس پر بوتلیں رکھی تھیں۔ کوکا کولا۔ سیون اَپ۔ اور بہت سی کالی پیلی ... لیں۔

ڈولی اُس کا ہاتھ تھامے اُسے کاؤنٹر کے پاس لے گئی۔ اُس کے کان میں سرگوشی کر کے بولی "یہ بار ہے بار۔" "؟" سجو نے حیرت سے ڈولی کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ جانتی ... بار کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی غیر یقینی انداز میں ڈولی کو دیکھے جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں بھئی بار ---- اچھا بتاؤ کیا پیو گی؟" ڈولی نے جلدی سے پوچھا۔

پھر کہنے لگی۔ "تم ایک سیون اَپ لے لو۔"

اُس نے سیون اَپ کی دو بوتلیں کھولیں۔ برف کے دو ٹکڑے گلاسوں میں ڈالے اور دونوں گلاسوں میں انڈیل دیں۔ ایک گلاس سجو کے ہاتھ میں پکڑا کر اُس نے مزاحیہ انداز ... ٹوسٹ کیا اور گلاس مُنہ سے لگا لیا۔ سجو نے بھی جھینپ کر گلاس مزے سے لگا لیا ---- "ابھی یہاں ڈانس ہوگا" ڈولی نے کہا۔

"اچھا" سجو نے دل چسپی سے جواب دیا۔ "تم بھی ناچو گی؟"

YOUR HEALTH

”ہاں اگر موڈ بن گیا تو۔۔؟“

”اور کون کون ناچے گا؟“

”جس جس کا دل چاہے گا اور جس جس سے کہا جائے گا ——— ارے اگر کوئی کہہ بیٹھا تو ———؟“ اُس نے شرارت سے سجّو سے پوچھا۔ ”تمہیں تو ڈانس نہیں آتا؟“

”نہیں۔“ سجّو نے مجرمانہ انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے میں باہر چلی جاؤں شرمندہ ہونے سے کیا فائدہ؟“

”ارے نہیں میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ کوئی تم سے نہیں پوچھے گا۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر کوئی پوچھ بھی لے۔“ اُس نے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”تو شکریہ کہہ کر معذرت کر دینا۔ باہر جاؤ گی . . . . تو سارا تماشہ کیسے دیکھو گی۔“

وہ دونوں محفل کا جائزہ لینے لگیں۔ اچانک سجّو نے دو تیز نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کی۔ گلاس مُنہ سے ہٹا کر اس طرف دیکھا تو یہ وہی گرے سُوٹ والا آدمی تھا جو باہر بھی اُسے گھور رہا تھا۔

”ڈولی۔“ اُس نے ڈولی کے کان میں سرگوشی کی۔ ”وہ گرے سُوٹ والا آدمی کون ———“ پیشتر اس کے کہ وہ اگلا جملہ بھی کہے ڈولی جھٹ بول اُٹھی:

”ارے وہ تو ساجد بھائی ہیں۔“ سجّو کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ شکر ہے اُس نے اگلا جملہ نہیں کہہ دیا تھا۔ ورنہ کس قدر شرمندگی ہوتی۔ ”آؤ تمہیں ان سے ملاؤں“ وہ سجّو کی حالت کا اندازہ کئے بغیر اُسے گھسیٹ کر ساجد کے پاس لے گئی۔ ”ساجد بھائی ان سے ملئے یہ میری عزیز ترین سہیلی سجیلہ ہے۔“

”آداب۔“ اُس نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر فلمی انداز میں ساجد نے بہت سارا دھواں چھوڑا اور اپنی ننگی نظروں سے سجّو کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”نام تو بڑا پیارا ہے۔“

”اور یہ خود نہیں پیاری۔“ ڈولی ٹھنکی۔

”ارے انہیں کی مناسبت سے تو کہہ رہا ہوں۔“

اب سجیلہ کو اپنی تعریف کرانا ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے اوچھے اوچھے تھے اس آدمی کے۔ اتنے میں میوزک تیزی سے بجنے لگا اور کچھ لوگ اُٹھ کر ڈانس کرنے لگے۔ باہر سے کچھ اور لوگ آ کر اُن کی جگہ پہ بیٹھ گئے۔

”عابد بھائی کہاں ہیں۔؟“ ڈولی نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سجّو کی طرف منہ کر کے بولی۔ ”میرے عابد بھائی کمال کا ڈانس کرتے ہیں۔ خدا کی قسم آج تک یہاں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ سب تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر وہ نہیں تھکتے۔ میں ابھی انہیں ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔ اور تمہارا اُن سے تعارف کراتی ہوں۔“

”نہیں نہیں ابھی کیا جلدی ہے۔“ سجّو گھبرائی۔

”پگلی وہ بڑی جلدی لڑکیوں کو ڈانس سکھا دیتے ہیں۔ چاہے کسی کو ایک قدم نہ اُٹھانا آتا ہو۔ اگر تم آج ڈانس کرنا چاہو تو وہ تمہیں ابھی چند STEP سکھا دیں گے۔“

”پلیز ڈولی آج نہیں۔“ اُس نے ڈولی کا بازو پکڑ لیا۔ ”خدا کے لئے مجھے اور ——— EMBARRACE نہ کرو نہیں تو میں ابھی نکل جاؤں گی۔“

لیکن ان دونوں کو خبر نہیں تھی کہ دُور کونے میں چھپے ہوئے عابد بھائی اُنہیں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے اور داخل ہوتے ہی اُن کی نظر سجّو پہ پڑ گئی تھی ——— شراب کی بھری ہوئی کوری صراحی ——— جس کا ڈھکنا نہ کُھلا تھا۔ اپنی تمام تر بوکھلاہٹ کے ساتھ سجّو اس وقت بڑی حسین لگ رہی تھی۔ حُسن و توانائی کا شاہکار لگ رہی تھی۔ بے داغ رنگ۔ متناسب نقوش ——— بھرپور جسم ——— اور چہرے پہ پھولوں جیسا تقدّس۔

عابد بھائی کی نظر اُس کے چہرے سے ہٹ ہی نہ سکی۔ وہ کونے میں بیٹھنے کا پورا

پُورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ڈانس شروع ہو چکا تھا۔
سجو اور ڈولی ڈانس دیکھنے میں محو تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈولی پھر بولی۔
عابد بھائی کہاں ہیں؟ اُن کے بغیر ڈانس کا لُطف ہی نہیں آ رہا۔ مگر ایک مصیبت
وہ سجو کی طرف مُنہ کر کے بولی۔ "عابد بھائی لڑکیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔
ڈانس کے لئے منانا بڑا مشکل کام ہے۔"

"تو پھر مجھے اُن سے کیوں مِلا رہی تھیں؟" سجو نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"تو کوئی لڑکی ہے؟" ڈولی نے کہا۔

"اور کیا ہوں میں۔؟"

"تُو تو ایک خوبصورت بلا ہے۔ بھلا تیرے آگے وہ انکار کر سکتے ہیں۔ میں تو
چاہتی تھی۔"

"خدا کے لئے مجھے اُن سے نہ مِلانا۔" سجو اور خوف زدہ ہو گئی۔
اِتنے میں ساجد بھائی ڈولی کے قریب آ گئے۔ "ڈولی میری پارٹنر ہو گی۔

FOR THE TIME BENING

ڈولی نے اپنا گلاس سجو کو پکڑایا اور اُن کے ساتھ چل دی۔
سجو کو اتنی حیرت ہوئی کہ وہ دِل پکڑ کر ایک کُرسی پر بیٹھ گئی۔ یا خدا! یہ لوگ کس
اور وسیع النظر ہیں۔ اور اپنی ماں بہنوں کو کیسی آزادیاں دے رکھی ہیں۔ دراصل ان
کے ضمیر صاف ہوتے ہیں۔ اُن کے اندر کوڑا کرکٹ نہیں بھرا ہوتا۔ بات بات پر
نہیں کرتے۔ ایک میرے بھائی ہیں۔
توبہ توبہ۔ مجھے تو اُن کے سامنے ننگے سر آنے کی اجازت نہیں۔ کہتے ہیں
وقت مُلانی بن کر رہو۔ حتیٰ کہ اُونچی آواز میں بولنے نہیں دیتے۔ اُسے تو کبھی بلا
اور اونچی آواز میں فرمائشی پروگرام سننے پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن سب

کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔
تھی۔ مگر وہ درپردہ
آپس میں ہنسنا بولنا تو کُجا۔ وہ اپنے بھائیوں سے بغیر ضرورت کے بات نہیں کر سکتی
تھی۔ اُس کا باپ یا بھائی گھر میں کیا داخل ہوتے جیسے کوئی دیو آدم بو۔ آدم بو کہتا ہوا گھر
میں گھُستا۔ سب بہنیں دوپٹے سروں پر رکھ کر دالانوں اور کمروں میں گھُس جاتیں۔ پھر کیا
مجال جو کسی کی آواز آ جائے۔ اور اِن کو دیکھو۔ یہاں نہ بھائی ہوا ہیں نہ باپ بھوت۔ کیسے شیرو
شکر ہیں یہ لوگ۔ کس طرح مِل جُل کر ناچ رہے ہیں۔ سب انسان ہیں۔ عورت اور مرد کا فرق
مٹ گیا ہے۔
پھر بیٹھے بیٹھے جانے اُسے کیا ہوا کہ اُس کا جی بھر آیا۔ اُس کا دِل چاہا کہ وہ اس ناانصافی
پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ مبادا اُس کے آنسو نکل آئیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل گئی۔
باہر ایک آدمی سے اُس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ سوری کہہ کر وہ آگے نکل گئی تو اس آدمی
نے بڑی انکساری سے کہا۔
"آپ کو پینے کے لئے کچھ چاہیئے؟"
"جی نہیں شکریہ۔"
"آپ کس کو ڈھونڈ رہی ہیں؟ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"
"جی نہیں شُکریہ۔ جی شکریہ۔" وہ بوکھلاہٹ میں کہہ کر جا رہی تھی کہ اُدھر سے راضی آپا
آ گئیں۔
"ارے سجیلہ تم یہاں ہو۔ میں تمہیں اُدھر ڈھونڈ رہی تھی۔ چلو کھانا کھا لو۔ ڈولی نے
کہا تھا تمہیں پہلے گروپ میں کِھلوا دوں۔ کیونکہ تمہیں ہوسٹل جانا ہے۔"
"ہاں آپا۔" سجیلہ نے آگے ہو کر کہا اور وہ آدمی اُس کے برابر آ گیا۔ "چلیئے میں آپ کو
کھانے والے پنڈال میں لے چلوں۔" اُس نے سجیلہ سے کہا۔
"ہاں امجد بھائی پلیز۔ آپ اُس کو اُدھر لے جایئے۔" راضی آپا نے اپنی ذمہ داری امجد

کے کاندھوں پر ڈال دی۔

سجّو کو خود بخود پتہ چل گیا کہ یہ ڈولی کے سب سے بڑے بھائی امجد ہیں۔ انہوں نے سر
جھکائے، ہاتھ باندھے، نظروں میں شرافت بھرے انکساری کا مجسمہ بنے ہوئے
ساتھ چلنے لگے۔

"آپ کا ہوسٹل کس وقت بند ہوتا ہے؟"

"جی۔ دس بجے بند ہو جاتا ہے۔" سجّو نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر اس وقت ہوسٹل بند ہو جائے تو آپ صبح چلی جایئے گا۔"

"جی نہیں۔" سجّو نے گھبرا کر کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے امجد بھائی۔ ہماری وارڈن
سخت گیر عورت ہے۔ اور پھر آج پہلی مرتبہ آئی ہوں۔ وقت پر نہ لوٹی تو مجھ
نہ ملے گی۔"

"ابھی تو آدھ گھنٹہ باقی ہے۔" امجد بھائی نے شفقت سے کہا۔ "آپ اطمینان
کھانا کھا لیں میں آپ کو بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

کھانے کی خوشبو جب سجّو کی ناک میں پہنچی تو اُسے احساس ہوا کہ واقعی اُسے
لگی ہے ایک میز پر اُسے کھڑا کر کے امجد بھائی اور لوگوں کی مدارات میں لگ گئے۔
میں آکر اسے پوچھ جاتے۔ کچھ اور تو نہیں چاہیئے۔

اُن کے اس رویّے سے سجّو دل ہی دل میں بہت متاثر ہو رہی تھی۔ کس قدر
اور اونچے خیالات کے ہیں یہ لوگ ۔۔۔ سہیلی تو وہ ڈولی کی ہے۔ مگر سبھی اسے
ذمہ داری سمجھ رہے ہیں۔ واقعی یہ ایک آئیڈیل گھرانہ ہے۔ اور امجد بھائی تو جیسے شفقت
گئے تھے ویسے ہی پائے گئے۔

سجّو کھانا کھا رہی تھی کہ ڈولی آ گئی۔ وہ ناچ ناچ کر تھک چکی تھی۔ اُس کے بال
بے ترتیب ہو گئے تھے اور سانولا رنگ بھی سُرخ ہو رہا تھا۔

"ڈولی اب مجھے چھوڑ آؤ پلیز۔ صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"میں اس وقت سے انکل کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے
ہیں۔" ڈولی نے تردد سے کہا۔ "وہ مل جائیں تو ہم دس منٹ میں ہوسٹل پہنچ جائیں گے۔"

"ہائے اللہ! اگر وہ نہ ملے تو دیر ہو جائے گی۔" سجّو اب اپنی ساری تفریح بھول گئی
تھی۔ "کسی اور کی گاڑی مانگ لو۔ اتنی تو بے شمار گاڑیاں کھڑی ہیں۔" سجّو نے بھولے پن سے
کہا۔ وہ یہ بھول چکی تھی کہ امجد بھائی نے بھی اُسے چھوڑ آنے کی پیش کش کی ہوتی ہے۔ ڈولی
اس کا بازو پکڑ کر اندر کو لپکی۔ ساجد بھائی کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ایک سگریٹ
سلگا رہے تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر جب سجّو کی طرف دیکھا تو سجّو ڈر گئی۔ وہی نگاہ کھا
جانے والی۔

ساجد بھائی! ۔۔۔" ڈولی نے چاپلوسانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "ذرا دیر کو اپنی گاڑی
دے دیجئے۔"

"مجھے ابھی کہیں جانا ہے۔" انہوں نے انکار کے لہجے میں کہا۔

"پلیز بھائی جان!" ڈولی مچلنے لگی۔ "بس پندرہ منٹ میں لوٹ آئیں گے۔ میں ڈرائیور
لے جاؤں گی۔ آپ بیٹھے رہیئے۔"

"مگر جانا کہاں ہے؟" ساجد نے پوچھا۔

"یو ذرا۔ سجّو کو ہوسٹل چھوڑنے جانا ہے۔ دس بجنے والے ہیں۔ ہوسٹل بند ہو جائے گا
اور اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

ساجد نے پھر نظر بھر کر سجّو کی طرف دیکھا۔ سجّو آنکھوں میں آنسو بھرے دوسری طرف
دیکھ رہی تھی۔

"مگر مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

سجّو کے آنسو ٹپکنے والے تھے وہ گھبرا کر باہر نکل گئی۔ ڈولی بھی اُس کے پیچھے باہر

نکلی۔ سجّو نے رومال کی نوک پر آنسو روک لئے۔ اور ڈولی بولی "گھبراؤ نہیں
ابھی انتظام ہوا جاتا ہے۔"

سامنے ہی ایک خوش پوش نوجوان ایک نیم برہنہ پاکستانی لڑکی سے مصروف
ڈولی اُس کی طرف دوڑی۔ سجّو اُس کے پیچھے تھی۔ "عابد بھائی! ہم تھوڑی دیر
آپ کی گاڑی لے جائیں۔ بس پندرہ منٹ میں واپس کر دیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" اُس نے مُنہ موڑے بغیر کہا۔ "میں خود کسی کو چھوڑنے جا رہا
"آؤ سجّو امجد بھائی سے بات کریں۔" ڈولی نے جب سجّو کا بازو پکڑا تو عابد
اُٹھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ آزردہ سی سجّو ڈولی کے ساتھ جا رہی تھی اور وہ کنکھیوں
اس لڑکی کے متعلق جاننے کی کوشش کر رہا تھا اور اب ——

سجّو اور ڈولی گیٹ میں جا کر کھڑی ہو گئیں۔ تاکہ جو بھی موٹر جا رہی ہو
لفٹ مانگ لیں۔

اچانک پرلی طرف سے ایک کار اُن کے پاس آ کر رُکی۔ دروازہ کھول
نے باہر دیکھا اور ڈولی سے بولے "چلنا ہو تو کار میں بیٹھ جاؤ۔ تم لوگوں کو بھی چھوڑ
اُس نے سجّو کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ڈولی کی جان میں جان آ گئی۔ ابھی وہ سوار نہ ہو
تھیں کہ پیچھے سے اور دائیں جانب سے دو کاریں اور آ کر رکیں۔ غور سے دیکھا تو عابد
اور امجد بھائی تھے۔ وہ دونوں غالباً اُن کو چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ مگر
ساتھ معاملہ طے ہوتا دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔ ڈولی نے آگے کا دروازہ کھولا تو
رعونت سے حکماً کہا۔ "پیچھے۔"

سجّو کو اس میں اپنی بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ مگر وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ کیونکہ
اسے بتا چکی تھی کہ وہ لڑکیوں سے نفرت کرتا ہے۔ جب کار چل پڑی تو ڈولی
عادت چپ نہ رہا جا سکا۔ بولی۔

"بھائی جان۔ میں نے سجّو سے آپ کو ملایا ہی نہیں یہ میری نئی سہیلی ہے اور میرے
کالج میں پڑھتی ہے۔" عابد نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ مُنہ سے سگریٹ کا دھواں
نے لگا۔ سجّو نے پہلی مرتبہ اُسے غور سے دیکھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بہتر تھا
لیے غالباً مغرور بھی تھا۔ مگر سجّو یہ نہ جانتی تھی کہ اُس نے اپنے شیشے کا رُخ سجّو کی طرف
رکھا ہے اور اس کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کر رہا ہے۔

"کہاں سے آئی ہے یہ؟" تھوڑی دیر بعد عابد نے اُجڈ پنے سے پوچھا۔

"مُلتان ہی سے سمجھ لیجئے۔ اس کے پاس ہی اُن کا گاؤں ہے۔" ڈولی بولی۔

"انتہائی قدامت پسند اور ٹیڑھا میڑھا شہر . . . !" وہ اسی انداز میں بولا اور سجّو اندر
اندر کھولنے لگی۔

"ہائے اللہ۔ عابد بھیا۔ آپ کو اس طرح نہیں کہنا چاہیئے۔" ڈولی ٹھنک کر بولی۔ "اتنی
ٹ ہے میری سہیلی آپ اس کا دل توڑ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا بازو سجّو کے
پر ڈال دیا۔ مگر سجّو کی تمام تر خودی اس وقت بیدار ہو گئی تھی۔ ڈولی کا بازو پرے
تے ہوئے بولی "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ڈولی۔ یہ تو ہر شخص کے سوچنے کا اپنا
ڈھب ہے۔ کچھ لوگ مُلتان کو مُلتان شریف کہتے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ ایک مقدس
شہر ہے۔ جس میں مقدس ہستیاں دفن ہیں۔"

کھسیانا ہو کر عابد نے ایک قہقہہ لگایا جسے سجّو نے قہقہہ استہزا جانا۔ ڈولی بولی "تم
ہی خالص مُلتانی ہو۔"

"بھائی جان!" پھر وہ عابد سے بولی۔ "اس کا گاؤں تو جال پور ہے۔" اور ڈولی نے
کے بارے میں اُس کی امارت، خدام، محل اور زمینوں کی بڑائی کر ڈالی۔

سجّو دل ہی دل میں اترانے لگی۔

"تبھی . . . تبھی . . ." عابد نے اداکاری کرتے ہوئے سگریٹ کا کش لگایا۔

"کیا تبھی ــــ؟" ڈولی چونکی۔

"ایک دم سے گاؤں کی لگتی ہے۔ تمہاری سہیلی۔"

"ارے نہیں تو ــــ" ڈولی کو اس مرتبہ سچ مچ بُرا لگا۔ "یہ تو اتنی اسمارٹ ہے… دیکھ کر تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ گاؤں کی ہے۔"

"بھئی ظاہری رکھ رکھاؤ سے کیا ہوتا ہے۔" عابد بولا۔ "میں تو ذہن کی بات کر رہا… ذہنی طور پر تمہاری سہیلی ابھی گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ پوچھ کے دیکھ لو اس سے۔… کتنا گھبرا رہی تھی۔ کسی سے کھل کر بات کرنا یہ معیوب سمجھتی ہے۔ کوئی غور سے دیکھے… جاتی ہے۔ مکس اَپ ہونے کے بجائے ایک کونا ڈھونڈ کر وہاں کھڑی ہو جاتی ہے۔…"

اُس نے دادطلب نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

سجّو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ بار بار اپنی پلکیں جھپکنے لگی۔ یہ سب با… تھیں۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ اُس نے تو اپنے آپ کو بڑے… سے سنبھالا ہوا تھا۔

"اور تو اور جب کوئی مذاق کرتا ہے تو انجوائے کرنے کے بجائے جھٹ بُرا مان جاتی…"

عابد نے اپنی تفتیش جاری رکھی۔ اس مرتبہ ڈولی زور سے ہنسی۔

"اچھا تو عابد بھائی آپ مذاق کر رہے ہیں۔ میں بھی حیران ہو رہی تھی کہ آپ ایسے… مہذب تو کبھی نہیں تھے۔"

"بھئی ہم تو پہلی ملاقات میں ہی جان جاتے ہیں کہ کس سے ہماری دوستی ہو گی… کس سے نہیں۔"

"سجّو۔" ڈولی نے جلدی سے کہا۔ "عابد بھائی کی باتوں کا بُرا نہ مانا کرو۔ یہ باہر… تیکھے ہیں اندر سے اتنے ہی میٹھے ہیں۔"

"سُبحان اللہ۔" عابد درمیان میں بولا۔

اور یہ ہر ایک کو چبھتے ہوئے فقرے کہتے رہتے ہیں۔ جو لوگ اِن کو اچھی طرح جانتے وہ بُرا نہیں مانتے۔"

سجّو چُپ چاپ بیٹھی رہی۔

"اور میرا خیال ہے تمہاری سہیلی باہر سے جتنی میٹھی ہے اندر سے اتنی ہی زہریلی ہے۔"

"نہیں… نہیں۔" ڈولی جلدی سے بولی۔ "عابد بھائی آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ یہ بس اتنی سویٹ ہے کہ کیا بتاؤں؟"

"بتانے کی ضرورت کیا ہے۔ کیا مجھے نظر نہیں آتا۔" عابد بولا۔

سجّو کا دل دھڑکنے لگا۔

"پھر آپ اس بیچاری کو تنگ کیوں کر رہے ہیں؟"

"تاکہ وہ پہلی ملاقات میں ہی کھل جائے۔"

"اچھا۔" ڈولی ہنسنے لگی۔

اتنے میں سامنے ہوسٹل آگیا۔ "اس طرف عابد بھائی۔" ڈولی نے کہا۔

"اندر پہنچ جاؤ گی یا چوکیدار کی تواضع کر دوں۔" عابد نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔" ڈولی نے کہا۔ "ہم خود طے کر لیں گے۔"

وہ دونوں کار سے باہر نکل آئیں۔ عابد بھی اتر آیا تھا۔ سجّو ڈولی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے… پھر جانے اُسے کیا خیال آیا۔ مڑ کر عابد سے بولی۔ "شکریہ۔"

"کس بات کا؟" عابد نے اُس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میرا تجزیہ کرنے کا۔" سجّو نے جانے کیسے شوخی سے کہہ دیا۔

"اوہ۔" عابد ہنسا۔ "اللہ نے چاہا تو یہ سلسلہ اب جاری ہی رہے گا۔"

سجّو اور ڈولی ہنستے ہوئے گیٹ کی طرف چل دیں۔

سجّو رات گئے تک جاگتی رہی۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ساری شام کا ہنگامہ بار بار

اُس کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ ایک ایک شکل اور ایک ایک بات کے متعلق اُس نے اور اتنی بار سوچا کہ سب کچھ اُسے ازبر ہوگیا۔ کتنا کیف آگیں ماحول تھا۔ کتنے مزے کے لوگ۔ زندگی سے بھرپور۔ انہیں کوئی احساسِ کمتری نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں کوئی دُکھ یہ اُس کا آئیڈیل ماحول تھا۔

کاش وہ اسی ماحول میں پیدا ہوئی ہوتی۔

اور پھر سب کچھ سوچتے سوچتے اُس کے لاشعور میں عابد بھائی کی شبیہ آجاتی جو اور پُرکشش تھا اتنا ہی زہریلا بھی تھا۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آجاتی۔ ایسے آدمی ہوتے ہی مغرور ہیں، اور پھر ڈولی نے کہہ دیا تھا کہ اُسے لڑکیوں سے نفرت ہے۔

بے چارا ——

مریض بن جاتے ہیں ایسے مرد۔ اب اس کی باتوں کا بُرا کیا ماننا، کہتا ہے سلسلہ رہے گا۔ مگر اب میں چوکنے والی نہیں ہوں ترکی بہ ترکی جواب دُوں گی۔

جب نیند اُس کے قریب آئی تو اُس کے ذہن میں صرف عابد بھائی کا خیال تھا۔

اُس کے لاشعور میں اس پتھر کو جونک لگانے کی تمنا تھی۔ ——

وہ اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلانا چاہتی تھی ——

اور اُسے اپنے حُسن پر پُورا بھروسہ تھا ——

مگر ہائے اللہ —— وہ یہ کیا سوچ رہی ہے۔ توبہ توبہ ——

وہ تو سب اُسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح چاہ رہے تھے۔ اور یہ میں کہاں جا پہنچی! رومانس کی دُنیا میں پہنچ گئیں۔

استغفراللہ ——

نے کب تک درُود و استغفار پڑھتی وہ سوگئی۔

اور اب تو وہ گُل افشاں" اتنی مرتبہ جا چکی تھی کہ اُن کے گھر کا ہی ایک فرد لگنے لگی تھی سب گھر والوں کی مزاج داں بن گئی تھی۔ اُن کے طور طریقے کیا ہیں۔ اُن کا رہن سہن کیسا ہے اور اُن کے گھریلو "سیٹ اَپ" SET UP کو تو وہ بخوبی جان گئی تھی۔

اس لئے اب وہاں رہتے ہوتے وہ اپنے آپ بالکل اجنبی نہیں سمجھتی تھی۔ اور نہ کسی کی تیکھی یا میٹھی بات کا بُرا مانتی تھی۔ وہ سب لوگ اتنے محبّت بھرے۔ اور آپس میں گھُلے ملے ہوئے تھے کہ کسی کو کسی سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور تو اور۔ کوئی کسی کی بات میں دخل نہ دیتا —— کوئی کسی کی بات کا بُرا نہ مانتا۔

اور مزہ یہ کہ ہر ایک کو مکمل آزادی تھی۔ جو جس کا دل چاہتا کرتا رہتا۔ گھر آنے کا کسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جس وقت جس کا دل چاہے وہ گھر آجاتے —— ایک دوسرے کے مہمانوں کی وہ جی جان سے عزت کرتے تھے۔ خاطر مدارات میں کمی نہ کرتے۔ اور نہ آنے جانے والوں کے مشاغل میں رُخنہ اندازی کرتے۔

اب تجانی کند ذہن بھی نہ تھی کہ اُن اچھائیوں کو نہ پرکھ پاتی۔ اُس نے جب رات کو بھی اُن کے ہاں چھٹی لے کر رہنا شروع کر دیا تو ساری باتیں خود بخود اُس کی سمجھ میں آنے لگیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ڈولی کی باجیاں اُسے بہت چاہتی تھیں۔ جب کبھی وہ آجاتی جانو، باغ و بہار ہوجاتیں اس کی خاطر تواضع کرتیں۔ اسے شاپنگ کراتیں۔ پکچر پہ لے جاتیں۔ اور پھر رات کو سونے سے پہلے بستروں میں بیٹھ کر مزے مزے کی باتیں سُناتیں۔

ڈولی کے بھائی اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر اُس کا بہت خیال رکھتے۔ ایک اُدھر سے آ کر چٹکی کاٹ جاتا۔ دوسرا اُسے گُدگُدی کر جاتا۔ تیسرا شفقت سے اُس کے بال خراب کر جاتا۔ اور پکچر اُسے ہر دفعہ دکھائی جاتی۔ کبھی بڑے بھائی لے جاتے۔ کبھی منجھلے بھائی۔ اور کبھی چھوٹے بھائی۔

گھریلو معاملات میں وہ برابر حصّہ لیتی تھی۔ بیرونی مہمانوں سے اُس کا تعارف فرسٹ کزن کہہ کر کرایا جاتا۔ یوں بھی اُس کے حُسنِ فتنہ ساز کے اندر باہر کھُلم کھلا چرچے ہوتے رہتے۔ اب بھی وہ اگر خود کو گھر کا فرد نہ سمجھنے لگتی تو کیا کرتی۔؟ اُسے یہ گھر اپنے گھر سے بھی اچھا لگتا۔ یہاں کی بات ہی اور تھی۔؟

یہاں رہ کر اُس نے اپنے ازلی احساسِ کمتری کو خُدا حافظ کہہ دیا تھا۔ اور بالکل ایک نئی نویلی سجو بن گئی تھی۔

مگر گھر کا سارا نظام کون چلا رہا ہے۔ درپردہ اس شیشہ گری میں کس کا ہاتھ ہے؟ اس گھر کا اصل سربراہ کون ہے؟ یہ بات سجو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اُسے تو یہاں مکمل جمہوریت کا تسلط نظر آتا تھا۔ اور آمریت سے متنفر سجو نے اس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا ——— ڈولی کے امی اور ابا۔ اس کی اماں اور بابا کی طرح ہرگز نہیں تھے۔ کبھی کسی کے معاملات میں دخل نہ دیتے بلکہ اُن سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

ڈولی کے ابا تو خیر ایک عرصے سے فالج کے مریض تھے۔ اس لئے وہ بیچارے گھر میں نہ ہونے کے برابر تھے۔

اتنے بڑے گھر میں ایک کونے میں اُن کا ایک چھوٹا سا کمرہ اور ساتھ ایک چھوٹا

غسل خانہ تھا۔ ایک نوکر اُن کے لئے مقرر تھا۔ جس کا جب دل چاہتا وہاں سے غائب ہوجاتا کیوں کہ محمد حُسین صاحب کی قوّتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اِس لئے وہ نوکر کو بُلانا تو کجا اپنی فریاد بھی کسی کو نہ سُنا سکتے تھے۔ اُن کا دایاں بازو بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ان کی بائیں ٹانگ پر بھی اثر ہو جاتا۔ تب وہ مہینوں چارپائی پہ لیٹے رہتے۔ کوئی ان کی صورت نہ دیکھتا۔ مگر اُن کی صورت دیکھنے کا وہاں کون تمنائی تھا۔ وہ اس گھر میں ایک عضوِ معطل تھے۔

ہاں آفرین تھی بیٹوں پر کہ ایک ڈاکٹر اور ایک مُلازم مستقل مقرر کر رکھے تھے اور بلا چُون و چرا ملازم کی تنخواہ اور ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کے بل ماہانہ ادا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کون اولاد ایسا کرتی ہے۔ کبھی کبھی جب محمد حسین کی طبیعت ذرا اچھی ہوتی یا موسم مناسب ہوتا تو اُن کا نوکر انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر برآمدے میں لے آتا۔ تب وہ ہر ایک شئے کو اپنی بے نور اور بیمار آنکھوں سے اس طرح دیکھتے جیسے اُن کے آس پاس صرف تابُوت ہی تابُوت رکھے ہوں۔ اُن کے مدقوق اور جھرّیوں زدہ سوکھے مارے چہرے پر بس اُن کی بڑی بڑی سفید اور مردہ آنکھیں ہی رہ گئی تھیں۔ جن کو دیکھ کر خوف بھی آتا تھا اور عبرت بھی حاصل ہوتی تھی۔

ایک روز جب سجو "گُل افشاں" میں آئی ہوئی تھی۔ اتفاقاً اُس کی نظر "وہیل چیئر" پر بیٹھے ہوئے اس ڈھانچے پر چلی گئی۔ ڈھانچہ بالکل بے حِس و حرکت تھا بلکہ خوفناک حد تک ساکت تھا۔ مگر اُس کی آنکھیں دیوانہ وار گول گول گھُوم رہی تھیں۔ وہ آنکھیں اس طرح اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے بول رہی ہوں ——— پُوچھ رہی ہوں ——— خبردار کر رہی ہوں ——— اور پھر ——— رو رہی ہوں ——— آہ و بکا کر رہی ہوں۔

سجو نے اس سے پیشتر محمد حسین صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُن کا ذکر بار بار سُن چکی تھی۔ نگران کے کمرے میں جانے کی اُس نے کبھی ہمت نہیں کی تھی۔ نوکر انہیں پچھلے برآمدے میں بٹھا کر کوارٹروں میں غائب ہوگیا تھا۔ سجو اچانک

اُدھر جانکلی۔ انہیں یوں تنِ تنہا بیٹھا دیکھ کر اُس کا دم فنا ہو گیا۔ چلّاتی ہوئی واپس بھاگی
آگے ہی ڈولی مل گئی۔ وہ اُس سے لپٹ گئی۔

جب ڈولی نے ساری بات اس سے سُن لی۔ تو کندھے جھٹک کر بولی ـــــ "وہ
میرے ڈیڈی ہیں۔ سجّو ڈرنے کی کوئی بات نہیں وہ تو ہل بھی نہیں سکتے۔"

"مگر اُن کی آنکھیں۔۔۔۔ جانے کیا کہہ رہی تھیں اُن کی آنکھیں۔۔۔ مجھے اُن سے
بڑا ڈر لگا۔" سجّو ہکلاتی ہوئی بولی۔

"اونھ۔۔۔" ڈولی نے کندھے اُچکائے ـــــ "وہ تمہارا وہم ہے۔ اُن کو ٹھیک
طرح سے نظر بھی نہیں آتا۔۔۔ چلو ہم اُدھر ہی چل کر بیٹھیں۔"

دونوں چلتی ہوئی پچھلے برآمدے میں آگئیں۔ محمد حسین اپنے اسی انداز میں ایک ٹک
سامنے دیکھے جا رہے تھے۔ اُن کا ایک بازو ہل رہا تھا اور اُن کا پیکرِ استخواں مٹی کی مانند
کرسی پر رکھا تھا۔ وہ دونوں آرام کرسیاں گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئیں۔ اور لگیں مزے مزے کی
باتیں کرنے۔ مگر سجّو کی نگاہ بار بار محمد حسین کی طرف اُٹھ جاتی۔

"ڈولی! تو نے میرا تعارف تو اُن سے کرایا نہیں۔" سجّو کو خواہ مخواہ وہ مُردہ نگاہ اپنے بدن
میں اُترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اُس کے جسم میں برف کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

"کونسا وہ سُن سکتے ہیں ـــــ" ڈولی نے بے نیازی سے میگزین کے صفحے اُلٹتے
ہوئے کہا۔

"میں سلام کر دوں ان کو ـــــ؟" سجّو بولی۔

"میں کہہ رہی ہوں۔ وہ سُن نہیں سکتے۔ کیا تم بہری تو نہیں ہو گئیں۔"

"تو میں اشارے سے سلام کر دیتی ہوں۔" سجّو نے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ اُن کو ٹھیک طرح سے نظر بھی نہیں آتا۔"

"کتنا بُرا لگتا ہے۔ ہم سامنے بیٹھ کر گپیں ہانک رہے ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں کم از کم

تم اُن کا حال تو پوچھ لو ڈولی؟" اب سجّو کو ترس آنے لگا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ یہ تصویر دیکھو۔" ڈولی نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"اب کے میں اس طرح کا ہیئر اسٹائل بنوا رہی ہوں۔"

سجّو نے بے دلی کے ساتھ تصویر کی طرف دیکھا خاصا مضحکہ خیز اسٹائل تھا۔ مگر شاید
ڈولی کا قد اس سے دو انچ بڑھ جاتا۔

وہ بولی۔ "تمہارے پاس تو آج کل پیسے نہیں اور یہ تو خاصا مہنگا اسٹائل لگ رہا
ہے۔"

"میں نے انکل سے بات کر لی ہے۔" ڈولی نے آنکھ مار کر کہا۔ "کہتے تھے پیسے دے
دوں گا۔"

"ڈولی! تم اپنے باپ کے سامنے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ اگر وہ دیکھ لیں تو ـــــ"
سجّو نے پھر گھبرا کر محمد حسین کی طرف دیکھا۔

"وہ خاک سنیں گے۔" ڈولی لا پرواہی سے رسالے کی ورق گردانی کرتی رہی۔

"تم نے کتنے دنوں بعد اپنے ڈیڈی کو دیکھا ہے۔" اچانک سجّو نے سوال کر ڈالا۔
اور ڈولی سوچنے لگی۔۔۔ "ہو گئے ہوں گے کوئی تین چار مہینے۔"

"تین چار مہینے۔۔۔؟" سجّو نے حیرت سے ڈولی کی طرف دیکھا۔ "ایک گھر
میں رہتے ہوئے؟"

"پتہ نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔" ڈولی کھسیانی ہو کر بولی
اور پھر جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی "آؤ ریڈیو پر کمرشل سروس سنتے ہیں۔"

جاتے ہوئے ایک بار پلٹ کر سجّو نے محمد حسین کی طرف دیکھا۔

اُسے یوں محسوس ہوا وہ بے نور آنکھیں اب شعلے اُگل رہی ہیں۔ ڈر کے مارے
اُس نے جلد جلد قدم اٹھانا شروع کر دیئے۔

کتنی دیر تک محمد حسین کا تصور اُس کے ذہن پر چھایا رہا۔ کبھی اس ڈھانچے
اُسے خوف آنے لگتا اور کبھی اُس پر ترس کھانے لگتی۔ پتہ نہیں بے چارے کی زندگی
طرح گذری ہوگی۔

سجوتہ جانتی تھی کہ شیخ محمد حسین جوانی میں رعنائی و توانائی کا پیکر تھے۔ وہ اپنے
بیٹے عابد حسین سے زیادہ خوبرو اور چاق و چوبند تھے۔ تب وہ ایک ڈاکٹر تھے اور بھاٹی
گیٹ کے اندر اُن کا مطب تھا۔ اپنے آبائی مکان کے ایک کمرے کو انہوں نے
بنا رکھا تھا۔ اُن کی پریکٹس وہاں بہت اچھی چل رہی تھی۔ اور وہ وہاں شیر و شکر ہو کر
تھے۔ اُن کی ایک ہی دلی خواہش تھی کہ اُن کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے چنانچہ انہوں
نے بچوں کی تعلیم پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔

بڑے بیٹے امجد حسین کو وکالت پڑھائی۔ عابد حسین نے انجینیرنگ کی ڈگری
اپنے خرچ پر بیرونی ممالک سے بھی ہو کر آتے۔ ساجد حسین نے فلاسفی میں ایم اے
اور دو سال امریکہ بھی رہ آئے۔ بڑی لڑکی کو انہوں نے بی اے۔ بی ایڈ کرایا۔ دوسری نے
اکنامکس میں ایم اے کیا۔ تیسری کو انہوں نے ڈاکٹری لائن میں ڈالا۔ مگر اُس نے
پسند کیا۔ چوتھی ابھی کالج میں داخل ہوئی تھی۔ اگر یہی اُن کی زندگی کا نصب العین تھا تو
اب مطمئن اور مسرور بھی ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اُن کی آنکھیں جانے کیا کیا راز اگلتی تھیں
اُن کی بیگم بھی اس راز کو نہ پا سکیں۔

بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک نئی روش کو اپنا لیا۔ جب پیسے کی فراوانی
ہوئی تو انہوں نے بھاٹی گیٹ سے گلبرگ کا رُخ کیا۔ ان کا خیال تھا بھاٹی گیٹ میں
ان کا سٹیٹس کبھی اُونچا نہیں ہو سکتا۔ شہر میں مرتبہ اور مقام حاصل کرنے کے لئے گلبرگ
میں رہنا ضروری ہے۔ جبکہ بوڑھا باپ اپنے دو منزلہ تنگ سیڑھیوں والے مکان
نکلنا چاہتا تھا۔ جب اُسے اُس کی زندگی میں وہاں سے نکال کر گل افشاں میں لا

اُن کی حالت مردوں سے بدتر ہوگئی۔ زندگی تو جسم سے نکل گئی۔ باقی سانسیں رہ گئیں۔
یہ سانسیں کب اُن کے اختیار میں تھیں۔

وہ مٹی کا ایک خستہ ڈھیلا بنے پڑے تھے۔ کاتب تقدیر کی ٹھوکر چاہیئے تھی۔ پھر
ذرہ بنتِ خاک اُڑ کر جانے کہاں کہاں بکھر جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دُنیا اُن سے دُور
ہو گئی تھی۔ اور تو اور اُن کی چہیتی بیگم بھی اُن کے نزدیک نہیں آتی تھیں۔ بس دن میں ایک
بار دور دراز کھڑے کھڑے اُن کی خیریت پوچھ جاتیں۔ بعض اوقات ان کے کپڑے بدلوانے
ہوتے تو نوکر کو ہدایات دینے آجاتیں۔ یا کبھی کبھار محمد حسین کا کوئی عزیز، بھائی، چچا،
ماموں، یا بچپن کا کوئی دوست آجاتا، جسے دیکھ کر محمد حسین کی بے نور آنکھیں بھرنے بن
جاتیں۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس کو آنسوؤں میں ڈھالتے۔ اور یہ آنسو الفاظ بن کر مخاطب
کے دل میں اُتر جاتے۔ وہ کچھ سمجھ پاتا اور کچھ نہیں۔ اور اُن کے ساتھ چند آنسو بہا کر اُٹھ جاتا۔
کبھی کبھی وہ بایاں ہاتھ اُٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کرتے۔ جیسے کہتے ہوں "دعا کرو اب اللہ
مجھے اس عذاب سے نجات دے"۔

کبھی اگر وہ پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر اپنے کسی لڑکے کو بلوا بھیجتے تو وہ بصد مجبوری ہاں
جاتا۔ کھڑے کھڑے اُن کے مبہم اشارے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ بودے انداز میں تسلی دے
کر لوٹ آتا۔ وہ زندوں کی اس دُنیا میں شکستہ قبر کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ اور قبرستان
میں کوئی زندہ آدمی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ پھر تو کسی سے شکوہ ہی عبث تھا۔

بیگم محمد حسین بھی یہی کہتیں کہ "ایک مردہ کے ساتھ وہ کہاں تک اپنے آپ کو مار سکتی
ہیں۔ اس آدمی کی بیماری نے تو انہیں دنیا سے بیزار کر دیا ہے"۔

دنیا سے اُن کی بیزاری کا یہ عالم تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت وہ کھانے پینے
میں گزارتیں۔ شوخ رنگوں کے بڑے بڑے پھولوں والے کپڑے پہنا کرتیں۔ اپنے
چہرے کو اندرونی غم کا اشتہار کہتیں۔ جگہ جگہ سے سفید ہوتے بالوں کو نت نئے خضابوں

سے رنگا کرتیں۔ اور اپنے ہاتھوں و پاؤں کے ٹوٹے ہوئے ناخنوں کو تیز رنگ کی پالش سے رنگی رہتیں۔ اُن کو سُرمے اور سُرخی کے بغیر کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جوانی میں میاں بیوی کے حق میں کافی سخت گیر تھے۔ خصوصاً اُسے بے ڈھنگے فیشن نہیں کرنے دیتے اب جبکہ اُن کی اولاد جوان تھی اور وہ تسبیح اور مُصلّے کی عمر میں داخل ہو چکی تھیں اپنے دِل کے ارمان پورے کیا کرتیں۔ اُن کی سہیلیاں بھی ان جیسی ہی تھیں۔ تمام زیب و زینت جوان نما بوڑھی عورتیں اور "مرمت طلب بیگمات"۔ کسی کے بال مصنوعی۔ کوئی مسلی کی عادی تو کوئی میک اَپ کی دِلدادہ۔ جب بھی اُن کی سہیلیاں آجاتیں۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں بُلا لیتیں یا پھر لان کے ایک گوشے میں کرسیاں بچھا کر گپ بازی ہوتی رہتی۔

کبھی کبھی یہ عمر رسیدہ شوقین مزاج "مہ جبینیں" تاش کے پتّوں سے بھی جی بہلاتیں۔ بیگم محمد حسین نے پیٹ کی بیماری کا عذر دے کر سگریٹ بھی پینا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے خیال میں اس عمر میں سگریٹ پینا امارت کی ایک نشانی تھی۔ مگر دانتوں کو مسی لگانی انہوں نے نہیں چھوڑی تھی اور کپڑوں پر تیز قسم کا دیسی عطر بھی لگایا کرتی تھیں۔ جہاں سے بھی گذر جاتیں کتنی دیر تک خوشبو آتی رہتی۔

نہ معلوم کیوں سجو کو وہ ہمیشہ ایک بوڑھی نائکہ کی مانند لگا کرتیں۔

کُہنہ سال —— زمانہ ہیں —— طرّار اور مطلب پرست عورت۔

بھائی امجد حسین بڑے ہی پیارے آدمی تھے۔ وہ شیخ محمد حسین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ہی غالباً وہ بڑے متحمل ملنسار اور شفیق تھے۔ زیادہ باتیں کرنے کی انہیں عادت نہیں تھی اور بحث و مباحثے میں حصّہ لینے کا شوق نہیں تھا جلدی سے قائل ہو جاتے۔ تاکہ بات نہ بڑھے۔ کوئی رو پڑتا تو بڑی جلدی ان کا دل پسیج جاتا۔

یوں تو انہوں نے وکالت پاس کی تھی۔ باپ کا خیال تھا اُن کا یہ بیٹا بیرسٹر کہلائے گا پھر جج بن جائے گا۔ لیکن اُن کے لاڈلے بیٹے کو قانون کی باریک بینیاں و نکتہ دانیاں نہ لُبھا سکیں۔ اُن کی پریکٹس صفر کے برابر رہی۔ تو انہوں نے مختلف کاموں میں ہاتھ ڈال لئے۔ اب عرفِ عام میں وہ بزنس کرتے تھے۔

سجو نے ڈولی سے یہ کبھی نہ پوچھا کہ وہ کیا بزنس کرتے ہیں۔ جب اُس نے بتایا کہ بڑے بڑے بزنس کرتے ہیں۔ تو اُس کے لہجے میں اتنا وقار اور یقین تھا کہ سجو کو خود یقین آگیا۔ کہ کوئی بہت بڑی فرم اُن کے زیرِ نگرانی چل رہی ہے۔ یا پھر اُنہوں نے ایک بہت بڑے کاروباری ادارے کو سنبھال رکھا ہے۔ امجد بھائی شادی شدہ تھے۔ اُن کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ کن پٹیوں پر سفید بال آگئے تھے۔ اِس لئے اُن سے کسی کو بھی

خطرہ نہ تھا۔ اُن کی شادی تبھی ہوگئی تھی۔ جب وہ لوگ بھائی دروازے والے
میں تھے اور اُن کی شادی پر شیخ محمد حسین نے دِل کھول کر دل کے ارمان نکالے
پھر امجد کی بیوی زبیدہ بھی تو اُن کے بڑے بھائی کی لڑکی تھی۔ باقی بہن بھائی اس رشتہ
کو پسند نہیں کرتے تھے اور چونکہ امجد بھائی اس موقع پر بھی خاموش رہے تھے
لئے ان کی شادی ہوگئی تھی۔

امجد بھائی کی بیوی یعنی زوبی بھابھی "گل افشاں" کی اوپر والی منزل میں رہتی تھیں
اُوپر دو بیڈ روم ایک بڑا ہال تھا۔ مگر اپنی ازلی بدمزاجی اور احساسِ کمتری کی وجہ سے
زوبی ابھی تک سُسرال میں گھُل مِل نہ سکی تھیں۔ بقول ڈولی۔ بھابھی میں ابھی تک
شہر کی خواتین والی عادتیں ہیں۔ وہ اتنی تنگ نظر ہیں کہ ہماری ہر بات کو معیوب
ہیں۔ اور تو اور امجد بھائی کی بہنوں سے بڑھی ہوئی محبت اور بے تکلفی کو بھی ناپسند
نظروں سے دیکھتی ہیں۔ اور پھر اس بھرے پُرے تعلیم یافتہ گھر میں —— وہ
تو میٹرک پاس، بنتی بھی تو کیسے۔؟ اس لئے وہ نیچے بہت کم نظر آتیں۔ کسی فنکشن
کسی خاص موقع پر ہی اُن کی جھلک نظر آجاتی۔ ورنہ اُوپر ہی سے اُن کے چیخنے چلا
اور بچوں کو مارنے پیٹنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ البتہ بچیاں اور امجد بھائی اکثر
نیچے ہی نظر آجاتے، یا پھر اُن کو ضرورت کے وقت بُلوا لیا جاتا۔ اور اگر کبھی بھابھی
کرنے یا سوئٹر کا نمونہ لینے نیچے اُتر آتیں تو سب بہنیں محتاط ہو جاتیں۔ کوئی ان
ہنسی مذاق نہ کرتا۔ سنبھل سنبھل کر بات کی جاتی۔ اور سمجھ سمجھ کر جواب دیا جاتا۔ مبادا
کا بتنگڑ بن جائے۔ بھابھی جتنی دیر بیٹھی رہتیں، ماحول میں تناؤ رہتا۔ اس لئے ان
موجودگی کو کوئی بھی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ویسے بھی بھابھی کا برتاؤ
لوگوں کے ساتھ جاکمانہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب کے سب اس کے
کی دولت پر عیش کرتے ہیں اور اینٹھتے بھی ساتھ ہیں۔ اگر آج میرا شوہر مجھے

ہو جائے تو انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ غالباً اسی وجہ سے اُن کی سُسرال
سے نہ بنتی تھی۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اپنی بچیوں اور شوہر کو نیچے جانے سے ہمیشہ
کے لئے روک دیتیں۔ مگر اس معاملے میں اُن کا شوہر اُن کی ایک نہ سنتا۔ اور وہ
جلتی کُڑھتی رہتی تھیں۔ ویسے فیشن کے معاملے میں نندوں کے کان کترتی تھیں۔
ہیر اسٹائل وہ بنواتیں۔ قیمتی سے قیمتی کپڑے پہنتیں۔ جہاں تک ہو سکتا نندوں
جلانے کا سامان کرتیں۔ اور اُن پر اپنی برتری ٹھونسنا چاہتیں۔ مگر اُن کی نندیں اِن حربوں
سے بے نیاز رہتیں۔ ایسی باتوں پر سوچ کر وہ اپنا قیمتی وقت برباد کرنا نہیں چاہتی تھیں۔
چونکہ اُن کی زندگی سے بھرپور دلچسپیاں انہیں کسی اور ہنگامے کی اجازت نہیں دیتی تھیں
امجد بھائی کی اُوپر تلے کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ لڑکا کوئی نہیں تھا۔ اور بھابھی کو لڑکے
بڑی حسرت تھی۔ وہ سمجھتیں۔ شاید اُن کا لڑکا نہیں ہے۔ اس لئے امجد حسین اس کی
نہیں بن سکے۔ اس لئے وہ پوری چھپے لڑکا پیدا ہونے کے تعویذ گنڈے کرتی رہتیں۔
امجد بھائی نے انہیں کئی بار سمجھایا تھا کہ اس احساسِ کمتری سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ اُنھیں لڑکے
کی اتنا نہیں ہے۔ اُن کی چار بہنیں ہیں۔ اگر پانچ بیٹیاں ہوگئیں تو کیا ——؟
مگر بھابھی اس ایک معاملے میں مات کھانے کو تیار نہیں تھیں اور انہیں اُمید بھی
تھی کہ ایک دِن اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔

ایک دِن اتفاق سے سجّو کی بھابھی سے تفصیلی ملاقات ہوگئی۔ اُس روز گھر والے
کسی شادی پر گئے ہوئے تھے۔ اور سجّو گھر میں اکیلی تھی۔
بھابھی ٹہلتی ٹہلتی سجّو کے کمرے میں آگئیں۔ سجّو کی اس گھر میں آمد و رفت بھابھی
کو بہت کھٹکنے لگی تھی۔ انہوں نے سجّو کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا تو سجّو بوکھلا گئی۔
پہلے سے بھابھی کی بدمزاجی کے قصّے سُن سُن کر وہ اُن سے پہلے ہی خوفزدہ تھی۔ اس
لئے اس نے ابتدا ہی میں گھر کے تمام افراد کے اوصاف اور خلوصِ بیکراں کے قصیدے

پڑھنا شروع کر دیتے۔ بھابھی طنز سے ہنسیں اور بولیں۔

"سجو بی! تمہیں ہر شے کی حقیقت کا علم تب ہوگا جب پانی سر سے گزر جائے گا"

"کیا مطلب بھابی ——؟" سجو کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔

"کچھ نہیں۔" بھابھی مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سجو بی! تم بھی مجھے جاہل، ان پڑھ، بدمزاج کہتی ہوگی۔" اس نے حیران کن طرف دیکھا "کہ میں اپنے شوہر کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ مجھ میں اتنے لوگوں کا مقابلہ کی ہمت نہیں ہے اور پھر میرے ارد گرد حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ہجوم بھی نہیں یہ ہنر تو ان بہنوں کو آتا ہے۔ بھائی اُن کے دیوانے کیوں نہ ہوں۔"

"جی ——؟" سجو حیرت سے کھڑی ہو گئی۔

"سمجھ جاؤ گی بی بی —— ! ابھی نادان ہو۔"

بھابھی حیران سی سجو کو چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اور سجو کا دل نفرت سے بھر گیا۔

یہ عورت نہیں۔ ناگن ہے۔ اس کو صرف ڈنک لگانا آتا ہے۔ اس کی محرومی نے اُسے ہر مسرور شخص سے متنفر کر دیا ہے۔ آخر اپنی نندوں سے اس قدر کیوں جلتی اللہ کا دیا سب کچھ ہے اس کے پاس —— اُس کی انہی باتوں سے عاجز آ کر اس کا شوہر اس سے دور رہتا ہے۔

مگر حسین لڑکیوں کا ہجوم....... یہ کیا کہہ رہی تھی —— میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا —— خدا نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ کس قدر احمق ہے یہ عورت —— اپنے صورت اور فرشتہ سیرت شوہر پر خود ہی کیچڑ اچھال رہی ہے۔ خدا کی قسم امجد بھائی جیسا شریف اور شفیق آدمی اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بھی سجو نے کوئی کام امجد بھائی سے کہا۔ انہوں نے ضرور کیا۔ وہ ڈولی کا کہا ٹال جاتے مگر سجو کا کہا انہوں نے

نہیں ٹالا تھا) اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کوئی بہن سجو کا نام لے کر امجد بھائی سے کہتی اس کو بازار سے کوئی شے لینی ہے ذرا لے چلیئے۔ وہ کتنے بھی تھکے ہوتے ہوتے جانے کو تیار ہو جاتے۔ ایک بات کی سجو کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ کہ جب ان لوگوں کے ساتھ وہ بازار جاتی تو اسے ڈولی یا کسی اور کے ساتھ موٹر میں آگے بیٹھنا پڑتا، اُسے ہمیشہ درمیان میں دھکیل دیا جاتا۔ پہلے پہل اُسے اس طرح پھنس کر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گئی۔ اگر ڈولی بھائیوں کے ساتھ اس طرح جڑ کر بیٹھ سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں بیٹھ سکتی اور پھر امجد بھائی کی نیت پر تو وہ کبھی شک نہیں کر سکتی تھی۔ ہمیشہ اُسے بی بی کہہ کر بلاتے اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کبھی کبھی یہ ہاتھ سر سے اتر کر کندھوں تک پہنچ جاتا۔ اور کچھ تجسس بھی ہو جاتا۔

اچھی تو ہو ——؟

کھانا ٹھیک مل رہا ہے ہوسٹل میں ——

دل تو اداس نہیں ہوتا ——؟

کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتانا ——

وہ کمر پر اوپر سے نیچے ہاتھ پھیرتے جاتے اور انتہائی مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں سجو سے تمام حالات دریافت کرتے جاتے۔ کئی بار جب اُن کا ہاتھ کافی دیر کے لئے اس کی کمر پر رکا رہتا تو سجو حیران ہو کر اُن کی شکل دیکھتی۔ مگر اُن کا چہرہ ہمیشہ کی طرح معصوم اور سادہ ہوتا۔ اُن کی نگاہ شرافت سے جھکی ہوتی۔ شرم سے اُن کا رنگ لال ہوتا۔ دھیمے دھیمے لہجے اور جذبات سے عاری آواز میں وہ باتیں کرتے جاتے۔ اس عالم میں اگر اُس کی کوئی بیٹی سامنے آجاتی تو وہ سجو کا کندھا چھوڑ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ پھیرنے لگتے۔ اور اپنے اسی پرانے انداز میں اُس سے ذرا ذرا کا حال پوچھنے لگتے۔ سجو کے علاوہ ڈولی کی اور بھی جتنی سہیلیاں آتی تھیں امجد بھائی کا اُن سب کے ساتھ ایسا ہی رویہ تھا۔ ذرا ڈولی کہہ دیتی

"امجد بھائی آج میری سہیلی کو فلاں پکچر دکھا دیں۔" تو وہ جھٹ تیار ہو جاتے۔
دکھاتے، بلکہ وہاں خوب خاطر مدارات بھی کرتے۔ اگر موڈ بہت اچھا ہوتا تو بازار
بھی لے کر دیتے۔ مگر مجال ہے جو کسی کو میلی نگاہ سے دیکھا ہو۔ کئی دفعہ سجّو کا
کہ انہیں بابا ـــــ کہہ کر خطاب کرے۔ اور ایک مرتبہ تو انہوں نے سجّو کو اس
کیا کہ وہ پہلے سے زیادہ اُن کی گرویدہ ہو گئی۔ اُس روز سجّو کو ہوسٹل جانے میں پھر دیر ہو
گھر میں کوئی موٹر بھی نہیں تھی۔ امجد بھائی کی لڑکی کو بہت تیز بخار تھا وہ اُس کی دوا
کر ابھی آئے تھے اور ابھی وہ دو ایک سیڑھیاں چڑھے تھے کہ راضی آپا نے پکار کر
"پلیز امجد بھائی۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ذرا سجّو کو ہوسٹل چھوڑ آئیں۔ دس
ہیں۔ اور اس غریب کو ڈانٹ پڑ جائے گی۔"

امجد بھائی وہیں رُک گئے۔ دوائیاں آپا کے حوالے کر کے بولے۔ "اُوپر جا کر
دے آؤ۔ اور کہو نسخے کے مطابق بچّی کو دینا شروع کریں۔ باقی تفصیل میں آکر بتاتا ہوں"

"نہیں امجد بھائی۔" سجّو جلدی سے بولی۔ "پلیز پہلے آپ اُوپر جا کر بچّی کو دوا دے آئیں
ذرا دیر انتظار کر لوں گی۔"

"نہیں۔" امجد بھائی نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ اُوپر جا کر اتنی جلدی آجانا ممکن نہ

"جاؤ راضی۔" اُنہوں نے آپا کو اشارہ کیا۔ آپا دوائیاں لے کر اُوپر چلی گئیں۔

اس قدر ذہنی پریشانی کے باوجود راستے میں اُنہوں نے سجّو کو مجبور کر کے کباب
کوک پلایا۔ آئس کریم بھی کھلائی اور دو عدد میٹھے پان اور دو موتیا کے گجرے بھی
کہ کہیں سجّو یہ نہ کہہ دے کہ آج امجد بھائی کو اپنی بیٹی کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور وہ سجّو کی
طرح مدارات نہیں کر رہے۔

راضی آپا نے تو واقعی سجّو کا دِل موہ لیا تھا۔ وہ شفقت کا ایک بھرا ہوا پیمانہ تھیں۔
جو ہر ایک کے لئے چھلک پڑتا۔ راضی آپا۔ امجد بھائی سے دو ڈھائی برس چھوٹی تھیں اُن
کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ اب انہیں شادی کا ارمان تھا۔ یعنی وہ ان منازل سے
کبھی کی گذر چکی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں "جوانی جب گدھی پہ آتی ہے تو وہ بھی حسین ہو جاتی ہے۔"

یہ راضی آپا کی بدقسمتی تھی کہ جوانی نے انہیں کوئی رُوپ نہ بخشا تھا۔ اپنے سب بہن
بھائیوں میں کم شکل ہونے کی وجہ سے اُن کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہ آیا تھا۔ اِن دِنوں
یہ لوگ اپنے بھائی دروازے والے مکان میں تھے۔ اُن کے آئیڈیل اتنے اُونچے بھی نہ
ہوئے تھے اور پھر کچھ مُعاشی حالات بھی قابلِ رشک نہ تھے۔ اس وقت راضی آپا کا پُورا
نام "ریاض اختر" تھا اور انہیں اپنے نام کے مردانہ ہونے کا ذرا بھی کامپلیکس نہ تھا۔
تب اُنہوں نے "ساجے ملجے" جیسے رشتے قبول کرنے کے بجائے نوکری کرنے کی
ٹھان لی تھی۔ انہوں نے بی۔ اے تو اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ بی۔ ایڈ میں داخلہ
لے لیا اس کے بعد ایک ہائی اسکول میں مُلازمت کر لی۔

یا۔ شاید راضی آپا دل ہی دل میں سمجھ گئی تھیں کہ اچھا رشتہ ان کے مقدر میں نہ ... ابھی سے زندگی گزارنے کا ایک ڈھنگ بنا لینا چاہیئے۔ اس وقت اگر دولت ... ہوتی تو راضی آپا کے باہر کو نکلے ہوئے دانت سبھوں کو سونے کے نظر آتے۔ یہ ... اپنے نصیب کی بات ہے کہ دولت تب ملی جب جوانی جُل دے گئی۔ اب تو اُن ... بال آدھے سفید ہو رہے تھے۔ جنہیں وہ بڑی خوبصورتی سے جوڑے میں چھپا لیتی تھیں ... بالکل اسی طرح جس طرح "گُل افشاں" میں آ کر انہوں نے اپنا اصلی نام چھپا لیا تھا ... موڈرن جگہ اور ایسا غیر موزوں نام۔

بچپن میں گھر کے افراد انہیں "راضی" کہہ کر بُلایا کرتے تھے۔ بس آپا کو کوئی نام ... کے بجائے یہی نام بھا گیا۔ گلبرگ میں آتے ہی وہ "مس راضی حسین" بن گئیں۔ پھر یہاں ... کے بعد انہوں نے شہر والے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اور سفارش سے ایک ... اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ تبھی فرفر انگریزی بولتیں۔ اسٹائل سے جوڑے باندھتیں ... نفیس ساڑھیاں پہنتی تھیں۔ ان کے چہرے کی بدصورتی اُن کی خوش خلقی نے ڈھانپ ... تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتیں تاکہ باہر نکلے ہوئے دانتوں کا عذر سامنے نہ آئے۔ جب کبھی ... تو یوں جیسے اُس کے بغیر اُن کی زندگی ادھوری تھی۔ اپنی تمام تر شفقت نچھاور کرنے پر ... گھر کے ایک ایک فرد کا وہ ماں کی طرح خیال رکھتیں بیگم محمد حسین تو صرف اُن کی جنم کی ... ہر ایک کی ضروریات کا خیال راضی آپا رکھتیں۔ باورچی خانے کا حساب کتاب، د... پارٹیوں کے اسٹیمیٹ ——— گھر کی مرمت۔ بہن بھائیوں کے کپڑے لتے ... کی فیسیں ——— سب راضی آپا کے اختیار میں تھیں۔ اور وہ سارا نظام انتہائی خوش ... سے چلا رہی تھیں۔

سب سے بڑی خوبی اُن میں یہ تھی کہ اُن کے لب پر کبھی اپنی بدقسمتی کا شکوہ نہ ... تھا۔ ایسے لگتا جیسے قدرت کے اس فیصلے کو انہوں نے بسروچشم قبول کر لیا ہے۔ ... ایک ہی بار اتنا رو چکی ہیں کہ اب اُن کی آنکھ سے کوئی آنسو نہیں ٹپکتا ... نصیبی پر ... اگر کوئی کبھی شادی کے بارے میں کہتا بھی تو بڑے سبھاؤ سے کہتیں: "اب کوئی میری ... شادی کی عمر ہے جی؟ اگر کوئی خواہشمند مل بھی جائے تو میری کہاں اس سے بنے گی؟ ... مجھے تو خود مختاری کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس لئے عورت پن تو رہا نہیں مجھ میں۔ نہ صورت میں دلکشی ——— نہ جوانی کا خمار ——— نہ سیرت میں لچک۔ جو بھی لے جائے گا نصیبوں کو رونے گا۔ بس مجھے اب ایسے ہی زندگی گزارنے دیجئے۔"

اُن کی یہ صاف گوئی سجو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ اُن کے متعلق گھر میں کوئی بھی اسکینڈل ... نہ نہیں تھا۔ البتہ اُن کی ایک چینی آدمی سے دوستی تھی جو ایک ریستوران کا مالک تھا اُسے ... راضی آپا کا اکلوتا بوائے فرینڈ کہہ لینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اکثر اس کے ساتھ باہر بھی جاتیں پکچر ز ... بھی دیکھتیں۔ اور گھر میں بھی آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

جب وہ آتا راضی آپا کالا سیاہ قہوہ بنا کر اُس کے پاس جا بیٹھتیں اور گھنٹوں وہ دونوں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہتے۔ شروع شروع میں چھوٹی چھوٹی بھدا نہ جیسی آنکھوں اور ... کی طرح پھولے ہوئے چہرے والا ٹھگنا چینی۔ سجو کو بالکل نہیں بھاتا تھا۔

"پتہ نہیں راضی آپا کو اس میں کیا نظر آتا ہے جو اُسے دوست بنا بیٹھی ہیں۔ میرا تو پاس بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

مگر جب دو ایک بار راضی آپا کی خوشنودی کی خاطر سجو کو اُس کی مدارات کرنی پڑ گئیں، تو اُسے احساس ہوا وہ بڑا دلچسپ اور خوش مزاج آدمی ہے۔ وہ اپنے بچوں جیسے انگریزی لب و لہجے میں بڑے مزے مزے کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ ویسے وہ اُردو بھی صاف بول لیتا تھا اور کوشش کرتا کہ زیادہ وقت اُردو زبان بولے۔

راضی آپا کی ایک اور بڑی پیاری عادت تھی کہ وہ جوان لڑکیوں کو نصیحت کرنے سے نہیں چوکتی تھیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ کوئی لڑکی خیالی دنیا بسا بیٹھی ہے اور اُس کا شادی

کا ارادہ نہیں ——— تو جب تک اُسے شادی کا قائل نہ کر لیتیں باز نہ آئیں۔

ایک بار جینی کی ایک ایسی دوست آگئی۔ جو مردوں سے متنفر تھی اور شادی کو
تصور کرتی تھی۔ راضی آپا کو جب اُس کے خیالات کا علم ہوا تو اس کے سر ہوگئیں۔

"رضوانہ! دیکھو پیاری یہ کائنات ساری ایک نظام کے تحت چل رہی ہے اور اس
قدرتی نظام کہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قوانینِ قدرت میں سے ہم کسی شے کو اپنی مرضی
مطابق بدل لیں اور پھر بھی سب کچھ ویسے ہی جاری رہے؟"

"نہیں ———"

"تو پھر تم شادی سے کیوں منحرف ہو؟ شادی قوانینِ قدرت میں سے ایک ہے
سے انحراف کرنے والے لوگ گویا اللہ کے بنائے ہوئے آئین کی منافی کرتے ہیں؟"

"مگر آپ کی بھی تو شادی نہیں ہوتی ہے؟" رضوانہ جلدی سے بولی۔

"مگر میں ذاتی طور پر شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ رضو!" آپا نے کمال متانت
دیا۔ "ہوسکتا ہے مناسب وقت پر مجھے اچھا رشتہ مل جاتا تو میری بھی شادی ہو جاتی
میں نے یہ سوچ کر حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض لوگوں کا
ہی بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ جب وہ کروڑہا نفوس کے جوڑے پیدا کرسکتا ہے تو چند ایک کو
بھول جاتا ہے؟"

"بس مجھے بھی ان چند ایک میں شامل کر لیجئے آپا!" رضوانہ بولی۔

"کیوں شامل کر لوں۔؟ تم نوجوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ صاحبِ حیثیت ہو۔ اور
سنا ہے تمہارے لئے اچھے خاصے رشتے آرہے ہیں۔ مگر تم انکار کئے جاتی ہو۔ کیا تم
میں ٹھوکر کھائی ہے؟"

"نہیں آپا ———" رضوانہ زور سے ہنسی۔ "میں تو سرے سے محبت کی قائل
نہیں ہوں۔"

"یہ اس سے بھی بُری بات ہے۔ محبت پر تو اس ساری کائنات کی بنیاد ہے۔"

"بس آپا ———" رضوانہ جھنجھلا کر بولی۔ "میں ان مردوں کی حاکمیت برداشت نہیں کرسکتی۔ یا پسند نہیں کرتی۔ کوئی مجھ پہ حکم چلائے اور مجھے لونڈی سمجھے۔"

"لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔" آپا بولی۔

"آپ کو پتہ نہیں آپا۔ میری کتنی ایسی سہیلیاں ہیں جن کے شوہر شادی سے پہلے دست بستہ ان کے آگے کھڑے رہتے تھے۔ مگر شادی کے بعد اُن سے جوتیاں سیدھی کرواتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ ؟ یہ تو بالکل قدرتی سی بات ہے۔"

"بس میں اس بات کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتی۔" رضوانہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ارے پگلی! ہمارے ہاں مرد کے لاشعور میں جو ازلی احساس برتری ہے، اُس کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ہمارے ہاں ہی کیا، ہر جگہ مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مرد جو ٹھہرے۔ عورت کو ہمیشہ عورت بن کر گزارہ کر لینا چاہئے۔ کبھی مرد کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔"

"کیوں آخر ———؟"

"اس لئے کہ عورت 'عورت' ہے۔ اللہ نے اُسے کمزور بنایا ہے۔ اور وہ مرد کے سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"اور آپ کیسے زندہ ہیں۔؟"

"اپنے بھائیوں کے سہارے پر ———"

رضوانہ لاجواب ہوگئی تو آپا نے اپنی تقریر جاری رکھی:

"مجھے تو چند بھائیوں نے سنبھال لیا ہے۔ مگر ہر لڑکی کے بھائی ایسے نہیں ہوتے۔ باپ بھائی، شوہر، بیٹا۔ عورت کو ان میں سے کسی نہ کسی کا سہارا چاہئے اور ان سب پر وہ شوہر کو کیوں ترجیح دے؟ شوہر بیوی کا جنم جنم کا ساتھ ہوتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں مرد کی محکومی میں بھی عجز کی لذت ہے۔ وہ تم پہ حکم ضرور چلاتا ہے۔ مگر تمہارے لئے محنت بھی تو کرتا ہے

تمہارے بچوں پہ فخر بھی تو کرتا ہے۔ اور تم کو اپنی آبرو، اپنا وقار سمجھتا ہے۔ کوئی عورت
پڑھی لکھی ہو۔ خوب صورت ہو۔ صاحبِ جائیداد ہو۔ اگر اس کا شوہر نہ ہو تو وہ کتنی
جاتی ہے اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کے بجائے اُسے بے شمار لوگوں
بیوی بننا پڑتا ہے۔" رضو ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ ہاں ——" آپا توجہ سے بولیں۔ "تم نہیں جانتیں۔ یہ معاشرہ کتنا ذلیل ہے
گھر ہو یا دفتر وہ جہاں بھی رہے گی۔ اسے کتنوں کی جی حضوری کرنی پڑے گی۔ اس سے
ہے کہ وہ ایک کی غلامی قبول کر لے اور پھر شادی تو مسلمان عورت کی زندگی کی معراج ہے
شادی اُسے ایک گھر، ایک رفیق۔ اور بچوں کا غرور عطا کرتی ہے۔ رضو بی! ہمیشہ یاد رکھو
تم جیسی نوجوان لڑکیوں کو باہر کی دنیا جتنی رنگین اور خوشنما نظر آتی ہے۔ اصل میں اتنی نہیں
زندگی میں ہر نیا قدم قربانی مانگتا ہے۔ پھر تم لوگ شادی کے معاملے میں قربانی دینے کو تیار
کیوں نہیں ہوتیں؟ شادی میں ہمیشہ عورت کو زیادہ جھکنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ عورت ہی
قربانیاں دیتی ہے۔ اور تمام کامیاب شادیاں صرف عورت کے ایثار، بردباری
کا کامیاب ریکارڈ ہیں۔ شادی کو نبھانے اور کامیاب بنانے میں مرد کا بہت کم ہاتھ
ہے۔ جو عورتیں یہ بات سمجھ جاتی ہیں وہ اپنی انا کو ختم کر ڈالتی ہیں اور جو اپنی گردن میں
ڈال لیتی ہیں اُن کی شادی ایک زہر بن جاتی ہے۔

مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ آجکل کی لڑکیاں حالات کا صحیح جائزہ لینے
نہیں کرتیں۔ ایک مستقل خادم ڈھونڈتی ہیں۔ شوہر کا صحیح تصور ہی ان کے ذہن میں نہیں
جہاں اُن کی خواہشوں میں ذرا سا تصادم ہوا، تڑاکر لوٹ آئیں۔ اری کمبختو! انہیں کیا
شادی کیا ہوتی ہے۔ شادی تو دو انسانوں کی ایک مشترکہ کاوش ہے۔ جس کا بوجھ بعض اوقات
ایک گردن پر زیادہ پڑ جاتا ہے۔ وہ گردن اگر بُردبار اور دانا نہ ہو تو یہ کاوش رشتہ کشتی بن جاتی
اور پھر سب کچھ تم پیار سے بھی تو حاصل کر سکتی ہو۔ غلامی میں بھی حکومت کر سکتی ہو

دل جیت لو تو ——
اور مرد کا دل کوئی ڈنڈے سے —— دولت سے —— یا حُسن سے کبھی
نہیں جیت سکا —— اس کے لئے سمجھ کی ضرورت ہے۔"
"ہائے اللہ ——" رضو کھسیانہ ہو کر بولی۔ "راضی آپا اگر آپ کی شادی ہو جاتی تو آپ
دنیا کی کامیاب ترین بیوی ہوتیں۔"
"اور یہی باتیں تو میں بتا رہی ہوں۔ تاکہ تم کامیاب ترین بیوی بن جاؤ۔"
"میں چلوں گی اب ——" رضو کھڑی ہو گئی۔ جانے اس پر آپا کی تقریر کا واقعی اثر
ہوا یا وہ بد دل ہو گئی تھی۔

وہ تو اٹھ کر چل دی
مگر بجو پہ دنوں آپا کی تقریر کا اثر رہا۔ واقعی انہوں نے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔
لڑکی کو شادی ضرور کرنی چاہیئے۔
کاش آپا کی شادی ہو جاتی!
کتنا خوش قسمت ہوتا وہ آدمی۔
بجو کا بس چلتا تو وہ کہیں سے آپا کا جوڑ ڈھونڈ ہی لاتی۔

لیکن اس گھر میں سجّو سب سے زیادہ متاثر عابد بھائی سے ہوئی تھی۔ عابد بھائی
آپا سے چھوٹے تھے۔ یوں تو وہ عورتوں سے متنفّر مشہور تھے۔ مگر زیادہ تر لڑکیوں کا
میں رہتے۔ اُن کو کھلی آزادی تھی۔ جس کو جو جی چاہے کہہ لیں۔ اُن کی باتوں کا کوئی بُرا
مانتا تھا اُن کی باتیں ایسی نوکدار ہوتیں جیسے مچھلی پکڑنے والا کانٹا۔ جو چُبھتا بھی ہے او
بھی کر لیتا ہے۔

عجیب بات تھی۔ سب لوگ دیا تو امجد بھائی کا کھاتے تھے مگر گن ہر وقت
بھائی کے گایا کرتے۔ سب بہنوں کی سہیلیاں اور رشتے دار خواتین عابد بھائی کو ہیرو
کرتی تھیں۔ ان باتوں نے عابد بھائی کی شخصیت کو ارفع اور پُراسرار بنا دیا تھا۔ یوں بھی
گھر کے "پرنس چارمنگ" تھے۔ اس لئے اُن کی شخصیت نے سجّو کے گرد ایک عجیب سا
بُن دیا تھا۔

اس پر عابد بھائی کی زندگی سے ایک ایسی ٹریجڈی وابستہ تھی، جس نے انہیں
دُوسروں کی ہمدردی کا حقدار بنا دیا تھا۔
اُن کی خوبصورت بیوی اُنہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یا دُوسرے لفظوں میں انہوں

دے دی تھی۔
بیوی کو طلاق دے دی تھی۔
ہائے اللہ۔ اتنے خوبرُو۔ اتنے وجیہہ۔ اور اتنے مہذّب آدمی کو کوئی عورت چھوڑ
سکتی ہے۔ سجّو کو عابد بھائی میں کوئی عیب ہی نظر نہ آتا تھا۔ ضرور وہ بدصُورت ہوگی؟
احساسِ کمتری کا کمپلیکس کے مارے چھوڑ کر چلی گئی ہوگی۔" سجّو کہتی۔
مگر جب ڈولی نے اُسے بتایا کہ بھابی حمیرا تو بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی اور عابد بھائی
نے اُس سے "لَو میرج" کی تھی۔ تو پھر وہ کوئی بڑی بدقسمت عورت ہوگی جو ایسے آدمی کو چھوڑ کر
چلی گئی اور اپنے پیچھے ایسا تلخ تاثر چھوڑ کر چلی گئی کہ اچھا بھلا نارمل آدمی ——— ایبنارمل
ہو گیا ہے۔" اسے خواہ مخواہ عابد بھائی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ گویا لاشعوری طور پر
اس بدسلوکی کی تلافی کرنا چاہتی۔ جو اُس کی صنف نے ایک عظیم الشّان مرد کے ساتھ کی تھی۔
غالباً اسی لئے عابد بھائی بہت ہی کھُردرے۔ اور مُنہ پھٹ ہو گئے تھے کہ اپنی "ایبنارملیٹی"
بعض اوقات وہ ایسی حرکتیں کر جاتے کہ سجّو حیران بھی ہوتی اور بُرا بھی نہ مانتی۔ اور یوں بھی وہ
گھر میں کئی باتوں کا بُرا اس لئے نہیں مانتی تھی کہ وہ شہری لڑکی کہلانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی کسی
حرکت سے یہ بات واضح نہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ گاؤں سے آئی ہے۔ اور عابد بھائی تو۔ اُس
کی چوری کئی بار پکڑ چکے تھے۔ اسی لئے تو ان کی تیز نگاہوں سے اُسے ڈر لگتا تھا۔
ویسے اُس کی بے جا شرم و حیا اور رلتے دیتے رہنے والی عادت کو عابد بھائی نے
ختم کیا تھا۔ سب لوگوں کی موجودگی میں اُنہوں نے کتنی بار اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اُسے
اُوپر کے لئے اٹھایا تھا۔
کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ سب لوگ کمرے میں بیٹھے ہوتے، اُدھر سے عابد بھائی
آ جاتے۔ کمرے میں جگہ ہونے کے باوجود وہ سجّو کی کرسی کی طرف لپکتے۔ اُس کے ننگے بازو
پکڑ کر اُسے کھڑا کر لیتے اور خود اس کی کرسی پہ بیٹھ جاتے۔ اور پھر اُسے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھا
لیتے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوتا کہ سجّو بیچاری سنبھل بھی نہ پاتی۔ مگر سب بہنیں اُس کے

بیٹھتے ہی۔ زور زور سے تالیاں پیٹنے لگ جاتیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے بھی لگاتیں
اس سے بڑا اور کوئی "جوک" ہی نہیں ہے۔ جب ذرا ہنسی کا طوفان تھمتا۔ تو امی
خفگی سے کہتیں:

"عابد کیوں تنگ کرتے ہو اس بے چاری کو۔"

مگر ڈولی جلدی جلدی اپنے دونوں ہاتھوں کو پاگلوں کی طرح نچا نچا کر کہتی۔ "ہائے
مزہ آیا ـــــ؟" تو سجو بے چاری کا سارا خون چہرے پر آجاتا۔

پہلے پہل تو اُسے ذرا سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا ادا ہے۔ عابد بھائی کے ہاتھوں کا لمس اُس
کورے جسم کو بجلی کے کرنٹ کے مانند لگتا۔ جیسے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ
مگر ذہن آگے سوچنے سے جواب دے دیتا۔

بیک وقت یہ فعل اچھا بھی لگتا اور بُرا بھی۔ اچھا کیوں لگتا ہے؟ یہ اُسے کبھی
اور اس سے زیادہ ناقابلِ فہم عابد بھائی کا رویہ بن جاتا۔ وہ سجو کو گود میں لئے تھوڑی
بیٹھے رہتے۔ پھر اس طرح اچانک اُٹھ کھڑے ہوتے۔ جیسے اپنی کوئی انتہائی ضروری
آگئی ہو یا پاؤں پر بچھو نے ڈنک لگا دیا ہو۔ وہ سجو کو ایک طرف پھینکتے اور باہر نکل جاتے
شروع شروع میں سجو کو اس میں اپنی تضحیک کا پہلو نظر آتا۔ مگر اب جیسے وہ اس
کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اس دن سے جس دن سے اُس نے سوچ لیا تھا کہ اگر ان
بُری ہو تو سب کے سامنے ایسا کبھی نہ کریں۔ آخر مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتے ہیں
تو سب کے سامنے لاڈ پیار کرتے لگتے ہیں۔ ورنہ کون کسی نوجوان لڑکی کو سب کے
گود میں بٹھا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عابد بھائی کی اور بھی بہت سی باتیں ناقابلِ فہم
اس کے باوجود وہ ان میں دلچسپی لیتی تھی۔ وہ اُسے اچھے لگنے لگے تھے۔

کبھی کبھی وہ ایک عجیب سے شک کے دوراہے پر کھڑی ہو جاتی ـــــ یہ اُن
ہوتا جب وہ عابد بھائی کے پاس تنہا ہوتی اور وہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھے

لاشعور میں ایک انجانی سی خواہش سر اٹھاتی:

اگر یہ مغرور سر میرے قدموں میں ہو ـــــ ؟؟؟

توبہ ..... توبہ ـــــ

وہ خود ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگتی۔ کوئی سُنے تو کیا کہے؟ وہ تو مجھے اپنی سگی بہنوں
(کی طرح) چاہتے ہیں۔ اور میں بڑی ذلیل ہو گئی ہوں۔ جو ایسی باتیں سوچ رہی ہوں۔ اور پھر
اُس نے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ ایسے آدمی سے شادی کرے گی۔ جو پہلی بیوی کو طلاق دے
اُس کا آئیڈیل تو کوئی ـــــ انوکھا، نرالا شہزادہ تھا۔ جو اُسی کی خاطر کڑے کوس کی
مسافت طے کر کے آرہا تھا۔ جسے اُس کا انتظار تھا۔ اس کے علاوہ جس نے کسی بھی لڑکی
کے من کے دریچے وا نہیں کئے تھے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ اُس کا آئیڈیل خود بخود
عابد بھائی میں ڈھل جاتا ـــــ آنکھیں بند کر کے جب اُس کے نوخیز جذبات اسے اپنی سانسوں
کے قریب بلاتے۔ تو ـــــ کے سگریٹوں میں مہکی ہوئی عابد بھائی کی سانسیں اُس
کے قریب آجاتیں۔ وہ اُس کے بازوؤں میں سمانا چاہتی۔ تو یہی صحت مند اور مضبوط بازو اُسے
اپنے حلقے میں لے لیتے اور جب وہ سرگوشیوں میں کچھ کہنا چاہتی۔ تو دو سُرخ آنکھیں طلب
میں ڈوبی اُس کے انگ انگ کا رس نچوڑنے لگتیں۔

یا اللہ .....

کبھی کبھی وہ عاجز آجاتی۔ یہ کیا مصیبت ہے؟ میرا آئیڈیل ہمیشہ عابد بھائی سے کیوں
مل جاتا ہے۔

لیکن خیر ـــــ کیا خبر وہ بھی ایسا ہی ہو۔ اتنا ہی ضدی۔ اتنا ہی کٹڑیل ـــــ اتنا
اتنا ہی بے نیاز۔ اپنی بات منوانے والا ـــــ

ٹھیک ہی ہے کہ عابد بھائی کو زبردستی اپنی بات منوانے کی عادت تھی۔ مگر وہ
ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی کبھی خود پر جھنجھلا اٹھتی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ سب

لوگ باہر لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ عابد بھائی حسبِ معمول ایک طرف دُور گھاس پر جا کر لیٹ گئے۔ راضی آپا نے کہا: سجّو ذرا عابد بھائی کو چائے تو بنا کر دے آؤ۔ سجّو نے ایک پیالی میں چائے بنائی۔ اور اُن کے قریب لے گئی۔ لے کر کھڑی ہو گئی تو وہ بے نیاز بن کر لیٹے رہے۔ جب گھاس پر رکھ کر آنے لگی تو تمکنت سے بولے۔

"ٹھہرو ———!"

وہ ٹھہر گئی۔

"بیٹھو ———!"

وہ بیٹھ گئی ———!

"اگر میں کہوں۔ کہ میرے ہونٹوں کو چوم لو۔ تو کیا تم چوم لو گی۔ ؟"

"جی ——— ؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر اس طرح پیچھے ہٹی۔ جیسے کسی دیو کا سامنا ہو گیا ہو۔

"آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو؟ جواب دو۔" انہوں نے کڑک کر کہا۔

"آپ کتنی واہیات بات پُوچھ رہے ہیں عابد بھائی" اُس نے روہانسی آواز میں کہا "آپ ڈُدلی سے ———"

"بکواس بند کرو" انہوں نے غصّے سے کہا اور پیالی اٹھا کر مُنہ سے لگالی۔ سجّو کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ گئے۔ چھنگلی سے دونوں آنسو پونچھ کر جب وہ جانے ہونے لگی تو عابد بھائی نے بڑی میٹھی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس پیالی سے ایک گھونٹ چائے پی لو۔ مگر اُسی کنارے سے جہاں سے میں نے پی ہے"

"کیوں ؟" وہ غرّائی۔

"میں کہتا ہوں۔" وہ غصّے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ورنہ میں ساری چائے تمہارے اُوپر گرا دوں گا"

سجّو لرز گئی۔ اور اُس نے وہیں سے چائے کا ایک گھونٹ بھر لیا، جیسے کوئی زہر پیتا ہے۔ عابد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بڑی پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سویٹی" اُس نے جذبات سے لدی آواز میں کہا۔

سجّو کا دل دھڑکنے لگا۔

"دیکھا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا۔ وہ ہو گیا نا۔ ؟"

"اللہ۔ عابد بھائی۔ آپ بڑے خراب ہیں۔" سجّو نے لجا کر کہا۔

عابد نے ہونٹوں کا دائرہ بنا کر جیسے ہوا میں ایک بوسہ اُس کی طرف پھینکا۔ اور پھر عجیب سی آواز میں بولا "یہ قرض کبھی اتار دوں گا۔"

واپسی پر سجّو کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ تنہائی میں جب بھی اُس نے اس امر پر غور کیا اُسے خُود پہ غصّہ ہی آیا۔ مگر نہ جانے کیوں۔ اس کا جذبات میں ڈوبا ہوا چہرہ بلکار آنکھیں۔ اور ہوا میں بوسہ پھینکنا اُسے بار بار یاد آتا تھا۔

ایک بار سب لوگ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گیلری میں سے نکل کر اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ اچانک بجلی کا فیوز اُڑ گیا۔ وہ جہاں کھڑی تھی کھڑی رہ گئی۔ اتنے میں نا جانے کہاں سے دو بازو آئے۔ انہوں نے سجّو کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اس طرح کہ وہ کسمسا بھی نہ سکی اور پھر دو گرم ہونٹ اس کے کنوارے ہونٹوں کا رس چوسنے لگے۔ کب تک یہ ہوتا رہا۔ اُسے کچھ پتہ نہیں۔ بس بتیاں جلیں تو وہ پاگلوں کی طرح کھڑی آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سانس الگ اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے تھے اور ہونٹ جل رہے تھے۔ سامنے سے راضی آپا نکل آئیں۔

"ایسے کیا ہوا سجّو ———؟" وہ اُس کا حلیہ دیکھ کر بولیں "کیا ڈر گئی تھیں۔ ؟"

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ سوائے اس کے کہ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو اندر آؤ" وہ اُس کا بازو تھام کر ڈرائنگ رُوم میں لے گئیں۔

"لائٹ تو تھوڑی دیر کے لئے گئی تھی۔ اگر کچھ دیر اور نہ آتی تو میرا خیال ہے ڈر کے مارے تیرا دم نکل جاتا" انہوں نے اُسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

ڈرتے ڈرتے اُس نے سب کی طرف دیکھا۔ اب تو عابد بھائی بھی سامنے صوفہ پر براجمان تھے۔ ایک ہاتھ میں سگار۔ دُوسرے میں اخبار۔ یوں انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ جیسے وہ نہ کسی کی سُن رہے ہیں۔ نہ سننے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سبھی وہاں موجود تھے۔

امجد بھائی ——

عابد بھائی ——

ساجد بھائی ——

تو پھر یہ حرکت کس کی تھی۔ ؟

بار بار اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ عابد بھائی سے پوچھے :

قرض چکانے کا یہ کونسا انداز تھا جی !

مگر وہ کیسے کہے۔

رات گئے تک وہ اپنے ہی واہموں سے جھگڑتی رہی۔ غصّہ سے کھولتی رہا

اس گتھی کو سلجھاتی رہی۔

مگر جب نیند لانے کی خاطر اُس نے اپنے آئیڈیل کیسا تھ آنکھ مچولی کھیلنی چاہی

تو وہ فولادی بازو ——

اور جنڈی ہونٹ ——

خود بخود اُس کے تصور میں آگئے۔

نیند سے پہلے وہ رومان کی دُنیا میں تھی۔

فیضی آپا کی دُنیا کچھ اور ہی دُنیا تھی۔ اُن کی جاندار محفلوں میں بیٹھ کر —— سجّو کے اُوپر یے ایسے انکشافات ہوتے کہ اُسے اکثر یوں محسُوس ہوتا کہ وہ کسی چوراہے پر کھڑی ہے اور اُس کے لئے ایک سمت کو اختیار کر لینا انتہائی مشکل امر بن چکا ہے۔ مگر ایک ت ہے۔ اُن کی محفلوں میں ذہن و دِل کو جو جلا ملتی تھی اُس سے بڑا لطف آتا تھا۔

اُن کی محفل میں مردوں کو بے بھاؤ کی سنائی جاتی تھیں۔ اور طرح طرح سے دِل کے جلے پھپھولے پھوڑے جاتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ فیضی آپا کی زیادہ تر سہیلیاں طلاق زدہ تھیں —— باقی ماندہ جو تھیں وہ یا تو اپنے شوہروں سے ازحد باغی تھیں۔ یا پھر طلاق لینے کے مراحل سے گذر رہی تھیں۔

وہ لوگ ایسا شوقیہ کرتی ہیں۔ یا واقعی اُن پر اتنے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ سجّو کو ابت کبھی سمجھ نہ آئی۔ اُسے یوں لگتا کہ فیضی آپا کا ڈرائنگ رُوم طلاق شدہ خواتین یا طلاق کی شوقین خواتین کا ایک کلب ہے۔

یا پھر فیضی آپا انہی عورتوں سے دوستی رکھتی تھیں جو اپنے شوہروں اور بچوں سے متنفر ہوں۔ اور کھُلم کھُلا اس نفرت کا اظہار بھی کرتی ہوں فیضی آپا کی اپنی زندگی اس حقیقت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کا ایک بیّن ثبوت تھی۔

یوں تو فیضی آپا کا اصلی نام فیاض اختر تھا۔ مگر انہوں نے بھی گلبرگ میں رہائش اختیار
کے بعد وقتی تقاضوں کے تحت اپنا نام "فیضی حسین" رکھ لیا تھا۔

"فیضی حسین" ایک زمانے میں یونیورسٹی کی نہایت شوخ و شنگ اور دلنواز لڑکی تھی۔
نئے تجربات کا اُسے بہت شوق تھا۔ نوازنا وہ جانتی تھی۔ ٹھکرانا اُس کی فطرت نہ تھی۔ ایسا
چند دنوں میں مشہور و معروف ہو گئی۔ اُس کی مسکراہٹوں کے موتی کسی بھی کالر پر سج سکتے
بشرطیکہ طلبگار کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہو۔ اپنی ہر دلعزیزی کے جلو میں اُس نے اکنامکس
میں ایم اے کر لیا۔ اور ساری کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی۔ جب تک کلاس کے کچھ عاشق
واویلا مچاتے وہ اسکالرشپ لے کر "ہائر اسٹڈیز" کے لئے امریکہ روانہ ہو چکی تھی۔

اپنی خوشی سے وہ وہاں پانچ سال رہی۔ واپس لوٹی تو ایک بینک میں ملازمت کر لی
وہاں وہ زندگی کی جن اعلیٰ اقدار کو چھوڑ کر آئی تھی۔ اُس کے رہن سہن سے ہی پتہ چلتا تھا۔
ہوتے وہ اپنی ایک ذاتی کار بھی لے آئی تھی۔ کرنی زمانہ کار کے بغیر کوئی "کاروبار" یا "ملازمت"
چل سکتی۔ اب وہ اتنی معصوم اور بچی تو نہ تھی کہ گھر والوں کی طرف سے۔ یا سوسائٹی کی طرف
اس پر غیر ضروری پابندیاں لگائی جاتیں —— ایسی قابل، خود مختار اور فخرِ زمانہ خاتون کو
مستقبل کا ساتھی چُن لینے کی بھی اجازتِ خاص تھی۔ جب شہر کے کئی متموّل اور امیر نوجوان
انٹرویو دے کر وہ تھک گئی۔ تو انجام کار اُسے ایک خوبرو اور امیر نوجوان بھا ہی گیا۔ جو بینک
میں اس کا اپنا کلائینٹ بنا تھا۔

شادی ہو گئی۔ ہنی مون کے لئے دونوں جنّت ارضی یعنی سوئٹزرلینڈ کو سدھارے۔
چھ مہینے بعد لوٹے تو اس عالم میں —— کہ

جو ممکن ہو تو لوٹا دو مری آہیں مرے نالے

کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وجہ دریافت کرتا۔ اس تجرباتی دُنیا میں —— جب تجربہ ناکام

تو توڑ دینا چاہیئے۔

طلاق بھی شادی کی طرح بڑی جلدی اور بطریقِ احسن انجام پائی یہ تب کسی نے دخل دیا تھا
نہ اب کسی نے باز پُرس کی۔

اب فیضی آپا تھیں اور اُن کی سگریٹ نوشی —— ! شادی کو وہ خودکشی کہتیں۔ اور بار بار
خودکشی کی کوشش کو حماقتِ عظمیٰ کا نام دیتیں —— !

انہوں نے دوبارہ بینک میں ملازمت کر لی تھی۔ اُن کی اپنی کار تھی۔ خوبصورت اور دیدہ زیب
پوشاکیں تھے —— زیادہ تر "امپورٹڈ" چیزیں استعمال کرتی تھیں۔ یہ انہیں کون لا کر دیتا تھا۔
ذرا معصوم —— ؟

چونکہ انہیں مردوں سے نفرت تھی۔ اس لئے انہیں مردوں سے آزادانہ میل جول رکھنے
کی اجازت تھی۔ کوئی اُن کا کیا بگاڑ لے گا —— ؟ آگ سے کھیلنے والا اپنا ہی دامن تو جلاتے گا۔
ان کی عادت بن چکی تھی کہ جہاں بیٹھتیں —— مردوں کو بے نطق سُناتیں۔ اور عورتوں کو شادی
سے متنفر کرتیں۔

نہ جانے کہاں سے انھوں نے —— چُن چُن کر اپنی ہم خیال عورتوں کو سہیلیاں بنا لیا
تھا۔ اتوار کے اتوار —— جب یہ "کافی پارٹی" یا "برج پارٹی" پر اکٹھی ہوتیں۔ تو سجّو اگر گل
گلشن میں ہوتی تو ضرور ان کی محفل میں جا بیٹھتی۔ ایسی ایسی طرحدار اور بانکی بیگمات آتیں کہ
تم انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی۔ مگر سجّو کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہ آسکی کہ اتنے خوبصورت
پوشاک پہننے والی خواتین در پردہ اتنی ناآسودہ کیوں ہیں؟ شکل و صورت بھی۔ اللہ نے دی
تھی۔ ذہن بھی، اخلاق بھی —— اور تعلیم یافتہ بھی تھیں —— تو کیا اُن کے شوہر
نہیں تھے —— یا اتنے ہی سفّاک —— جس کو دیکھو زبان پر شوہر کا شکوہ۔ ہر عورت
اپنے آپ کو دنیا کی مظلوم ترین عورت کہتی تھی، مگر اُن کے غمزوں سے اور کھنکھناتے قہقہوں سے
یوں معلوم ہوتا۔ جیسے اُن سے بڑھ کر کوئی خوش فکر اور خوش قسمت دنیا میں ہے ہی نہیں ——

سجّو بے چاری اکثر حیران ہوتی۔ مگر پھر بھی جب وہ گرما گرم پکوڑوں کے ساتھ

شروع کرتیں ـــــــ تو سجّو کافی کی پیالیاں پکڑانے کے بہانے اندر چلی جاتی۔

وہ کبھی مرد کی دوغلی فطرت پر بحث کرتیں۔ کبھی مرد کی کوتاہ نظری اور کم ظرفی کے

بیٹھتیں۔ ایک خاتون اُن میں بہت چرب زبان تھی۔ وہ فیضی آپا کی مشیر خاص

اُس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شوقیہ چار شوہر بدل چکی ہے اور آج کل ایک بار پھر

تجربے کی توانائی حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

اُس کا نام نازنین تھا۔ وہ محفل میں جب زبان کھولتی تو سب کو ہاں کہتے بنتی۔

شافو بے چاری نے ان عورتوں کی دیکھا دیکھی طلاق تو لے لی تھی۔ مگر اس کے دل

ہر وقت اس کی آنکھوں سے جھانکا کرتا۔ بات بات میں وہ رو پڑتی اور ساری عورتیں مل کر اُس

مذاق اُڑاتیں۔

"کم بخت! تیری تو وہ پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت کاروبار کا عذر دے کر باہر

تھا۔ تجھے بھی وہ گھر کا ایک مُلازم ہی سمجھتا تھا۔ شکر کر کہ اس خود غرض کے چنگل سے آزاد ہو

مگر شافو ہمیشہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی۔ "تم کیا جانو؟ اس اسیری میں کتنی لذت تھی؟ اور

آزادی میں کیا کیا دُکھ ہیں ـــــــ"

"چل بک بک نہ کر۔" غزالہ سگریٹ کا کش لیتے ہوتے کہتی۔ "زندگی ہونی چاہیے!

دُنیا میں اچھے سے اچھا مرد مل سکتا ہے۔ بتا شادی کرادوں تیری ـــــــ؟"

پر شافو کانوں کو ہاتھ لگانے لگتی۔

"ہاں ہاں اگر اس کے اس لم ڈھینگ نے شادی نہ رچالی ہوتی تو یہ اب تک اُسی کے

پاس لوٹ جاتی۔"

"کیوں شافو ـــــــ؟" کوئی ٹہوکا دیتی۔

"بھئی آخر تم سب میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟ اور بھی تو یہاں لوگ ہیں۔"

اشارہ کرتی اور سب عورتیں قہقہے لگا کر ہنسنے لگتیں۔

"شافو بی! ہم تمہاری طرح چھپا نہیں رہے۔ بلکہ اپنی آزادی کو انجوائے کر رہے ہیں۔"

"آزادی ـــــــ آزادی ـــــــ

آزادی کیا ہوتی ہے ـــــــ؟

کبھی کبھی دُور کونے میں سلائیاں بُنتی ہوئی راضی آپا چیخ اُٹھتیں ـــــــ

"اِن عورتوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں۔ عورت کی آزادی اور خود مختاری یہی ہے کہ وہ

مرد کی تابع رہے۔ وہ اس کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرتا رہے اور گھر کی مالکہ بنا کر رکھے ـــــــ تم

جس کو آزادی کہہ رہی ہو، میں اُسے بے راہ روی اور بے جا مطالبات کہتی ہوں۔"

ہا... ہا... ہا ـــــــ قہقہہ اُمنڈ پڑتا۔

"راضی آپا نے پھر گوہر افشانی کی۔" نازنین پتّے پھینٹ کر اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لے

کر کہتی۔

"پڑھے نہ لکھے اور نام محمّد فاضل ـــــــ"

"جس دشت میں آپ نے قدم نہیں رکھا۔ اُس کی اُونچ نیچ آپ کیا جانیں؟"

"راضی آپا! آپ بس چولہے کا حساب کتاب ہی رکھا کریں۔ اس ضمن میں آپ کو ضرور تجربہ

ہوگا۔ مگر مردوں کے معاملے میں ـــــــ میں اتھارٹی ہوں۔"

"اس لئے کہ تم چار شوہر کر چکی ہو۔" راضی آپا جل کر کہتیں۔

"بے شک!" نازنین فخر سے گردن اُٹھا کر کہتی۔ "اور یہ صرف میرا ہی حوصلہ ہے کہ چار مرتبہ

بلا تعنی خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے اور صاف بچ نکلی ہوں۔"

"اور اب ماشاء اللہ پانچویں بار..." کسی طرف سے ایک آواز آتی۔ اور سارا کمرہ قہقہوں

سے گونج اُٹھتا۔

کھسیانی ہونے کی بجائے۔ نازنین کش لے کر بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہتی۔ "انشاء اللہ"

توساری محفل پہ گھڑوں پانی پڑ جاتا۔

راحتی آپا کھسیا کر یا شاید جل کر باہر نکل جاتیں۔ تو نازنین پھر لیکچر دینا شروع کر دیتی۔

"یہ مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ ان کا واحد علاج یہ ہے کہ ان کو جوتی کی نوک پر رکھو۔ تم اُن کے پیچھے پیچھے بھاگو گی۔ ان کے تلوے چاٹو گی۔ ان کی خوشنودی کے لئے اپنا خُون بھی بہا دو گی۔ تو یہ کبھی تمہاری پرواہ نہیں کریں گے۔ ہاں البتہ تم پرواہ نہ کرو۔ اُن کے آگے آگے بھاگو۔ اُن کو دُور سے للچاؤ۔ تو دیکھو کس طرح تمہارے بے دام بنے نظر آئیں گے ہاں بالکل دُرست!"

"تبھی تو یہ گھروں میں اپنی شریف اور مسکین بیویوں کی پرواہ نہیں کرتے اور باہر کی تتلیوں کے پیچھے پاگل کتوں کی طرح دوڑتے ہیں" کوئی جواب میں کہتی۔

"اور اگر ان کو باہر کی آوارہ اور آبرو باختہ عورتیں ہی لبھا سکتی ہیں۔ تو پھر ان کی بیویاں ہی یہ رُوپ کیوں نہ دھار لیں"

"ہیئر... ہیئر...." نازلی تالی بجاتی۔

"اب ہماری بچیاں بالغ ہو رہی ہیں"

پھر تو بحث اپنے عروج پہ پہنچ جاتی اور چاروں طرف سے کچھ اس قسم کی پُرجوش آوازیں آنے لگیں۔

—— مرد عورت کی آزادی کا کبھی قائل نہ تھا —— نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ نہ ہی دل سے اس کے مساوی حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔

—— اُس نے ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

—— جس باپ کی بیٹی اُسے کما کر کھلاتی ہے۔ وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی وکالت خوانی کرتا ہے۔ جس بھائی کو اس کی جوان بہن اپنی جوانی کا تیل نکال کر پڑھاتی ہے اور اس کے جائز و ناجائز اخراجات برداشت کرتی ہے۔ وہ بھائی چونکہ خود سوسائٹی کا عضو معطل ہے

...ں نے عورت کے مساوی حقوق پہ لیکچر دیتا ہے۔ جس شوہر کو بیوی کی کمائی کی لت پڑ ...الی ہے۔ وہ عورت اور مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے کی پُرزور حمایت کرتا ہے اور جن گھروں ...یا ایسے مسائل نہیں ہیں۔ باپ، بھائی یا شوہر نے۔ عورتوں کو زندگی کی کچھ سہولتیں دے ...کھی ہیں۔ وہ ہر قدم پہ ان سہولتوں کی قیمت وصُول کرتا ہے۔ ہر موڑ پہ اس پہ پابندیاں ...لگائی جاتی ہیں۔ باپ اُسے پردے میں رکھ کر، بھائی اس کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کر کے، اور شوہر اسے بچوں اور اپنی خدمت میں اُلجھا کر اپنی اپنی قیمت وصُول کر لیتے ہیں۔

—— عورت بھولی ہے۔ ہر موڑ پہ مرد کے فریب میں آجاتی ہے۔ اور اُسے ...نی فطرت کا تقاضا سمجھ بیٹھتی ہے۔

—— کیا یہ آزادی ہے؟

—— عورت غریب کو چار دیواری سے نکال کر بوجھ لادنے والا بیل بنا دیا گیا ہے۔ اب گھریلو ذمّہ داریاں انجام دے اور پیسہ بھی کما کر لائے۔

—— اور وہ بے چاری کبھی خوشی سے اور کبھی بہ مجبُوری یہ بوجھ اُٹھائے چلی جا رہی ہے۔

—— ہاں ہاں! جو مرد عورتوں سے معاشی ذمّہ داریوں کا بوجھ نہیں اُٹھواتے ...گز دیکھو تو سہی —— انہیں ذہنی اور جسمانی کیسی کیسی اذیتیں دیتے ہیں۔ اور پھر چاہتے ہیں ...ٹی ٹکڑوں کے عوض وہ ان مشقتوں کو چُپ چاپ سہتی چلی جاتے۔

—— عجیب بات ہے۔ اندر بیٹھنے والی سِسکتی ہوئی مجروح عورت ...ر —— باہر رہنے والی عورت پر رشک آتا ہے۔ اور باہر کی دُنیا میں ذلیل و خوار ہوتی ...ئی عورت اندر بیٹھ کر راج کرنے والی عورت سے جلتی ہے۔

—— عورت کے لئے ہمارا معاشرہ سازگار ہی نہیں ہے۔ یہاں اس کو ...تو مقام نہیں مل سکتا جو دوسرے ممالک میں عورتوں نے حاصل کر لیا ہے۔ یہاں تو اُسے دُون

صورتوں میں نیچ اور کم تر ہی سمجھا جاتا رہے گا۔

——— کیا آزادی دے رکھی ہے مرد نے عورت کو ——— واویلا ہے
عورت آزاد ہوگئی ہے۔ جہاں جہاں بھی اُسے آزادی دی ہے۔ فقط اپنے نفس
دی ہے۔

——— ایک صدی پہلے جب عورت اور بوڑھا ایک ہستی کے دو نام
مرد کوٹھے پر جاتا تھا۔ ولایتی میم لاتا تھا۔ اُسے گٹ پٹ کرنے والی گڑیا چاہیئے تھی
چلانے والی حسینہ کو پہلو میں بٹھانا چاہتا تھا۔ اُسے رات کے گھُپ اندھیارے میں
کی بُو میں بسی ہوئی عورت کا بے معنی حجاب ناپسند تھا۔ اُس کی باغی نگاہوں کی
اُٹھی۔ اپنا حق پامال ہوتا دیکھ کر اُسے جھرجھری آگئی۔ اُس کی نیند کھل گئی۔ مرد طوائف
کیوں کرتا ہے۔ اور وہ ولایتی گڑیا کا دیوانہ کیوں ہے۔ جلد ہی یہ دو باتیں عورت کی سمجھ
انھی کی روشنی میں اُس نے اپنی منزلِ مقصود متعین کرنے کی ٹھان لی۔ تعلیم حاصل کی
سیکھے۔ نئے طور طریقے اپنائے۔ مرد کی ہوس گیری کے رموز و اسرار سے خود کو آشنا

اور اب ——— اب اس مکار مرد کو اپنی بیوی کے مقابلے میں اپنی ماں، نانی اور
یاد آجاتی ہے۔ یہ وہی بزرگ ہستیاں ہیں۔ جن کے سفید سروں پر ان مردوں نے بارہا
ڈالی۔ ایک دن کی بیاہی عورتیں کنواری بیوائیں بنیں زندگی بھر اُن کے کوٹھے سے
یا ولایت سے پلٹنے کے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ لیکن آج انہیں اِن خود غرض اور نفس
مردوں کو اپنی روشن خیال و تعلیم یافتہ بیویاں بُری لگتی ہیں۔ اُن کو جلانے کے لئے ان
ہستیوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جن کی قبروں سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا ہوگا۔
بے بات اپنی ماں یا نانی اُن کو یاد آجاتی ہے۔ کوئی موقع ہو جھٹ بیوی کو طعنہ دیں
اور کہیں گے:

"ایک ہماری ماں تھی، دس بچوں کے ساتھ گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ تمہارے پاس

ذکر ہیں پھر بھی سارا دن چلاتی ہو۔ ایک ہماری دادی تھی جس کی ساری جوانی چولھے
ہوئی۔ مگر پلٹ کر کبھی ہمارے دادا سے شکوہ نہ کیا۔"

شکوہ کیسے کرتی وہ ———؟ زبان تو ان لوگوں نے پہلے دن ہی سُرخ سلاخوں سے
داغ دی تھی اور ماں دس بچوں کے ساتھ چولھے میں کیوں نہ فنا ہو جاتی۔ جب میاں کی شکل
پہلے بھی دیکھنی نصیب ہوتی تھی نہ زبان کھولنے کی اس غریب کو اجازت تھی نہ فریاد کی۔

——— اور بے چاری کہتی بھی تو کس سے جب والدین نے روایتی انداز میں
کہا اس گھر میں تمہاری ڈولی جا رہی ہے۔ وہاں سے اب تمہارا جنازہ اُٹھے گا۔ ہم نے
تو ہی فاتحہ پڑھ لی ہے تمہاری"

——— اس بات سے مرد کو شہ ملتی یا نہ ——— جو عورت صرف مرنے
کے لئے اس گھر میں آئی ہو اُسے تو وہ سو سو طرح سے، اور لاکھوں بہانوں سے مارے گا۔
صدیوں سے مار رہا ہے یہ مرد عورت کو۔

——— اور تمہارا خیال ہے، اب یہ لوگ کم کرتے ہیں۔ ان کی فطرت میں تو فرق
نہیں آیا۔

——— ان کی نئی مکاری ملاحظہ ہو۔ اب مرد کس خوش اسلوبی سے فرماتے ہیں
ہمیں تو وہی پرانے زمانے کی کم گو، کم تعلیم یافتہ اور گھریلو عورت پسند ہے۔ اب اعلیٰ تعلیم یافتہ
اور فیشن ایبل خاتون اُن کے کام کی نہیں۔

گویا آپ نے اب پھر عورت کو ایک اور زاویئے سے جُل دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس
زمانے کی عورت اُن کے مکر و فریب کو بہت حد تک سمجھنے کے قابل ہوگئی ہے۔ پر کوئی
پوچھے کہ عقل کے اندھو! اس پرانے زمانے کی بے زبان کو یہ جوا کس نے پہنایا؟
تمہارے ظلم و ستم نے نا؟ ——— اس وقت وہ عورت نظروں میں ناچیز تھی۔ اب یہ
نظروں سے گر رہی ہے۔ تم اپنا دماغ درست کیوں نہیں کرتے۔

———— نہیں جی! عورت کو بُرا بھلا کہنے کا مرد کو کوئی بہانہ چاہیئے۔ اسے عورت میں ہر پہلو سے کوئی نہ کوئی بُرائی ضرور ڈھونڈ لے گا۔ خواہ وہ گھریلو عورت ہو یا بازاری

————عورت پر الزام تھوپنا تو اُسے ورثے میں ملا ہے۔ غالباً اس طرح ہر دور کی عورت کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔

———— جی نہیں! عورت کو بُرا بھلا کہہ کر یہ اپنے احساسِ کمتری کو تسکین دیتا ہے۔ کیونکہ عورت جیسی بھی ہے، ہر زمانے میں اُس کی کمزوری رہی ہے۔ اسے انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ اُس کی ہر فطری کمزوری سے واقف ہے۔ اس لئے مرد نے ہر محفل میں عورت کو کم تر اور بُرا بھلا کہنے کا رواج بنا لیا ہے۔

———— اور تو اور ———— اس صدی کی عورت نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف مرد کے شانہ بشانہ چل سکتی ہے۔ بلکہ چاہے تو کئی میدانوں میں مرد کو پیچھے چھوڑ سکتی ہے۔

————اور یہ اپنی ہزار کوششوں کے باوجود ایک بچہ بھی نہیں جن سکتا۔

(زبردست قہقہہ)

ایسی پُر زور بحثوں اور ایسے زبردست قہقہوں کے بعد اکثر محفل درہم برہم ہو جاتی۔ اس کے بعد مُعزّز خواتین مغلّظات پر اُتر آتیں۔ اور پھر اپنی ڈفلی۔ اور اپنا اپنا راگ الاپتیں اپنے اپنے ٹھکانوں کی راہ لیتیں۔ اتنی بے شمار و پُر جوش اور وزن دار آوازیں سُن کر سجو کے دل میں ہلچل مچ جاتی۔ جب تک وہ ان کی محفل میں بیٹھی رہتی۔ اندر سے کھولتی رہتی۔ اسے بالکل محسوس ہوتا کہ یہ مرد انتہائی حقیر اور ذلیل مخلوق ہیں۔ یہ صرف ظلم کرنے اور عورتوں کے جذبات پامال کرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ دُنیا میں اگر کوئی اعلیٰ و ارفع ہستی ہے تو وہ عورت ہے۔ آج کی عورت کو چاہیئے کہ وہ مرد۔ سے جنم جنم کا بدلہ لے لے۔ اُسے ٹھکرا دے اور ذلیل کرے تاکہ وہ پھر اُسے کچلنے کے قابل نہ رہے۔ پھر جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جاتی اپنے آرام دہ بستر پر لیٹتی تو وہ پھر وہی پریوں کی شہزادی والی سجّو بن جاتی۔ جو کسی انجانے بہادر، اور خوبرو شہزادے کے انتظار میں پلکوں کا پنجرہ کھولے ہمہ تن انتظار بنی پڑی ہو۔ جب سبھی مَرد ذلیل ہوتے ہیں۔ سفّاک اور ظالم ہوتے ہیں۔ عورت کی محبت کے قدردان نہیں ہوتے۔ ہوس پرست اور فریبی ہوتے ہیں تو پھر یہ کون ہے۔ تم جس کے خواب دیکھ رہی ہو ———— جو تمہارے دِل میں دھڑک رہا ہے۔ پہلو کو حرارت پہنچا رہا ہے۔

کیا یہ اُن مردوں سے مختلف ہے۔ یا کوئی آفاقی پیکر ہے؟

یہ ..... یہ

سجّو گھبرا اُٹھتی!

یہ پیکر تو ساری دُنیا سے نرالا ———— انوکھا، اور وفادار ہے۔ اس کو تو اللہ نے صرف میرے لئے بنایا ہے اور میرے لئے بھیجا ہے۔ یہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔

یہ میرا ہے۔

ہائے اس کا تصوّر کئے بغیر، اُس کو حاصل کئے بغیر زندگی کیسے مکمل ہو گی ————؟

نیند آنے تک سجّو ان ماڈرن خواتین کی تمام لایعنی باتیں، بھول چکی ہوتی ———— دو مضبوط بازو اُسے اپنے ہالے میں لے لیتے۔ اور مستی میں چُور دو آنکھیں اس کے انگ انگ میں چنگاریاں بھرنے لگتیں۔

اور جانے کب وہ سو جاتی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ساجد بھائی بھی اللہ کی عجیب مخلوق تھے۔ اوّل تو سجّو کو اُن کی شخصیت میں کوئی ایسی با
نظر نہیں آئی تھی کہ اُن پر غور کرنے کو جی چاہتا۔ دوسرے۔ اُن کا روّیہ، طور طریقے اور رہن سہ
کچھ پُراسرار تھا اور اس پُراسراریت سے سجّو نفرت کرتی تھی۔ حالانکہ وہ دونوں بھائیوں سے
چھوٹے تھے مگر اُن کا چہرہ اُن دونوں کی نسبت بہت کرخت تھا۔ سر کے بال بھی اُڑ چکے تھ
بس کھوپڑی کے کناروں پر ایک جھالر سی رہ گئی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرار تھے۔ صبح کو ا
اپنی سُرخ رنگ کی فوکس ویگن پر گھر سے نکلتے۔ اور رات کو گھر واپس آتے۔

ان کے پسندیدہ مشاغل ہمہ وقت سگریٹ پینا اور جوان لڑکیوں کو گھورنا تھے۔ گھورنے
بھی عجیب انداز میں تھے۔ ادھر گھر میں کوئی لڑکی یا خوبصورت عورت داخل ہوئی ادھر انہوں نے
سگریٹ مُنہ کو لگا لیا اور دھوئیں کے بادل چہرے کے ارد گرد پھیلا کر اُن کی اوٹ سے ا
نووارد کو تاڑتے رہتے۔ کسی نہ کسی بہانے ادہر اُدہر۔ اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے
ایسے لگتا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں موصوفہ کو نگل جائیں گے۔ کھا جائیں گے۔

سجّو کو اُن کی یہ عادت، یا گُرسنہ نگاہی زہر لگتی تھی۔ چلو جی مانا! کہ خوبصورت عورتوں
اور جوان لڑکیوں کو تاکنا ہر مرد کی سرشت میں ہے۔ مگر یہ سب بھی کسی ڈھنگ اور پُروقار

اس طرح للچائی نظر سے دیکھنا جس طرح ایک فاقہ مست مرغن کھانوں
ے کیا جا سکتا ہے۔
ن دیکھتا ہے۔
ال ٹپکی پڑتی ہے۔
چھی چھی....
سجّو کو اُبکائی آجاتی۔
خبر نہیں بعض مردوں کا مافی الضمیر اُن کی آنکھوں سے کیوں چھلکنے لگتا ہے؟
سجّو جب بھی چھٹّی پر "گُل افشاں" میں آتی۔ اسی کوشش میں رہتی کہ نہ تو ساجد بھائی کا
سامنا ہو اور نہ بغیر ضرورت کے اُن سے بات ہی کرنی پڑے۔
اور جو کبھی شامت کی ماری اکیلے میں اُن کے ہاتھ آ جاتی۔ تو اُسے یوں محسوس ہوتا کہ اُن
کی کھا جانے والی نظروں نے اُس کے تن کے کپڑے ریزہ ریزہ کر دیئے ہیں اور اب یہ تیکھی
نظریں اس کے کورے بدن کے آر پار جا رہی ہیں۔
اِتنے اچھّے ـــــ من موہنے ـــــ سُندر سیرت ـــــ بہن بھائیوں میں
... یہ کیسے خبیث ہیں؟
سجّو دل ہی دل میں سوچا کرتی!
بھلا عابد بھائی کا اُن سے کیا مقابلہ ـــــ؟
وہ تو مسجد کا اُونچا مینار لگتے ـــــ اور یہ ـــــ بدرُو ـــــ!
سب کے سامنے وہ سجّو کے ساتھ بڑی بے نیازی سے پیش آتے۔ مگر تنہائی میں
لگتا جیسے قدموں تلے بچھ ہی تو جائیں گے۔
منافق!
سجّو کی تیوری چڑھ جاتی۔ ایک تو اُن کے دانت اتنے بھدّے اور بدوضع تھے۔ خیر
کثرتِ سگریٹ نوشی سے یا ـــــ وہسکی پینے کی وجہ سے اُن کے دانت کنھّے کے

رنگ کے ہو گئے تھے۔ ہنستے تو اُن کی سیاہ دلی اور بھی واضح ہو جاتی۔

اُن کے متعلق تو یہ بھی مشہور تھا کہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ خوب فلرٹ کرتے تھے۔
پتہ نہیں کونسی عقل کی اندھی لڑکیاں ہوں گی جو اُن کے ساتھ چل پڑتی ہوں گی۔
سنجو خود بخود کھولنے لگتی۔

یہ لڑکیاں بھی نری احمق ہوتی ہیں۔ بعض اوقات گدھے کو ہیرو سمجھ بیٹھتی ہیں۔

سنجو کی برہمی اور اکتاہٹ سے ساجد بھائی بے خبر نہیں تھے۔ اُس کی بدلتی رنگت۔
بے زار لہجہ ——— اور چڑھی ہوئی تیوریاں۔ اُس کی دلی کیفیت اُن پر عیاں کر چکی تھیں۔
پر نہ جانے کیوں ——— جب بھی وہ سنجو کی جانب دیکھتے ان کے انداز میں طنز
تضحیک کے عنصر نمایاں ہوتے۔ جیسے ٹھٹھا لگانے والے ہوں۔

کیوں ——— ؟

کیوں ——— ؟

کیوں ——— ؟

شیخ محمد حسین کے بعد سنجو کو شیخ ساجد حسین کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا۔

پُراسرار ———

معنی خیز ———

غلیظ ———

مگر طنز میں ڈوبی ہوئی آنکھیں!

جینی کا اصل نام "جنت الفردوس" تھا۔ مگر جب سے وہ کونونیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ اِس کا نام بھی اُس کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ پہلے پہل تو کونونیٹ کی لڑکیوں نے اپنے بگڑے ہوئے لب و لہجے میں اسے "جے نٹ" کہہ کر بلانا شروع کیا پھر رفتہ رفتہ وہ "جینی" بن گئی۔

"جینی حسین" اِس گھر میں سب سے پیاری لڑکی تھی۔ شکل و صورت میں بھی اور عادات و اطوار میں بھی ——— گُلِ نوشگفتہ کی سی رنگت ——— خوبصورت غزالی آنکھیں - مسکراتے ہوئے لب ——— درمیانہ قد ——— متناسب اعضاء اور کندھوں تک لٹکتے ہوئے گھنے بال ——— یُوں لگتا جیسے جوانی اپنی رعنائیاں اور قیامت خیزیاں صرف اسی پر لٹا رہی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ سب بہنوں سے پہلے اُسے بَر مِل گیا تھا۔ مِل کیا گیا تھا۔ اُس نے خود تلاش کر لیا تھا۔

بی اے کرنے کے بعد اُس نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ پتہ نہیں اسے وکالت پڑھنے کا شوق کیوں چرایا۔ مگر شوق نے اُس کا دِل چُرا لیا۔ سُلطان اس کا کلاس فیلو تھا بیشاور

کے ایک معزز پٹھان خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

دل ملے تو دونوں نے پیمانِ وفا بھی باندھ لیا۔ جینی کے گھر والوں کو اس رشتہ پہ کوئی اعتراض نہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے قانونی طور پہ نکاح کی اجازت دے کر اس کو اور مضبوط کر دیا۔

نکاح کے بعد جینی اور سلطان زیادہ تر اکٹھّے رہتے۔ کچھ پتہ نہ چلتا جینی کب اپنے گھر ہوتی ہے۔ اور کب غائب ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر سلطان کے اسکوٹر پہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی ملتی۔ گھر آتے تو دونوں اکٹھے۔ گھر سے جاتے تو دونوں اکٹھّے۔

بیچز ـــــ ریستوران ـــــ پکنک ـــــ بازار ـــــ ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ملتے۔

سجّو کو ان دونوں پہ بہت رشک آتا۔

کتنی بے مثال جوڑی تھی۔

سلطان جب جینی کی طرف دیکھتا تو یوں کہ ساری دنیا کا پیار اُس کی آنکھوں میں سمٹ آتا۔

کیسی ہی حسین لڑکی اُس کے پاس بیٹھی ہو۔ جینی کی موجودگی میں وہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

اور جینی کو چاہیئے تھا کہ ایسے خوبصورت ساتھی کا بے لوث پیار پا کر بے حد مغرور ہو جاتی مگر نہیں ـــــ وہ اسی طرح ہنس مکھ اور لاابالی لڑکی تھی۔ اُس کی ہر ادا سادگی سے پُر اور پیاری تھی۔ ہنستی رہتی۔ لطیفے سناتی رہتی ـــــ چیونگم چباتی رہتی ــ

سلطان اُس پہ پروانہ وار نثار ہوتا تھا۔

کبھی کبھی وہ رات کو بھی گھر نہیں آتی تھی اس روز لیٹ شو کا پروگرام ہوتا۔ تو وہ سلطان کے پاس ہی ٹھہر جاتی۔ گھر صرف فون کر کے اطلاع دے دیتی۔

پٹھان فیملی بھی اُسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتا ـــــ۔

کتنے اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔

شرعاً تو نکاح ہی اصل شادی ہوتی ہے۔

اب وہ دونوں اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کرتے رہتے ـــــ کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈ کر اسے سجانے کا پروگرام بناتے۔

سجو کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دونوں ہنی مون منا رہے ہوں اور جو شادی سے پہلے یہ عالم ہے تو یہ لوگ ہنی مون کے زمانے میں کیا کریں گے۔

سجو کو اس قدر رشک آتا کہ ـــــ اُس کا دل چاہتا کہ ایک دم جینی کا روپ دھار لے ـــــ اور اس کا شہزادہ سلطان کے روپ میں چاہتوں کے بیکراں سمندر لے کر اس کی دُنیا میں چلا آئے۔ مگر وہ تھا کون ـــــ؟

"اُمۃ الحفیظ" عرف "ڈولی حسین" گل افشاں کی ایک ایسی کہانی تھی۔ جو دلچسپ
ہوتی ہے اور بیزار کُن بھی! مگر سجّو اکثر اس سے بیزار ہو جاتی۔ اس کی حرکتیں
کے طور طریقے۔ اس کے معمُولات۔ کبھی سجّو کی سمجھ میں نہ آسکے۔

اسے اُس کے قریب رہ کر اُلجھن سی ہونے لگتی۔

مگر وہ اس کا اظہار نہ کر سکتی۔ کیونکہ ڈولی ہی کے توسّط سے تو وہ اس
سے آشنا ہوئی تھی۔ اگر ڈولی سے اس کی دوستی نہ ہوتی تو وہ زندگی کی اس خو
روشنی کو ترستی رہ جاتی۔ اُس کی زندگی تاریک سیاہ ہوتی۔ اور پڑھ لکھ کر بھی وہ
گنوار ہی رہتی۔

نہ جانے میٹرک پاس کرنے میں ڈولی نے کتنے سال لگائے۔ لیکن اتنا ضرو
کہ وہ لاہور کے تقریباً سبھی اسکُولوں سے آشنا ہوگئی۔ ہر سال فیل ہونے کے بعد
کے ساتھ اپنا "ہیر اسٹائل" بھی بدل لیتی۔

بالآخر وہ پاس ہوگئی۔ یا شاید بورڈ والے بھی اُسے فیل کر کر کے تھک گئے
کالج میں داخل ہونے کا اُسے بہت شوق تھا ——— مگر پڑھنے کا نہیں

ت نئے فیشن اپنانا۔ نئے نئے "بوائے فرینڈز" بنانا۔ پکچرز دیکھنا۔ اور شاپنگ کرنا
کے بہترین مشاغل تھے۔

وہ اور سجّو دونوں اب سیکنڈ ایئر میں تھیں۔ ایف اے کا پہلا سال بھی ڈولی نے سجّو کے
ہی کے سہارے ہی پاس کیا تھا۔ اور فائنل میں بھی اُسے اُمید تھی کہ سجّو ہی کوئی چارہ کرے گی
گھر میں چُونکہ جمہوریت کا راج تھا۔ اس لئے ڈولی بھی اپنے قول و فعل میں بالکل آزاد تھی۔
بالکل بے مہار تھی۔ یہ سارا گھرانہ کبھی کبھی سجّو کو عجیب و غریب گھرانہ لگتا۔ کبھی تو اُسے یوُں
محسوس ہوتا کہ یہ بھانت بھانت کے جانوروں کا ایک چڑیا گھر ہے۔ اور کبھی صرف رین بسیرا
لگتا کہ ہر کوئی رات گذارنے کے لئے چلا آرہا ہے۔

تاہم زندگی کے تجربات اٹھانے اور خوش وقتی کے لئے یہ اچھی جگہ تھی۔ اُس نے کون
سا یہاں مستقل رہنا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں اُس کا دِل اِن لوگوں میں خوب لگ گیا تھا۔ جیسے
وہ اس کی زندگی کا جزو بنتے جا رہے ہوں۔

ڈولی کا ذکر اُدھورا رہے گا اگر انکل پاشانی کا تذکرہ نہ کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں انکل
اور ڈولی اس گھر میں لازم و ملزُوم بن گئے تھے۔

انکل پاشانی کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔ خوب سُرخ و سفید اور دراز قد
لمبے تھے۔ چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز اور سر کے بال سیاہ۔ گویا خضاب کا استعمال بھی
کثرت سے کرتے تھے۔ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ کسی زمانے میں وہ ایران سے ہجرت کر کے
پاکستان میں آگئے تھے اور اب مستقل یہیں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کی ذاتی زندگی کے
بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا ——— وہ کیا کاروبار کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو پتہ نہیں
تھا۔ لیکن وہ گُل برگ کی اونچی سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ اُن کے پاس ایک
پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کار تھی۔ وہ اکثر نوجوان لڑکیوں کو اس میں گھماتے پھرتے۔ گویا وہ
سب کے انکل تھے۔

کوئی انکل سے بازار چلنے کی فرمائش کر رہی ہے ——— کوئی پکچر دیکھنے کی۔
اور کوئی نمائش دیکھنے کی۔

اور انکل ہر ایک کی جی حضوری کر رہے ہیں۔ ہر ایک کو پرچا رہے ہیں۔
مگر ایک بات تھی۔ جو لڑکی فرمائش کرتی اسے اگلی سیٹ پر انکل کے ساتھ بیٹھنا پڑتا

کیوں ——— ؟

اس بات کی سمجھ سجو کو کبھی نہ آئی۔

ایک بار بھولے سے اس بچاری نے بھی فرمائش کر دی۔ اُس کو مال روڈ سے کچھ کتابیں لینا تھیں۔ انکل کے سوا اس روز کوئی ہتھے نہ چڑھا۔ اُس نے ڈولی سے کہا اور ڈولی جھٹ انکل کے کندھوں پر سوار ہو گئی۔ اُس کا خیال تھا۔ اس بہانے کوک اور آئس کریم کے مزے بھی لوٹ آئیں گے۔ بیٹھتے وقت جب ڈولی نے سجو کو پہلے اندر دھکا دیا تو وہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی ساتھ ہی ڈولی بھی اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ ایک تو جگہ تنگ اور اُس پر انکل کے موڑ کاٹنے کا انداز۔ بریک لگاتے ہوئے۔ کلچ دباتے ہوئے۔ غرض ہر ہر زاویے سے انکل نے اس کے جسم کی پیمائش کی۔ سجو کو غصّہ بھی آتا رہا۔ اور ابکائیاں بھی۔ اُس روز اُس نے پہلی مرتبہ انکل اور ڈولی کی دوستی کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ ورنہ اُن کا گٹھ جوڑ اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا تھا۔

یوں تو ڈولی انکل انکل کرتی پھرتی۔ مگر انکل نے کبھی اُسے بیٹی کہہ نہیں پکارا تھا۔ جب بھی بولتے "سویٹی" "منی" یا "ڈیری" کہتے۔ سجو سمجھتی بیٹی کو بھی تو اس طرح پکارا جا سکتا ہے۔ شاید جدیدیت کا تقاضا ہے۔ ویسے بھی وہ ڈولی کے معشوقانہ نازو ادا اور لاڈ پیار کو طفلانہ سی سرکشی سمجھتی۔

ایک بار پہلے بھی وہ اسی شش و پنج میں گرفتار ہوئی تھی۔ اُس روز گھر میں کوئی پارٹی تھی اور ڈولی کا ایک نوجوان بوائے فرینڈ بھی آیا ہوا تھا۔ پارٹی عروج کو پہنچی تو ڈولی نے اُن کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ناچتے ناچتے وہ لوگ اتنے بے سُدھ ہوئے کہ انہیں ادھر ادھر کا ہوش نہ رہا۔ حتیٰ کہ سب جوڑے تھک کر بیٹھ گئے۔ مگر وہ دونوں حد سے زیادہ نڈھال ہو گئے تب کہیں بیٹھے جاکر ——— اور چاروں طرف سے وہ تالیاں بجیں کہ الامان ———

ڈولی کا سانولا رنگ بالکل سُرخ ہو گیا تھا اور اُس کے گال کا مصنوعی تِل اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ اپنے گداز جسم کی جنبشوں پر ہانپتے ہوتے وہ بڑی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ انکل کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔ جونہی ڈولی دھم سے اُن کے پاس آ کر بیٹھی وہ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب ڈولی نے مہمانوں کی بالکل پرواہ نہ کی۔ خود بھی اُن کے پیچھے باہر کو لپکی۔

تھوڑی دیر تو سجو اندر بیٹھی رہی پھر تجسّس نے اُس کو بے قرار کیا۔ اور وہ بھی باہر نکل آئی برآمدے میں کھڑے ہو کر دُور دُور نظر دوڑائی تو دیکھا۔ بڑے لان کے آخری سرے پر انکل رُوٹھے ہوئے شہزادے بنے کھڑے ہیں اور ڈولی نے اپنی باہیں اُن کی گردن میں ڈال رکھی ہیں۔

واہ یہ منانے کا اچھا ڈھنگ ہے۔

اور بھلا انکل رُوٹھے کس بات پر ہیں۔ سجو کو بالکل سمجھ نہ آئی۔ اور پھر دُور اندھیرے میں کھڑے یہ لوگ کیا کر رہے ہیں کہ دو کی جگہ ایک ہی سایہ نظر آ رہا ہے۔

سجو خود سے اُلجھ کر اندر چلی آئی۔ جہاں ڈولی کا بوائے فرینڈ اُسے تنہا دیکھ کر فریفتہ ہونے لگا۔

مگر اُس دن کے بعد سے سجو کو ڈولی سے اور بھی چِڑ ہو گئی تھی۔ وہ عجیب اُلجھی ہوئی نظر آنے لگی تھی اُسے۔ مگر کیا کرتی ——— ؟ اپنی بے زاری اور اُکتاہٹ کو ظاہر نہ کر سکتی تھی۔ ایک دن مجبوراً کہہ بیٹھی۔ "تو کیا ہر وقت اِس بوڑھے کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔" تو ڈولی نے بڑے مزے سے ایک آنکھ بند کر کے کہا
HE IS IN LOVE WITH ME

کیا ——— ؟ سجو کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"جی ہاں۔ سمجھیں!" ڈولی مسکرائی۔

"تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔ جو اس سے شادی کرے گی۔ تیرے باپ کے برابر

"ارے شادی کون کافر کر رہا ہے۔" ڈولی نے لہرا کر کہا۔ "ایسے ہی ذرا بڈھے کو

اُلو سیدھا کرتی رہتی ہوں۔ دیکھتی نہیں کتنا امیر آدمی ہے اُس نے مجھ سے وعدہ کیا

کہ مجھے بیروت ــــ لے کر جائے گا۔ اور مجھے اپنی محبت کے تحفے کے طور پر ایک کار دے

"اور کیا تجھے اُس کے ساتھ بیروت جانے کی اجازت مل جائے گی؟" سجو نے بڑی

سے پوچھا۔

"ہاں۔ راضی آپا نے کہہ دیا ہے کہ بی اے کرنے کے بعد تو اُتنی خود مختار ہو سکتی ہو

چلی جاتے۔"

"اور تو ایک غیر مرد کے ساتھ اکیلی چلی جائے گی؟" سجو نے پھر پوچھا۔

"ہاں بھئی ہاں۔ کتنی بار کہوں۔ تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ اور کیا یہ مجھے کھا جائے گا

عاشق مزاج ہے۔ مجھے پسند کرتا ہے۔ بس ــــــ"

"اور جو تیرے گھر والوں کو اس کا پتہ چل جائے تو ــــ" سجو نے اپنی طرف

سے پوچھا۔

"واقعی تو بڑی گدھی ہے۔" ڈولی قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "سب کو اس بات کا پتہ ہے۔

سب ہی انکل کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

اور تب سجو کو یاد آیا کہ اکثر ڈولی کی بہنیں اس سے کہتیں۔ اری تیرا انکل آیا ہے

نہیں ــــ یا ڈولی اپنے انکل سے کہہ کے فلاں کام تو کرا دے۔

یہ تو بڑی بے حیائی ہے۔ کبھی کبھی وہ دل میں سوچتی ــــ پر اس گھر میں جیا

کام ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر اُسے خود سے ہی شرم آنے لگتی۔

بھئی یہ تو جدید تہذیب کے تقاضے ہیں سب۔ ذرا اپنا سوچنے کا انداز بدل ڈالو

کو اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور پھر ضروری تو نہیں کہ آدمی اُن کی ہر بات اپنا لے۔ جو جی کو نہ لگے وہ چھوڑ دے۔

اس گھرانے میں ایک اور کردار بھی قابلِ ذکر تھا اور وہ تھا اُن کا مشترکہ ڈرائیور طفیل احمد۔ جسے سب طفیل کہتے تھے۔ طفیل کی ایک آنکھ قدرے چھوٹی تھی۔ طوطے کی طرح مڑی ہوئی لمبی ناک تھی۔ اور چہرے کی بناوٹ سے نہایت شاطر اور عیار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حرکات اکثر گستاخانہ اور غیر شریفانہ ہوتیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بُرا نہ مانتا۔ سب اُس سے یوں دبتے تھے۔ جیسے وہ اُن میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی خطرناک راز سینے میں دبائے پھرتا ہو۔ جب اُس کا دل چاہتا ــــ جتنے دل چاہتا۔ اور جس سے دل چاہتا پیسے اُدھار مانگ لیتا۔ نہیں واپس کرنے کا وہ کبھی نام بھی نہ لیتا اور نہ کوئی واپسی کا تقاضا کرتا۔ "بس غریب ہے بچارا ــــ یا "ملازم ہے" کہہ کر سب ٹال جاتے۔

ایک بار جب وہ سجو کے سامنے ڈولی سے ستر روپے مانگنے آیا تو ڈولی کو بہت طیش آیا۔ بولی "میرے پاس نہیں ہیں۔ ابھی ہفتہ ہوا تم پچاس روپے مانگ کر لے گئے تھے۔ وہ کیا ہوئے ــــ؟"

"بس جی ...." وہ غلیظ دانت پھاڑ کر ہنسا "میری بیوی بیمار ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ دوائیاں وغیرہ خریدلیں۔ جی وہ خرچ ہوگئے۔" وہ پھر بےہودہ انداز میں ہنسا ــــ "دے دیں گی۔ جلدی لوٹا دوں گا ــــ نہیں تو جی .... اگر آپ کے پاس نہیں ہیں تو انکل جی سے مانگ لوں گا۔"

بڑبڑاتے ہوئے ڈولی نے اُٹھ کر اُسے پیسے لا دیئے ــــ وہ طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے چلا گیا۔

"کیوں دیئے تم نے پیسے ــــ؟" سجو پھٹ پڑی ــــ "اس طرح تو تم نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں میری جان! اس لئے خاموش رہو۔"

سجو اس قدر حیران ہوئی کہ سچ مچ اُس کی زبان کو تالا لگ گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کالج کے دو سال تو "گل افشاں" میں ہونے والی پارٹیوں، فلموں اور سیر سپاٹوں کی نذر ہو گئے۔ فائنل امتحان سر پہ آیا تو سجو کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میٹرک میں اُس نے وظیفہ لیا تھا۔ اب اگر فیل ہو گئی یا کم نمبر لئے تو بابا کبھی لاہور نہ بھیجیں گے۔ وہ تو پہلے ہی اُس کی شادی کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ اُس کے تعلیمی شوق میں کمی آ گئی ہے۔ یا لاہور کے ماحول نے اُس پہ اچھا اثر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ مستقبل سنوارنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ جی جان سے محنت کرتی اور اچھے نمبروں میں پاس ہوتی۔ امتحان میں دو ماہ رہ گئے تو وہ چھٹیاں لے کر اور بہت سارے نوٹس اکٹھے کر کے گاؤں چلی گئی تاکہ یکسوئی سے پڑھ سکے۔ مگر پڑھتے پڑھتے جب اُس کی طبیعت اُکتا جاتی اور لاہور کی رنگین یادیں اُسے بے قرار کرتیں تو وہ اپنی چھوٹی بہن بلی کو مزے لے لے کر بہت سے قصے سُناتی اور بلی جس کا اصلی نام [illegible] تھا۔ مگر سب اسے اُس کی کرنجی آنکھوں کی وجہ سے "بلی" ہی پکارتے تھے۔ حیرت سے منہ کھولے یہ باتیں سنتی رہتی۔ جیسے سجو نہ ہو کوہ قاف سے کوئی پری اُتر آئی ہو۔ اور دن رات [illegible] مافوق الفطرت قصے سُناتی رہتی ہو۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس کی عقل بھلا [illegible] کہاں تھی کہ ان باتوں کو سمجھ سکتی۔ مگر وہ اچھی سامع تھی۔ اور مزے دار باتیں سُننے

کے لالچ میں دوڑ دوڑ کر سجّو کے سو کام کر دیتی۔ اور سجّو بھی اکثر اس کے ساتھ باتیں کرکے اپنا
کی اُداسی دُور کر لیا کرتی تھی۔ البتہ اس بار اُس نے ایک عجیب سی بات محسوس کی تھی
اب اُسے اپنے ماموں زاد سے بڑی چڑ ہو گئی تھی۔ حالانکہ شیر افگن سے اس کی منگنی بچپن
ہی ہو گئی تھی ——— پہلے جب وہ شہر میں پڑھنے گیا ہوا تھا اور سجّو گاؤں میں پہنچا
تو وہ اُسے بڑا عظیم اور دلکش لگتا تھا۔ شہر سے آتا تو اُس کے لئے چوڑیاں، کلپ اور کئی
سوغاتیں لاتا۔ سجّو خوشی سے پھُولی نہ سماتی اور چھُپ چھُپ کر اُسے دیکھا کرتی تھی۔ کیا وہ اُس
سے محبّت کرتی تھی ——— ؟

نہیں ایسے کسی جذبے سے وہ آشنا نہیں تھی۔ یہ سب ایک لگاوٹ کے تحت ہی
وہ جو منسوب ہو جانے کی انسیّت سی ہوتی ہے۔ کیونکہ سب کہتے کہ وہ تیرا منگیتر ہے اور
بھی خوب تحفے تحائف لا کر دیتا تھا۔ تو وہ اسے اچھّا لگنے لگا تھا۔

مگر اب شعور کی آنکھیں کھُل گئی تھیں۔

کبھی اگر وہ اس کا موازنہ عابد بھائی سے کرتی تو شیر افگن اسے بہت ہی گھٹیا اور
کا کیڑا لگنے لگتا تھا۔

کمبخت بی۔ اے۔ پاس کرکے بھی اُجڈ کا اُجڈ ہی رہا۔ ابھی تک کپڑے پہننے کا سلیقہ
آیا نہیں دھاریدار تہبند اور کھلے گلے کا کرتا پہنے سارا وقت زمینوں پر گھومتا رہتا اور اکثر
میں سجّو سے بھی ملنے آ جاتا۔ اور جو گھر یہ لالہ غلام غوث اور لالہ غلام فرید سے مڈبھیڑ ہو جاتی
وہیں پر اُن کے ساتھ بیٹھ جاتا اور حقّے کی نَے منہ میں لے کر لمبے لمبے گڑگڑاتے کش لینے لگتا
سجّو مارے نفرت کے اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔ جسے عُرفِ عام میں اُس کی حیا بھی
اگر اُس کا بس چلتا تو اس اُجڈ گنوار کا مُنہ نوچ لیتی ——— اس خیال کے آتے ہی کہ شیر افگن
کا ہونے والا دُولہا ہے۔ اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

"تو بہ زہر کھا لوں گی۔"

اس کے ساتھ شادی کرنا تو خُودکشی کرنا ہے۔

کہاں میں ——— اور کہاں یہ ——— ؟

میرے لئے تو کوئی آفاق کا شہزادہ آنا چاہیئے۔ وہ دِل میں سوچتی ——— اور اس سوچ
کے ساتھ ہی ——— عابد بھائی کا پیکر اُس کے لاشعور میں اُبھر آتا۔ وہ مست کر دینے والی
آنکھیں ——— دل میں گھر کر لینے والے انداز۔ اور 555 کے سگریٹ کی معطر لپٹیں ———
یا کہنا اُن کی شخصیت کا ———

اور کیسا عمدہ اُن کے لباس کا انتخاب ہے ——— ؟

اور کس طرح دھیمے لہجے میں وہ رک رک کر باتیں کرتے ہیں۔ جیسے کلیوں اور پھُولوں کی
بارش ہو رہی ہو۔ پھر اُن کی ہر بات اور ہر ادا کو کلیجے میں چھُپا لینے کو جی چاہتا ہے۔

اسے کہتے ہیں مقناطیسی کشش ———

پر پگلی تو کیوں ان کے بارے میں اتنا سوچا کرتی ہے۔ چاہے انہیں تیری پرواہ ہی
نہ ہو ———

نہیں ——— وہ خُود ہی اپنی تردید بھی کرتی۔

پھر ——— ایک لڑکی اتنی احمق نہیں ہو سکتی کہ اپنی طرف اُٹھنے والی ہر نگاہِ شوق کو نہ
پہچان سکے۔ کئی بار تو انہوں نے اشاروں، کنایوں میں اظہارِ محبّت کیا ہے۔ اب وہ اتنی
نا سمجھ بھی نہیں کہ سمجھ نہ سکے۔

اُس روز جب وہ اُس کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے تو گاڑی میں سوار کراتے وقت کتنی زور
سے اُس کا ہاتھ دبایا۔ جب اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ تو مسکرا کر بولے "جلدی لوٹ آنا مجھے تو آج
سے سارا شہر ویران نظر آنے لگا ہے۔"

اور آج ——— جب وہ دو ماہ بعد لاہور جانے کے لئے ٹرین میں سوار ہونے آئی
تو اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پیشتر بھی وہ کئی مرتبہ چھٹیوں میں گھر آ چکی

تھی۔ اور ان لوگوں کا تصور لئے واپس بھی گئی تھی۔ مگر اب کے اُس کے احساسات اور جذبات
بدل گئے تھے۔ اس بار ــــــ ہر رات اُس نے عابد بھائی کے سپنے دیکھے تھے اور ہر صبح
فضاؤں میں اُن کی خوشبو سونگھی تھی۔ اور اب اُن کا سامنا کیسے ہوگا ــــــ ؟ کہیں
کے دل کا چور نہ پکڑ لیں۔ کوئی اور مشتبہ نہ ہو جاتے ــــــ

لوگ کیا کہیں گے ــــــ ؟

اور خود عابد بھائی کیا سوچیں گے ــــــ ؟

اُس نے اپنے آنے کی اطلاع "گلِ افشاں" میں دے دی تھی۔ مگر اسٹیشن پر جب اُسے کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ سجّو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ بہرحال جانا تو اُس کو "گلِ افشاں" ہی تھا۔ کیونکہ ہوسٹل سب گرمی کی چھٹیوں میں بند ہو چکے تھے۔ اور اپنی وارڈن کو اُس نے اپنی آمد کی اطلاع اس لئے نہیں دی تھی کیونکہ ڈولی نے اُس کے ساتھ اکٹھے مل کر پڑھنے اور پھر امتحان دینے کا پروگرام بنایا تھا اس لئے اُس نے سوچا تھا۔ یہ ایک مہینہ وہ "گلِ افشاں" میں ہی رہ کر سکون سے امتحان دے لے گی۔

مگر جب گھر آئی تو اُسے بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ڈرائیور طفیل کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ سب لوگ سیزن گزارنے مری جا چکے ہیں۔

"کیا ڈولی بھی چلی گئی۔ اُسے امتحان نہیں دینا ؟"۔ وہ حیرت سے بولی۔

"جی ــــــ وہ کیا کریں گی جی امتحان دے کر جی ــــــ" طفیل ایک آوارہ سی ہنسی ہنسا۔

"کیا مطلب ــــــ ؟" سجّو نے گھور کر پوچھا۔

"جی میرا مطلب ہے۔ اُن کی صحت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اور پھر انکل جی بھی تو جا رہے تھے۔ اُن کو زبردستی لے گئے ــــــ کہہ رہی تھیں۔ اگلے سیزن میں امتحان دے دوں گی"۔

سجّو کو ڈولی پر بڑا غصّہ آیا۔ اور سب گھر والوں پر بھی۔ حالانکہ اُس نے انہیں اپنے ...

... کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ اگر سبھوں نے گھر چھوڑ جانا تھا۔ تو کم از کم اُسے بروقت
... دی ہوتی۔ یوں تو وہ پہلے بھی کئی مرتبہ اکیلے گھر میں رہ چکی تھی۔ مگر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد
... ہوتا تھا۔ کبھی نوکروں کے ساتھ محمد حسین ہوتے تھے۔ کبھی بھابھی زوبی اور بھائی امجد حسین
... والے حصّے میں ہوتے تھے۔ لیکن اب ــــــ اتنے بڑے گھر میں نوکروں کے ساتھ
... رہنا تو بڑی زیادتی تھی۔

"کیا امجد بھائی اور بھابی زبیدہ بھی چلے گئے ہیں ؟" اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"ہاں جی ــــــ"

"اور گھر میں کوئی نہیں ہے"۔ وہ ابھی تک برآمدے میں اپنے سامان کے ساتھ کھڑی
ــــــ

"ہے کیوں نہیں جی ــــــ بڑے میاں جی اور اُن کا ملازم ہے اور وہ اپنے ــــــ"
... ذرا سا ہنسا مگر بے تکے پن سے ــــــ وہ اپنے دولہا میاں بھی یہیں ہیں ــــــ"

"کون دولہا میاں۔ کیا سُلطان بھائی ــــــ ؟" سجّو جلدی سے بولی۔

"نہیں جی۔ سُلطان میاں تو اپنی دُلہنیا کے ساتھ سوات گئے ہوئے ہیں"۔

"پھر اور کون . . . " سجّو اور بوکھلا گئی۔

ابھی طفیل کچھ کہنے والا تھا کہ ایک کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔

"لو جی۔ وہ خود ہی آ گئے ہیں۔ لینے کو تو گئے تھے آپ کو۔ مگر آپ پہلے آ گئیں . . . "
... طفیل بیہودہ انداز میں ہنسا۔

سجّو نے اُس کی ہنسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جلدی سے باہر نکل کر دیکھا۔ موٹر میں سے
... نکل رہے تھے۔

"وہی ہوا نا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ میں صرف پانچ منٹ لیٹ ہو گیا۔ اور تم انتظار کرنے
... بھاگ آئیں"۔

سجّو کی جان میں جان آ گئی۔

"میں کیا کرتی عابد بھائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ لوگوں میں سے کوئی اسٹیشن پر نہیں آیا۔ اتنی بوکھلاہٹ طاری ہوئی کہ جلدی سے ٹیکسی لی اور گھر پہنچ گئی۔ مبادا اور دیر ہو۔ یہاں پہنچی تو طفیل نے پہیلیاں بجھوا بجھوا کر اور بوکھلا دیا۔"

"احمق ہے یہ سور ——— !" عابد بھائی نے آگے بڑھ کر سجّو کو بازو سے تھاما۔ "چلو اندر چل کر بیٹھو ——— چائے پیو۔ تمہارا تو سامان بھی باہر پڑا ہے۔ کیا بھاگنے کا ارادہ ہے ———"

وہ دونوں ایک ساتھ اندر کو جانے لگے۔

"مگر اس تنہا گھر میں میں کیسے رہ سکوں گی عابد بھائی۔ پرسوں میرا پہلا پیپر ہے۔ اور کوئی دوسرا بندوبست کیسے ہو گا؟"

"اچھا تو اب تم ہمیں انسانوں کے زمرے میں ہی شمار نہیں کرتی ہو۔ یا پھر تمہیں ہم پر اعتبار ہی نہیں ——— گھر پر میں ہوں ابا جان ہیں ——— نوکر چاکر ہیں ———"

"یہ بات نہیں عابد بھائی ———"

"کیا بات ہے ——— ؟"

"دیکھیں نا، کتنا عجیب لگتا ہے۔ گھر میں سب مرد ہیں اور . . . ."

"مجھے تو خیر تم مردوں میں شمار ہی نہ کرو۔ میں تو ایک اچھا پرستار ہوں اور بس ———" انہوں نے ہنس کر کہا۔ "ابا میاں بچارے معذور۔ باقی رہے یہ نوکر۔ مجال ہے جو تمہاری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھیں . . . . اور کچھ؟"

"اور باقی لوگ آکر کیا سوچیں گے؟"

"باقی لوگ کون ——— ؟ راضی آپا نے مجھے خود مجبور کر کے تمہاری خاطر یہاں بھیجا ہے۔ اس مرتبہ اُن سب کا جلدی جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ تمہیں بروقت اطلاع نہ دے پائے۔

انہوں نے مجھے کہا میں چلا جاؤں۔ کہیں خالی گھر دیکھ کر تم واپس نہ لوٹ جاؤ۔ حالانکہ مجھے ابھی ایک ہفتہ اور وہاں ٹھہرنا تھا۔ لیکن جناب ——— آپ کی خاطر گرمی میں جھلسنے کو آ گیا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ مزاج ہی نہیں ملتے۔

"اچھا۔" سجّو شرمندہ ہو کر ہنس پڑی۔ "مجھے بھلا ان باتوں کا کیا پتہ تھا۔ کتنے اچھے ہیں آپ عابد بھائی۔ سب لوگ تو وہاں مزے کریں گے اور آپ ——— میری خاطر ———"

"مگر یہ میری بھی تمنا تھی سجّو جان!" عابد بھائی نے جذبات میں ڈوب کر کہا۔ "میرا نہ وہاں تمہارے بغیر جی لگتا نہ یہاں۔"

اس بات کا سجّو بھلا کیا جواب دیتی۔ وہ تو پہلے ہی پور بنی پھرتی تھی۔ جلدی سے بولی:

"مگر میں سوؤں گی کہاں عابد بھائی؟"

"ابھی سوچے لیتے ہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھو!"

انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ اور تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد عابد بھائی نے سجّو کو بتایا کہ وہ اُن کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں رہ سکتی ہے۔"

"مگر آپ اتنی سخت گرمی میں کہاں رہیں گے؟"

"میں ساجد کے کمرے میں رہ لوں گا۔"

"لیکن اگر وہ آ گئے تو ——— ؟"

"وہ غالباً پندرہ دن بعد آئے گا۔ لیکن اگر آ بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے۔ دونوں بھائی ایک کمرے میں رہ سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی نامحرم نہیں کہ . . . ."

فقرہ پورا ہونے سے پہلے دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

سجّو کے دل میں عابد بھائی کی عظمت اور بھی گہری ہو گئی۔ وہ اور بھی بلند اور بھی دلکش ——— اور بھی قریب محسوس ہونے لگے۔

سجّو نے اپنا سامان اُن کے کمرے میں لگا لیا۔

عابد بھائی اور ساجد بھائی کے کمروں کا غسل خانہ مشترکہ تھا۔ اور دونوں بھائی آنے جانے کے لئے بھی اسی راستے کو زیادہ تر استعمال کرتے تھے۔

کمرے میں سامان لگا لینے کے باوجود سجو کو یہ بڑی زیادتی لگ رہی تھی کہ اس نے بھائی کے کمرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اُن کی ضرورت کی ہر شے تو اسی کمرے میں رکھی ہے۔ کھانے کے وقت جب اُن کا ڈرائنگ روم میں آمنا سامنا ہوا تو وہ بولی۔

"عابد بھائی میں ساجد بھائی کے کمرے میں رہ لیتی ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں رہیے۔"

"نہیں ——؟" عابد بھائی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی وقت رات کو اچانک آجائے۔ تو دروازہ کھٹکھٹا کر رات کو تمہیں پریشان کرے گا۔ اور تم یہاں سکون سے رہ کر امتحان دینے آئی ہو۔ رات کی نیند تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔"

"عابد بھائی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ رات کو میں باہر لان میں سو جایا کروں ——!"

"بے وقوف لڑکی! —— عابد گرجا۔ ایک تو برسات کا موسم ہے۔ اتنی حبس اور گھٹن میں لان میں کیا سویا جائے گا۔ دوسرے ایک اکیلی لڑکی کیسے باہر سو سکتی ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ جو ایسی باتیں سوچ رہی ہو۔ اور پھر نہیں ڈر کس بات کا ہے؟"

"ایسے ہی عابد بھائی"۔ سجو روہانسی ہو گئی۔ "آپ کی تکلیف کے خیال سے کہہ رہی تھی ——"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی —— جس چیز کی ضرورت ہوگی آکر لے جاؤں گا۔ اور پھر یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم میرے کمرے میں رہو۔ میرے بستر پر سوؤ —— ان دنوں تم صرف میری مہمان ہو —— صرف میری —— میں جس طرح چاہوں گا تمہیں رکھوں گا۔"

عابد حسین نے نہ جانے کس انداز میں یہ جملے کہے کہ سجو سے نظر نہ اٹھائی گئی۔

جب کافی دیر بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے نظر اُٹھائی تو —— نہ جانے ...ین کی آنکھوں میں کیا دیکھا —— نوالہ اُس کے ہاتھ سے گر گیا —— ...ں کا دل نئی نویلی دُلہن کی طرح دھڑکنے لگا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس روز سجّو کا آخری پرچہ تھا۔ پیپر دینے کے بعد۔ وہ اپنی ایک سہیلی کو ساتھ لے کر شا
کرنے چلی گئی۔ کیونکہ اگلے دِن سجّو کا واپس جانے کا ارادہ تھا۔ رات کے آٹھ بجے جب وہ ڈبّوا
اور لفافوں سے لدی پھندی اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔
ایرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ موتیا کے تازہ پھُولوں کی مہک اور سگریٹ کی خوشبو نے مل کر کمرے
پُراسرار اور رومانٹک بنا دیا تھا۔ پہلے تو وہ ٹھِٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر آگے بڑھ کر بتی جلا دی
عابد بھائی اوندھے مُنہ پلنگ پر لیٹے تھے۔ جلتا ہوا سگریٹ اُن کی انگلیوں میں دبا تھا
اور ایک کتاب فرش پر گری ہوئی تھی۔

"خیر تو ہے عابد بھائی۔" سجّو نے اُن کے قریب جا کر اُن کا بازو چھوا۔

"اوہ ——— ہاں . . . . ." وہ ایک دم چونک کر اُٹھے۔ جیسے انہیں گہری نیند
جگا دیا گیا ہو۔ اور پھر اُٹھ کر جلدی سے بیٹھ گئے۔ "میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔" انہوں نے زمِ
پر گری ہوئی کتاب اُٹھا کر کہا۔ "پڑھتے پڑھتے اُونگھ آ گئی۔" پھر انہوں نے اپنی کلائی کی گھڑ
دیکھی اور حیرت سے کہا۔ "ارے رات ہو گئی۔"

"اس کا مطلب ہے آپ شام سے پڑے سو رہے ہیں۔" سجّو اپنے پیکٹ ز

گی۔ ... تم بتاؤ آج سارا دن کہاں غائب رہیں ——— ؟ میں آج جلدی گھر آ گیا تھا۔ سوچا
جانا ہے۔ ذرا پکچر وکچر دیکھیں گے۔ تمہیں گھما پھرا لائیں گے۔"
سجّو نے لڑکیوں والے خاص انداز HOW SWEET OF YOU ABID BI
کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو بتا نہ سکی تھی کہ آج مجھے بے شمار شاپنگ کرنا
ین نے کہا۔ بہت ساری چھوٹی موٹی چیزوں کی خریداری ہے۔ آپ بازار میں گھومتے
بناحق بور ہو رہے۔ اس لئے اپنی ایک سہیلی کو ساتھ لے گئی تھی۔"
"واقعی تم تو بے شمار چیزیں خرید لائی ہو؟" عابد حسین اُس کے ڈبّے اور لفافے ٹٹولنے لگا۔
پر بولا۔ بھئی تم تو کسی غریب کی بہت ہی مہنگی بیوی بنو گی۔"

"کیوں ——— ؟" سجّو اٹھلا کر بولی۔

"دیکھو تو شادی سے پہلے اتنی زیادہ شاپنگ کر لائی ہو۔ شادی کے بعد تو بازار کے بازار
یدلایا کرو گی۔"

سجّو ناز سے مُسکرائی۔ "نہیں عابد بھائی۔ اس میں تو بہت سی چیزیں میری بھابیوں اور
بہنوں کی ہیں۔ آپ جانتے ہیں، گاؤں سے جب کوئی لاہور آتا ہے تو فرمائشوں کی بارش
ہونے لگتی ہے۔ میری تو ان میں چند ایک قمیصیں اور چپل ہیں۔ دکھاؤں آپ کو۔ ؟" وہ ایک
پیکٹ کھولتے ہوئے بولی۔ "اور پتہ ہے عابد بھائی۔ لڑکیاں سب فضول خرچی شادی سے پہلے
کرتی ہیں۔ والدین کا پیسہ پھونکنے کا انہیں ذرا قلق نہیں ہوتا۔ مگر ———"

اُس کا مُنہ سُرخ ہو گیا۔

"مگر اپنے شوہر کا پیسہ وہ خوب سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہیں۔" یہ کہتے ہی اُس نے نظر بھر
کر عابد کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظر میں تمام تر پیار ہی پیار تھا۔

عابد نے سگریٹ کا کش لے کر ایک لمبی سانس چھوڑی۔ اور بے نیازی کی اداکاری کرتے

ہوئے بولا۔

"ہمیں کیا پتہ اِن باتوں کا ——— ؟" اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

سجّو کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کہ اُس نے عابد بھائی کے زخموں کو ناحق چھ

بات بدلنے کی خاطر بولی۔

"دیکھئے یہ قمیض اچھی ہے نا؟" ایک بہت ہی خوبصورت اور قیمتی قمیض اُس نے لفا

میں سے نکالی۔ اور قدِ آدم شیشے کے آگے کھڑی ہو کر اپنے ساتھ لگائی۔

عابد اپنی کتاب میں گم ہو چکا تھا۔ "دیکھئے نا پلیز" وہ زور سے چلّائی۔

عابد نے سرسری نظر ڈال کر کہا۔ "بہت اچھی ہے" اور پھر نظر کتاب پر مرکوز کر دی۔ ا

پڑھنے میں محو ہو گیا ہے۔

سجّو کو بہت غصّہ آیا۔ قمیض ہاتھ میں لے کر دھپ سے عابد کے پاس بیٹھ گئی۔ ل

عابد حسین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بے نیازی سے کتاب پڑھنے میں مگن رہا۔

حقیقت میں اُس کے اندر الاؤ سُلگنے لگے تھے۔ اس خوبصورت کومل بدن کا لم

اور جوانی کی مہک ——— جس کے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہا تھا۔ بھلا کیسے نظر انداز کر

تھا۔ مگر وہ بھی گھاگ شکاری تھا۔ پھر ٹھنڈے توے پر روٹی ڈالنے کا تو وہ قائل ہی نہ تھا۔ اُا

کا اصول تھا توے کو تپنے دو۔ حتیٰ کہ وہ آگ بن جائے۔ پھر روٹی کو خود بخود پکڑ لے گا۔

سجّو ٹانگیں ہلا ہلا کر بولی۔ "اتنی تو پیاری میں قمیض لائی ہوں۔ آپ نے ذرا غور سے نہیں دیکھا

اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"دیکھ لی ہے بابا ——— دیکھ لی ہے ———" عابد حسین نظریں اٹھائے بغیر بولا۔

"خاک ———؟" سجّو چڑ کر اُٹھنے لگی تو عابد نے اُس کی کمر کے گرد بازو اس طرح ڈال

دیا جیسے کہ تیار ہی کر رکھا ہو اور پھر کھینچ کر اُسے قریب ہی بٹھا لیا۔ وہ لاکھ بے نیاز ہونے کی کوشش

کی ایکٹنگ کرتا مگر اندر سے فرشتہ ہرگز نہ تھا۔ کہ گھونٹ بھرے بغیر جام اوندھا دیتا۔ ہو

وہ بیٹھنا پڑا۔

وہ کسمساتی سی بیٹھ گئی۔ مگر اُس نے اپنے چہرے یا رویئے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ

ے عابد کا اس طرح پکڑنا یا بٹھانا عجیب یا بُرا لگا ہے۔ وہ بھی بے نیازی سے ٹانگیں ہلانے لگی۔

مجھے پتہ ہے تم بڑی قیمتی اور خوبصورت قمیض لائی ہو۔ اور یہ۔ تم پر بہت جچے گی۔ بہن

نہایت لگو گی وغیرہ وغیرہ ——— میں نے تمہیں غور سے اس لئے نہیں دیکھا تھا کہ کہیں

ہک ہی نہ جاؤں۔"

عابد بھائی کے اتنے قریب بیٹھ کر اور ایسے فقرے سُن کر سجّو کا دِل بے طرح دھڑکنے لگا۔

بھی اظہارِ محبت کا ایک انداز تھا۔ مگر وہ شرمانا لجانا نہیں چاہتی تھی۔ شرمانا لجانا یا نخرے دکھانا

محبت کا جواب ہوتا ہے۔

وہ اسی بے نیازی سے بیٹھی ٹانگیں ہلاتی رہی۔ عابد حسین یہ سب کچھ کہہ کر پھر کتاب پر جھک

گیا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ ابھی تک سجّو کی کمر کے گرد تھا۔ اور اس کی گرفت بھی کافی سخت تھی۔

سجّو کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کہے ——— یا کیا کرے۔؟

سمجھ کر ناسمجھ بن جانے کے بعد کون سا مرحلہ آتا ہے۔ پھر اُس نے یونہی۔ ماحول کا تأثر

بدلنے کی خاطر کہنا شروع کیا۔

"اگلے ہفتے میرے بھائی کے چھوٹے بیٹے کا عقیقہ ہے۔ اس تقریب پر پہننے کے

لئے میں نے یہ قمیض بنوائی ہے۔"

"میں نے کہا نا، تم سادہ کپڑوں میں بھی سب سے زیادہ حسین لگو گی۔" عابد نے کتاب سے نظریں

اٹھائے بغیر کہا۔ گویا اس وقت کتاب سجّو سے بھی زیادہ پُرکشش ہے۔ اس کے لئے۔

بظاہر تو سجّو خاموش بیٹھی رہی۔ مگر لاشعوری طور پر وہ خاصی چڑ گئی تھی۔

اتنی خوبصورت لڑکی پہلو میں بیٹھی ہو۔ اور آدمی اتنی بے نیازی دکھائے۔ اُسے یہ آدمی

وہ پتھر کا معلوم ہونے لگا۔ اور بعض اوقات لڑکیاں پتھر کو چوٹ لگانے کی دُھن میں اپنا شیشہ

چور چور کر لیتی ہیں۔ بُرا ماننے کے باوجود سجّو کا وہاں سے اُٹھنے کو دل نہ چاہا۔

تھوڑی خاموشی طاری رہی۔

پھر یکایک سجّو نے محسوس کیا کہ عابد حسین کی انگلیاں اُس کے پہلو میں حرکت کر کے کچھ گُل بوٹے سے بنا رہی ہیں۔۔۔ اُس نے چور انکھیوں سے عابد حسین کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ تانبے کے تھال کی مانند سُرخ اور سپاٹ تھا۔ جیسے وہ کتاب کی دلچسپی میں ڈوب چکا ہے اور یونہی۔ اس کی انگلیاں غیر ارادی طور پر حرکت میں آگئی ہیں۔

سجّو حیران سی بیٹھی تھی۔

انگلیوں کا یہ لمس اور گدگدی اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یونہی کسی کی قربت کا احساس ہونے لگا اور کسی کو کلیجے میں چھپا لینے والی کیفیت طاری ہوتے لگی۔ مگر اُسے اپنے آپ ہنسی آگئی۔

وہ بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی! ایسی باتیں اُس کے لئے لغزش کا باعث نہ تھیں۔

اور پھر عابد بھائی کے ساتھ کوئی بُرا خیال منسوب کرنا —— چھی چھی۔۔۔۔ کتنی گندی بات تھی۔

بہرحال وہ تو انہیں عابد بھائی ہی کہتی آئی تھی۔ اور بے خیالی میں وہ کتنی معصوم حرکت کر رہے تھے۔ من کا میلا آدمی ایسا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر میں اس معصوم حرکت کا خواہ مخواہ نوٹس لینے لگوں؟ تو اس کا مطلب یہ کہ میرے من میں بھی چور ہے۔۔۔ پھر اُس کو یوں محسوس ہونے لگا۔۔۔ جیسے انگلیاں —— گُل بوٹوں سے بھی آگے بڑھ رہی ہیں اور جب پیمائش کے انداز میں دوڑنے ہوئیں تو سجّو تڑپ کر اُٹھ گئی۔

"کیوں۔ کیا ہوا ——؟" عابد بھائی نے اتنی معصوم شکل بنا کر پوچھا کہ خود سجّو کو اپنے

...شرم آنے لگی۔

اس بیچارے کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

خیر۔۔۔ وہ سنبھل گئی۔

"میں ذرا یہ سامان سمیٹ لوں۔ صبح جانا ہے۔ اور مجھے ابھی یہ ساری پیکنگ کرنا ہے۔"

"اس وقت کافی دیر ہو گئی ہے۔ اور ابھی کھانا بھی کھانا ہے۔ پیکنگ صبح کر لینا۔" عابد ...کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ خاص بھوک نہیں ہے۔ کیونکہ آج بازار میں نان کباب کھا لئے تھے اور میں اس قدر تھک چکی ہوں کہ اُمید نہیں علی الصبح اُٹھ کر سامان باندھ سکوں۔ اس لئے مجھے ابھی سارا ...کر لینے دیجئے۔"

"ارے صبح صبح میں جگا دوں گا۔ کل مجھے بھی کوئی کام نہیں۔ بلکہ ناشتے کے بعد تمہاری پیکنگ میں کرا دوں گا۔ تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہو۔ چلو اچھی بچی بن کر سو جاؤ اب۔" عابد بھائی نے انتہائی شفقت سے کہا۔

سجّو کو اُن پر بے حد پیار آگیا۔

"اللہ۔ عابد بھائی آپ کتنے سویٹ ہیں۔ خدا کی قسم میں آپ کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔"

عابد حسین جاتے جاتے رُک گئے اور مڑ کر بولے۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم غسل خانے کی اندر سے کنڈی لگا لینا۔" ہر رات اُسے شب بخیر کہنے سے پہلے عابد بھائی یہی بات کہہ کر جاتے تھے۔

"...لگاؤں گی۔ ابھی تو مجھے کپڑے بدلنا ہیں۔"

"بھئی میں اپنے والے دروازے کی کہہ رہا ہوں۔"

"اللہ —— عابد بھائی آپ بھی عجیب ہیں۔ فرض کریں وہ دروازہ رات کو کھلا ...رہ گیا تو کیا ہو گا۔ پتہ نہیں آپ ہر رات ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

"میں تو اس لئے کہتا ہوں" عابد بھائی نے اپنا انداز مزاحیہ بنا کر کہا "کہیں ایسا نہ ہو رات کو دروازہ کھلا پا کر میں غسل خانے میں چھپ کر بیٹھ جاؤں۔ اور جب تم اپنا دروازہ کھولو لپک کر تمہیں پکڑ لوں۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔

"تو پکڑنے سے کیا ہوگا ——؟" اسی سادگی سے سجّو نے پوچھا جیسے اُسے عابد سے کبھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور نہ ہوگا۔

"ارے ہونا کیا ہے۔ پکڑ کر پھر چھوڑ دوں گا۔"

دونوں پھر ہنسے۔

"آپ بھی کمال ہیں عابد بھائی۔ پتہ نہیں ایسی ایسی باتیں آپ کے دماغ میں کہاں سے جاتی ہیں۔ بس زیادہ کتابیں نہ پڑھا کیجئے۔ اسی لئے آپ کو سوچنے کی بہت باتیں مل جاتی ہیں۔"

"اچھا بھئی شب بخیر۔" عابد نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"شب بخیر عابد بھائی ——" سجّو نے تین انگلیاں اٹھا کر کہا۔ اور غسل خانے کے راستے عابد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سجّو نے بازار سے لائے ہوئے تمام کپڑے بکس میں سنوار کر رکھ لئے تو اُس پر نیند غالب آگئی۔ اُس نے سوچا باقی کام وہ صبح اُٹھ کر کرلے گی۔

اپنے نئے سلیپنگ سوٹ کو لے کر وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ عابد بھائی والے دروازے کی اندر سے چٹخنی چڑھائی اور کپڑے بدلنے لگی —— عابد تاکید کرتا یا نہ —— یہ اس کی عادت تھی کہ سونے سے پیشتر اردگرد کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بہت اچھی طرح بند کر کے سوتی —— بھئی کسی کا کیا اعتبار ——

رات کو تو فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔

وہ کپڑے بدل کر اور اچھی طرح کنڈیاں بند کر کے لوٹی تو شیلف پر سے ایک رسالہ اٹھا بستر پر لیٹ کر اُس کی ورق گردانی کرتی رہی ——

آدھ گھنٹہ وہ رسالہ پڑھتی رہی۔ پھر اُسے محسوس ہوا اُسے نیند آرہی ہے —— اپنی جگہ پر رکھ کر اُس نے بتی بجھا دی۔ اور ہلکا نیلا بلب روشن کر دیا۔ جو تمام رات جلتا تھا۔ اُس کی ہلکی سی روشنی کا سہارا لے کر جب وہ بستر پر لیٹی تو کمرہ ایک دم بڑا مہیب اور ڈراؤنا لگنے لگا —— اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا —— لیکن جب اُس نے دل پر قابو پالیا تو یہی کمرہ بڑا خوابناک اور رومانٹک بن گیا —— وہ نرم تکیوں کو بانہوں میں لے کر منہ اوندھا کے لیٹ گئی۔ گویا سونے کی کوشش کرنے لگی۔

یہ عابد بھائی کے تکیے ہیں۔

ہر رات سونے سے پہلے وہ یہ سوچا کرتی۔

پر آج تو وہ اُن پر سو گئے تھے۔ اس لئے اُن میں سے اُن کی پیاری پیاری خوشبو آ رہی تھی۔ آج تو اسے ویسے بھی عابد بھائی پر بڑا پیار آرہا تھا۔

یوں تو ان پندرہ بیس دنوں میں واقعی انہوں نے اپنی بات پوری کر دکھائی تھی۔ یعنی "اپنا مہمانِ خصوصی" بنا کر رکھا تھا۔

صبح کو زبردستی ناشتہ کرا کے بھیجتے۔ پیپر ختم ہونے سے پہلے اس کے سنٹر میں پہنچ جاتے ہیں اُسے کسی ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل میں لے جاتے۔ وہاں پر لنچ کھلاتے۔ گپ بازی کرتے۔ گھر چھوڑ جاتے۔ اور ساتھ ہی تاکید بھی کر جاتے کہ وہ دوپہر کو دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اگلے پیپر کی تیاری کرے۔

رات کے کھانے پر اگر وہ گھر ہوتے دونوں ساتھ کھانا کھاتے —— ورنہ نوکر کو تاکید کر جاتے کہ سجّو کا کھانا ٹرالی میں لگا کے اُس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ ہر رات شب بخیر کہہ کر جاتے۔

"کسی شے کی ضرورت ہے؟"

"یا کوئی تکلیف تو نہیں ——؟"

جیسے فقرے اتنی محبت سے کہتے کہ سجو کا دل چاہتا۔ اُن کی معطر اور خوبصورت
کر اس پر اپنی پیشانی رکھ دے۔

اگر ایسا چاہنے والا —— جو شفقتوں کا مرقع —— اور مردانہ وجاہت کا
تصویر ہے۔ ہمسفری کے لئے مل جائے۔ تو کسی لڑکی کو دنیا کی کوئی اور دولت درکار

کاش ——؟ مگر کاش کیوں؟

تجھے تو اپنے نصیبوں پر ناز کرنا چاہیئے۔ سجو بی!

نہ جانے کن آسمانوں سے یہ آواز آتی اور وہ اُن تکیوں کو اور بھی زور سے بازو
بھینچ لیتی۔

آج اُس کی یہاں آخری رات تھی۔ بظاہر کھُل کر اظہارِ محبت نہ ہوا تھا۔ مگر وہ کچھ
بے قرار نظر آ رہی تھی —— اُس کی آرزوئیں جلتی ہوئی لکڑیوں کی طرح چٹخ رہی تھیں
بھی ہو۔ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔

کیا کہتی ——؟

اور کس طرح کہتی ——؟

جبکہ عابد بھائی خود بھی کھُل کر سامنے نہیں آ رہے تھے۔ ایک دن بھی تو انہوں
لفظ بھائی پر اعتراض نہیں کیا تھا اور یہی ایک بات تھی جو اُس کو اکثر دوسرے پہلو پر
پر مجبور کر دیتی۔

پتہ نہیں عابد بھائی اتنے عجیب اور پُرکشش کیوں نظر آتے ہیں ——؟

پتہ نہیں تنہائی کی زندگی کس طرح اُنہیں راس آ گئی ہے۔ کتابیں ——
سگریٹ، کار، ہوٹل۔ بس یہی تو اُن کی زندگی کے لوازمات تھے۔

اش میں اُن کی زندگی کے سارے پھیکے رنگ نکھار دوں۔

میں تو اپنی جان تک اُن کے قدموں میں نچھاور کر دوں۔ اگر قسمت کو یہ ملن منظور ہو تو ——
پھر اُن کی وہ متحرک انگلیاں اُس کو یاد آ گئیں —— ہائے اللہ —— اُس نے تکیوں
زور سے بھینچ لیا۔ ان ہاتھوں کا لمس کتنا جان لیوا تھا۔

پھر وہ سہم کر سیدھی لیٹ گئی۔ اور اُس کو محسوس ہوا، اُس کا جسم جل رہا ہے۔

ائرکنڈیشنڈ کمرہ ہو —— فضا موتیے کے پھولوں سے بسی ہو —— ہلکا نیلا بلب
ن ہو —— ہر سمت خاموشی ہو —— اور کسی کی گرم انگلیاں جسم پر چیونٹیوں کی مانند
رہی ہوں۔ تو پھر نیند کس کافر کو آ سکتی ہے؟

ماحول بھی جذبات پر کس قدر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

وہ اپنے پر خود ہی حیران ہونے لگی۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ کچھ اور تھی —— اور اب کچھ اور ہو گئی تھی ——

یہی دن اور رات میں فرق ہے!

اُس نے سرہانے کی سمت آہٹ محسوس کی۔ پھر دو مضبوط انگلیاں اُس کے بالوں میں
گئیں اور دو سخت بازوؤں نے اُسے اپنے ہالے میں لے لیا۔ انگلیاں اُس کے سارے
پُرسحر جال بننے لگیں۔ اور جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب یک بیک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی
کے سینے پہ بیٹھا اُس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ ہڑبڑا کر جو وہ اُٹھی تو چاروں کھونٹ قبر جیسا
اندھیرا تھا۔ اُس کا دم گھٹ رہا تھا اور آنکھوں کے آگے خودساختہ جن بھوت ناچ رہے
اور وہ پسینے میں تر بتر ہو رہی تھی۔ اپنے دھڑ دھڑاتے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اس کا
ردِّعمل تو یہی تھا کہ زور زور سے چلاتے ـــــ مگر نہ جانے کسی غیبی طاقت نے اس کا
بند کر دیا۔ جب ذرا اُس کے اوسان بجا ہوئے۔ تو اُسے صورتِ حال کا علم ہوا۔ بجلی رات
کسی پہر فیوز ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے ایرکنڈیشنر بند ہو گیا تھا اور بلب بھی بجھ چکا تھا۔ کمرہ
میں گھٹن ہو گئی تھی۔ اور اندھیرا اس گھٹن کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہا تھا۔

ایسی صورتِ حال کے متعلق تو اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اب جو حالات کا جائزہ
تو جان میں جان آئی ورنہ اُس نے تو فوری طور پہ یہی سمجھ لیا تھا کہ لوگ اُسے لق و دق قبرستان
میں چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود اُس کے ڈر میں کمی نہیں آئی۔ وہ
جلد از جلد روشنی کرنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کے پاس موم بتی تھی نہ ماچس
اُس نے اُٹھ کر عابد بھائی کی میزیں ٹٹولنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہیں پر اُن کی سگریٹ

بھی ہوتی تھیں۔ قدم پلنگ سے نیچے رکھ کر اُس نے اوپر اٹھا لیا۔ اگر ماچس بھی نہ ملی
کہیں کا راستہ بھی نہ ملا تو جانے وہ کس کونے میں جا کر گرے گی۔ اب کم از کم بستر پہ تو پڑی تھی
کہیں کسی اور مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔

وہ دل کڑا کر کے وہیں بیٹھی رہی کہ شاید ابھی بجلی آ جائے۔ کمروں میں سونے کی یہی مصیبت
ہے۔ وہ دل ہی دل میں کھولنے لگی۔
باہر اور کچھ نہیں تو ستاروں کی روشنی وحشت دُور کرنے کو راہبری کرتی ہے۔ پھر اگر چلانا پڑے
تو آدمی سُن سکتے ہیں۔ یہاں اندر ہی دم گھٹ جاتے اور کسی کو خبر نہ ملے ـــــ اور اس پر
یہ طرز کے تعمیر شدہ گھر..... اونھ کمرے نہیں یہ ڈربے ہیں۔ اتنی تو نیچی چھتیں ہوتی ہیں
کی ـــ اس پہ ایک ہی دروازہ ـــــ روشن دان کا نام نہیں۔ ایک کھڑکی ہے سو وہ
ـــ پردے لٹکانے کو ـــ کون کھولتا ہے اس کو ـــ جانے کیسے کھلتی ہے ـــ؟
پہلی بار اُسے اپنے گاؤں کے بڑے بڑے روشن کمرے اور دالانوں کا خیال آیا ـــ
یہ کمرے ہیں کہ قبریں ـــــ
ایرکنڈیشنر کے بغیر ان لوہے اور سیمنٹ کے پنجروں میں کوئی نہیں رہ سکتا اور جو
ایرکنڈیشنر بند ہو جاتے تو دم گھٹ کر رہ جائے۔
یہی کمرہ جو ـــ چند گھنٹے پیشتر اُس کے سجے سجائے ارمانوں کو حجلۂ عروسی لگ رہا
تھا اب اُسے مرگھٹ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اور گھر میں کوئی عورت بھی نہ تھی۔ جسے آواز دے
کر بلا لیتی۔ اب اس وقت وہ عابد بھائی کو بھی نہ پکار سکتی تھی۔ کوئی تُک ہے انہیں
جگا کر بتانے کی کہ ـــ اسے ڈر لگ رہا ہے ـــــ بھئی لعنت ہے ان حالات

وہ ٹھنڈی سانس چھوڑ کر دوبارہ لیٹ گئی۔ اب جو ہو ـــــ سو ہو ـــــ
لیکن دوبارہ لیٹتے ہی اُسے باہر کچھ عجیب و غریب شور سنائی دیا۔ پہلے تو اُسے

سمجھ نہیں آئی ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا ۔ جیسے کتے اور بلیاں آپس میں لڑ رہے ہوں۔
ان آوازوں میں ڈھول پیٹنے کی آواز بھی شامل ہوگئی ۔ پھر کچھ بھنبھنانے کی بیہودہ آوازیں
شامل ہوگئیں۔

ابھی وہ مارے خوف کے سکرات کے عالم میں ہی تھی کہ یکایک کسی نے اس کے کمرے
کی کھڑکی پر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے ——— اب تو اس کی جان ہی نکل
گئی ———

اب ضرور کچھ ہو کر رہے گا ——— یہ سوچتے ہی اس کے جسم کا سارا خون خشک
ہو گیا۔

"کون ہے ———؟" اس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے خوف زدہ آواز میں
"کون ہے ———؟" دوبارہ پوچھا ——— مگر وہ آواز دور ہو گئی۔
ڈھول پیٹنے کی آواز کبھی نزدیک ہو جاتی کبھی دور ——— اور پھر بیٹھے بٹھائے
اُسے یاد آ گیا۔ ایک دن راضی آپا اسے بتا رہی تھیں کہ اس کوٹھی میں جن بھوت ہیں۔
اس وقت سب کو اُسے بے وقوف بنانا مقصود تھا۔ مگر رات کے اس لمحے میں ان
تمام باتیں سچی معلوم ہونے لگیں اور اسے خیال آیا ——— اگر کچھ منٹ اور یہی عمل جاری رہا
تو اُس کی جان ہی نکل جائے گی۔

بہتر ہے وہ عابد بھائی کو جگا دے ——— یہ سوچ کر ——— لرزتے کانپتے
اس نے زمین پر پاؤں رکھا ——— پہلے اندازے سے غسل خانے کی سمت معین کی
اور پھر گرتی پڑتی . . . سنبھل سنبھل کر قدم دھرتی . . . غسلخانے کے دروازے تک جا پہنچی
——— جلدی سے دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔

ایک ثانیے کے لئے اُسے خیال آیا کہ بے دھڑک ان کے کمرے میں جانا مناسب نہیں
اس لئے جو دروازہ اُن کے کمرے میں کھلتا تھا، اُس کے ساتھ منہ لگا کر اس نے

ترنم کر دیں۔
انہوں نے کہاں سُنی ہوں گی یہ آوازیں ———؟ کیونکہ باہر کی بھیانک آوازیں
بڑھ گئی تھیں۔ اور ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس
لگ رہا ہے کہ بھوت اب اس کے کمرے میں گھس آئے ہیں ۔ اس کو جھرجھری آ گئی۔ اس مرحلے
پر اس نے ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھا اور اپنی طرف کی چٹخنی کھول کر عابد بھائی کے کمرے
میں چلی گئی۔ پریشانی میں اُس نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا کہ اُن کے کمرے کا ایئرکنڈیشنر بدستور
چل رہا تھا۔ البتہ کمرے کی بتیاں گُل تھیں۔ ایئرکنڈیشنر کی سُرخ موہوم سی بتی کی روشنی میں اُس
نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عابد بھائی کا پلنگ تلاش کیا۔ اور دوڑ کر ان تک پہنچ گئی۔
"عابد بھائی، عابد بھائی۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُن کو جھنجوڑ ڈالا۔
آج نہ جانے ان کی نیند گہری ہو گئی تھی یا سجو کے جھنجوڑنے کو وہ ایک خوبصورت سپنا
سمجھ رہے تھے۔ جب سجو نے جھنجھلا کر رونا شروع کر دیا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ "کون ہے۔
کون ہے ———؟" سجو باقاعدہ رونے لگی!
"ہیں . . . . ہیں . . . کون ہو تم بھئی۔" انہوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتے
ہوئے کہا۔

"میں ہوں ———!" یہ کہہ کر سجو پھر رونے لگی۔
"ارے تم ہو سجو۔ کیا ہوا میری جان ——— اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟ کیا صبح ہو
گئی ہے جو آئی ہو؟"
"نہیں۔ ابھی تو رات ہے ———" سجو نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔ "مگر مجھے ڈر لگ
رہا ہے۔"

"توبہ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں نے سوچا جانے کیا ہو گیا ہے۔ بھئی میں جو ساتھ
والے کمرے میں سو رہا ہوں۔ ڈر کس بات کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ غسل خانے والے دروازے

کھول دو۔

"نہیں۔ عابد بھائی میں اس کمرے میں نہیں جاؤں گی!" سجو دھم سے ان کے پاس آ گئی۔ "وہاں بھوت ہیں۔"

"بھوت ــــــــــ" عابد زور سے ہنسا۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے!"

"خدا کے لئے عابد بھائی! میرا مذاق نہ اڑائیے۔ ورنہ صبح آپ میری لاش وہاں پائیں گے ... میں یہاں قالین پر سو جاتی ہوں ..." اُس نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ "مگر وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی" اور وہ سچ مچ پلنگ سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ فرش پر ــ

عابد حسین نے بازو لمبا کر کے سجو کو بازو سے پکڑا اور اُس کا سر اپنے سینے پر رکھ دیا اور ...

"یہ سینہ کس لئے بنا ہے۔ تمہارے لئے تکیے کا کام دے گا۔ آج ہی نہیں ساری عمر بھی!"

اس کے سینے پر سر ٹکاتے ہی سجو کا سارا خوف دور ہو گیا۔ بلکہ وہ مدہوش سی ہو گئی جیسے کسی انتہائی محفوظ مقام پر پہنچ گئی ہو۔ "یہ بری بات ہے ــــ" اُس کے اندر سے شرماتی سی آواز آئی۔

مگر رات والے جذبات عروسی جوڑا لے کر اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اسے کچھ نہیں کہا ... زور سے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر۔ ہولے ہولے اُس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ جیسے وہ ایک ننھی بچی ہو۔ اور خواب میں ڈر گئی ہو۔ اب عابد ایک شفیق باپ کی مانند اسے تھپک رہا ہو۔

اُس کی انگلیوں کے مس نے سجو کے رونگٹے رونگٹے میں انگارے بھر دیئے۔

اور یہ عابد خوب جانتا تھا۔ وہ تو لڑکی کو خود سپردگی کے دورے پڑا دیتا تھا۔ اس پر اپنا آپ نچھاور کر دینے والا عالم طاری کر دیتا تھا ... وہ مجبور اور گھومنا کا عادی نہ تھا ... اُس کے بہت سے گر آزمائے ہوئے تھے ...

ن ہو جانے والی اسٹیج پہ لے آیا تھا۔ اور جب لڑکی سود و زیاں سے بے نیاز ہو

وا، نچھاور ہو جانے پر آمادہ بیٹھی ہو تو کوئی احمق ہی موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے

عابد حسین کی تو اس پہ دو سالوں کی محنت نکھر آئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دو دفعہ مُلازم بلانے کے لئے آیا۔ مگر وہ ناشتے کے لئے نہ جاسکی۔ ناشتے

عابد حسین اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمّت نہیں پا رہی تھی۔

اُف رات کو کیا ہوا ——— ؟

وہ بار بار سوچتی مگر اُسے سمجھ نہ آتی۔

رات کیسے بیتی۔؟ ساری باتیں تصویروں کی مانند بار بار اُس کے ذہن میں گھو

تھیں . . . کبھی اُسے محسوس ہوتا جیسے کلیوں اور پھولوں کے جلو میں وہ کہکشاں کو

ہے۔ اور کبھی یوں معلوم دیتا جیسے اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے۔

وہ صرف خواب تھا ———

فلم تھی ———

یا محض رات کو پڑھا ہوا کوئی افسانہ

مگر نہیں ——— وہ فلم تھی نہ خواب نہ افسانہ۔

وہ تو سب حقیقت بن کر نظر کے سامنے تھا۔

اب وہ اس عابد حسین کا سامنا کیسے کر سکتی تھی؟ جو شادی سے پیشتر ہی ا

پچا تھا۔

صبح سے اب تک اُس نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔

صبح جب وہ اٹھی تو وہ بستر میں تنہا تھی۔ پہلے تو کتنی دیر اُسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کہاں ہے؟

مگر جب نیند پوری کھلنے پر سب باتیں اُس کو یاد آنے لگیں تو وہ سخت حیران

یوں ہے۔؟

ہوئی۔

ایسا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے!

نہ اُس نے ایسا کبھی سوچا ——— نہ ایسا چاہا ——— واقعات اور حالات انسان

کبھی کن دو راہوں پہ لے آتے ہیں۔

وہ بستر سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ مگر وہ بدل گئی تھی۔

نہ ڈھول بجا نہ شہنائی گونجی۔

اور وہ کسی کی ہو بھی گئی ———

کیا اس طرح کسی کے ساتھ تن من کا سودا کرتے ہیں۔؟ وہ تو بڑی روایت پسند تھی! وہ سب

روایتی انداز میں چاہتی تھی۔

جو باتیں اور فعل خود بخود سرزد ہو جائیں۔ ان میں قدرت کی رضا اور انسان کی بہتری ہوتی

نے رات کو عابد کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔

اُف اُس کے وہ والہانہ انداز ——— اور محبت کی قسمیں ——— اور جب اُس نے سچ

پہ ہاتھ رکھ کر اُس سے شادی کرنے کی قسم کھائی تھی . . . تو پھر . . . گھبرانا کیسا۔

جانے اُس کے قدم کیسے پڑ رہے تھے؟ سوچنا کچھ چاہتی اور سوچا کچھ جاتا۔

بچی بات تو یہ ہے کہ اُس نے جی بھر کے اپنے ضمیر کو ملامت کرنی چاہی۔ اپنے آپ کو

ٹھہرا کر بُرا بھلا کہنا چاہا۔ رونا چاہا۔ چیخنا چاہا ——— اپنی بدقسمتی کا ماتم کرنا چاہا ———

اور عابد حسین کو فریبی اور دغا باز کے الزامات سے نوازنا چاہا۔۔۔ مگر
نہ کرسکی۔ جب بھی وہ اپنے ضمیر کو جھنجوڑنے اور حالات کو کوسنے کا موڈ بناتی۔ ایک
اور خود سپردگی کی حالت اس پر طاری ہونے لگتی۔

سچ پوچھو تو یہ سب ہو جانے کا اُسے ذرا بھی قلق نہیں ہو رہا تھا۔ عابد حسین کی
محبت جو اسے مل گئی تھی۔

اور کیا اپنی چاہت میں وہ اتنی آگے نکل آئی تھی کہ اپنے وجود کا جوہر گنوا کر
تھی۔ بلکہ مطمئن تھی۔ کہ امانت بہر حال اسی کی تھی۔

نہیں ——— یہ عابد حسین کی خوبصورت باتوں کا سحر تھا۔ جو وہ تمام شب اُس
کانوں میں پھونکتا رہا تھا۔ اور اُس کے پیکر سے کھیلتا رہا تھا۔۔۔۔

ہاں وہ بڑے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر مذہب اور محبت کا آج ملا
نہیں ہو سکا۔ وہ کپڑے اٹھا کر غسل خانے میں چلی گئی۔

کیا وہ نئی نویلی دُلہن تھی - ؟

تو پھر اس - سہاگ رات کو کیا نام دیا جائے ؟

کیا ہی اچھا ہوتا یہ سب اگر شادی کے بعد ہوتا ——— ؟

تو شاید دِل میں یہ ہلکی ہلکی چبھن نہ ہوتی ——— ؟

اونھ ——— !

شادی کیا ہے ——— ؟

جب شاور کی ٹھنڈی ٹھنڈی، اور ننھی ننھی پھواریں اُس کے خوب صورت جسم پر
تو سارے خیالات یک دم بدل گئے۔ شادی بھی تو ایک اقرار نامہ ہے۔ جو دو انسانوں
درمیان ہوتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی اس قسم کی زندگی گذارنے کا ایک پروانہ رضامندی بھی!

پروانہ یا اقرار نامہ ساری پبلک کے سامنے نہ حاصل کیا۔ دو ہستیوں نے دُنیا سے چُھپ
مقصد تو وہی ہے نا؟ دونوں ایک دوسرے کے وفادار رہوں اور خدا کو حاضر و ناظر
اپنا آپ ایک دوسرے کے حوالے کر دیں تو یہ گناہ نہیں۔

شادی صرف قاضی جی کے رجسٹر، لوگوں کی بھیڑ اور پلاؤ فرنی کا نام نہیں ہے۔
اسی بندھن کا نام شادی ہے۔

آج سے ہم ایک دوسرے کے ہو گئے۔ میری تو اب جان بھی عابد حسین کے نام وقف

نہا دھو کر، اور تیار ہو کر اس نے جب گھڑی دیکھی تو گاڑی کا وقت نکل چکا تھا اور مُلازمہ
ناشتے کے لئے بُلانے آیا تھا۔

"میں ناشتہ نہیں کروں گی۔"

جیسے وہ اپنی نظروں سے آپ چُھپ رہی تھی۔

کاش یہ سب شادی کے بعد ہوتا۔ اس کے اندر مسلسل کوئی شے بولے جا رہی تھی۔
تب اُس کے غسل سے پہلے ولیمے کا شاہانہ جوڑا یہاں تیار رکھا ہوتا، ساری بہنیں اُسے
سجانے بنانے کو یہاں بے کل کھڑی ہوتیں۔ اور ساری سکھیاں، سنگیاں چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناک
میں دم کر دیتیں۔

کیا ہوا ——— ؟

کیونکر ہوا ——— ؟

کیسے کیسے وہ لجاتی، مسکراتی، شرما جاتی ——— کچھ کہہ جاتی، کچھ چُھپا جاتی ———
اور وہ گدگدی کر کے اُس کی جان کو آجاتیں ——— تب وہ اُن کو قسمیں دیتی ———
پھر سے اچانک عابد حسین آجاتا۔ تو ساری کی ساری باہر بھاگ جاتیں۔
اُس کے چہرے پر اتنی سُرخی دیکھ کر عابد پوچھ بیٹھتا ——— کیا ہوا ہے رانی ——— ؟ اور

یہ لڑکیاں تمہیں کیوں تنگ کر رہی تھیں ؟"

تو اُس سے پلکیں نہ اٹھائی جاتیں۔

"ہائے اللہ راہ زن پُوچھ رہا ہے کہ کیسے لٹیں تم ——؟"

لیکن ——

مُلازم پھر دوسری مرتبہ آمودار ہوا ——

"جی! صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک آپ نہیں آئیں گی۔ وہ ناشتہ نہیں کریں گے۔"

"اُن سے کہہ دو مجھے بھوک نہیں ہے۔ وہ ناشتہ کریں۔" اُس نے جھجکتے ہوئے یوں جیسے مُلازم نے بھی اُس کی چوری پکڑ لی ہو۔

مگر وہ اب عابد حسین کے سامنے جانے کا حوصلہ کہاں سے لائے گی۔ جنھیں وہ ہمیشہ عابد بھائی کہتی آئی تھی۔

ایک اور بات بھی اُس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ دل سے نہ سہی پر اوپر اوپر سے اُسے فا... پر اپنی خفگی ظاہر کر کے رُعب ڈالنا چاہیئے کہیں وہ اسے ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھ بیٹھے...! سوچ کر اُس نے خیالوں ہی خیالوں میں مضمون باندھنا شروع کئے کہ.... آپ نے میری مجبوری سے فائدہ اُٹھایا..... میں آپ کو شریف آدمی سمجھتی تھی.... خاندان کا ایک فرد بن کر رہ رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ابھی وہ خیالوں کے تانے بن رہی تھی کہ دروازہ کھُلا اور عابد حسین اندر داخل ہوا۔ سجّو سے نظر نہ اٹھائی گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں پہ جم گئی۔

اُس کو اس قدر سنجیدہ دیکھ کر عابد حسین ٹھٹکا۔ پھر آگے بڑھ آیا۔ اور محبت سے بولا۔

"سجّو تم ناشتے کے لئے کیوں نہیں آئیں۔؟"

سجّو نے فوراً تقریر کرنا چاہی۔ مگر نہ جانے کیسا حجاب تھا کہ اُس کی زبان کو گونگا لگ گیا اور...

...نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

عابد نے اُس کی خاموشی کو کسی طوفان کا پیش خیمہ سمجھا۔ جلدی سے اُس کے قریب آیا۔ ...ہو اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ بچّوں کی مانند اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور لجاجت ...ے بولا۔

سجّو! میری جان! مجھ سے خفا مت ہونا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ رسُولؐ کیلئے ...ے معاف کر دو۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھ سے بہت بڑی خطا ہو گئی ہے۔ تم جیسی مقدس اور ...عصمت لڑکی کے حضور اس طرح نذرانۂ الفت نہیں پیش کرنا چاہیئے تھا۔ مگر بتاؤ —— ...یا کرتا میں —— کیا کرتا —— بولو ——؟

اتنے عرصے سے تمہیں پُوج رہا تھا۔ تمہاری اس بیکراں چاہت کو تو میں نے اپنے آپ ...ے بھی چھپایا ہوا تھا۔ مبادا مجھ بدنصیب کی نظر لگ جاتے.... سوچتا تھا میری قسمت میں ...و محرومیاں ہیں —— اس لئے اسے دُور دُور سے چاہوں گا۔ اس کے قریب نہیں ...جاؤں گا —— اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ زندگی کی پاکیزہ اور فرحت بخش صُبح سمجھ کر اس کی ...پرستش کئے جاؤں گا۔ اُس کی چوکھٹ پہ جبینِ نیاز کے سارے سجدے کرتا جاؤں گا مگر ...... رات....... رات جب تم اچانک آ گئیں..... اور اس قدر قریب آ گئیں ...... تو...... میں اپنے ہوش کھو بیٹھا.... دیوانہ ہو گیا —— پاگل بن گیا ——

یا اللہ مجھے کیا ہو گیا تھا ——؟

...یری چاہت کا تیز و تند طوفان مجھے بہا کر لے گیا۔

مجھے خود پر اور اپنے افعال پر اختیار نہ رہا —— تم ہی بتاؤ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنے ...آپ پر قابو رکھ سکتیں ——؟"

سجّو بُت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

"سجّو پیاری بتاؤ نا؟" اُس نے سجّو کو جھنجوڑا۔

پہلی بار سجّو نے نظر اُٹھا کر اُس کے چہرے کو دیکھا

اُف کس قدر کرب اور کتنی ندامت تھی اُس کے چہرے پہ۔

سجّو کو ایک دم اُس پر ترس آنے لگا۔

"میں تو اپنا قصور مانتا ہوں سجّو۔ مجھے سو جوتے مار لو ——— میرے مُنہ پر تھوک دو۔ مگر رانی ——— یوں مجھ سے خفا نہ رہو۔

میں مر جاؤں گا۔ ایک تو ندامت کا بوجھ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ اُس پر تمہاری نفرت مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔

سجّو..... سجّو..... وہ دیوانوں کی مانند چلّانے لگا ——— مجھے اپنے اوپر اختیار نہ رہا ——— اتنے عرصے کے زہد و تقویٰ کو میں نے بالائے طاق کیوں رکھ دیا ——— میں پتھر سے انسان کیسے بن گیا۔ اور تمہارے وجود کی گرمی نے مجھے موم کی طرح کیوں پگھلا دیا.....

سجّو! تم میرے کمرے میں کیوں آئیں ———؟ میں کہتا ہوں۔ میرے جذبات کو تم نے بے نقاب ہونے کا موقع کیوں دیا ———؟ اب اپنی نظروں میں خود ذلیل ہو رہا ہوں۔ تمہیں نہ پا کر میں زندہ رہ سکتا تھا۔ مگر تمہاری نظروں سے گر کر میں زندہ رہنا پسند نہ کروں گا۔ کاش اس لمحے مجھے موت آگئی ہوتی..... میں مر گیا ہوتا۔ وہ رونے لگا.....

یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اور سجّو بے قرار ہو گئی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ....." اُس نے دونوں ہاتھوں سے عابد کے بازوؤں کو پکڑ کر اُسے کھڑا کر دیا۔

"پہلے مجھے بتاؤ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو۔" عابد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"مگر..... مگر..... اب....." سجّو ہکلانے لگی۔

"خدا کے لئے سجّو مجھ پر اعتبار کرو۔ تمام رات بھی تمہیں سمجھاتا رہا ہوں۔ اور اب بھی تمہارا انہی پشیماں جوانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارا ہوں ——— ہمیشہ ——— دمِ آخر تک تمہارا رہوں گا۔

آج سے تم میری بیوی ہو ——— میری جان ہو ——— میری آرزو ہو ——— میرا ایمان میری عزت ہو ——— بس۔ کہو تو لکھ دوں سب کچھ ———"

سجّو دھیرے سے مسکرائی۔

"لیکن....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں ———" عابد جلدی سے بولا۔ "میں چاہوں تو ابھی اسی وقت تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ مجھ پہ کسی کا دباؤ نہیں ہے۔ اور کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ تمہاری بڑے سے التوا میں ڈال رہا ہوں۔ حالانکہ تم جانتی ہو اب تمہارے بغیر میں ایک دن بھی بسر نہیں کر سکتا..... لیکن تمہارے بابا کا خیال آتا ہے..... اُن کا اعتماد پامال ہو جائے گا۔ تم بی اے کر لو تو۔ دنیا کو سہرا باندھ کے اور گھونگھٹ نکال کے بھی دکھا دیں گے..... لیکن تب تک ہم ایک دوسرے کے ہیں..... اور یاد رکھو کہ میاں بیوی ہیں۔"

سجّو کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ اس کو بار بار شرم آ رہی تھی۔

"لیکن عابد بھائی ———"

"عابد کہو عابد ——— بلکہ میرے عابد کہو ——— اُس نے اپنے ہاتھ سے سجّو کی ٹھوڑی اُٹھائی..... "بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو ———؟"

"میری ٹرین تو نکل گئی ہے۔ اب میں کونسی ٹرین سے جاؤں گی۔"

"اب تم نہیں جاؤ گی۔"

"کیا کہا ———؟" وہ گھبرائی۔

"میرا مطلب ہے اس طرح مجھے تڑپا کر نہیں جا سکتیں۔"

"لیکن عابد۔ میں گھر اطلاع دے چکی ہوں۔ گھر والے کیا سوچیں گے؟"

"گھر والوں کو ایک ادھ اطلاع بھجوا دو۔ کہ پرچوں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بخیال مجھے ہو
گئے۔ اس لئے ایک ہفتہ رکنا پڑے گا!"

"بہت چالاک ہیں آپ۔ مگر میں رکوں گی نہیں۔"

"کیسے نہیں رکو گی؟ اب قانوناً تم پر میرا حق ہے۔"

"اللہ پلیز مجھے جانے دیں!"

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" عابد ایک دم آزردہ ہو گیا۔

"اب معافی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جب تو نے کہا مان گئے، مان گئے ہم

"ایسے نہیں ——؟"

"تو پھر کیسے ——؟؟؟"

"میرے گلے میں بانہیں ڈال دو۔ تب ہم جانیں۔"

"ہائے۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔"

"کیوں نہ ہو سکے گا۔ ہم سب کچھ سکھائیں گے۔" اس نے زبردستی سجو کی بانہیں پکڑ لے
اپنی گردن میں ڈال دیں۔ "یہ بانہیں صرف اسی لئے بنی ہیں۔ سُنا۔؟"

سجو شرمانے لگی۔

"اچھا تو پھر ایک ہفتے کے لئے ٹھیر رہی ہو نا؟"

"پتہ نہیں —— میں تو ——"

"نہیں نہیں —— تم ایک ہفتہ رکو گی —— میرے پاس رہو گی بے
قریب —— میں اپنی زندگی کی ساری باتیں تم سے کروں گا —— سارے بوجھ
کروں گا —— تم کو اچھی طرح اپنی بناؤں گا۔ پھر تم جا سکو گی!"

سجو نے شرما کے اور بے بس ہو کے گردن ڈال دی۔

اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اُسے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

ادھر آؤ" عابد نے

یا ہے؟ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

کس قدر خوبصورت لگ رہی ہو۔ ذرا اپنی تاب آج خود لگا کے دیکھو تو جانیں ——؟"

آج ——؟" سجو نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

بھی —— یہ اپنا آج کا رُوپ . . . . اور ہمارا حال تباہ دیکھو ۵

"تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی"

پھر وہ اگلا ایک سال سجّو کی زندگی میں خوشیوں، مسرّتوں اور حیرتوں کے ایسے بے بہا خزانے لایا کہ اسے اپنی قسمت پر سو سو بار خود رشک آیا۔

کیا اس روئے زمین پر کوئی لڑکی اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہے۔ ایک خوبرو، خوش باش امیر و کبیر سوسائٹی میں ہر دلعزیز مرد ——— اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہے۔ اُس کی ہر اِک ادا پر ہزار بار قربان جائے ——— اُس کے ابرو کے اک اشارے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے۔ اس کے لئے آنکھیں فرش راہ کرے۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر صبح کی ابتدا کرے اور اُس کے چہرے پر نظریں جمائے شام کر دے۔ اور سدا ایسا ہی رہنے کا اقرار کرے۔

اگر کسی لڑکی کو زندگی میں اتنی بڑی خوشی میسّر آجائے تو وہ ساری دنیا کو ٹھوکر مار دیتی ہے۔ میں آنے والی رکاوٹوں کا اور طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اور بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتی ہے۔

سجّو کی راہ میں تو صرف ایک ہی دیوار تھی۔ اور اُسے ڈھانے میں اُسے دیر نہیں لگی۔ البتّہ اس کا ردِ عمل ابھی تک سارے خاندان میں ہو رہا تھا۔

ادھر سجّو کا ایف۔ اے کا رزلٹ آؤٹ ہوا اُدھر اُس نے اپنے دل میں آئندہ زندگی کا پروگرام بنالیا۔ رزلٹ کے انتظار میں یہ ساری چھٹیاں انتہائی بے کیف اور تڑپتے ہوئے گزری تھیں۔ اب عابد حسین سے دُور رہنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ آنکھیں بند کر کے جب کھولے تو عابد حسین کی معطر آغوش میں ہو۔ مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ رزلٹ کا انتظار کرے۔ عابد حسین نے بھی اُسے یہی گُر سکھایا تھا۔ اگر اس کی کیفیت کا گھر میں کسی کو ذرہ برابر بھی علم ہو جاتا تو اُس کی پڑھائی بند کرادی جاتی جو اُسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔

پیچھے اُس کے بہت اچھے ہو گئے تھے۔ اور اب وہ لاہور جانے کے لئے ایک ایک دن کانٹوں پر بسر کر رہی تھی۔

رزلٹ آؤٹ ہوا تو اُسے یقین ہو گیا کہ قدرت واقعی اس پر بڑی مہربان ہے۔ کیونکہ اُس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ بلکہ اسکالر شپ بھی ملا تھا۔ اور اب اسکالر شپ کو ضائع کرنا فضول تھا۔ اس نے بی۔ اے میں داخلہ لینے کو رختِ سفر باندھا۔ اور بابا کے کانوں تک یہ بات بھی اماں کے ذریعے پہنچادی۔ بابا اب اُس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ شیر افگن کے والد کی طرف سے بہت تقاضا ہو رہا تھا اور چونکہ شیر افگن نے صرف بی اے پاس کیا تھا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ سجّو بی اے میں داخلہ لے۔

اُنہوں نے اماں کی معرفت سجّو کو اپنا عندیہ کہلوایا تو اُس نے رو رو کر جان گنوانی شروع کردی۔

"خدا کے لئے مجھے بی اے تو کر لینے دو۔ میرے اوپر یہ ظلم نہ کرو۔"

اماں پسیج گئیں۔ اور بابا نے اُسے لاہور کے لئے روانہ کر دیا۔ لاہور آکر اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بابا کو ایک چِٹھی لکھ دی اور اُس میں صاف لکھ دیا کہ وہ شیر افگن سے ہرگز شادی نہیں کرے گی۔ اگر اس کی منگنی نہ توڑی گئی تو وہ زہر کھالے گی۔

نہ صرف یہی بلکہ اُس نے اسی مضمون کا خط اپنے ماموں فضل دین کو بھی لکھ دیا۔ تاکہ شیر افگن تک یہ بات پہنچ جائے۔

اُس کا خط پڑھ کر شیر افگن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔"کمینی۔ لاہور جا کر آوارہ ہو گئی ہے
میں اُسے چُٹیا سے پکڑ کر لاؤں گا۔اور دیکھوں گا کس طرح مجھ سے بیاہ نہیں کرتی۔"

اُس کے زیرک باپ نے اُس کا غصّہ ٹھنڈا کر کے اُسے معاملے کی نزاکت کا احساس
دلایا اور کہا۔

"شور و غل نہ کرو۔آپس کا معاملہ ہے۔ دونوں خاندان ہی برادری میں بدنام ہو جائیں
گے۔ وہ لڑکی تو شروع دن سے ہی خودسر ہے اور کچھ بھائی صاحب نے بھی اُسے سر چڑھا رکھا
ہے۔ پہلے کوئی تدبیر لڑاتے ہیں۔ پھر سختی کریں گے۔"

دونوں باپ بیٹے جلال دین کے ہاں پہنچے۔ وہ میاں بیوی پہلے ہی سر پکڑے بیٹھے تھے۔
اِن دونوں باپ بیٹے کو دیکھا تو اور چکرائے۔ مگر جب بات کھلی تو دونوں ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے
نِکلے۔

جلال دین نے اپنی پگڑی آتار کر فضل دین کے قدموں پہ رکھ دی۔اور کہا کہ "سجیلہ کے خط کا
ذکر برادری میں کسی سے نہ کریں۔ ورنہ وہ کہیں مُنھ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے، کیونکہ برادری کا
ہر فرد سجّو کی مزید تعلیم کا مخالف تھا۔اور اب اس عُمر میں' جلال دین میں اتنے طعنے سننے کی
سکت نہیں رہی تھی۔

فضل دین نے ایک سچّے ہمدرد کی طرح اُن کی بات پر عمل کیا۔کئی دن تک اُن کے ہاں
اندر ہی اندر کھچڑی پکتی رہی ـــــ سجّو کو ڈراوے دھمکاوے کے خطوط لکھے گئے۔ جن کا
نے لکھ بھیجا کہ وہ اس کا ہوسٹل کا خرچہ بند کر دیں گے۔ ان دنوں عابد حسین نے اپنی جاب
سجّو کے لئے وقف کر چھوڑی تھی۔ اس لئے اُس نے بے دھڑک لکھ دیا کہ اسے ان کے پیسوں
کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نوکری کر کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے۔

اب پھر سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اور فیصلہ ہوا کہ سجّو کو پیار سے سمجھایا جائے۔ اور خود
شیر افگن اس سے ملنے لاہور جائے۔ ہو سکے تو اُسے ساتھ ہی لیتا آئے۔

...تو اُس کے ساتھ کیا آتی ـــــ؟ اُس نے تو شیر افگن سے ملنے سے ہی انکار کر دیا! اور
...کو صاف صاف کہہ آئی کہ میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ ہمارے گاؤں کا ایک لفنگا ہے
...پیچھا کرتا ہوا یہاں بھی آ پہنچا ہے۔" یہی نہیں اپنے بابا کو ایک دھمکی آمیز خط بھی لکھ دیا
...بھیج کر مجھے یوں پریشان کیا گیا تو میں لاہور چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔"

...بابا اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے واقف تھے۔ ڈر گئے۔ مگر اُس کے ہوسٹل سے
...برآمد ہو کر نکلتے ہی شیر افگن کے دل میں سجّو کی طرف سے بلا کی نفرت پیدا ہو گئی۔ اُسے احساس
...اِتنی خودسر لڑکی کبھی اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ اب جبکہ اُسے لاہور کی ہوا لگ چکی
...اُس کے لئے گاؤں کی ہو کر رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ بہتر ہے سجّو کو اپنے کئے کی سزا پانے
...کے لئے اُس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے۔

کچھ روز لاہور میں رہ کر اُس نے اپنے دل کو بہلایا۔ اس خلش اور بے چینی کو کم کیا جو سجّو
بے وفائی کی وجہ سے اُسے تڑپا رہی تھی۔ اور گھر واپس روانہ ہوا۔

جس وقت وہ اپنے سفر کی رُوداد سنانے کے لئے سجّو کے گھر میں داخل ہوا تو شام ڈوب
...رہی تھی۔ ڈھور ڈنگر اپنے اپنے تھانوں پر واپس آ رہے تھے۔ ہر ذی رُوح جیسے تھکا ماندہ
اپنے آشیانوں کو لوٹ رہا تھا۔ اُس کا دِل اُداس تھا۔ جسم تھکا ہوا تھا۔ اور ذہن پر قنوطیت
...چھائی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اُس کی نظر للّی پہ پڑی۔ اُس نے کم سِن بچیوں کی
...طرح سر پہ اپنا دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ اور کچّی ممٹی پہ بیٹھی مرغیوں کو آٹا ڈال رہی تھی۔ اور ساتھ ہی
...بھولپن بھری پھنکار سے۔ اُنہیں ڈربے کی طرف دھکیل رہی تھی۔

ڈوبتے سُورج کی سرخی مائل زردسی روشنی میں وہ انتہائی معصُوم اور حسین معلوم ہو رہی
...تھی۔ نئی نئی جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھنے والی تھی۔ شیر افگن کو اپنی بدلتی نگاہ پر حیرت ہوئی۔ جس طرح اس پر نکھار اُمنڈ رہا
...تھا، اُس کے انگ انگ سے ظاہر تھا۔ بس دو ایک سال میں سجّو سے بھی زیادہ سجیلی اور پُرکشش نکلے گی۔

اس نئے خیال پر شیرافگن جھوم جھوم اُٹھا۔ لاہور میں اُس کی جو بے عزتی ہوئی تھی
نظر پھوپھی کو بھی تلافی کی یہی صورت نظر آئی۔ اُس نے جلال دین کو بھی راضی کر لیا۔

لیکن شیرافگن کی دو مرادیں بر آئیں۔ دوسری یہ کہ وہ اِسی صورت میں سجّو سے
لے سکتا تھا۔ جلال دین بے چارہ انکار کر ہی نہ سکا۔ ایک بیٹی نہ سہی دوسری سہی۔
کی بھی اشک شوئی کرنا تھی۔ ورنہ اگر وہ برادری کے سامنے اس مسئلے کو پیش کر دیتے تو سارے
گاؤں میں ان لوگوں کی کیا آبرو رہ جاتی۔ یہ ضرور ہے کہ بلّی اور شیرے کی عمر میں پندرہ سال
فرق تھا۔ مگر اس فرق کو کون دیکھتا ہے۔

ساری برادری میں بلّی اور شیرے کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ سبھی انگشت بدنداں
کہ "شیرے کی منگ تو سجّو تھی"۔

"سجّو کو پڑھنے کا شوق ہے۔ وہ ابھی بہت سا پڑھے گی۔ شیرا جلد شادی کرنا چاہتا تھا
اس لئے بلّی سے اس کی منگنی کر دی گئی ہے۔"

اگرچہ برادری والوں نے یہ عذر بالکل نہ مانا۔ انھوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ سُو سُو
کھود کرید کی ——— مگر ان دونوں گھرانوں نے جو ایکا کر لیا تھا۔ اس پر قائم رہے۔ بات ڈیوڑھی
سے باہر نہ نکلی۔ البتہ شیرے نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میٹرک کا امتحان دیتے ہی
کی شادی کر دیں۔ اس سے زیادہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ——— اور بھلا جلال دین ایسا
کرتا۔ توبہ توبہ دودھ کا جلا تھا وہ۔ چھاچھ کیوں نہ پھونک پھونک کر پیتا۔

سو اندر ہی اندر شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بلّی نے سُنا تو اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا
وہ کل تک جسے اپنا بہنوئی سمجھ رہی تھی۔ وہ اُس کا منگیتر کیسے بن گیا؟ مگر اُسے کچھ بھی
سوائے اس کے کہ شیرے کو دیکھتے ہی اندر بھاگ جاتی اور کوٹھری میں چھپ جاتی۔ گو کہ
اُس کے من کے خفیہ خزانے کا کھوج لگانے اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

گو کہ سجّو سے سارا گھرانا ناراض تھا۔ مگر جب اُس نے بلّی اور شیرے کی منگنی کی خبر سُنی

ـے دیوانی ہو گئی۔
دیا، شیرے کا جوڑ بلّی ہی ہو سکتی تھی۔ بھلا اس کا اور شیرے کا کیا جوڑ ——— ؟" اُس کا
بارادہ چیخ کر ساری کائنات کو اپنی خوشی میں شامل کر لے۔ اور اتنا ناچے کہ زمین اُس کے
تلے تھرّانے لگے۔

ویسے اب وہ بہت عمدہ ناچنے لگی تھی۔ عابد حسین نے ہر قسم کا مغربی رقص اُسے
سکھا دیا تھا۔ ہفتے کی شام آ کر وہ اُسے ہوسٹل سے لے جاتا۔ بن ٹھن کر اتراتی ہوئی وہ اس
کے ساتھ کسی ہوٹل میں چل دیتی۔ وہاں وہ لوگ ڈنر کھاتے۔ رقص ہوتا۔ اور رقص میں بھی۔
کی اجازت سے عابد حسین تھوڑی سی پی لیتا اور اکثر دونوں رات ہوٹل ہی میں بسر کرتے۔
اسی بہانے سجّو نے لاہور کے بڑے بڑے اور مشہور سبھی ہوٹل اور ان کی رہائش دیکھ ڈالی
تھی۔

در پردہ تو دونوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ مگر ابھی دُنیا
سے پردہ تھا۔ سجّو نہیں چاہتی تھی کہ "گل افشاں" میں ابھی کسی کو ان کے تعلقات کا علم ہو۔ اس لئے
عابد حسین کے ساتھ ہوسٹل سے ہی باہر چلی جاتی۔ یہ بات نہیں کہ اُس نے "گل افشاں" میں
جانا ترک کر دیا تھا۔ وہاں بھی جاتی۔ ان سب کا خلوص سدا بہار تھا۔ وہیں سے کئی بار وہ عابد حسین
کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اکیلی کہیں چل دیتی۔ مگر سب یوں بیٹھے رہتے جیسے کسی نے دیکھا ہی
نہیں۔ اگر دیکھا ہے تو کسی کو اچنبھا نہیں ہوا۔ یہ سب اُن کی عین مرضی کے مطابق ہو
رہا ہے۔

گھر کا وہی ماحول تھا۔ ہر کوئی اپنے رنگ میں مست تھا۔ اگر زندگی بدل گئی تھی تو سجّو
کی۔ وہ اپنی مستی میں اس قدر خوش اور سرشار رہتی کہ اگر گھر والوں کے رویہ میں تبدیلی بھی آ جاتی
تو اُسے پرواہ نہ تھی۔

رضی آپا ابھی تک سب پر اپنی ممتا نچھاور کرتی رہتیں۔ فیضی آپا کی برج پارٹیاں اور

کافی پارٹیاں اسی کھنکھناہٹ سے جاری رہتیں۔ مگر اب سجو کو ان میں بیٹھنے کی فرصت
ویسے بھی اب اُس کو اُس کا آئیڈیل مل گیا تھا۔ وہ کیوں ان ناآسودہ شر پسند …
میں بیٹھ کر اپنا مزاج خراب کرتی۔ جبینی اور سلطان پر اب اس کو رشک نہ آتا۔ وہ …
زیادہ بھرپور اور خوش آگیں زندگی گذار رہی تھی۔ ہاں ایک خلش ضرور تھی ——؟
کا نکاح ہو چکا تھا۔ مگر یہ دونوں دنیا کی نظر میں مجرم تھے۔

لیکن خیر —— عابد حسین کا وعدہ اتنا جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اتنا اٹوٹ پیا…
اُس کا —— جلد ہی شادی بھی کرلے گا۔

بھائی ساجد حسین کی نظروں کی اب سجو بالکل پرواہ نہ کرتی۔ وہ اب اور بھی کٹیلی ادا…
جانے والی ہوگئی تھیں۔ بلکہ اب وہ اس کو عابد حسین کے ساتھ جاتا دیکھ کر ایک طنزیہ …
دیتے۔ سجو ان گرسنہ نظروں اور نیچ انسانوں سے بالا ہوگئی تھی۔ کسی کی پرواہ نہ تھی۔
امجد حسین اور بھابی زوبی کے جھگڑوں کے متعلق سوچنے کی تو اُسے بالکل بھی فرصت نہ تھی
البتہ ڈولی آجکل اُس سے کچھ دور ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اُس نے اُ…
ساتھ امسال ایف اے کا امتحان نہیں دیا تھا۔ اُس کی کلاس کی ساری لڑکیاں تھرڈ ای…
چلی گئی تھیں۔ اس لئے اُس نے حسبِ سابق کالج ہی بدل لیا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھار ملاقا…
ہو جاتی تھی۔ ورنہ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے بات ہیلو سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

سجو نے تو اپنے آپ کو بالکل عابد حسین کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اپنے خوبصورت
لمبے بال کٹوا لئے تھے اور کٹے ہوئے بالوں کا سوئچ بنوا لیا تھا۔ کیونکہ عابد حسین کو کٹے ہوئے …
بال پسند تھے۔ وہ کپڑے بھی اس کی مرضی کے مطابق پہنتی۔ رنگوں کا انتخاب وہ کر کے …
اپنی پسند کے خرید کر دیتا۔ ہر تیسرے چوتھے دن وہ عابد حسین کے ساتھ شاپنگ کرنے جاتی
بے شمار جدید فیشن کے ملبوسات۔ اور لاتعداد قسم کی چیزیں اُس کے پاس جمع ہوگئی تھیں
اُس کے آنگن میں تو ایک دم مینہ برسنے لگا تھا۔ اگر یہی محبت ہے تو واقعی محبت بڑی …

…زن شے ہے۔ اُس کے آنے سے جگ میں اجالا ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی قدر و
…ے خود آگاہ ہونے لگتا ہے۔ اور خدا کی خدائی پر خواہ مخواہ پیار آنے لگتا ہے۔
ابھی تو یہ کورٹ شپ کا زمانہ ہے۔ نہ جانے "ہنی مون" کا زمانہ کتنا کیف آگیں ہوگا۔ سجو
…رچتی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور خوشی یا چاہت کی ادا ہو سکتی ہے۔
عابد حسین اُس سے کہہ رہا تھا کہ ہنی مون ہم سوئٹزرلینڈ میں منائیں گے۔
تب سے اُس کے سارے خواب وہیں پر جاکر بکھرتے۔ اُن مرغزاروں میں، خوبصورت
…ی دیں میں —— جب وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے —— آکاش کے کنارے چھونے کو
…یں گے تو لوگ اتنی موزوں جوڑی کو رشک اور حسد کی نگاہوں سے دیکھیں گے ——
ان سب خوشیوں اور خوابوں کے گہوارے میں جھولتے جھولتے —— کبھی کبھی اسے
…یر کی خلش بے چین کر دیتی۔ یہ زندگی جو تو گذار رہی ہے۔ گناہ کی زندگی ہے۔ عابد حسین
…را پہلا اور آخری پیار سہی۔ تو نے اپنا تن من، اور حال و مستقبل سب اُس کے قدموں میں رکھ
…یا ہے۔ لیکن مذہب اور معاشرے کی نظر میں تو مجرم ہے۔ ہر بات کا ایک وقت ہوتا
ہے اور محبت کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہے —— محبت اُسے نہیں کہتے ——
کیا تجھ سے پہلے دنیا میں کسی نے محبت نہیں کی؟ اور کتنی لڑکیاں ہیں جو شادی سے
پہلے اپنے محبوب کو اپنے جسم کا نذرانہ پیش کر دیتی ہیں۔ مشرقی لڑکی کا زیور تو اُس کی نسوانیت
ہے اس کا جوہرِ نسوانی ہے۔
جو کچھ تو کر رہی ہے، اسے عصمت فروشی کہتے ہیں یا داشتہ گیری ——
توبہ توبہ ......

وہ اپنے گلے پیٹنے لگتی۔ اتنے سخت الفاظ، اتنے توہین آمیز ——
میں ایسی نہیں ہوں۔ میں ایسی ہرگز نہیں ہوں۔ میں بہت شریف النفس اور خدا
…ن کہلانے والی لڑکی تھی۔ میں نے ذہنی طور پر کبھی ایسا نہیں چاہا۔ مجھے اس راہ پر اس کا فر

نے ڈالا ہے۔ جو اب میرا دین و ایمان بن بیٹھا ہے۔ اگر وہ مخلص ہوتا تو تجھے اس داؤ پر نہ لگاتا۔ وہ جانتا تھا کہ تو معصوم اور با عصمت ہے اور تجھ سے صرف بیاہ کیا جا سکتا ہے۔ بیاہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ اگر ذرا سی کوشش کی جاتی تو ——

بیاہ تو وہ مجھ سے ضرور کرے گا —— ؟

مگر کب —— ؟؟؟ جب تیری جوانی کا سارا رس نچوڑ لے گا۔ تجھے اپنی داشتہ بنا کر وہ بیوی کے طور پر کیسے قبول کر لے گا —— ؟

داشتہ —— ؟ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ مجھے داشتہ نہیں محبوبہ سمجھتا ہے۔

محبوبہ —— ؟ اُس کے ضمیر کا قہقہہ بلند ہوتا۔۔۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔۔ محبوبہ۔۔۔۔

اور کیا محبوبہ کو اس طرح جذبات کی پیاس بجھانے کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ محبوبہ کو تنہائی میں سجدے کئے جاتے ہیں۔ اس سے غزل کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔ جب ملو تو کلیوں اور غنچوں کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں۔ جدائی کی راتوں میں اُسے کلیجے میں بھینچ لینے کو دل چاہتا ہے مگر ملاقات کے وقت ہونٹ لرزتے رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ کانپتے رہ جاتے ہیں نظریں طواف کرتی جاتی ہیں۔ بڑھ کر اُس کے آنچل کو بوسہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ جسم کا خراج تو اُن سے وصول کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے جسم کی قیمت وصول کر لی ہو۔

جسم کی قیمت —— ؟

جی ہاں —— یہ بیش قیمت تحائف —— ملبوسات، یہ ہوٹلوں میں شب باشیاں —— یہ سیر و تفریح کا خرچہ —— اس کے علاوہ اور بہت سی ضروریات کا فراہم کرنا ——

کیا وہ ان سب پر خرچ نہیں کر رہا۔

وہ تیری قیمت چکا رہا ہے۔ ایک ایک لمحے کا حساب کر رہا ہے۔

سمجھیں ——

نہیں، نہیں۔ نہیں! سجّو اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

وہ ایسا نہیں ہے۔

وہ ایسا نہیں ہو سکتا ——

وہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ——

وہ مجھ سے شادی کرے گا ——

ضرور شادی کرے گا ——

اور آج کے بعد میں اسے اپنا جسم نہیں پیش کروں گی۔

اس کو میری رُوح سے محبت کرنی پڑے گی۔

کہاں ہے تیری رُوح —— ؟

تیری رُوح تو اُس کے پاس گروی پڑی ہے۔ اور جسم اُس کو چھڑانے کی قیمت ادا کر رہا ہے گا۔

سجّو!

سجّو!

سجّو!

ضمیر کی ان آوازوں سے گھبرا کر وہ اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتی —— پریشان ہو جاتی —— اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔

کاش یہ سب کچھ شادی کے بعد ہوتا!

لیکن سجّو بی! اتنا کچھ حاصل کرنے میں —— اتنی بلندیوں پہ پرواز کرنے کے لئے۔ کچھ نہ کچھ تو گنوانا ہی پڑتا ہے۔ قربانی کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا —— ایمان کی کہہ۔ بہرحال پہلے تو ایسی ہی بھرپور لڑکی تھی۔ اتنی معلومات تھیں۔ تیرے پاس اور تو نے دنیا کس انداز میں جانا تھا۔ تو سیپ میں بند تھی۔ اور اب تو —— ترشا ہوا ہیرا ہے۔ ہر

جوہری کی نگاہ تجھ پہ اٹھتی ہے۔

اس سربلندی میں کچھ کھو گیا تو کیا ——— ؟ اور یہ تو کھو ہی جانا تھا ———

توکل ——— اچھا ہوا جس کی پونجی تھی اس کو مل گئی۔

لیکن اگر اُس نے مجھے تہی دامن کر کے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تو۔۔۔ مجھ کو

مفلوج کر دیا تو۔۔۔ میں کیا کروں گی واقعی۔۔۔ میرے سامنے تو کوئی اور راستہ

ہے۔ اور پچھلے سارے راستے میں نے خود بند کر دیئے ہیں۔

یہ سوچ کر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اور وہ دل میں پکا عہد کر لیتی کہ اب وہ عابد حسین

طرح نہیں ملے گی۔ صاف صاف کہہ دے گی کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اُ

کو ہاتھ نہ لگائے۔ یا اُس کے ساتھ جلد شادی کر لے۔ اس قسم کی زندگی جس میں ہر قدم

وہ گوارا نہیں کر سکتی وہ کڑا عہد کر کے مطمئن ہو جاتی۔

مگر جب وہ دشمنِ جاں آتا۔ سحر خیز مسکراہٹ سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈا

دیتا۔ تو وہ فوراً اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیتی۔ اور پھر جب ہوٹل کے سجے سجائے کرے

وہ اُس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔ تو وہ موم کی طرح پگھلنے لگتی

اگر یہ گناہ ہے تو مجھے منظور ———

محبت ہے تو سر آنکھوں پر ———

فریب ہے تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

اب کے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد سجو لاہور آئی تو۔ لاہور اسے بدلا بدلا سا لگا۔

نہ معلوم کیوں ——— ؟

حالانکہ وہی لوگ تھے ——— وہی رُت تھی ——— وہی شاہراہیں ——— اور وہی

سڑکیں ———

شاید اس لئے کہ اُس کا اپنا جی ماندہ تھا۔

دراصل ان چھٹیوں میں اس کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ گاؤں کے ڈاکٹروں کی غلط تشخیص سے

اُن کا بخار بگڑ گیا تھا نتیجۃً اُسے دو ماہ بستر پہ کاٹنے پڑے ——— اتنی سخت بیماری کاٹنے

کے بعد اس میں پہلے کی سی توانائی بحال نہیں ہو رہی تھی۔ جوں توں کر کے اُس نے چھٹیاں گزاریں

اُس کا خیال تھا کہ لاہور جا کر اُس کی صحت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔

"گل افشاں" والے اس مرتبہ بھی حسبِ معمول مری میں سیزن گذارنے چلے گئے تھے۔ راضی آپا

نے اُس کو لکھا بھی تھا کہ بیماری کے بعد وہ کمزور ہو گئی ہو گی۔ کچھ دنوں کے لئے اُن کے پاس مری

آ جائے۔ گھر والوں کو شاید وہ پٹ کر منا لیتی ——— لیکن اس ڈر سے نہ گئی کہ وہاں جا کر اُس

کے اور عابد حسین کے تعلقات طشت از بام ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔

ایسے پُر فضا مقام پہ ——— اور خنک بہاروں کی پُرکیف وادی میں عابد حسین کا
قدم پہ بہک جانے کا خطرہ تھا۔ مگر وہ ضبط سے کام لے کر اپنا آخری سال پورا کرنا چاہتی تھی۔
اور جب سے وہ بیمار ہوئی تھی۔ اس کے دماغ میں عجیب و غریب خیال آنے لگے تھے۔
اللہ تعالیٰ نے اُسے اس گناہ کی ایسی سزا دی ہے کہ اُس کی زندگی کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔
دعاؤں سے وہ بچ تو گئی ہے لیکن اب اُسے گناہ آلود زندگی نہیں گزارنی چاہیئے۔ یوں بھی عابد
نے قسمیں کھائی تھیں کہ جونہی وہ بی اے کا فائنل امتحان دے لے گی، وہ بارات لے کر اُس کے گھر
چڑھ دوڑے گا۔ یہ اُس کا آخری سال تھا۔ اور باقی چھ ماہ جو رہ گئے تھے۔ وہ شرافت سے پڑھائی
میں گزارنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے راضی آپا کو شکریہ کا خط لکھ دیا۔

یوں تو راضی آپا کے علاوہ ڈولی نے بھی اُسے عرصۂ دراز بعد محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اس
حال پوچھا تھا اور اُسے مری آجانے کی تاکید کی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ اس کی نئی نویلی
شادی بھی اس دفعہ اُس کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ تم بھی آجاؤ تو سیر کا لطف دوبالا ہو جائے۔

مگر مصلحتوں نے اُسے روک دیا۔

اس کے علاوہ ان دنوں کچھ اَن جانے خوف تھے جو ہر وقت سائے کی طرح سجّو کا پیچھا
نہ جانے یہ اُس کے ضمیر کے گھڑے ہوئے بھوت تھے۔ یا اُس کے واہمے... بیمار کیا ہوئی
تو ذہنی طور پر بھی بیمار رہنے لگی تھی۔

کل کیا ہوگا ——— ؟

کل کا اُسے انتظار بھی تھا اور خوف بھی
بیماری اور خوف نے مِل کر اس کی ساری توانائی اور رعنائی چوس لی تھی۔ تبھی تو جب
چھٹیوں کے اختتام پہ وہ "گُل افشاں" میں آئی تو کوئی بھی اُسے پہچان نہ سکا۔
خدا کا شکر ہے۔ عابد حسین ان دنوں کسی کام کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ ورنہ سجّو کو دیکھ کر
اُسے کتنا صدمہ پہنچتا۔ سجّو تو ——— وہ گلاب کی پتیوں اور ستاروں سے گندھی ہوئی تھی۔

لگتی تھی۔
اس قدر کمزور اتنی زرد!
ہوسٹل کی لڑکیاں بھی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اب نہ اس کا پڑھائی میں دل لگتا نہ کسی
کھیل تماشے میں۔
تاہم اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔
ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ٹانک اور پھل باقاعدہ استعمال کرتی رہی۔
رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ہونے لگی۔ ماحول کے ساتھ مطابقت کرنے لگی۔ اور پڑھائی میں دلچسپی
لینے لگی۔
اُس کی توقع کے مطابق عابد حسین کراچی سے واپس آتے ہی اُسے ملنے آیا تھا۔ اُسے اتنے
دنوں بعد دیکھ کر جانے کیوں سجّو کا دل بھر آیا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اُس کے مضبوط کندھے
سے سر لگا کر خوب روئے۔ اتنا روئے کہ مایوسی اور اداسی کے تمام بادل چھٹ جائیں! اور وہ پہلے
والی ہلکی پھلکی من موہنی سجّو بن جائے۔
عابد حسین نے اُس کی صحت کے متعلق تشویش کا اظہار تو کیا مگر اسے چلنے کو نہیں کہا۔
وہ اس انتظار میں رہی کہ اُس کے ساتھ کہیں جا کر وہ یہ جل تھل کرے گی۔ لیکن اس نے ایک
کاروباری مجبوری کا عذر کیا ——— اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔
اُس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں سجّو کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ وہیں گیٹ پر ہی چوکیدار
کی پرواہ کئے بغیر ہی رونے لگی۔ شام کتنی اُداس لگ رہی تھی۔
اور ایسے معلوم دے رہا تھا، جیسے تیر کمان سے نکل گیا ہو۔ یا وقت کا پنچھی رہا ہو گیا ہو۔
یا کانچ کی نازک اور نُکیلی چوڑیاں ہاتھوں سے گر کر کرچی کرچی ہو گئی ہوں۔
اُن میں بھی کس قدر قنوطی ہو رہی ہوں۔
ہو سکتا ہے عابد کو کوئی ضروری کام ہو؟

پھر اس طرح کے ضروری کام عابد کو اکثر پڑنے لگے۔ جب وہ اس کی سرد مہری کا گلہ کرتی تو وہ ہنس کر کہتا۔

"پچھلا سارا سال تمہارے عشق میں ضائع کیا ہے۔ اس سال تو کچھ کام کرنے دو۔ ورنہ پیٹ کا دھندا کیسے چلے گا۔؟"

وہ مُسکرا کر مطمئن ہو جاتی۔

ویسے وہ کبھی کبھار اُسے ساتھ بھی لے جاتا تھا۔ مگر ایسے ہی گھما پھرا کر تھوڑی دیر بعد واپس چھوڑ جاتا۔

اگرچہ وہ خود بھی یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب تعلّقات اس نہج پہ نہیں بڑھائے گی۔ بلکہ شادی تک وہ ایک دوسرے سے دُور رہیں گے۔ مگر اس قدر چاہنے والے اور بے صبر آدمی کی محبّت اُسے اور بھی مضطرب کر رہی تھی۔ وہ وہم و گمان میں اسیر رہنے لگی تھی۔

"اس سے تو وہ گناہ آلود زندگی ہی بہتر تھی"۔ کبھی کبھی وہ سوچتی۔

پھر خود ہی دِل کو تسلیاں بھی دینے لگتی۔ میں تو خود اُسے ہر وقت منع کرتی تھی اور اب اُس کے ایسا کرنے پہ غصّہ کیوں کر رہی ہوں۔

دسمبر ٹیسٹ ہوا تو اُس میں سجّو فیل ہو گئی۔ اُس کو جلد ہی اپنے غائب دماغ ہونے کا احساس ہو گیا۔ اُس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس لئے وہ سالانہ امتحان میں فیل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے دل میں مصمّم ارادہ کر لیا کہ ساری فضولیات اور تفریحات چھوڑ کر وہ پڑھائی کی طرف مائل ہو جائے گی۔ عابد حسین نے بھی وعدہ کر لیا کہ ہفتے عشرے میں آ کر اُسے مِل جایا کرے گا۔ اب ضد کر کے اُسے باہر نہیں لے جائے گا۔ اس طرح اس کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

لیکن وعدہ کرنے کے باوجود اُس نے آنا بند کر دیا۔ سجّو کے اضطراب میں کمی نہیں آئی بلکہ فون پہ اُس سے شکوہ کرتی تو وہ ٹال جاتا۔ کبھی کوئی بہانہ گھڑ دیتا کبھی کوئی —— اسی کی خاطر کبھی کبھار گلِ افشاں نکل جاتی۔ سب اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ڈولی کی نئی دوست شازی ابھی ستان میں نظر آتی تھی۔ بوٹے سے قد کی یہ بھرپور جسم والی لڑکی بہت اسمارٹ تھی۔ اُس کی اس طرح کا تھا جیسے کسی مصوّر نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔ ہر نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

سجّو کی چھبی جس نے اُسے ایک اور ہی وہم میں ڈال دیا۔ شازی کے سامنے عابد حسین بنا سجّو سے ذرا التفات نہ برتتا۔ مگر اُس کے ہٹتے ہی لاگ لپٹ کرنے لگتا۔

سجّو اس وہم کو زبان کیسے دیتی ۔۔۔؟ جب اُس نے عابد کو شازی کی طرف ملتفت پایا تھا۔

"بھلا کبھی اتنا آگے بڑھ کر کوئی آدمی کسی لڑکی کو دھوکا دے سکتا ہے؟" وہ اپنے دل سوچتی۔ "اور ہر لڑکی سے بھی اتنا ٹوٹ کر محبّت نہیں کی جا سکتی۔"

شازی اسمارٹ اور طرار لڑکی ضرور تھی۔ مگر حُسن اور دلکشی میں سجّو کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔

اُن دِنوں اس کے گھروندے بنا اور مٹا کر اس بے قرار لڑکی کے شب و روز بیتنے

وقت سرکتا رہا ——

آنکھیں دیکھتی رہیں ——

اور وسوسے جال بنتے رہے ——

اور سجّو کا امتحان سر پہ آ گیا۔

پہلی مرتبہ اسے امتحان ایک مصیبت زدہ لگا۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ امتحانوں کے دنوں بہت پُرسرور رہا کرتی تھی۔ بلکہ وہ امتحان کو تمام فکروں کا خاتمہ کہا کرتی تھی۔

امتحان سے پہلے سجّو کا دل چاہا کہ ایک چکر "گُلِ افشاں" کا لگا آئے۔ وہ کافی ہفتوں سے وہ نہیں آیا تھا اور سجّو کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ عشق کی آگ میں وہ تنہا ہی جھلس رہی تھی۔

اُسے گئے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اُس نے دیکھا عابد حسین کی کار گیٹ میں داخل ہو رہی ہے اور اگلی سیٹ پر ڈولی اور شازی بالکل اس طرح بیٹھی ہیں۔ جیسے کبھی وہ اور ڈولی بیٹھا کرتے تھے۔ یعنی شازی درمیان میں بیٹھی تھی اور عابد حسین کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر بیٹھی ہوئی تھی اور تینوں نہ جانے کس بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔

سجّو کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں کی طرف سے ایک شعلہ اُٹھ کر اُس کے سر تک چلا گیا ہے۔ اور اس شعلے میں اُس کا سارا وجُود بھسم ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پایا۔ اور اپنے امنڈتے آنسوؤں کو پلکوں پر روکا۔ اور دل میں تہیّہ کر لیا کہ آج وہ عابد حسین سے ضرُور بات کرے گی۔

وہ کھڑی ہوئی تو عابد زن سے اُس کے پاس سے گذر گیا۔ ڈولی کی ہیلو کی پرواہ نہ کرتے ہوُئے وہ عابد کے پیچھے لپکی اور بولی۔

"عابد مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

پہلے وہ کہا کرتا تھا۔ "میرے کمرے میں چلی آؤ۔" اب بھی سجّو کو یہی اُمید تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ کمرے میں جا کر اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالے گی۔ خوب روئے گی۔ چلائے گی مگر عابد حسین روکھائی سے بولا۔ "میں ذرا نہا لوں پھر آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔" اور جلدی سے چلا گیا۔ جانے وہ کتنی دیر تک بیٹھی اُس کے غسل خانے سے نکلنے کا انتظار کرتی رہی جب ڈولی نے آ کر اسے بتایا کہ عابد بھائی تو کب کے شازی کو گھر چھوڑنے جا چکے ہیں۔

تو سجّو بی! قدرُت کی ساری مہربانی اب شازی کی طرف چلی گئی ہے

تو پھر پیٹا کر یہاں بیٹھ کر۔

اپنا سینہ ——— یا اپنا ماتھا ———

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اُس کے دِل کو یقین ہی نہ آتا۔

بھلا اتنی جلدی عابد حسین کیسے بدل سکتا ہے۔

موسم کو بدلتے دیر لگتی ہے سجّو بی!

مگر مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی ———

بہت سی سُنائی باتیں ——— پڑھے پڑھائے قِصّے ——— اور سینہ بہ سینہ چلتی روایتیں سجّو کو یاد آنے لگیں۔

شادی سے پہلے جسم کی سرحد پار کرنے کے بعد مرد عورت کو اس طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے جیسے وہ کوئی آسیب زدہ مکان ہو ——— کسی فریاد پہ بھی مُڑ کر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ مبادا وہ پتھر میں بدل جائے۔

مرد کس قدر سیاہ دِل ہوتا ہے؟

وہ رات سجّو پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کا جی چاہتا وہ اپنا کمرہ بند کر لے اور اتنا چیخے چلائے کہ لوگ اُسے پاگل سمجھ کر کسی ویرانے میں چھوڑ آئیں۔ وہ اپنے ہوسٹل واپس چلی آئی۔ یہاں آ کر وہ ... روئی بھی ———

تمام رات اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے پلنگ پر اوندھی لیٹی آنسو بہاتی رہی۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو اس کی سہیلی اُسے بُلانے بھی آئی۔ مگر اُس نے دروازہ کھولے بغیر اندر سے کہہ دیا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ اُس کی طبیعت خراب ہے۔

دس بجے تک باہر ہوسٹل کی لڑکیوں کے غُل غپاڑے کی آوازیں آتی رہیں ——— اُس کے بعد رفتہ رفتہ شور مدھم ہو گیا۔ رات کی جادوگرنی نے سارے عالم پر کالا علم پڑھنا شروع کر دیا۔ کائنات سنسان اور ویران ہوتی چلی گئی۔ سنسان فضائیں پچھتاووں کے ناگ لے کر سجّو کے زخموں کو ڈسنے لگیں ... لمحے لمحے کا کرب اُس کی رُوح کو گھائل کرنے لگا۔ ... ماضی میں عابد حسین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات تازیانے بن گئے۔ "گُل افشاں" اُسے ایک گمراہ کُن منزل نظر آنے لگا۔ "گُل افشاں" کے باسی سب مکر و ریا کے پُتلے۔ کبھی کبھی اُسے یوں محسُوس ہوتا، جیسے

اُسے ایک قربان گاہ پر لٹکا دیا گیا ہے۔ نیچے آگ کے الاؤ جل رہے ہیں۔ اور ارد گرد
"گل افشاں" والے بھوتوں اور جنگلی درندوں کا رُوپ دھار کر محوِ رقص ہیں ـــــ چلّا چلّا کر
ـــــ شور مچا رہے ہیں ـــــ شیطانی قہقہے لگا رہے ہیں ـــــ اور اس انتظار
میں ہیں کہ کب وہ اس الاؤ میں گر کر جلے ـــــ اور وہ اُسے بوٹی بوٹی کر کے کھا
جائیں ـــــ

تمام رات وہ ایک پل نہ سو سکی۔ سوتی بھی تو ایسے ہی بھیانک خواب اُسے نظر آتے
بار بار دوزخ کا تصوّر اُس کے ذہن میں آتا۔ اور وہ خوف سے کانپ اٹھتی ـــــ
صرف ضمیر کے کچوکے ہیں اور جو سزا اللہ میاں نے دینی ہے وہ نہ جانے کتنی شدید
ہاتے ـــــ وہ تو بڑی ہی نیک لڑکی تھی۔ سات سال کی عمر میں اُس نے
قرآن شریف ختم کر لیا تھا۔ ماں کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھی ـــــ وہ اپنے
کنوارے جسم کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھتی تھی ـــــ وہ تو ایک مجازی خدا کا انتظار
کرتی تھی ـــــ وہ تو دُلہن بن کر کہیں جانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

مگر اب کہاں ہے وہ ـــــ

سجّو تو مر گئی ـــــ

سجّو تو اب کبھی دُلہن نہ بن سکے گی۔

بے شرم تُو نے وہ حرکت کی ہے۔ جس پر تیرا سارا خاندان تجھ پہ ہزار سال تک
لعنت بھیجتا رہے کم ہے۔

سجّو تو نے اپنے ماں باپ کا دِل دُکھایا ہے۔ اُن کے اعتماد کو دھچکا لگایا ہے۔ اُن
کی کمر توڑ دی ہے۔

ایک بے مہر ـــــ بے فیض ـــــ ہوس پرست اور مصنوعی آدمی کے لیے تو نے
شیر افگن جیسے سیدھے اور سچے آدمی کا رشتہ ٹھکرایا ـــــ

دُنیا کو جنت سمجھ بیٹھی۔
یہ بھول گئی کہ فیصلے کرنے والا تو خدا ہے ـــــ اور اب جب تک تو زندہ ہے
ہے کی سزا بھگت۔

سزا ـــــ
اُن ـــــ اُس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اُس کی آنکھیں سُوج کر انگارہ بن چکی
مگر پھر بھی یوں معلوم دیتا تھا ابھی اُس کی آنکھوں میں سمندر پنہاں ہیں جو بہہ جانے کو
تیار ہیں۔ نہ معلوم وہ یہ تمام آنسو اس ایک رات میں ہی کیوں بہا دینا چاہتی تھی۔
اُس کا خیال تھا کہ ان آنسوؤں میں عصیاں کے سب داغ بھی دُھل جائیں گے
مگر کچھ داغ تو مقدّر بن جاتے ہیں ـــــ
لڑکیاں اگر یہ جانتی ہوں تو اپنے اُجلے دامن کو کبھی داغدار نہ کریں۔

آج پورے چار ماہ بعد سجّو نے "گل افشاں" میں قدم رکھا تھا۔ وہی "گل افشاں" جسے ا
خوبصورت خوابوں کی آماجگاہ کہا کرتی تھی۔ وہ "گل افشاں" جہاں آکر اُس کی ہر تمنا جو
تھی ـــــــ ہر سپنا چونکا تھا، اور ہر آرزو نے کروٹ لی تھی۔

"گل افشاں" جس نے اُسے "سجیلہ بانو ہاشمی" سے سجّو رانی اور پھر کسی کے دا
بنا دیا تھا۔

"گل افشاں" ـــــــ جس نے چاہتوں اور محبتوں کے دَر وا کیئے تھے۔

"گل افشاں" ـــــــ جس نے اُسے روایتوں، رشتوں اور گلیوں سے نفرت
سکھایا تھا۔

وہی "گل افشاں" جس نے اُس کی سیپ ایسی جوانی کا موتی نگل لیا تھا۔

ہاتے ـــــــ اسی "گل افشاں" میں ایک مُدت کے بعد قدم رکھتے ہوئے اا
جی لہولہان ہو رہا تھا۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے ـــــ وہ اُس پیاری اور متوالی سجّو کو یہیں کہیں رکھ کے بھول
گئی ہے۔ اب اُس کا خول اُٹھائے چلی آئی ہے۔ اُس کے قدم یوں اُٹھ رہے تھے۔

ی متاعِ عزیز کہیں کھو چکی ہو ـــــ اور اب اُس کی یادداشت ساتھ نہ دے رہی

واقعی اُس کی یادداشت بالکل اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ وہ تو ھر گز
ہ تھی۔

اور یہ پورے چار ماہ اُس نے اس پا پیادہ مسافر کی مانند گزار دیئے تھے۔ جس کی کوئی منزل
ہوتی۔ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کوئی گھر نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ فاقہ مستی کے عالم میں چلتا ہی
ہے ـــــ سفر برائے سفر جاری رکھنے کو ـــــ
سجّو بھی کیا کرتی ـــــ؟

بہت دِن روتی ـــــ اپنی جانِ عزیز جوانی کے لُٹ جانے کا بہت دِن ماتم کیا کچھ
ایسے کرب انگیز بھی آئے جب اُس نے سنجیدگی سے خودکشی کرنے کے بارے میں سوچا
لف طریقوں سے جان گنوانے کی ترکیبیں وضع کرتی رہی۔ مگر ایک خیال ـــــ اُسے
ہمیشہ ایسا کرنے سے روک دیتا تھا۔ خودکشی کے بعد لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور ہوتا ہے تو
ا خودکشی کی وجہ سارے زمانے کو معلوم ہو جائے گی۔ وہ لاکھ بُری سہی۔ ننگِ خاندان
ی آباؤ اجداد کے منہ پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ بہت سی غلطیاں اور بیشمار
اس سے سرزد ہوئے تھے۔ مگر وہ یہ آخری گناہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ خودکشی کا ایک اور
ذریعہ طریقہ ہے نا ؟ ـــــ

ست دنوں کی بے کلی اور اضطراب کے بعد وہ ایک نتیجے پہ پہنچ گئی تھی۔ کہ ساری زندگی
اُس جرم کی سزا دے گی۔ حتیٰ کہ اپنا وجود ختم کر دے گی۔
پھر رفتہ رفتہ اُس کی زندگی معمول پہ آنے لگی۔
انسان مجبورِ محض ہے۔
کبھی وہ تصوّر کرتے ہوئے گھبراتا ہے۔ اگر سر پہ پڑ جائے بڑی آسانی سے سہہ لیتا ہے

اپنے اضطراب اور بےچینی کو اُس نے خود ہی سہارے دینے شروع کر دیئے
ایک آخری اُمید اُس کے دامن میں تھی۔ وہ عابد حسین سے آخری اور فیصلہ کُن
کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی منت اور سماجت کرنا چاہتی تھی۔ نہیں تو اُسے دھمکانا چاہتی تھی
اس کا خیال تھا کسی نہ کسی طور وہ اُس کے ساتھ شادی پہ آمادہ ہو جائے گا۔

آس اور یاس کے گھروندے بناتے بناتے اُس نے چار ماہ بِتا دیئے تھے۔

شروع شروع میں لڑکیاں اُس کی غائب دماغی اور مخبوط الحواسی پر بہت تا
کرتی رہیں۔ اُس کی صحت کے بگڑنے اور حُسن کے کُملا جانے کو کئی باتوں سے تعبیر کرتی رہیں
اکثر لڑکیوں کا خیال تھا کہ محبت میں ناکامی نے سجّو کو اتنا بد دِل کر دیا ہے کہ وہ بُجھ کر رہ گئی
سارا دِن اپنے کمرے میں گھسی پڑی رہتی ہے۔ نہ ہنستی ہے۔ نہ گپ بازی کرتی ہے۔ نہ
کے معاملات میں پہلے کی طرح بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہے۔

کچھ لڑکیوں کو معلوم تھا کہ اس کا افیئر ڈولی کے بھائی کے ساتھ چل رہا ہے۔ کیونکہ ان
نے اکثر اُسے اُس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر صاف لفظوں میں کوئی بھی
زبوں حالی کا تذکرہ نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ اس ضمن میں سجّو نے کسی کو اپنا ہمراز بنانا پسند نہیں
اپنے کئے کی سزا خود بُھگت رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ خشوع و خضوع سے
پڑھے اور رو رو کر مصلّے بھگو دے۔ پھر اللہ تعالےٰ سے اس قدر گڑگڑا کر معافی مانگے کہ ا
معاف کرتے ہی بنے۔

اگلے ہی لمحے اُسے اپنی گناہ آلود زندگی کا تصوّر آ جاتا۔ اور وہ تکیوں میں اپنا م
چھپا لیتی۔

"میں اس قابل بھی نہیں رہی کہ خُدا کے حضور اپنا سر جُھکا سکوں۔"

ایک عجیب سے کرب آمیز احساسِ کمتری نے اُسے اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ ک
جہاں اک اک سانس بھی پھانس کی طرح کھٹک رہی تھی۔

اسی طرح لیل و نہار گزرتے رہے۔ کہ اُن کو گزرنا ہوتا ہے۔
سجو کی ڈگمگاتی زندگی معمول پر آ گئی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ کتابوں پر مرکوز کر دی۔ مگر اُس
نا ماضی پہ ماتم کرنے اور مستقبل کے منصوبے بنانے سے باز نہیں آیا۔ اس عرصے میں اس
نے بار بار عابد حسین کو ٹیلی فون کرنا چاہا۔ مگر پھر نہ جانے کس قسم کی غیرت آ گئی کہ وہ ایسا نہ کر سکی۔
البتہ ڈولی اُسے کئی بار ہوسٹل میں ملنے آئی تھی۔ اور اُسے ساتھ چلنے کو بھی کہا تھا۔ مگر
نے ہمیشہ پڑھائی کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ ڈولی سے اب اُسے شدید نفرت محسوس ہوتی
ج کل شازی اس کے ساتھ ہوتی اور اسے زبیدہ بھابی کی کہی ہوئی باتیں بالکل سچ
م ہوتیں۔

ایک مرتبہ نور اضی آپا خود بھی آئی تھیں۔ سجّو کے لئے بہت سے عمدہ عمدہ کھانے بھی پکا
تھیں۔ اور انہوں نے سجّو کو گلے سے لگا کر اس قدر پیار کیا اور اس قدر شفقت سے
کے "گل افشاں" نہ آنے کا شکوہ کیا کہ سجّو کا دِل چاہا کہ اپنا دِل ذرا چیر کر اُن کے آگے رکھ
اور اُن سے اپنے سہاگ کی بھیک مانگ لے۔

مگر وہ جلدی سنبھل گئی۔

یہ لوگ بہروپئے ہیں۔ کون جانے اِن کے من میں کیا ہے؟ اور اب کیا دیکھنا باقی ہے۔
اُس نے راضی آپا سے وعدہ کیا کہ امتحان ختم ہوتے ہی وہ کچھ دن آ کر اُن کے پاس ضرور ر
گی۔ مگر آجکل اُسے مجبور نہ کیا جائے۔ مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے وہ کلاس سے
پیچھے رہ گئی ہے اور آجکل اپنا کورس ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔
راضی آپا مان گئیں اور اس پہ واری فدا ہوتے ہوئے رخصت ہو گئیں۔

اُس نے حسبِ وعدہ چار ماہ بعد "گل افشاں" میں قدم رکھا تھا اور اس کا دل چاہ
افشاں کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر روئے۔ جنہوں نے اُس کے لٹنے کا تماشا خاموشی
اور بے حسی سے اُس کو تماشا بنایا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ الٹے پاؤں واپس چلی جائے۔ ان مکرو ریا کے پجاریوں کو شکل نہ دکھائے۔ مگر —— اُس کو وہاں جانا تھا ——۔

ایک آخری آس تھی۔ اس دُشمنِ جاں کو راہ پر لانے کی۔ وہ ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی کہ کس قِسم کی آس ہے۔ کیا وہ ابھی تک عابد حسین سے محبّت کرتی تھی؟

وہ جب اُس کی ہوس پرستی کے متعلق سوچتی تو اُسے اس سے گھن آنے لگتی۔ پھر اُس کی محبّت بھری باتیں یاد کرتی تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ کاش وہ ہمیشہ ویسا ہی رہتا بلا سے جھوٹ ہی بولتا رہتا۔ مگر بوالہوس نہ ثابت ہوتا۔ ہاں اگر وہ اب بھی سجّو کو قبول کرتا وہ اس کی ساری خطائیں معاف کر کے اُس کی لونڈی بن کر رہے گی۔

اِس کے علاوہ وہ دو چار دن اور لاہور میں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ بلّی کی شادی کی تاریخ ہو چکی تھی اور اُس کی ماں نے بلّی کے جہیز کی چیزوں کی ایک طویل فہرست مع خطیر رقم اسے بھیج دی تھی اور کہا تھا کہ وہ فارغ ہو کر ساری چیزیں لیتی آئے۔

اس نے کچھ کپڑے اور زیورات تو بننے دے دیئے تھے۔ مگر باقی چیزیں وہ راضی ہو کر ساتھ خریدنا چاہتی تھی۔ سو ایک منصوبے کے تحت وہ آج "گل افشاں" میں داخل ہوئی۔

حسبِ معمول سب لوگ بہت محبت اور پیار سے ملے۔ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آؤ بھگت کی گئی —— لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ڈولی، شازی اور عابد حسین پکچر گئے ہوئے ہیں تو اُسے یوں معلوم ہوا جیسے بے شمار زہریلے بچھوؤں نے ایک ساتھ اسے ڈنک لگایا ہے۔

وہ تین چار دن "گل افشاں" میں رہی۔ مگر عابد حسین اُس سے کچھ اکھڑا اکھڑا رہا۔ ساجد حسین اُس کی طرف بہت ملتفت رہا۔ اور اُس کے ہر التفات سے سجّو کو گھن آتی رہی۔ ایک روز تو غضب ہو گیا۔ وہ ڈرائنگ رُوم کے ایک صوفے پر کشن سر تلے دبائے لیٹی ہوئی تھی کہ ساجد حسین بغیر اجازت کے اندر آگیا۔ اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت مار کر بولا۔

"اے جناب —— ؟"

وہ پہلے تو حیرت زدہ سی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی! وہ بال دوپٹہ سنوارنے لگی۔

ساجد حسین پائپ کا کش لیتے ہوئے اُس کے پاس صوفے پہ بیٹھ گیا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔

"سجّو! آجکل تم بہت چُپ چُپ اور کھوئی کھوئی رہتی ہو؟ کیا وجہ ہے؟"

"کوئی وجہ نہیں ساجد بھائی!" وہ اکھڑے ہوئے انداز میں بولی۔ "یونہی آپ کا خیال ہے۔"

"رانی! مجھ سے نہ چھپاؤ۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "شاید میں تمہارے غم کا مداوا کر سکوں۔"

"غم کا اس دنیا میں مداوا کوئی نہیں ساجد بھائی!" وہ اداسی سے بولی۔

"سجّو!" ساجد حسین کی آواز ایک سرگوشی بن گئی۔ "تمہیں اس طرح اُداس اور پریشان دیکھ کر کیا بتاؤں مجھے کس قدر دُکھ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارے اس سوگوار چہرے کا سارا حزن و ملال چھین کر تمہیں پہلے کی طرح بہاراں بہاراں بنا دوں۔"

ہمدردی کی ایسی باتیں سُن کر سجّو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ ذرا کسی نے چھیڑا اور دُکھ گئی۔

ساجد حسین نے اُس کی دُکھتی رگ کو دانستہ چھیڑا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ تم نے عابد حسین پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا۔ مگر..... مگر میں پہلے بھی کئی بار تم سے کہنا چاہتا تھا کہ گو عابد میرا بھائی ہے —— مگر میں سچّی بات کہوں گا کہ —— وہ لڑکیوں کے بارے میں ذرا سیریس نہیں ہے۔"

سجّو نے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

اور وہ کہے گیا۔

"مگر تم نے کبھی مجھے اِتنی لفٹ ہی نہ دی کہ میں تم سے دوستانہ ماحول میں ایسی باتیں کہہ سکتا

یا . . . . اپنا دل تمہارے آگے چیر کر رکھ دیتا۔"

ذرا گلا صاف کرتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ تم تو وہ خوشنما پھول ہو جسے ہم اپنے لئے گلے کی زینت بنا لینا چاہیئے۔ تم روندے جانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔"

سجّو نے اور زور سے رونا شروع کر دیا۔

"لیکن خیر ——— اس سے کیا ہوتا ہے۔"

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا۔ عابد کو تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ آج کل شادی کے ساتھ ہم ہے۔ اور تم رو رو کر جان ہلکان کر رہی ہو۔"

"ساجد بھائی۔ میں مر جاؤں گی ساجد بھائی!" سجّو نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"نہیں تم زندہ رہو گی۔" ساجد نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"جی ——— ؟" سجّو نے چونک کر آنسو بھری آنکھیں اوپر اُٹھائیں۔

"ہاں ——— میں تم سے شادی کروں گا۔ میں ———" اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

اور سجّو پھر دوبارہ رونے لگی۔

اگر لُٹ گیا اک نشیمن تو کیا غم ؟

اُس نے مُسکراتے ہوئے سجّو کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی۔

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

سجّو نے جب اپنی حیران سی آنکھیں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں تو وہ لرز گئی۔ ساجد حسین کی نظروں میں بھی اُسے وہی شیطان نظر آیا جس کا مفہوم اب وہ سمجھنے لگی تھی۔ وہ سمٹ کر پیچھے ہو گئی۔ ساجد نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ساجد بھائی! میرا ہاتھ تو چھوڑ دیں۔"

ساجد نے اُسے قریب کھینچ کر اُس کا بوسہ لینا چاہا تو سجّو تڑپ کر پرے ہو گئی۔ اُس نے پورا زور لگا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے ساجد حسین کو پرے دھکیل کر بولی۔

"ساجد بھائی۔ میں آپ کی باتوں سے آپ کو مخلص انسان سمجھی تھی۔ مگر آپ انتہائی کمینے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں آپ کے بھائی کی امانت ہوں۔ اور پھر بھی آپ "

"ہا . . . . ہا . . . . ہا" ساجد حسین نے قہقہہ لگایا۔ "بھائی کی امانت ——— سجّو بیگم! کس خوش فہمی میں ہو۔ تم جیسی لڑکیاں کسی کی امانت نہیں ہوتیں۔ مگر ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ خود کو کسی نہ کسی کی امانت سمجھ بیٹھتی ہیں ——— میں تو تمہیں پھر بھی اچھی زندگی کی ضمانت دے رہا ہوں۔

"بکواس بند کیجئے۔ اگر مجھے اس گھر کا لحاظ نہ ہوتا تو میں جوتا اُٹھا کر آپ کے مُنہ پہ مارتی" سجّو نے انتہائی غصّے سے کہا۔

"اوہو! اس میں غصّہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ تم میرے ساتھ سمجھوتہ کر لیتیں تو اچھا تھا ورنہ کسی نہ کسی کی آغوش میں تو گرنا ہی ہے۔ ———"

"میں طوائف نہیں ہوں ساجد حسین۔ ایک شریف خاندان کی عزت ہوں۔ تم ذرا میرے سامنے منہ سنبھال کر بات کرو۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں کھڑے کھڑے تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں میں اس قسم کی فحش باتیں سننے کی عادی نہیں ہوں اور ابھی اتنی ذلیل بھی نہیں ہوئی جتنا تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔"

"اوہ ———" ساجد حسین کھڑا ہو گیا۔ "تم تو خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو۔ بہرحال ——— میں جا رہا ہوں۔ مگر سوچنے کا ایک اور موقع دے جاتا ہوں۔ میرے ساتھ سودا کر تو میں ہر معاملے میں عابد حسین سے اچھا ثابت ہوں گا۔"

"شٹ اپ ———" سجّو زور سے چلائی۔ اور ساجد حسین جلدی سے باہر نکل گیا۔

سجّو کُشن میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

اتنے میں راضی آپا اندر آگئیں۔ خُدا معلوم انہوں نے سجّو کے زور سے رونے کی آواز سُنی تھی یا اُسے ڈھونڈتی ہوئی آگئیں۔ اُسے روتا دیکھ کر جھٹ سینے سے لگا لیا۔

"کیا ہوا میری گڑیا کو ——— کیا ہوا ———" وہ اُسے سینے سے لگائے تھپکتی جاتیں پوچھتی جاتیں۔

"گڑیا تو کانچ کی تھی۔ ایک ہی بار گری تو چُور چُور ہو گئی۔۔۔۔ اب اُس کے ٹکڑوں کو تو رُسوا نہ کرو ظالمو!"

سجّو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس روئے گئی۔ جب ذرا اُس کی ہچکیاں تھمیں تو وہ پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو خود بھی اپنے رونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی مگر بہت رونے سے دِل کا غبار ضرور نکل جاتا ہے۔"

راضی آپا اسے چمکارنے لگیں۔ "منھ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں ذرا گھما لاتی ہوں۔"

"نہیں راضی آپا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے آج بلّی کا زیور لینے جیولر کے پاس جانا!"

"ہاں ہاں ——— راضی آپا بھی کھڑی ہو گئیں۔ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ آج کا وعدہ تھا! تیار ہو جاؤ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ باقی ماندہ سب شاپنگ ہو گئی کیا ———؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"تقریباً سب چیزیں لے چکی ہوں۔ دو چار جو چھوٹی موٹی رہ گئی ہیں۔ وہ اب لے لوں گی۔"

وہ دونوں تیار ہو کر بازار چلی گئیں۔

رات کے نو بجے وہ دونوں بازار سے لوٹیں۔ سجّو نے بلّی کے جہیز کی تمام چیزیں سب اُن کو دکھائیں۔ انہوں نے جی کھول کر تعریفیں کیں۔ اور پھر اُس کے ساتھ مل کر سب چیزیں اکٹھی پیک کرا دیں۔

"اب صبح مجھے چلے جانا چاہیئے راضی آپا۔" سجّو مایوسی سے بولی۔

"کیوں۔ ابھی کچھ دن تو رہو نا ———؟"

"بلّی کی شادی میں باقی دو دِن رہ گئے ہیں۔ کل رات کو بھی ایک فنکشن ہے۔ امّی نے کہا تھا اس میں ضرور شامل ہو جانا۔ میں تو صرف اُس کی چند چیزوں کے لئے رُک گئی تھی ورنہ امتحان ختم ہوتے ہی چلی جاتی۔"

"اچھا۔" راضی آپا مان گئیں۔ سجّو نے سب کچھ احتیاط سے بند کر دیا اور پھر ریلوے ٹائم ٹیبل لے کر گاڑیوں کے اوقات دیکھنے لگی۔

اصل میں آج وہ ہمیشہ سے زیادہ دُکھی تھی۔ ابھی تک اُس کی عابد حسین سے مفصل ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جس کے لئے وہ بطورِ خاص "گل افشاں" میں آگئی تھی۔ وہ ستم شعار اِن دنوں "گل افشاں" میں بہت کم نظر آیا تھا۔ آتا بھی تو ڈولی اور شازی اُس کے ہمراہ ہوتیں۔ کبھی پکچر کا پروگرام ہوتا اور کبھی نمائش کا۔ وہ تو اُس کو یوں نظر انداز کر رہا تھا۔ جیسے اس گھر میں اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

یہ وہی عابد حسین تھا جو سجّو کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلایا کرتا تھا۔ مگر وقت وقت کی بات ہے۔ اب وقت کی لگام سجّو کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اور وہ گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا چاہتی تھی۔ یہ اس گناہ سے بھی بڑی نادانی تھی۔

وہ بستر پر پڑی کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ اور آئندہ زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتی رہی۔ گیارہ بجے کے قریب جب اُس کا ذہن سوچ سوچ کر شل ہو چکا تھا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے باہر کوئی گاڑی رُکی ہے اور کوئی اندر آ رہا ہے۔ اُٹھ کر پردے کی اوٹ سے دیکھا تو اس کا اندازہ صحیح تھا۔ عابد حسین جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

سجّو کو یہی اور آخری موقع نظر آیا اپنی بگڑی کو بنانے کا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے چپّل پہنے اور بکھرے بال ٹھیک کرتی ہوئی عابد حسین کے پیچھے لپکی۔

"اپنے کمرے میں داخل ہو کے ابھی ٹائی کی گرہ درست ہی کر رہا تھا کہ سجّو دروازہ کھول کر

جلدی سے اندر داخل ہوگئی اور اپنے پیچھے اُس نے دروازہ بند کرلیا۔ عابد حسین نے مڑ کر
اور اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ۔ کیسے آنا ہوا ——— ؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو
تھیں اور وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

سجّو کو اس کا یہ کھویا کھویا انداز کس قدر بھلا لگا کرتا تھا کہ وہ جھٹ اپنا آپ نچھاور کر دیا کرتی
مگر آج اس کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کو طیش آ گیا۔ وہ بالکل بھول گئی کہ وہ تو لجاجت سے اپنا
کرنے آئی تھی۔ منّت سماجت کر کے اس کے قدموں میں رہنے کی بھیک مانگنے آئی تھی۔ اُس کا
رُواں رُواں انگارہ بن گیا۔

یہ شخص میرا قاتل ہے۔

میری عصمت کا ——— شرافت کا ——— اور میرے مستقبل کا قاتل ہے۔ اس نے
مجھے گمراہ کیا ——— لُوٹا ——— اور پھر میری بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا ——— اور اب ———
کس قدر انجان بن رہا ہے ——— اُس نے نظر اُٹھا کر عابد حسین کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا رہا تھا اسی انداز میں ———

"اس طرح کیوں گھور رہی ہو ——— بیٹھ جاؤ ——— میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا
ہوں ——— ؟"

"عابد! میں بیٹھنے نہیں آئی۔ آج تم سے دو ٹوک بات کرنے آئی ہوں۔"

"کیسی بات ——— ؟ کس قسم کی بات ——— ؟"

"تم تو ایسے انجان بن رہے ہو۔ جیسے کچھ جانتے نہیں۔"

"اگر نہیں جانتا تو تم ہی بتا دو۔" وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

"اس وقت غالباً تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔"

عابد حسین نے قہقہہ لگا۔

ی سمجھ لو ——— ورنہ میں تو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ کہ تم آدھی رات کو میرے کمرے
بے دھڑک چلی آئی ہو۔ غصّے میں پیچ و تاب کھا رہی ہو ——— اور نہ جانے کیا کہنا چاہتی ہو
اس کے باوجود تم مجھے ہوش میں نہیں سمجھ رہیں تو تمہاری مرضی ———"

عابد! میں تمہیں بہت اونچا انسان سمجھتی تھی۔"

اور اب تمہیں اندازہ ہوا ہے کہ میں تو بہت ہی گھٹیا آدمی ہوں۔ اور تم مجھے یہ بتانے آئی
" عابد نے پلٹ کر اُس پر چوٹ کی۔

ظلم کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے شیخ عابد حسین ——— ؟" سجّو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سو بہا کر نہ دکھاؤ، میں عورت کے اس ہتھیار کا گھائل نہیں ہوں۔ صاف صاف
یا کہنا چاہتی ہو۔"

عابد! میں تمہارے بدلنے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں ؟"

اگر تم پوچھو گی تو میں تمہیں دنیا کی بیوقوف ترین لڑکی سمجھوں گا۔"

کیوں ؟"

کبھی کسی نے موسموں کے تغیّر و تبدّل کی وجہ پوچھی ہے۔ کبھی کسی نے دن اور رات کے
ے پر اعتراض کیا ہے۔ کبھی کسی نے زمین کی گردش کا بُرا مانا ہے ———"

میں سمجھی نہیں۔ ذرا وضاحت کرو۔"

معصوم نہ بنو! جو چیزیں بدلنے کی ہوں۔ وہ بدلتی رہتی ہیں اور اُن کے بدل جانے سے
دنیا کا نظام برقرار ہے۔ وہ اگر نہ بدلیں تب اچنبھے کی بات ہو گی۔"

گویا تم اپنی بد باطنی کا اعتراف کر رہے ہو۔"

ہی سمجھ لو۔"

یاد رکھو! میں تمہیں ایسے معاف کرنے والی نہیں ہوں۔" سجّو ایک دم شعلہ بن گئی۔

بہت دیکھی ہیں تم جیسی۔ جاؤ اب کسی اور سے دلرُبائی کرو۔"

"تم اتنے ہتک آمیز لہجے میں کیوں بات کر رہے ہو؟"

اور تم کونسی باعصمت خاتون ہو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو عابد۔ تم تو جانتے ہو میں باعصمت اور مقدّس تھی۔"

"جب تھیں تب ہم بھی عزّت سے بات کرتے تھے۔"

"مگر اس کا ذمّہ دار کون ہے؟ کس نے کسے ورغلایا؟"

"سجّو بی بی!" عابد ذرا سا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ہر عورت اپنی عصمت کی خود محافظ ہوتی ہے۔ جب وہ اُس کا محافظ کسی مرد کو بنا ڈالتی ہے تو وہی سب سے پہلا راہزن ثابت ہوتا ہے۔ جو یہ بھول گئی۔ ذلیل و رُسوا ہوئی۔ بیسوا ٹھہری۔"

(ہائے کچھ عرصہ پہلے اسی کمرے میں۔ اس کی عصمت لوٹنے کے بعد یہ کیسے کیسے دلائل پیش کر رہا تھا۔ اور ہر طریقے سے اُسے قائل کر کے اپنی خباثت کو منوانے کا جتن کر رہا تھا)

سجّو کے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

"مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر اب یہ سبق پڑھانے سے فائدہ۔؟"

"تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیئے۔ تم جیسی لڑکی کو میں نے خوبصورت زندگی گزارنے کے گُر سکھا دیئے ہیں۔ اب چاہو تو تم اس شہر کی مشہور ترین اور مصروف ترین عورت بن سکتی ہو۔ بڑی بڑی موٹریں اور بڑے بڑے عہدہ دار تمہارے پیچھے پیچھے پھر سکتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو عابد! تمہارے کردار کا یہ گھناؤنا رُخ آج میرے سامنے بے نقاب ہو جانا سوچ کر تو میں یہ آئی تھی کہ تمہارے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں گی۔ اور تمہاری داسی بن کر رہنا بھی قبول کر لوں گی، مگر اب ——— تمہارا یہ مکروہ رُخ دیکھ کر میں زندگی بھر تمہارا نام لینا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"یہ تمہارا مجھ پر آخری کرم ہو گا۔ پلیز ایسا ہی کرنا۔" عابد حسین ڈھٹائی سے بولا۔ "یہی میرے حق میں بہتر ہے۔"

نی جانتی ہوں تم آجکل شازی کو شیشے میں اُتار رہے ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"ی کاروباری نکما بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔"

ی کاروباری نکما بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔

کھو تم اپنے اس گھناؤنے کاروبار میں ہمیشہ بار آور نہیں رہو گے۔ ایک دن تمہیں مگر یاد رکھو

ملے گی کہ کتے سے بھی ذلیل گردانے جاؤ گے۔"

ں ایسی دھمکیوں سے دبنے والا نہیں ہوں۔ بس بہت ہو چکیں باتیں۔ فوراً میرے کمرے باہر نکل جاؤ۔" عابد حسین گرجا۔ "تمہارے پاس مجھے مجرم ٹھہرانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ساری جاتی ہے۔ جب تک کوئی لڑکی خود اپنا جسم بیچنے پر آمادہ نہ ہو۔ کوئی مرد اُس کے جسم کو ہاتھ لگانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہارے جسم کی پوری پوری قیمت ادا کی ہے۔ لیکن اگر اب تم چاہو تو اور بھی قیمت ادا کر سکتا ہوں۔ وہ بھی ان تعلقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو میرے اور تمہارے رہے تھے۔ ورنہ باہر جا کر دیکھو تم جیسی لڑکیاں تو آجکل صرف سینما کے ایک ٹکٹ کے لئے اپنا آپ بیچ رہی ہیں۔"

سجّو کو یوں محسوس ہوا جیسے بھونچال آ گیا ہے۔ اس قدر توہین۔ اتنی گندی زبان ——— اور یہ خبیث آدمی ——— سجّو کے پاس اُس کی گھٹیا باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اُس نے بہ مشکل اپنے آپ کو اس کے کمرے سے باہر نکالا اور سسکتی ہوئی جا کر اپنے بستر پر ——— اوندھے منہ گری یا شاید بے ہوش ہو گئی۔ اُسے دروازہ بند کرنا بھی یاد نہ رہا ———

جب اُسے ہوش آیا تو اُسے یوں محسوس ہوا کوئی شخص اُس کی کمر سہلا رہا ہے۔ گھبرا کر اُٹھی تو نوجوانی امجد حسین اُس کے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ یہ کب اور کیسے آ گئے ——— ؟ وہ حیرت سے بولی انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

"میں ... میں ..." وہ خود ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔ "اوپر جانے سے پہلے تمہارے کمرے میں جھانکا ——— تمہاری سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ یہاں آ کر تمہیں بلایا تو تم بے ہوش پڑی تھیں۔ شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا ——— یہ کیا ہو گیا تھا تمہیں۔؟"

"امجد بھائی۔ امجد بھائی ——"

سجّو کو نہ جانے کیا ہوا۔ رات کے ان سنسان لمحوں میں ایک ہمدرد کو پاکر پھوٹ پھوٹ کر بے اختیار امجد بھائی کے سینے سے لگ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی...... وہ اس طرح ہوئی روتی رہی —— پہلے تو امجد بھائی بھی ششدر رہ گئے۔ پھر اسے سینے سے لگا کر آہستہ آہستہ اُس کی پیٹھ تھپکنے لگے۔

وہ بدنصیب اس طرح دُکھ گئی تھی کہ خود اپنے پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ شاید یہ آخری آس ٹوٹ جانے کا دُکھ تھا۔ یا —— آج اُسے اپنے لٹ جانے یا بک جانے کا احساس ہم سے زیادہ ہو گیا تھا۔ یا —— وہ کسی سچّے ہمدرد اور غمگسار کی پُرسکون آغوش چاہتی تھی جو اپنے دردِ دل میں شریک کرنا چاہتی تھی —— کسی کو اپنا پُرفریب ماضی سونپ کر سو جانا چاہتی تھی یا اپنے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا لینا چاہتی تھی۔ شاید اس لئے اُسے بالکل ہوش نہ تھا کہ وہ راضی آپا کے سینے سے لگی بیٹھی ہے یا بھائی امجد حسین کے سینے سے۔ وہ تو بس کندھے سے لگی جھٹکے کھا کھا کر روئے جا رہی تھی۔ یہ آنسو اُس کے دل کی آواز کو کم نہیں۔ بلکہ زیادہ کر رہے تھے۔ وہ کسی سے کہے تو کیا کہے ——

اور اپنی نادانی کو لوگوں کی ہمدردیوں کے عوض بدنام بھی کیوں کرے ——؟

روتے روتے اُس کی آواز بیٹھ گئی۔

اُس کے جھٹکے اور ہچکیاں بھی کم ہو گئیں.....

وہ تھک گئی —— اُس کی گردن ڈھلک گئی —— اپنی ذات پر خود اُسے ترس آنے لگا

اُس نے دُکھتی ہوئی آنکھیں موندلیں۔

سو جانا چاہا ——

بھول جانا چاہا ——

مرجانا چاہا ——

جب ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"چلو رانی! اُوپر چلتے ہیں......"

اُس نے مبہوت ہو کر اپنا سر اٹھایا۔ جیسے اس کمرے میں جنات موجود ہوں۔

"کون ہے یہ۔۔ اور ایسا کیوں کہہ رہا ہے ——؟"

جب اُس نے چونک کر سارے کمرے کا جائزہ لیا تو اُسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ کافی دیر سے بھائی امجد حسین کے سینے سے لگی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے۔

بھائی جان یہ کب آئے —— اور کیوں ——؟

اب وہ اپنے حواسوں میں آنے لگی۔

اور ابھی یہ کیا کہہ رہے تھے.... میرا ان سے کیا رشتہ ہے؟

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ انہوں نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی طرف کیا —— اور محبت بھری آواز میں بولے —— "چلو رانی اوپر چلتے ہیں ——"

"اُوپر کیوں ——؟" وہ اسی حیرت سے بولی۔

"اُوپر اپنے کمرے میں ——"

"اپنا کمرہ ——" وہ اور حیران ہوئی۔

"ہاں ہاں —— میرے کمرے میں —— آج زبیدہ میکے گئی ہوئی ہے۔ اور... میں تمہیں اتنا پیار کروں گا۔ اتنا پیار کروں گا کہ تمہارے سارے غم مٹ جائیں گے ——"

"جی ——"

"ہاں... اور آج تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ ایک خاموش پجاری کی محبت کیا شے ہوتی ہے"

"جی ——"

"وہ پجاری جو ہمیشہ دُور دُور سے نظارہ کرتا تھا۔ اور پیاسا رہتا تھا —— شاید آج تمہیں بھی اُس کی ضرورت ہو —— دیر نہ کرو —— یہاں کوئی جاگ جائے گا۔ کوئی

دیکھ لے گا۔ ہم اوپر اپنے بیڈروم میں چلتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہارے ایک ایک لمحہ
میں اتنی خوشیاں دے سکتا ہوں کہ تمہیں اس ظالم دنیا کی پرواہ ہی نہیں رہے گی۔۔۔"

"جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سجّو کا سر اور زور سے گھومنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ بھائی امجد حسین لپک کر
جانے کس پاگل پن کے عالم میں وہ بپھر کر کھڑی ہو گئی۔

"رانی ۔ ۔ ۔ سمجھنے کی کوشش کرو نا ۔ ۔ ۔ ۔ چلو اُوپر چلتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہیں وہاں
بہت سی باتیں بتاؤں گا۔" انھوں نے جب سجّو کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو سجّو نے ایک زناٹے دار
امجد حسین کے منہ پر لگایا اور بولی۔

"اب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں شیخ امجد حسین! اور بہت جلد سمجھ جاؤں گی۔ تم
قابل بھی نہیں ہو کہ تمہیں بھائی کہا جائے۔ تم لوگ انتہائی کمینے اور ذلیل ہو۔ اور اس کے ساتھ
بے غیرت بھی ہو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میری دوستی تمہارے چھوٹے بھائی سے تھی
کے باوجود تم نے مجھے بکاؤ مال سمجھا اور اپنا حصّہ لینے کے لئے آ پہنچے۔ تم لوگ انسانیت کی
میٹھنے والے گدھ ہو ــــــ خوش لباس، خوش گفتار اور تعلیم یافتہ گدھ ــــــ اب
سمجھ آئی ہے ــــــ یہ گھر نہیں ــــــ قمار خانہ ہے ــــــ تم لوگوں کی بے غیرتی
کا آئینہ ہے ــــــ تم لوگ ایک مجبور کے اردگرد مکر و ریا کا جال بنتے ہو۔ اور ایک معصوم
کا شکار نین پتھروں سے کرتے ہو۔ ایک بھائی اپنی ہوس پوری کر کے دور جا بیٹھتا ہے۔ اور بعد
میں تم دونوں اپنا حصّہ لینے آتے ہو ــــــ تم مُردار کھانے والے مہذب گدھ ہو
حرام کھانے والے ہو ــــــ سیاہ دل ہو ــــــ ایک نے تو مجھے اپنے دام میں پھنسا لیا
مگر اب ــــــ میں تم جیسے بزدل اور بددیانت آدمیوں کے دام میں گرفتار ہونے والی نہیں
اپنی شریف بیویوں کے خود ساختہ مظالم کی داستان بیان کرنے والے مردوں کے چلتر سے واقف
ہو گئی ہوں۔ اُس نے ایک اور زناٹے دار تھپڑ امجد حسین کے دوسرے گال پر جڑ دیا۔

فوراً اٹھو ــــــ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ پیشتر اس کے کہ میں سارے گھر کو جگا کر
بھائیوں کا کچا چٹھا کھول کر سناؤں۔ تم لوگوں کو آبرو باختہ لڑکیوں کی عادت ہو گی۔
میں مجبور ضرور ہوں۔ مگر اپنے مقام سے گری نہیں ــــــ اور انتقام لینا بھی خوب
جانتی ہوں۔

کھڑے ہو جاؤ فوراً ــــــ

امجد حسین سہما ہوا ــــــ تابعدار بچّے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ ابھی تک
اپنے رخسار پر رکھا ہوا تھا۔ سجّو میں آج نہ جانے ایسی ماورائی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ دونوں
تھپڑ امجد حسین کے منہ پر لگے تھے۔ انھوں نے انگلیوں کے نشان چھوڑے تھے۔ شاید وہ
امجد حسین کا سارا غصّہ امجد حسین پر نکال رہی تھی۔ یا اب اُسے صحیح معنوں میں ہوش آ گیا تھا۔
امجد حسین مسکین سی شکل بنائے دروازے کی طرف بڑھا۔

"امجد حسین! تمہاری بھی پانچ بیٹیاں ہیں۔ کسی کی بیٹی پہ ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُن کے متعلق
بھی سوچ لینا۔ کل کو وہ بھی خوابگاہوں کی زینت بن سکتی ہیں۔"

امجد حسین کو باہر دھکا دے کر سجّو نے دروازہ بند کیا اور اندر سے کنڈی لگا لی۔ رات کی
خاموشی میں امجد حسین کے لٹے لٹے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آنے لگی۔ اور ساتھ ہی
اسے زبیدہ بھابی کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سجّو بی ۔ ۔ ۔ تمہیں ہر شے کی حقیقت کا علم تب ہو گا جب پانی سر سے گزر جائے گا۔ ۔ ۔ ۔
جو ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کی ہمّت نہیں ہے ۔ ۔ ۔ اور پھر میرے اردگرد حسین و نوجوان
لڑکیوں کا ہجوم بھی نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہُنر تو ان بہنوں کو آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی ان کے دیوانے
ہوں نہ ہوں ــــــ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

واقعی سجّو حیرت سے آنکھیں پھاڑے بھابی کے الفاظ یاد کرنے لگی۔ تب
وہ نادان تھی۔ ان سب کی انتہاء کو کہاں پا سکتی تھی۔ ایک نیم خواندہ عورت نے اُس کی عقل سے

پردہ ہٹانا چاہا تھا۔ باتوں باتوں میں بڑے پتے کی باتیں کہی تھیں ——— کاش وہ سمجھ

——— تو برباد ہونے سے بچ جاتی ———

مگر ——— وہ کیسے سمجھ سکتی تھی۔ اس پر سب بہن بھائیوں نے دل کھول کر...

وہ تو اُن کے خلاف کوئی بات سننے پر آمادہ ہی نہ تھی۔ . . . اُلٹا زوبی بھابی کو...

بے ہودہ عورت سمجھتی تھی۔

مگر آہ ——— اب کیا ہو سکتا ہے ——— کیا ہو سکتا ہے اب ———

جو ہونا تھا ہو چکا ———

آشیاں جل چکا ——— راکھ اُڑ چکی ——— خواب بکھر چکا ——— ...

ٹوٹ گئیں۔

کانچ بکھر گیا ———

باقی کیا رہا ———

پچھتاوا ———

احساسِ جرم ——— یا

احساسِ گناہ!

جو کچھ بھی باقی بچا تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ سجو جیسی پاکیزہ صفت اور معصوم لڑکی کے لئے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ ابھی پوری زندگی اُس کے سامنے تھی ——— اُسے صرف یہ جھیلنا تھا ——— بلکہ اس کی ہوا تک زمانے سے چھپانی تھی۔ اپنے چہرے پر ایک... چہرہ سجانا تھا۔ اپنے ٹوٹے دل کو از سرِ نو جوڑنا تھا مصنوعی مسکراہٹوں کو ہونٹوں پر بکھیرنا پڑھنا تھا ——— گو زندگی کے متعلق فیصلہ کرنے کی ابھی اُس میں سکت نہ تھی۔ مگر وہ... کا فیصلہ بھی نہ کر سکتی تھی۔

اُس کی موت نے اس کالک کو جو وہ اپنے ناموس اور والدین کے نام کو لگا چکی تھی...

...تھا۔

وہ تو مر بھی نہ سکتی تھی ———

کتنی مجبور تھی ——— ؟

کتنی بے شمار مصلحتیں تھیں جو اُسے خاموش رہنے پر۔ اور زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

انتقام کی سکت اس میں نہ تھی ———

بددعا ——— رستے ہوتے زخموں کا مرہم نہیں ہوتی ———

انصاف ——— ؟ کس سے طلب کرتی۔؟ اُس خدا سے جس کے بنائے ہوئے ...اُس نے ٹھکرا دیئے اور زمین پر ایک خاکی مسجُود ڈھونڈ لیا ———

اپنے خدا سے وہ شرمندہ تھی۔

یوں دیواروں میں منہ دے دے کر روتی۔ جیسے خدا سے اپنا گناہ گار چہرہ چھپانا ہی ہے۔

یہ آنسو بھی ناپاک تھے۔ یہ اُس کی چوکھٹ پر نہ بہائے جا سکتے تھے ———

روتے وقت وہ ہائے اللہ نہ کہتی ——— یہ عظیم و برتر نام اُس کے ناپاک ہونٹوں ...لائق نہیں تھا ———

چلاتے وقت وہ حسبِ عادت ہائے اماں بھی نہ کہتی ———

اماں کیوں ——— ؟ اماں کے مقدس اور پاک دودھ کو اُس نے گندگیوں اور آوارگیوں ...آلودہ کر دیا۔ دھبہ لگا دیا۔ کہاں رکھی اُن کے دودھ کی لاج ——— اُن کے خون ...آبرو ——— ؟

ہائے سجو! تو کتنی گر گئی تھی ———

غلاظت میں گر کر غلاظت بن گئی۔

...اور غلاظت کو اگر سونے کے ورق میں بھی لپیٹ دیا جائے تو وہ غلاظت ہی رہتی

ہے۔

اب تو تعفن کا ایک ڈھیر ہے۔

سڑی ہوئی مُردار کی لاش ہے ——

مکھیوں اور گِدھوں کا آخری مسکن ہے۔

تو اُن سچے، سیدھے اور پاکباز انسانوں میں رہنے کے قابل نہیں رہی ——

تو نے جنم لیا اور جن کے اعتماد کو تو نے دھوکا دیا ——

تیرا درد اس پوری دنیا میں کوئی نہ جان سکے گا۔ تو اپنے پچھتاووں کو ہتھیلی کا چھپا

یونہی زندگی بھر دُکھتی پھرے گی۔ رِستی پھرے گی —— یہی تیرے اس جرم کی

ہوگی۔

تجھے اپنے ضمیر کی سزا بن کر زندہ رہنا ہوگا۔

اور اس کے سوا کوئی راہِ فرار نہیں ——

تمام رات وہ بیکل رہی —— انگاروں پر لوٹتی رہی —— آنسو تو اتنے!

آنکھوں کے دریا خشک ہو گئے۔

اب وہ ایک پل بھی اس اندھیر نگری میں نہ رہنا چاہتی تھی۔

یہ گھر —— اُسے بچھوؤں اور سانپوں کا بسیرا معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں وہ بھول کر

نکلی تھی۔ اور اپنے جسم و روح کو ڈسوا کر زہر آلود کر لیا تھا۔

کاش اُس نے اس منحوس جہنم کدے میں کبھی قدم نہ رکھا ہوتا۔ کاش ——

یہ رات ——

ڈھلتی ہوئی سوگوار رات —— اُسے پھر سے پہلے والی سجو بنا دے ——

وہی سجو! جو پہلے پہل برقعہ اوڑھے اور اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے، کلائی پر ا

فیشن کی گھڑی باندھے ہراساں و پُرشوق لاہور کے پلیٹ فارم پر اُتری تھی۔ تب اے!

تھا —— ؟

زندگی میں اتنی جلدی کیا کچھ ہو جائے گا —— ؟

اے لاہور —— دے دے میری عصمت، میری دوشیزگی —— میری پاکیزگی!

میرا ابھرا وجود —— اور میرے تن کا غرور ——

کہاں گیا وہ موتی —— ؟ جو سیپ میں بند تھا۔ تیرے سمندری مگرمچھوں نے

نگل لیا ہے۔

میرا مصفا تن اور معصوم ذہن لوٹا دے۔

لوٹا دے ——

لوٹا دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دیوانی۔ دیوانوں جیسی باتیں سوچتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ اور صبح ہو گئی۔

اُس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس گھر کے کسی بھی فرد کا سامنا کرے۔ بہرحال ایسا تو ناممکن تھا

نے جلد جلد اپنا سامان ٹھیک کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ چہرے پر بشاشت پیدا

کر باہر برآمدے میں نکل آئی۔

راضی آپا حسبِ معمول مُسکراتے ہوئے آگے بڑھیں۔ "صبح بخیر۔ بہت پیاری لگ رہی ہو

دُھلائی۔"

صبح بخیر ——

ہونہہ ۔ ۔ ۔ اُسے راضی آپا کے باہر نکلے ہوئے دانت اژدھے کے دانت لگے۔

جو ہر کھب جائیں تو سارا خون نچوڑ لیتے ہیں۔

"ابھی تو گاڑی میں بہت وقت ہے۔ آؤ پہلے تم ناشتہ کر لو۔"

حالانکہ ناشتے کو اُس کا ذرا بھی دِل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے

اُس نے چند لقمے زہر مار کئے اور چائے کی ایک پیالی پی کر اُٹھ گئی۔

"راضی آپا! میں ذرا وقت سے پہلے اسٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ کیونکہ آج سامان زیادہ ہے۔ جگہ بنانے میں آسانی رہے گی۔"

"اچھا ——" راضی آپا سوچتے ہوئے بولیں۔ "بھائی تو سب ابھی سوئے ہوئے ہیں تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے ——" اُس نے شکر کیا۔ وہ کب بھائیوں کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

راضی آپا نے موٹر میں اُس کا سامان رکھوا دیا۔ اُس کی پیشانی چومی۔ اور تاکید کی کہ جاتے ہی خیریت سے پہنچنے کا خط لکھنا۔ اور رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی یہاں آجانا۔ یونیورسٹی میں داخلہ دِلا دیں گے۔

اُس نے بھی اوپرے دِل سے حامی بھر لی۔ پھر سوتے ہوئے لوگوں کے لئے دعا پیش کی کہ وہ اُنہیں خدا حافظ نہیں کہہ سکی۔ اور موٹر میں جا بیٹھی۔

موٹر اسٹارٹ ہوئی اور "گُلِ افشاں" کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ ایسے جیسے کسی کے تن سے رُوح نکل جاتی ہے۔ سجّو نے کم از کم ایسا ہی محسوس کیا۔

اُس نے اپنے دل سے کہا —— آج آخری بار گزرے ایام اور بکھرے خوابوں پر فاتحہ پڑھ لے۔ پھر اس کے بعد ان در و دیوار کو، ان خوشبوؤں کو —— اور ان کہانیوں کو یاد تک نہ کرنا ——

نہ جانے کہاں سے دو آنسو اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے ——

"کیا بات ہے بی بی جی۔؟ جانے کا بہت دُکھ ہو رہا ہے؟"

سجّو ایک دم چونک گئی۔ اُس کو احساس ہی نہیں تھا کہ ڈرائیور اپنی ایک آنکھ سے شیشے میں اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُسے وہ ایک آنکھ بہت چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر وہ خاموش بیٹھی رہی —— اُس میں اتنی ہمت کہاں تھی؟ کہ اس ڈرائیور کے طفیل سے جواب دیتی۔ اور پھر اب ان جوابوں سے کیا حاصل تھا۔؟

"عابد میاں! آج آپ کو چھوڑنے کیوں نہیں آئے ——؟" وہ پھر مکروہ انداز میں ہنسا۔

سجّو کا دِل چاہا جوتا اتار کر اُس کے سر میں مار دے۔ بہت سر چڑھا ڈرائیور تھا۔ وہ جانتی تھی گھر کا بھیدی تھا اس لئے بہت سی باتوں کو جانتا تھا۔ سجّو ضبط کر گئی۔ مگر اُس نے پھر بھی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"ویسے جی —— یہ جو اپنے عابد میاں ہیں نا جی۔ بڑے اپٹوڈیٹ آدمی ہیں۔۔۔"

سجّو کو طفیل کے جُملے کی ذرا سمجھ نہ آئی۔ ایسے ہی اُس نے استفہامیہ انداز میں نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

طفیل جبڑے پھاڑ کر ہنسا۔ "ہاں جی —— بڑے کھیل باز آدمی ہیں۔"

"کھیل باز۔۔۔؟" سجّو نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں جی۔ وہ کھیل۔۔۔ جسے کہتے ہیں نا جی ڈرامہ ——"

"ڈرامہ۔۔۔ تو ایسے ڈرامے یہ گھر میں کرتے اور کرواتے ہیں"۔ اب سجّو کو تجسس ہوا۔ براہِ راست بولی۔

"کیسے ڈرامے طفیل ——؟"

"بس جی —— وہ جی ——" گردن اِدھر اُدھر گھما کر پھر بے ہودہ انداز میں ہنسنے لگا "کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کہیں اُن کو پتہ نہ چل جائے۔"

"اُن کو کون بتائے گا۔ میں تو یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔" سجّو نے سادگی سے کہا۔

"یہی سوچ کر تو بتانا چاہتا تھا جی۔۔۔۔ کہ بس ایسے ڈرامے لڑکیوں کو چکر دینے والے۔۔۔ بی بی جی خواہ مخواہ اتنی اداس ہو کر جا رہی ہیں۔ اُن کی تو عادت ہے بس چار دن کے کھیل۔۔۔"

سجّو ایک دم سُن ہو گئی۔ ایک شعلہ سا اُس کے ذہن میں لپک گیا۔

"وہ جی ——— جب آپ امتحانوں کے دنوں میں "گل افشاں" میں ٹھہری ہوئی تھیں جی . . . . " وہ شرارت سے ہنسا۔

"ایک رات عابد میاں نے میری ڈیوٹی آپ پر لگادی تھی ——"

"مجھ پر ——— وہ کیوں ———؟" سجّو نے بپھر کر پوچھا

"جی وہ ——— پتہ نہیں جی ———" وہ سر کھجاتے ہوئے ہنسا ——— مجھے تو بس انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ رات کے ایک بجے آپ کے کمرے کا فیوز اڑا دوں اور کے پاس آکر کسی کنستر یا ڈرم کو بجا بجا کر خوب شور و غل کروں۔ عجیب و غریب آوازیں نکال کر کو ڈراؤں . . . ."

"کیوں ———؟"

سجّو نے پوچھنے کو تو پوچھ لیا۔ مگر یہ سنتے ہی اُس کا دل ایک دم بیٹھ گیا . . . اور اُس کو بھیانک رات یاد آگئی۔

"بس جی ——— مجھے کیا معلوم ——— ویسے جی اُس رات سارے گھر کی لائٹ نہیں ہوتی تھی جی . . . ."

ہوں! سجّو نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ تو اس طرح کا تانا بانا بنایا گیا تھا۔

"اور تمہیں اس کام کے کتنے پیسے ملے تھے ———؟"

"جی ———" وہ بے شرمی سے ہنسا۔ "صبح اٹھ کر انہوں نے مجھے سو روپے دیے تھے۔ اور شاباش الگ۔"

"تم مجھ سے دو سو روپے لے لیتے۔ اور اُن کی کارستانی مجھے بتا دیتے۔" سجّو نے جیسے ہوئے کہا۔

"بس جی۔ ہم تو نمک خوار ہیں۔ ملازم ہیں۔ غلام ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں جی . . . . ہیں جو مالکوں کا حکم ہو ——— حکم اچھا ہو یا بُرا . . . . ہمیں تو ماننا پڑتا ہے جی

بھی اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔"

یہ آخری تازیانہ اگرچہ بڑا جانگسل تھا مگر سجّو بھی خاموش ہو گئی۔ اب مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔

بھی سہہ لیا۔

تو جی . . . . اس رات کیا واقعی آپ ڈر گئی تھیں اور بھاگ کر عابد میاں کے کمرے

طفیل ———" سجّو ایک دم چیخ پڑی۔ "بکواس بند کرو اور گاڑی چلاؤ۔ ورنہ میں ابھی ٹیکسی لے لوں گی۔"

ڈرائیور خاموش ہو گیا۔

اور سجّو آگ کے شعلوں میں جلنے لگی۔ آج اسٹیشن کا راستہ بھی لمبا ہو گیا تھا۔

تھوڑی دُور جا کر ڈرائیور پھر آپ ہی آپ بولنے لگا۔

میں تو جی غریب آدمی ہوں . . . . چھ بچے ہیں۔ بیوی ہر وقت بیمار رہتی ہے اس کا ساتواں بچہ ہونے والا ہے۔ آج کل ہسپتال میں ہے . . . ."

سجّو خاموش بیٹھی رہی۔ جیسے یہ سب کچھ مہمل ہو . . . . سامنے اسٹیشن نظر آنے لگا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

تنخواہ ساری کی ساری اُس کے علاج پر لگ جاتی ہے۔ بچوں کا خرچہ الگ ہے۔ . . . . نوکری کروں یا لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں . . . جی اس پیٹ کے بھرنے کے لئے آدمی کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا . . . ." وہ بولے گیا۔

اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ ڈرائیور نے سامان اُتارا۔ قلی دوڑے دوڑے آگئے۔ سجّو ابھی بیٹھی ہی تھی کہ ڈرائیور نے شیشے کے قریب آکر کہا۔ "میں جاؤں یا آپ کو سوار کرا کے جاؤں"

"نہیں طفیل تم گھر چلے جاؤ۔ میں خود سوار ہو جاؤں گی۔" یہ کہہ کر سجّو نے پرس اٹھایا۔ ڈرائیور

نے دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر نکلی۔

طفیل مسکین سی شکل بنا کر بولا۔" جی۔ وہ میں نے عرض کیا تھا ناکہ میری بیوی بیمار ہے اُس کا آپریشن ہونا ہے۔ غریب آدمی ہوں ——— مہینہ ختم ہونے کو ہے ——— اب کس سے مانگوں ——— غریب کو تو کوئی اُدھار بھی نہیں دیتا۔ اگر آپ کے پاس اسی نوّے روپے فالتو ہوں تو اُدھار دے دیں۔ اپنا پتہ بتا جائیں۔ تنخواہ ملتے ہی لوٹا دوں گا۔"

سجّو کو ایک دم یاد آ گیا کہ وہ ڈولی وغیرہ سے بھی اسی طرح رقم بٹورا کرتا تھا۔ اس کا بیوی بچّہ نہیں ہے۔

مگر . . . . . .

چونکہ وہ سب کی سیاہ زندگی کا ساجھی تھا۔ اس لئے بھید کی قیمت وصول کرنے کا عادی تھا . . . . اور اس کے ساتھ بھی اس وقت وہی حربہ آزما رہا تھا۔ خیر ——— اُس نے خاموشی سے پرس کھولا۔ پیسے گنے۔ ٹکٹ وہ خرید چکی تھی۔ سفر خرچ کیلئے تھوڑے سے پیسے رکھ کے باقی اُس نے طفیل کے ہاتھ پر رکھ دیئے ——— یہ اُس کی توقع سے بھی زیادہ پیسے تھے ———

مگر اب وہ یہاں سے دُور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ یہ آسیب کے سائے ——— خوفناک ڈھانچے ——— جوں جوں اُن کے قریب جا رہی تھی ——— نئے نئے اور بھیانک انکشاف ہو رہے تھے ——— اب اُس میں زیادہ دیکھنے اور سننے کی تاب نہیں تھی ——— وہ قلیوں سے سامان اُٹھوا کر اندھا دھند پلیٹ فارم کی طرف دوڑی ——— کہیں پلیٹ فارم پہ کھڑی ٹرین بھی ——— اُس کے کرتوتوں کو جان کر اُسے چھوڑ کر نہ چل دے

سجّو جب تھکی ہاری، بُرقعہ اوڑھے ہوئے اپنی بڑی سی حویلی کے اندر داخل ہوئی تو اُسے احساس ہوا کہ گھر شادی کے ہنگاموں میں ڈوبا ہوا ہے۔ بے شمار مرد باہر ڈیرے میں چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ اور اندر "زنان خانے" میں ہر عمر کی عورتیں و بچّے ——— رنگ برنگ کپڑوں اور زیوروں میں اِدھر اُدھر بے مقصد بھاگ دوڑ رہے تھے۔

سجّو کو دیکھتے ہی دو تین نوکرانیاں لپک کر آئیں اور اُس کے پاؤں چھُو کر فرشی سلام کئے ——— گاؤں کا دستور تھا کہ سیّدوں کے چھوٹے بچّوں کو بھی پاؤں چھُو کر سب لوگ سلام کرتے ——— پہلی بار سجّو کو احساس ہوا یہ پاؤں اس قابل نہیں تھے کہ انہیں اتنی عقیدت سے چھُوا جاتا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ ورنہ اس سے پہلے تو نوکروں چاکروں کے اس طرح قدموں پہ گرنے سے اُسے بڑی تسکین ہوتی تھی۔

کسی کو اُس نے اپنا پرس پکڑایا، کسی کو بُرقعہ۔ دو تین کو باہر تانگے سے سامان اٹھوا کر اندر لانے کی ہدایات دیں۔ اور پھر وہ اپنی ماں کا پوچھ کر اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ امّاں بھی ارد گرد بیٹھی عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تکئے کے ڈھیر لگائے۔ دس بارہ معزز قسم کی رشتہ دار خواتین میں گھری بیٹھی تھیں۔ سجّو کو دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اسے سینے سے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا۔ اُن کے سینے سے لگتے

ہی سجّو کا جی چاہا چیخ مار کر روتے۔ یہ سینہ نہیں۔ خانہ کعبہ ہے اور اس غلاف سے لپٹ کر
اپنے سارے گناہوں کے داغ دھو لے۔

مگر اُس نے اپنی چیخ اپنے سینے میں ہی روک لی۔

"تیرا چہرہ بہت اُترا ہوا ہے۔ بہت تھک گئی ہے میری بیٹی؟" ماں نے بیٹی کا اُدا
کیا۔

"بس یونہی۔ امتحانوں کے بعد دو چار روز بازاروں میں پھرتی رہی ہوں۔ آرام نہیں کیا"
اُس کی ماں نے اُسے آرام سے پلنگ پر بٹھایا اور نوکرانیوں کی فوج کو حکم دیا کہ بی
لئے ٹھنڈا اور خوشبودار دُودھ لائیں۔ مگر اُسے اس وقت گرم گرم چائے کی طلب ہو رہی
گاؤں کی روایات کے ساتھ ساتھ وہ دُودھ بھی چھوڑ چکی تھی۔ اور چائے کے نشے میں اپنا
ہونٹ جلانے کی عادی بن چکی تھی۔ چنانچہ اُس نے چائے کے لئے کہہ دیا۔

پھر خود منہ ہاتھ دھونے کے لئے اپنے کمرے میں آگئی۔ چائے پی چکنے کے بعد
کی طبیعت ذرا سنبھل گئی تو اُس نے بلّی کے جہیز کی وہ تمام چیزیں جو لاہور سے خرید کر لائی
ماں کو اور سب رشتہ داروں کو دکھانی شروع کیں۔ اس کے ساتھ رسیدیں نکال کر
حساب بھی بتاتی گئی۔ ماں سب کپڑے، زیور اور چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں
کے رسم و رواج کے مطابق انہوں نے جو کچھ بلّی کے لئے بنایا تھا۔ نکال نکال کر سجّو کو دکھانے
سجّو نے ہر شے کی بہت تعریف کی اور ماں کا حوصلہ بڑھایا۔ گو ذاتی طور پر اُ
قدر بھاری کپڑے اور بے شمار بے تکی چیزیں پسند نہیں آئی تھیں۔ مگر اب سجّو پہلے والی
منہ پھٹ سجّو نہیں تھی۔

دونوں ماں بیٹیوں کو اندر حساب کتاب لگانے اور گہنے کپڑے گننے میں خبر ہی نہ
باہر رات اُتر آئی ہے اور ڈھولک کا شور تیز تر ہو گیا ہے معلوم ہوا کہ شادی کی پہلی رسم کرنے
لئے دُولہا اندر آنا چاہتا ہے۔ اُس کی ماں تو اسی طرح باہر نکل گئی۔ مگر سجّو نے کہا وہ ذرا

پہنے گی۔

جب سجّو خوبصورت سا پاجامہ کرتا پہنے اور بڑا سا جوڑا لگائے باہر نکلی تو گاؤں کی سب
مبہوت ہو کر اُسے دیکھنے لگیں وہ جدھر نکل جاتی سب خود بخود اُس کے لئے راستہ
دیتیں۔ جیسے کہ وہ کوئی مہارانی ہو۔

بہت سی محلے کی عورتیں یا مزارعین کی بیویاں اسے دیکھتے ہی بھاگ کر آتیں اور اُس کے
چھو کر لمبا سا سلام کرتیں۔ جب بھی کوئی عورت اُس کے قدموں میں جھکتی، وہ نئے سرے سے
کرب میں مبتلا ہو جاتی۔ بہرحال وہ انہیں کیا کہہ سکتی تھی۔ لوگوں کے سلاموں کے جواب دیتی
اس ہجوم میں پہنچ گئی۔

وہاں اُس کی رشتہ دار خواتین، بہنیں، بھابھیاں اور بھانجیاں، بھتیجیاں براجمان تھیں
ہنے سب سے ملی۔ دو چار فقروں میں اُن کا حال پوچھا۔ اپنا بتایا۔ اور پھر وہاں پہنچنے
کوشش کرنے لگی جہاں دُولہا دُلہن چھپے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے جگہ بنا کر وہ ان دونوں
پہنچ گئی۔

پسینے کی بدبو، شور و غل، بدتمیزی کا مظاہرہ ———— ان باتوں سے وہ سراسر نفرت
تی تھی۔ مگر آج اُسے کچھ بُرا نہیں لگا۔ دُولہا اور دُلہن دونوں اپنی اپنی جگہوں پر دو خوبصورت
ں میں چھپے بیٹھے تھے۔ سامنے ایک خاتون ایک برتن میں رُوئی کے پھول توڑ توڑ کر پھینک
ں۔ دُولہا کا بھی ایک ہاتھ باہر تھا اور دُلہن کا بھی ———— دونوں ہاتھ جلدی جلدی ان
ں کو چھُنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر بار ہاتھوں کے ٹکراؤ پر عورتیں اور لڑکیاں شور و غل
رہی تھیں۔ ذرا پرے میراثن اپنی پاٹ دار آواز میں گا رہی تھی۔

"کتیں کوں نہ ڈیساں مانگوا
میرا اصل دو خالا لاڈلا"

(میرا عجیب الطرفین ساجن ہے۔ میں کسی کو ذرا کی ذرا مانگنے پر بھی نہ دوں گی)

وہ ان رسموں اور رواجوں کو بیہودہ سمجھا کرتی تھی۔ دُولہا دُلہن کا اندھے بن کر بیٹھنا اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ فضول سی رسمیں اُسے جاہلانہ لگا کرتیں پتہ نہیں چل رہا کہ ان کے اندر کیا شے ہے ——— ؟ انسانی پیکر ہیں یا مٹی کے ڈھیر ———

مگر آج ——— وہاں دُولہا دُلہن کے قریب کھڑے جانے کس نے اُس کے کان میں کہہ دیا۔

"ان فرسُودہ دوشالوں کے اندر خاندان کی عزت اور شرم و حیا ہوتی ہے۔"

اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ایک دم پلٹ گئی۔ ہجوم کو چیرا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ رشتے دار خواتین حیران بھی ہوئیں کہ اب وہ اتنی مزاج دار ہوگئی ہے کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی نہیں کیا ——— مگر وہ تھکاوٹ کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ یوں بھی رات ہو چکی تھی۔ بستر پہ پڑتے ہی سو گئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب ایک نوکرانی اُس کے سرہانے کھڑی اُسے جگا رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر کلائی پر نظر ڈالی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔

"شاہ سائیں۔ اور سب لوگ اندر آگئے ہیں اور آپ کو بُلا رہے ہیں۔"

تب اُسے خیال آیا وہ اپنے گھر میں ہے اور ابھی اپنے بابا سے نہیں ملی۔ جلدی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سر پہ دوپٹہ سنوارا ——— باہر نکلی ——— سارا گھر گیس کے ہنڈوں سے جھول رہا تھا۔ مہمان عورتیں کھانا کھا کر جا چکی تھیں۔ مگر رشتہ دار اتنے زیادہ تھے کہ گھر میں کافی چہل پہل تھی۔

وہ بڑے مؤدب طریقے سے اپنے بابا کے پاس گئی۔ نظریں جھکا کر، قدم چھو کر انہیں سلام کیا۔ اور اسی طرح اپنے دونوں بھائیوں اور باقی بزرگ رشتہ داروں سے ملی۔ بھائیوں نے سرسری انداز میں اُس کا حال پُوچھا۔ بابا نے پیروں کے بارے میں پوچھا۔

بابا کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر اُس نے اُن کے بوڑھے جھرّیوں دار چہرے کی جانب دیکھا۔

سفید اور سیاہ ملی جلی داڑھی ———

چھوٹی بڑی جھرّیاں ———

نیلی نیلی آنکھیں ———

بابا۔ بابا۔ اُس کا دل چیخنے لگا۔

میرے مُنہ پر تھوک دو بابا۔ یا پھر مجھے نئے سرے سے جنم دو۔ تمہاری جُھکی جُھکی آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ کہ تم مجھ سے خُوش نہیں ہو۔"

مگر اُس نے یہ چیخ بھی اپنے سینے میں دبا لی۔ سب لوگوں سے مِل کر اُن کے مختصر سوالوں کے جواب دے کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ گھر کے لوگ اب کھانا کھا رہے تھے۔ امّاں نے پوچھا وہ کہاں بیٹھ کر کھانا کھائے گی۔

ایک دم سے اُسے یاد آگیا کہ وہ ابھی تک بلّی سے نہیں ملی۔ اُس نے امّاں سے پوچھا کہ بلّی نے کھانا کھا لیا ہے۔ جب اُنھوں نے بتایا کہ اب وہ بلّی کو ہی کھانا بھجوا رہی ہیں۔ تو وہ بولی کہ وہیں بھیج دیں۔ میں اُس کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔ وہاں سے وہ اُس کے کمرے کی طرف بڑھ دی۔ جہاں بلّی مائیوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اندر داخل ہو کر دیکھا۔ کہ اپنی چار پانچ سہیلیوں کے ساتھ بلّی ابھی تک دوشالے میں چھپی ہوئی سی بیٹھی ہے۔ اتنی سخت گرمی میں اُسے ذرا بھی گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے سجّو کو اندر آتے دیکھا تو مارے خوشی کے کھڑی ہوگئی۔ سجّو نے بھی وفورِ جذبات سے اُسے گلے لگا لیا۔ اور پھر دونوں بہنیں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں۔

اُنہیں روتا دیکھ کر کمرے میں موجود سب لڑکیاں اور نوکرانیاں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ یہ شاید ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پرائے کی آنکھ چھلک جاتی ہے۔

بلّی کیوں رو رہی تھی ——— ؟

شاید اُسے احساس تھا کہ ایسے موقعوں پر یونہی مِل کر رو دیتے ہیں۔ یا اُسے اپنی آنکھوں سے بچھڑنے کا غم تھا۔ سجّو کیوں بلک بلک کر رو رہی تھی ——— ؟

دیکھنے والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ اُسے چونکہ چھوٹی بہن سے بہت پیار ہے اِس لئے اُس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی، سینے سے لگی رو رہی ہے . . . . .

مگر سجّو تو جس وقت سے آئی تھی، اُس نے کئی چیخیں اپنے سینے میں دبائی تھیں کئی بار تھے۔ اور کتنی آہوں کو ہونٹوں میں دبایا تھا۔ لمحہ لمحہ اُسے کرب بخش رہا تھا۔ اور یہ کرب اُس کے میں جمع ہو رہا تھا۔ اب بلّی کی معصوم شکل دیکھ کر، اس کے سینے سے لگ کر، اسے اپنی محرو کا احساس بڑی شدّت سے ہونے لگا تھا۔ وہ پھوٹ پڑی ——— رو دی ——— رونے کو کوئی کندھا تو مِلا ——— جی ہلکا کرنے کو کوئی غمگسار تو نظر آیا۔ کوئی اپنا تو مِلا۔ جس کے گلے لگ کر وہ حالات کا بوجھ اُتارنا چاہتی تھی۔

اور بلّی سے اسے واقعی بڑا پیار تھا۔ بچھڑنے کا دُکھ اور جُدائی کا احساس اپنی جگہ پر تھا۔ زندگی کے اس سنگم پر دو پیار کرنے والی بہنیں اسی طرح رو دیا کرتی ہیں۔ مگر رخصتی تو کل تھی۔ اور وہ دونوں آج ایک دوسرے سے لپٹی رو رہی تھیں۔ پھر جب سجّو کی گھٹی ہوئی چیخیں آنسوؤں کی راہ نکل گئیں تو اُسے ہوش آ گیا۔ اتنی دیر تک گلے لگ کر رونا ٹھیک نہیں۔ دیکھنے والے یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ آخر پچھتاوے کیسے ہیں۔"

وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔ اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کیا۔ پھر بلّی کو چُپ کرایا۔ اُس کا چہرہ صاف کیا۔ اتنے میں کھانا آ گیا۔ دونوں بہنوں نے مِل کر کھانا کھایا۔ پھر سجّو اُس کا موڈ ٹھیک کرنے کو بولی۔ تیرے لئے میں لاہور سے بہت ہی خوبصورت چیزیں بنوا کر لائی ہوں۔ دکھاؤں؟

"ہاں۔" بلّی نے شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ سجّو جو بکس بھر کر لاہور سے لائی تھی وہ نوکرانیوں سے اسی کمرے میں منگوا لئے۔ اور ایک ایک کپڑا کھول کر بلّی کو دکھانے لگی۔ خوبصورت

...پ کا سامان، جوتے، پرس۔ اور اتنی بے شمار پیاری پیاری چیزیں جن کا بلّی تصوّر ...ر سکتی تھی۔ خوشی کے مارے بلّی کا چہرہ چودھویں کے چاند جیسا ہو گیا۔ چاند کی کرنیں ...پھوٹ کر اس کے رُوپ کو اور نکھار بخشنے لگیں۔ سجّو یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ مائیوں ...ں بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ زرد میلے کپڑے ——— تیل میں چپکے ہوئے بال ——— ...ں پر گہری سیاہ مہندی ——— اُبٹن کی خوشبو ———

بلّی کتنی خوش تھی ——— ؟

معصوم سی سترہ سالہ بلّی!

جسے کچھ علم نہیں تھا کہ شادی کیا ہوتی ہے۔

ہاں وہ اس بات سے خوش تھی کہ اُس کو پہننے کے لئے ڈھیر سارے زرق برق کپڑے ...زیور مل رہے ہیں۔ اور بس ———

"اِسی عمر میں لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہیئے۔"

سجّو ایک دم بوڑھی ضعیف بن گئی۔

بلّی حیرت سے میک اَپ کی ایک ایک چیز اُٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی پوچھ بھی رہی تھی کہ ———

آپا یہ کیا ہوتا ہے ———

یہ کس لئے ہوتا ہے ———

سجّو نے پیار سے اُسے سب کچھ سمجھایا اور بولی۔

"کل میں تیرا بڑا خوبصورت میک اَپ کروں گی۔ اور خبردار جو تو رخصتی کے وقت روئی تو سارا مُنہ خراب ہو جائے گا۔"

بلّی نے شرما کر اپنے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

سجّو نے ساری چیزیں سمیٹیں ——— نوکرانیوں سے اٹھوا کر سب چیزیں جہیز والے کمرے

میں رکھوا دیں۔ وقت دیکھا تو دو بج رہے تھے۔ اُس نے بلّی کو پیار کیا۔ اور جلدی سو جانے کی ہدایت دے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

باقی تھوڑی سی رات رہ گئی تھی، کروٹیں لینے میں گزر گئی۔ نور کے تڑکے ہی شادی کے ہنگامے بھی جاگ اُٹھے۔ شور و غل، چیخ و پکار۔ کام کم اور شور زیادہ جو گاؤں کا خاصا ہوتا ہے ہر کوئی اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔

دوپہر سے پہلے بارات آ گئی۔ نکاح بھی ہو گیا۔ چھوہارے تقسیم ہو گئے۔ باراتیوں نے کھل کر بھر بھر کے کھانا کھایا۔ باہر ڈھول کی تھاپ پر خوب بھنگڑا ناچ ہوا۔ بھانڈوں نے اپنی جگت بازیوں سے محفل کو خوب ہنسایا۔ اندر ایک طرف بیٹھی ہوئی میراثن گلا پھاڑ پھاڑ کر فلموں کے پرانے گانے، گانے میں مگن رہی۔

شادی کیا تھی؟ ایک غیر منظم افراتفری تھی۔ مگر جیسے سب اپنی جگہ پر مطمئن اور خوش تھے۔

نکاح کے بعد سجّو تو بلّی کو دلہن بنانے میں مگن ہو گئی۔ تین گھنٹے لگا کر اُس نے بلّی کو سنوارا سُرخ و سنہری کامدانی کے غرارا سوٹ میں بلّی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ایک بار تو مارے رشک کے سجّو دل پکڑ کر رہ گئی۔

سجّو کا دل چاہ رہا تھا۔ اسی طرح کھلے دوپٹے کے ساتھ اُسے لے جا کر محفل میں بٹھا دیا جائے جیسے شہر کی دلہنیں بیٹھتی ہیں۔ مگر یہاں کا دستور ایسا نہ تھا۔ یہاں تو لمبا گھونگھٹ کاڑھ کے ماتھے پر پھولوں کا سہرا باندھ کے اس کو باہر لے جا کر بٹھانا تھا اور اس طرح اُس کے سارے میک اپ کا ستیاناس ہو جانا تھا۔

جب "لاواں پھیراں" (ایک رسم) کا وقت آیا تو دولہا کو اندر لایا گیا۔ شیر افگن نے سفید شلوار قمیض کے اُوپر کمخواب کی سنہری اچکن پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سنہری کھسہ تھا۔ سر پہ پگڑی اوپر لمبا پھولوں اور سنہری تاروں والا سہرا تھا۔

چہرہ تو سارا اس کا سہرے میں چھپا ہوا تھا۔ مگر بظاہر وہ عجیب مسخرا سا مگر خوبصورت لگ رہا

ے مضبوط، سانولے ہاتھ سہرے کے باہر نظر آ رہے تھے وہ ایک دم سے ا تھا۔ اُسے دیکھ کر سجّو کے دل میں ہُوک اٹھی۔ مگر وہ سالی بن کر اس کے نزدیک ہی اندر سے بلّی کو اٹھا کر لائی اور شیر افگن کے سامنے لا کر بٹھا دیا۔ شادی کی رسمیں شروع دوں سے کھسک گئی۔ چیخ و پکار سے اس کا دل بیٹھتا تھا۔

وہ خود بھی بڑی اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔ سُرخ رنگ کی سنہری باڈر والی ساڑھی پہنے تھی۔ پہل والا جوڑا لگایا ہوا تھا۔ اُس کی ماں نے اُس کی شادی کے لئے رکھا ہوا سرخ نگوں والا طلائی سیٹ اُسے پہنا دیا تھا۔ بلاشبہ وہ خود بھی بہت ہی خوبصورت اور اسمارٹ رہی تھی۔ جدھر جدھر وہ جاتی عورتیں رشک اور حیرت سے اُسے دیکھتیں۔ اس کے جوڑے ساڑھی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتیں اور سوچتیں ——— واقعی یہ تو شہر کی میم لگتی ہے۔ اٹھایا ہوا اس نے شیر افگن کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس کا دُولہا تو شہر کا بڑا افسر ہونا چاہیئے۔"

مگر سجّو کا تو عالم ہی اور تھا۔ وہ کہتی ——— "مجھے نہ دیکھو ——— یہ دیکھو کہ جوڑے کے پیچھے اور اس لال ساڑھی کے اندر، کرچی کرچی دل اور پامال شدہ جسم ہے ———"

بلّی رخصت ہو گئی گھر والیوں نے حسبِ روایت اُسے رُلا رُلا کر ادھ مُوا کر دیا۔ الگ کھڑی اس بات کا افسوس ہوتا رہا کہ اُس کی آنکھوں کا خوبصورت مسکارا خراب ہو گیا ہوگا۔ ایسا مارے چہرے پر کالی لکیریں پڑ جائیں ——— اس لئے اُس نے برقعہ پہنانے کے وقت طرف لے جا کر اس کا چہرہ پھر ٹھیک کر دیا۔

بلّی چلی گئی۔ اور گھر کے ہنگاموں پر ایک اُداسی سی چھا گئی۔

اگلے روز دستور کے مطابق سب گھر والے ولیمے پر گئے۔ اور اسے ساتھ لے آئے۔

کے بعد بلّی اپنے میکے ایک ہفتہ رہی۔ اور یہ ایک ہفتہ سجّو پر قیامتیں ڈھاتا

ہنی مون کا زمانہ کیا ہوتا ہے؟ اور دُلہن کسے کہتے ہیں۔؟ سجّو کو ہر بات جان کر ایک
انوکھا سا دُکھ ہونے لگا۔ بلّی ہمہ وقت سولہ سنگھار کئے بیٹھی رہتی۔ اور شیرا پروانے کی طرح اُس پر
نثار ہوتا رہتا۔ ایک منٹ کے لئے کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ اگر کسی کام سے باہر جاتا تو فوراً لوٹ
آجاتا۔ لوگ جونہی بلّی کے کمرے سے باہر نکلتے وہ جلدی سے کنڈی چڑھا لیتا۔

اندر کیا ہوتا ہے ——— ؟

سجّو خوب جانتی تھی۔ اور اب اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ معاشرے نے جو رسم و رواج
صدیوں سے رائج کر رکھے ہیں۔ وہ فضول اور بے معنی ہرگز نہیں ہیں۔ ہر رسم و رواج کسی نہ کسی
مصلحت کا تقاضا ہے . . . ہمارے ہاں جو شادی بیاہ کے طور طریقے ہیں۔ وہ ان سے
ہمیشہ متنفر رہی۔ اُسے ایک آزاد معاشرے کی آزادی ہمیشہ بھاتی رہی۔ لڑکی کی بے جا شرم و
حیا کو بھی ہمیشہ کوستی رہی۔ آخر اسے حق ہونا چاہیئے اپنے جیون ساتھی کے انتخاب کا ———
یہ کیا کہ ——— پال پوس کر والدین نے یوں قیمت وصول کر لی کہ اسے اپنی قرابت داریوں اور
مصلحتوں پر قربان کر دیا ——— اور وہ کبھی سسک کر اور کبھی ہنس کر زندگی سے نباہ
کر لیتی ہے۔

اونہہ ———

اسے شیرا انتہائی داہیات اور اکھڑ آدمی لگتا تھا۔ جس میں نفاست نام کو نہ تھی۔ بات کرنے
کا ڈھنگ نہ جانتا تھا ——— آنکھوں میں مستی بھر کے فلمی انداز میں اظہارِ محبت نہ کر سکتا تھا۔
——— خاص اسٹائل سے سگریٹ نہ پیتا تھا۔ ایسے ہی جو جی میں آتا کرتا رہتا ——— اس
اس کا ہر کام بے ڈھنگا اور ہر بات بے تکی لگتی تھی۔

مگر اب ——— اب اُسے محسوس ہوتا کہ شیرا اس گھر میں بہت نفاست سے
رہتا تھا ——— ہر وقت اُس کی آنکھیں مستی میں ڈوبی رہتی تھیں ——— اُس کا ایک ایک
اشارہ بلّی کی والہانہ محبت کا مظہر تھا ——— اکثر سجّو اُن کے کمرے میں جا بیٹھتی ———

بچّہ ہو چکا تھا۔ وہ الگ ——— سجّو ابھی تک بلا کی حسین تھی۔ بلکہ اب اُس کے حسن میں
نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ مگر شیرا اُس کی طرف ایک آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا ———
وہی شیرا جو اس کا بچپن کا منگیتر تھا۔ اور اپنی منگ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہی شیرا
اُسے بڑے احترام سے آپا کہتا تو اُس کا کلیجہ کٹنے لگتا۔ وہ اس سے سات برس چھوٹی
تھی۔ مگر وہ رشتے کا احترام کرتا تھا۔ کیونکہ بلّی اُسے آپا کہتی تھی۔ پھر شیرا کیا کرتا۔
ساجی! تو وہ اس وقت کہا کرتا تھا جب وہ اس کے خوابوں کی پری تھی۔ پھر یہ سارے خواب
اس نے خود توڑ دیئے ———
اُسے شیرے ایسا جنگلی، گنوار اور گاؤں کا پروردہ آدمی نہیں چاہیئے تھا۔ کیا ہوا جو اس
نے بی اے کر لیا تھا ———
شکل سے اور اپنی حرکات سے وہ ایک دم گاؤں کا لگتا تھا۔ مگر اب کچھ دنوں سے
وہ دیکھ رہی تھی کہ شیرے میں وہ تمام تر خوبیاں تھیں جو ایک مرد میں ہونی چاہیئں۔
وہ اکثر سوٹ بھی پہنتا ——— ٹائی بھی لگاتا ——— اس وقت اس کی وجاہت اور
نکھار اختیار کر جاتی۔
شام کو وہ اکثر کھدّر کا شلوار کرتا پہن لیتا۔ اس وقت بڑا بانکا چھبیلا لگتا ———.
رات کو وہ اکثر دھوتی باندھا کرتا تھا۔ باڈر والی چارخانی دھوتی میں وہ اور بھی دلکش اور
چھبیلا لگتا۔ بڑی ادا سے سگریٹ پی کر اُس کا دُھواں چھوڑتا ———.
شرارت بھری نظروں سے بلّی کو دیکھتا اور اُس کی معصوم حرکتوں کی نقلیں کیا کرتا۔
سارا دن اپنی بزلہ سنجی سے ان دونوں کو خوب ہنسایا کرتا۔ بلّی تو اتنی معصوم تھی کہ وہ
اپنی ہنسی سنبھال ہی نہ سکتی . . . ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی۔
پھر شیرے کو لباس کی اتنی شناخت تھی کہ سجّو جتنے بھی کپڑے لاہور سے اُس کے لئے
لائی تھی اُسے بہت پسند آتے تھے۔ پھر اُس نے خاص طور پر سجّو کے رنگوں کے

انتخاب اور اُس کی پسند کو سراہا بھی تھا۔ یہ بات بھی اُسے بلّی نے ہی بتائی تھی۔

"بس آپا! وہ مجھے کہتے ہیں۔ یہ جو آج کل کی لڑکیاں جوڑے لگاتی ہیں۔ تم مت لگایا کرو۔"

"تم نے اُس کی وجہ نہیں پوچھی؟"

"پوچھی تھی۔ بس انہوں نے اتنا کہا۔ تم سیدھے بالوں اور ایک چٹیا میں ہی مجھے اچھی لگتی ہو۔ ایک جیسے جوڑے لگا کر لڑکیوں کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ سب ایک جیسی لگتی ہیں۔"

"اور کیا کہتا ہے شیرا ———" سجّو کا دل بہت کچھ پوچھنے کو مچلتا ———

"وہ کہتے ہیں تو اِسی طرح مجھے خوبصورت لگتی ہے۔"

"اور۔ ۔ ۔ ۔ اور کیا کہتا ہے؟"

"بس کچھ نہیں۔" بلّی لجا جاتی۔

"اور میرے متعلق کیا کہتا ہے ———؟" یونہی سجّو کے منہ سے نکل گیا۔

"آپ کے متعلق ———؟" بلّی نے حیران ہو کر پوچھا ——— "آپ کے متعلق تو انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔

"او... " سجّو سنبھل گئی۔ "میرا پوچھنے سے یہ مطلب تھا کہ میں بھی تو آج کل کی لڑکیوں کی طرح جوڑے ——— تو مجھے بھی وہ بُری لڑکی سمجھتا ہو گا۔"

"نہیں نہیں آپا۔ خدا نہ کرے۔ آپ نے ایسا کیوں سمجھ لیا۔" بلّی بڑی معصومیت سے بولی "وہ تو آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ میں آپا کا ہمیشہ شکر گذار رہوں گا۔ جس کی وجہ سے ——— جس کی ——— وہ ... میرا مطلب ہے ———" پھر بلّی کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا بات بنائے۔ بھولپن میں وہ اس کے خلوت میں کہے ہوئے فقرے دہرانے لگی تھی۔ مگر رُک گئی۔ اتنی اُسے سمجھ تھی کہ آپا کے منہ پر ایسا کہنا خلاف مصلحت ہو گا۔ مگر سجّو سمجھ گئی کہ شیرے نے کیا کہا ہو گا۔؟

ایسے لمحوں میں مرد کیا کہتے ہیں؛ پھر یہ تو بلّی کا شوہر تھا۔ سب کچھ کہہ سکتا تھا ———

ویسے بھی ہر لحاظ سے اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت معصوم، زمانے کے مکر و ریا سے بے پروا اچھوتی اور سادا ——— اس لئے شیرے کو ضرور اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو گا۔ اُس نے کیا جو اپنی بیوی سے وہ سب کچھ کہا ——— یعنی میرے جیسی خود سر اور خود بین لڑکی کی وجہ سے اُسے بلّی جیسی اچھی بیوی مل گئی۔ ورنہ میں تو سچ مچ اُس کی زندگی اجیرن

ایسے ہی جتنے دن تک بلّی اور شیرا رہے۔ اُسے بیٹھے بٹھائے کوئی خلش تڑپانے لگتی وہ بلّی سے عجیب و غریب سوال کرنے بیٹھ جاتی۔ بلّی اگر ذرا سیانی ہوتی تو ان سوالوں کی تہہ تک پہنچنے کی ضرور کوشش کرتی۔ مگر وہ تو بالکل الھڑ تھی۔ اور پھر اپنی آپا کو کوئی ماورائی شے سمجھتی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

اور پھر یہ کچھ معمول سا بن گیا کہ ہفتے میں ایک بار بلّی اور شیرا یہاں آتے۔ رات بھر رہتے اور دن چلے جاتے۔ کبھی کبھی سجّو بھی بلّی کے گھر چلی جاتی۔ سارا دن رہتی گھر کی سجاوٹ میں مشورے دیتی۔ اور پہلے سے زیادہ پژمردہ اور بے دم ہو کر لوٹتی۔ ماموں اور ممانی کا رویہ اس کے ساتھ پہلے جیسا نہ تھا۔ تاہم اب تو وہ خود کو ہر قسم کی سزا کا مستحق سمجھتی تھی۔ اس لئے طعنے اور کڑوی نگاہ سب کو خندہ پیشانی سے پی جاتی۔

اُسے سمجھ نہ آتی کہ یہ چھٹیاں کیونکر گزارے ——— وہ خواب کہاں تھے۔ جو ہر پل اُس کے پہلو سے پھوٹا کرتے تھے۔ سارا دن اوندھی لیٹی سوچتی کہ اب وہ کیا کرے اخبار رسالے پڑھنے کو اُس کا دل نہ چاہتا۔ ہر کہانی کسی نہ کسی طور اُسے اپنی کہانی لگنے لگتی اخبار میں زنا اور اغوا کی خبریں پڑھتے ہوئے وہ پسینے میں ڈوب جاتی۔ اُسے ایسے لگتا جیسے اخبار اسی کے کرتوتوں سے بھرا پڑا ہے۔ ریڈیو لگاتی تو ہر نغمہ درد میں ڈوبا محسوس ہوتا۔

ایک مہینہ گزرا ——— پھر دوسرا ——— اب اُسے رزلٹ کا بڑا بے چینی سے انتظار تھا۔ رزلٹ آئے تو وہ آئندہ کے لئے کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھائے۔ ویسے اُس کی

اماں نے طریقے سلیقے سے اُسے سنا دیا تھا کہ اُس کے لئے شہر سے پڑھے لکھے برسرِ روزگار ملازموں کے پیغام بھی آرہے ہیں۔ اگر وہ حامی بھرے تو. . . . .

فی الحال اُس نے سنی اَن سنی کردی تھی۔

ایک دن بلّی میکے آئی تو اُس کی عجیب اُڑی اڑی رنگت تھی۔ چہرہ بالکل زرد ہورہا تھا۔ چہرے پر کوئی میک اَپ نہ تھا۔ بال بھی ٹھیک طرح نہ بنے ہوئے تھے۔ بہت تھکی تھکی اداس لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سجّو کا ماتھا ٹھنکا۔

نہ جانے ایک لمحے میں کیسے کیسے تکلیف دہ واہمے اُس کے دِل میں آئے۔ وہ بلّی کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں چلی آئی اور بولی۔

"تجھے کیا ہوا ہے بلّی۔؟"

"کچھ بھی نہیں آپا"

"نہیں کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ ذرا اپنی رنگت دیکھ۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں لپ اسٹک تک نہیں لگا رکھی۔ سچ سچ بتا ــــ کیا بات ہے ــــ؟" جیسے وہ اُس کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہوگئی۔" اور شیرا کہاں ہے؟ وہ تشویش سے بولی۔

"وہ بھی ساتھ آئے ہیں" ابھی بلّی کا فقرہ نہ پورا ہوا تھا۔ کہ شیر افگن اٹیچی پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم آپا ــــ"

اُس نے سلام کا جواب نہ دیا۔ بلکہ اُلٹا سوال کردیا۔" شیر بھائی۔ بلّی کو کیا ہوا ہے۔ کتنی کمزور لگ رہی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ ذرا ــــ" وہ نگاہ چُرانے لگا۔" ذرا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اس کا چہرہ اتنا اُتر گیا ہے۔ اور آپ بے نیازی سے کہہ رہے ہیں۔ ذرا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ یہ بھی کوئی تک ہے۔ کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟

[illegible] اللہ نے توفیق نہیں دی تھی۔ تو مجھے بتاتے میں اُسے موٹر میں ڈال کے مُلتان لے [illegible]

[illegible] نیرے نے اُس کی ڈانٹ کے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ معنی خیز نظروں سے بلّی کی طرف [illegible]

[illegible]

[illegible] بی نے بھی نظر چرا لی۔

[illegible] کیا تکلیف ہے تمہیں ــــ بتاؤ نا مجھے ــــ وہ پھر بلّی کے پیچھے پڑ گئی۔

[illegible] بتنے میں اُن کی پُرانی نائن جو بلّی کے ساتھ سُسرال گئی تھی، کمرے میں داخل ہوگئی۔ اُس [illegible] یہ فقرہ سُن لیا تھا ــــ سامان ایک طرف رکھ کر بولی۔

[illegible] بی بی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔ بس وہی تکلیف ہے [illegible] بیاہتا لڑکیوں کو ہو جاتی ہے۔ اب کنواری لڑکی کو کیسے بتائے کہ اس کا پیر بھاری ہو گیا ہے [illegible] اچھا نہیں رہتا"

[illegible] پیر بھاری ــــ؟" ایک دم سجّو پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کس قدر بے وقوف ہے وہ [illegible] ــــ اور بعض اوقات جذباتی ہو جاتی ہے۔ وہ خود کیوں نہ سمجھ گئی۔

اتنے میں بلّی کو زور کی اُبکائی آئی۔ وہ غسلخانے کو بھاگی۔ تو شیر افگن بھی بے تابی سے [illegible] کے پیچھے بھاگا۔ سجّو کو وہاں سے کھسک جانے کا موقع مِل گیا۔

کمرے میں آکر وہ اپنی خِفّت مٹانے لگی۔ پھر نائن کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے [illegible]

اب کنواری لڑکی کو کیا بتائے کہ. . . . . .

[illegible] کنواری لڑکی ــــ یہ کتنی بڑی گالی تھی اُسے ــــ

[illegible] مگر کسی کو تو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ وہ خود ہی چور بنی پھرتی۔ یا خود کو اذیّت دینے کا سامان [illegible] کرتی۔ اور پھر خود ہی خود کو کچوکے بھی لگاتی رہتی۔

اس مرتبہ بلی ایک ہفتہ رہی۔ اور اس ایک ہفتے میں شیرے نے بلی کی اتنی ناز بردا...
کی کہ گناہ کے زمانے میں عابد حسین نے بھی اُس کی نہ کی ہوگی۔

وہ جونسی چیز مُنہ سے نکالتی لیکر حاضر ہو جاتا۔ کھٹی میٹھی چیزیں لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا۔ اور منّت سماجت کرکے اُسے دُودھ پلاتا ——— دوائیاں کھلاتا ——— راتوں کو تھپک تھپک کر سُلاتا۔ غسل خانے میں اُس کے ساتھ جاتا۔ اور بلی ناز کرتی رہ جاتی۔ مگر وہ واری نیاری ہوتا رہتا۔

ستجو رشک سے کڑھ کر رہ جاتی۔

ہائے شوہر کا پیار ایسا ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو اُس کی تکلیف پر کیسے تڑپ رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ یہ تو صرف نئی نئی شادی کے چونچلے ہوتے ہیں۔ پہلے بچے کے بعد سارا پیار ہرن ہو جاتا ہے۔

تو کیا ہوتا ہے ——— ؟ ساری دُنیا کب ایک ہی چلن پر رہتی ہے۔ تھوڑے عرصے کے لئے ہی سہی۔ ہیں تو یہ جذبات خوبصورت ——— ساری زندگی کون ایک جیسا رہتا ہے۔ ہاں مگر یادیں تو زندگی کو جینے کا جواز بخشتی رہتی ہیں اور پھر یہ سب کچھ اگر اپنا شوہر کرے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔

بلی اس ساری تکلیف اور بد مزگی کے باوجود کتنی خوش اور کھلی کھلی رہتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک! اور ممتا کا غرور آ گیا تھا تخلیق کی بجلیاں اُس کی رگ رگ میں کوند رہی تھیں۔ اور بھی خوبصورت اور بھی اُجلی لگتی تھی۔ کچھ کچھ سیانی بھی لگنے لگی ہے۔ اپنے شوہر کی امانت شکم میں چھپا کر عورت کا رُوپ ہی بدل جاتا ہے۔ اگر سب قدرت کے اصُولوں کے مطابق کیا جائے۔ تو کس قدر اچھا ——— اور کتنا دل پذیر لگتا ہے۔

کتنا دل خوش کن ہوتا ہے ———

——— اُس کے اندر سوتے ہوئے زہریلی یادوں کے ناگ نے کروٹ ... گناہ کے زمانے کی ایک پھانس یہ بھی اُس کے کلیجے میں اٹکی ہوتی تھی ... اولین دنوں میں ستجو کو اس قسم کا شک گزرا تھا ——— اُس نے خوف زدہ ہو ... ین کو بتایا۔ اُس نے بغیر کوئی اثر لئے کہا تھا۔ کہ جلد معاملہ رفع دفع ہو جانا چاہیئے ... بات بگڑ جائیں گے۔ فلم کی ہیروئن کی طرح ستجو نے اُسے جلدی شادی کر لینے ... ط دیا تھا۔ مگر کسی طرح اس ظالم نے ستجو کو ورغلا ہی لیا۔ پھر اپنی ایک واقف لیڈی ... کے پاس لے گیا تھا اور بہترین ٹریٹ منٹ دلوا کر ستجو کا یہ کانٹا نکلوا دیا تھا۔ اس کے ... نیاطی تدابیر بھی سمجھا دی تھیں۔ کہ پھر یہ رخنہ درمیان میں حائل نہ ہو۔

... او سیاہ باطن ستجو!

تجھے کیا ہو گیا تھا ——— وہ اپنے آپ سے پُوچھتی۔

تُو گناہ پر گناہ کئے گئی مگر تجھے ذرا خُدا کا خوف نہ آیا۔ اب دیکھنا خُدا کس طرح تجھے ... ابیں مُبتلا رکھے گا۔

... دونوں زندگیوں میں کتنا فرق ہے ——— شادی کے بعد بچہ ہو تو عورت کا ... درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ شوہر کے دل میں بھی اور معاشرے کی نگاہ میں بھی ——— اور شادی کے بغیر یہ سب کچھ ایک مکروہ اور گھناؤنا جُرم بن جاتا ہے۔ خُدا کے ... ہاں۔ اور بندوں کی نظر میں بھی۔

اُف!

لڑکیاں جب جوانی کی روش پر اندھا دُھند آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتی ہیں تو وہ اس ... دُنیا سے الگ کیوں ہو جاتی ہیں؟ وہ اپنا ایک الگ جہاں کیوں سمجھ لیتی ہیں .... جہاں سے الگ کوئی جہان نہیں ہے ——— گیتوں اور خوابوں کی باتیں ——— سراب ... محض سراب ——— کاش وہ جان سکتی کہ حقیقت اور خواب میں بڑا فرق ہے۔

بلی نے سجّو کو ایک اور کرب میں مُبتلا کردیا تھا۔ اب وہ اس گھر میں مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر وہ پاس ہوگئی تو ایم۔ اے میں داخلہ لے لے گی۔ ورنہ یہیں پڑے پڑے پاگل ہوجائے گی۔

خُدا کی قدرت جب اگلے مہینے رزلٹ آیا تو اس بار بھی سجّو کی فرسٹ ڈویژن کو لایا۔ نا اُمیدیوں میں ایک دِیا روشن ہوگیا۔

اب تو اس کو داخلہ لینے کا بہانہ مل گیا۔ ورنہ اسکالرشپ ضائع ہوجاتا۔

اُس نے اپنی امّاں کی معرفت بابا کو کہلا دیا۔ بابا اُس کی مزید تعلیم کے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ اب اس کی بھی شادی کردینی چاہیئے ——— مگر لفظ شادی سے ہی سجّو بدکتی تھی۔

اُس نے چپکے چپکے انگلش ایم اے میں داخلے کا فارم بھیج دیا۔

جب اُس کو انٹرویو کی کال آئی۔ تو اُس نے رو رو کر ماں کا ناک میں دم کردیا۔ ماں تھی۔ ترس آگیا۔ باپ کی مخالفت کے باوجود اُسے لاہور جاکر ایم اے کرنے کی اجازت مل گئی۔

یونیورسٹی کے رومان پرور اور ہوش رُبا قصّے سُن کر سجّو نے ایم۔ اے میں داخلہ [...]ا اس کا مُعاملہ ان لڑکیوں سے بھی جُدا تھا۔ جو بظاہر کھاتے پیتے گھرانوں سے [...]لتی ہیں۔ مگر چونکہ کوئی موزوں رشتہ نہیں مِلتا۔ اس لئے ایم۔ اے میں داخلہ لے [...]یا کہ تلاش کے ساتھ ساتھ شغل بھی جاری رہے گا۔ اور عمرِ عزیز کے رائیگاں جانے کا [...]ہیں ہوگا۔

وہ اِن غریب لڑکیوں میں سے بھی نہیں تھی۔ پیٹ کاٹ کر جنہیں والدین تعلیم [...]تے ہیں اور پھر ایم اے کی ڈگری کے ساتھ اپنی تمام تر اُمیدیں وابستہ کر چھوڑتے ہیں [...] انہیں خرچ کیا ہوا مال مع سُود واپس مِلنے والا ہو۔

وہ اکرہیہ المنظر بھی نہیں تھی کہ اپنا یہ کامپلیکس اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے دُور کرنا چاہتی [...]

[...]باقی رہ گیا شوق ——— تو اب اُسے کسی چیز کا شوق نہیں رہ گیا تھا۔ [...]نہ اعلیٰ تعلیم کا ——— نہ اچھے کپڑوں کا ——— نہ بہتر زندگی کا! وہ تو یونہی [...]بالا کاٹنے اس نگری میں چلی آئی تھی۔ یہ فردِ جرم بھی اُس نے خود پر خود ہی عائد کرلی

تھی۔ اور سزا کا حکم سُنا کے خود ہی اُس پر عمل پیرا ہو گئی تھی"۔

اب جبکہ ——— اُس نے شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ مرد دل سے وہ تم ہو چکی تھی۔ تو زندگی گزارنے کا کوئی تو بہانہ ہونا چاہیئے۔

ایم۔ اے کر کے وہ کم از کم کوئی باعزت نوکری کر سکتی تھی۔ نوکری کرنے کے بع شادی نہ کرنے کے کئی عذر نکل آتے ہیں۔ مگر گھر کی چار دیواری کے اندر والدین کا دستگیر رہ کر، تو کوئی نہ کوئی زنجیر پاؤں میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔

وہ بھلا کس کا گھر بسانے کے قابل ہے ——— ؟

کئی بار اُس نے سوچا مگر اپنا جواب نفی میں پایا۔ وہ ذہنی طور پر ابھی زندگی کے ر چلنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس صدمے کو جھیلنا تھا۔ ان زخموں کو بھرنے کے لئے وق درکار تھا۔ گھر پر رہتی تو امّاں اور بابا ضرور اُس کے ساتھ زبردستی کرتے۔ اُس نے کوئی اور لا نہ پا کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔

یونیورسٹی میں آکر وہ اور بھی ہراساں ہو گئی۔ گو اُس نے یہاں کے قصّے بہت پہلے سُ رکھے تھے۔ مگر اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتی اُس کا اُسے بہت افسوس ہوتا۔ اور وہ ٹھو جو اُس نے زندگی کے پہلے موڑ پر کھائی تھی اُس نے وقت سے پہلے اُس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ بہت سی باتیں، جنہیں عام لڑکیاں نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اُس کی سمجھ میں آجاتیں۔ یہاں صبح و شام جو تماشے ہوتے انھیں وہ اپنی کھُلی آنکھوں سے دیکھا کرتی۔ اور اکثر اپنے دل میں سوچتی کہ اگر مجھے یہ اتنی بڑی ٹھوکر نہ لگی ہوتی تو آج میں بھی شطرنج کا ایک مہرہ ہوتی دو چار میرے آگے ہوتے۔ دو چار میرے پیچھے۔ اور پھر ——— انجام تو وہی ہونا تھا جو ہو چکا۔ مگر اب اس طرح تماشائی بن کر رہنے میں اُسے بڑا مزہ آرہا تھا۔

جب شام کو ہوسٹل کی کچھ لڑکیاں بن سنور کر کھُلے کھُلے پاجامے۔ اور گول گول عینکیں لگائے اِک شانِ بے نیازی سے لمبے لمبے پرس جھُلاتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلتیں تو وہ

پہچان جاتی کہ وہ کہاں جا رہی ہیں؟

وہ موٹریں جو گیٹ کے باہر اُن کے انتظار میں کھڑی ہوتیں، اُن میں نہ اُن کا کوئی کزن بھائی ہوتا ——— سب کے سب شیخ عابد حسین ہی ہوتے ———

لڑکیاں جوانی کے اوّلین دور میں شیخ عابد حسین کو نہیں پہچان سکا کرتیں۔ وہ سمجھتی ہیں جوانی اور اُن کا روپ ہی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو جب چاہے اور جدھر چاہے ن کا دھارا موڑ سکتا ہے۔

پھر زد یکھنے جا رہی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانا کھا رہی ہیں۔ سینما ہال کے "باکس" میں کیا ہوتا ان ہوٹلوں کے سجے سجائے کمرے کس مصرف کے لئے ہوتے ہیں۔ اب سجّو جان گئی بڑی بے وقوف لڑکیاں تخیلیے کے ان سرابوں میں اپنے موتی گم کر رہی تھیں۔ اور اُسے ت، چاہت۔ زندگی اور جوانی کہتی تھیں۔

رات کو خوش خوش ڈھیر ساری شاپنگ کر کے لوٹتیں۔ اُن کے پرسوں میں سبز سبز نوٹ ے آجاتے۔ یہ نت نئے کپڑے کہاں سے بناتی ہیں۔ کیا ان سب کے والدین اتنا ٹھا سکتے ہیں ——— ؟

جانے سجّو کو کیا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پیمانہ فِٹ ہو گیا تھا۔ وہ لڑکیوں بلکہ گروہ کو دیکھ کر فوراً شریف اور آوارہ لڑکیوں کو الگ الگ چھانٹ لیتی۔

بلاشُبہ اس ہوسٹل میں بے شمار شریف النفس اور مہذّب لڑکیاں بھی تھیں مگر اُن سے بچی کئی، آخر کار آوارہ لڑکیوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو جاتیں۔

سجّو کو بہت دُکھ ہوتا۔ یہ سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں آدمی رُوح کی پیاس بُجھانے آتا ہے۔ مگر یہاں تو معلوم ہوتا ہے، شریف گھرانوں کے فرشتے نہیں، بلکہ جانور آتے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں، اور چہروں پر جنس کی پیاس پھیلی ہوئی ہے۔ اساتذہ سے لے کر شاگردوں تک۔ ہر کوئی کسی نہ کسی لڑکی کا دُم چھلّا بن جانا چاہتا ہے! ایسے

اساتذہ بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اچھے نمبر حاصل کرنے کے لئے خواہ لڑکیاں جی جان سے پڑھ کر اپنی صحت اور رُوپ خراب نہ کریں۔ مگر انہیں مسکراہٹیں اور تحفے بخش کر نمبر بڑھواتی رہیں۔

اور اکثر لڑکوں کا وطیرہ بھی کچھ اس قسم کا تھا جیسے گھر سے ہی اپنی لیلیٰ کو ڈھونڈنے آئے ہوں۔

کاش کتابوں کی آڑ میں جسموں کا یہ گھناؤنا کھیل نہ ہوتا۔ سجّو بڑی جلدی یونیورسٹی کے ماحول سے اکتا گئی۔ خود اُس کا رویّہ وہاں کے لوگوں کے لئے ایک سوال بنا ہوا تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی اور اتنی آدم بے زار۔ شروع شروع میں کئی لڑکے دِل کا دروازہ وا کرکے اُس کی سمت بڑھے۔ مگر وہ ایسے بنی رہی، جیسے کہ اندھی، بہری یا گونگی ہے۔ کبھی کسی سے بات نہ کرتی، کبھی کسی کی بات نہ سنتی۔

اس کا سوگوار حسُن اور دلکش ہو گیا تھا۔ جدھر سے گزر جاتی لڑکے اُس کے پیچھے چل پڑتے۔ اِدھر اُدھر سے اس کا پتہ دریافت کرتے۔ کون ہے؟ کس قماش کی ہے—— کہاں سے آئی ہے —— کیسے شیشے میں اُترے گی ——؟ مگر ہر قسم کا کھوج لگا کر بھی کوئی اس کا کھوج نہ پا سکا۔ وہ کلاسز ختم ہونے کے بعد سیدھی ہوسٹل میں آجاتی، اور پھر ہوسٹل سے باہر نہ نکلتی۔

کبھی کبھی بازار جاتی تو ڈھیر سارے رسالے اور کتابوں خرید لاتی۔ اور اس لاہور میں کیا تھا جو اُس نے گزشتہ چار سالوں میں نہیں دیکھا تھا۔ جو نہ دیکھا تھا وہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اُسے کسی شے کے ساتھ دلچسپی نہ تھی۔ نہ وہ پکچر دیکھتی۔ نہ کلاس کے ساتھ کسی ٹرپ پر جاتی۔ جانے اُس کا دِل سچ مچ مر گیا تھا۔ یا اُس نے خود جبر کر لیا تھا۔

یا شاید یہ کوئی تپسیا کی منزل تھی۔

پھر لوگوں میں اُس کے متعلق عجیب و غریب افواہیں مشہور ہونی شروع ہو گئیں۔

کوئی کہتا اسے کسی آدمی سے محبت ہے۔ اس لئے یونیورسٹی میں کسی سے دلچسپی نہیں لیتی۔

کوئی کہتا۔ اس کا محبوب اُسے چھوڑ گیا ہے۔ اس لئے سوگوار رہتی ہے۔

کوئی کہتا۔ گاؤں کے رسم و رواج کے مُطابق اس کا نکاح بچپن میں ہو گیا تھا۔ اس لئے اب کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔

اس دُنیا میں بسا اوقات پاکیزگی پر بھی اتنے ہی الزام لگتے ہیں جتنے آلودگی پر۔

وہ یہ سب سنتی اور مُسکرا کر رہ جاتی۔

ان افواہوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اُس کے آگے خود بخود ایک حفاظتی دیوار بن گئی۔ کوئی پھلانگنے کی جرأت نہ کرسکا۔ ورنہ اتنی حسین لڑکی۔ اور پروانوں کے جھُرمٹ سے بچی رہتی۔

بہت سے کمرے بدل بدل کر اب اُسے جو کمرہ ہوسٹل میں ملا تھا۔ اس کی روم میٹ اسے بہت پسند آئی۔ بہت ہی شوخ و شنگ اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ سجّو نے انگلش ایم اے میں داخلہ لیا تھا۔ مگر وہ پولٹیکل سائنس کی طالبہ تھی۔ اُسے یونیورسٹی کا ضمیمہ کہنا چاہیئے ہر ڈیپارٹمنٹ کے اندرونی معاملے اور سکینڈلز کا اُسے علم ہوتا۔ عشق و عاشقی کے قصّے اس قدر دلچسپ انداز اور روانی میں سُناتی کہ سننے والے کو مزہ آجاتا۔

نام تو اُس کا سمیرا تھا۔ مگر سب لڑکیاں اسے سمی کہتی تھیں۔ وہ ہوسٹل میں بھی ہر دلعزیز تھی۔ اس کی چلتی ہوئی زبان اور شوخ فطرت نے پہلے تو کچھ دن سجّو کو بہت پریشان کیا۔ وہ بار بار سوچتی کہ وارڈن سے کہہ کر کمرہ بدل لے ——— اُدھر سمی بھی اس مُردہ صفت لڑکی کی صحبت میں گھبرا گئی تھی۔ پھر نہ جانے کس طرح دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئیں اور تھوڑے دنوں ہی میں اتنی گہری سہیلیاں بن گئیں کہ کوئی بات چھپی ڈھکی نہ رہی۔

سجّو کو ڈھال کی صورت میں ایسی طرار دوست چاہیئے تھی۔ سو یہ کام سمی نے بہت اچھی

طرح انجام دیا۔ وہ مزے مزے کی باتیں سُنا کر سجّو کو خوب ہنسایا کرتی۔

ایک دِن سجّو سے کہنے لگی۔

"کم بخت! تجھ پر اتنے لڑکے مرتے ہیں کہ مجھے حسد محسُوس ہونے لگا ہے!"

"بھئی لڑکوں کا تو کام ہی مرنا ہے۔ تم اُن سے جا کر کہدو۔ مرے ہوئے پر کیا مرنا، مجھ پر مرو۔"

"او بے وقوف کی بچّی سجّو! یہی تو رونا ہے کہ ان میں سے بیشتر لڑکے مجھ پر مرتے تھے۔ جب سے میں نے تمہارے ساتھ پھرنا شروع کیا ہے۔ سب کی نگاہیں تمہاری طرف ہو گئی ہیں۔ لہذا ــ دوستی ایک طرف اور کاروبار ایک طرف ـــــ جب میں اپنے بوائے فرینڈز کو ملنے جایا کروں تم میرے ساتھ نہ جایا کرو۔"

"بہُت اچھا۔" سجّو نے تابعدار بچّے کی مانند کہا۔

اور سمی کھل کھِلا کر ہنس پڑی۔

"تو کتنی اچھی ہے سجّو! میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ میرے پاس ابھی عاشقوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔"

"کیا مطلب ـــــــــ؟" سجّو حیران ہوئی۔ "میں تو سمجھتی تھی تو کسی ایک لڑکے سے محبّت کرتی ہوگی۔"

"لے جی۔ ان لڑکوں سے محبّت کون کرتا ہے۔ میں تو ان سے محبّت کرواتی ہوں۔ کیا تم ان چھٹانک چھٹانک کے بے وقوف قسم کے لڑکوں سے عشق کر سکتی ہو۔ میں تو کبھی ہولنہ لوگ جتنی انرجی لڑکیوں کے پیچھے جوتے چٹخانے میں ضائع کرتے ہیں۔ اُس سے اپنی صحت بحال کریں اور جتنے پیسے لڑکیوں کو پھنسانے میں ضائع کرتے ہیں۔ اُس سے خوش خوراکی کریں تو ذرا اُن کی صُورت بھی صحیح نکل آئے۔ مکڑوں کی طرح سوکھی سوکھی ٹانگیں! درشاعر کے محبُوب کی مانند پتلی کمر۔ پچکے ہوئے چہرے۔ لاغر جسم . . . . واہ جی واہ ـــــ

...ے پھرتے ہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو ہر صبح ان کو خوب ورزش کراؤں۔ پھر گرم دودھ ...ے پلا کر پلاؤں ـــــ پھر کہوں جاؤ بیٹھو! اب عشق کے میدان میں کود پڑو۔

...جو کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔

"کم بخت تو ان کو بے وقوف بھی سمجھتی ہے اور عاشق بھی بنائے پھرتی ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم سجّو بی! فی زمانہ نوجوان لڑکیوں کو ایک سے زیادہ عاشقوں کی ضرورت ...ہے۔ ایک تو یہ احمق ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ دوسرے ...نے پر حفاظت کو آ پہنچتے ہیں۔"

"...اس زعم میں نہ رہنا سمی۔ لڑکی آخر لڑکی ہوتی ہے۔ اور مرد کے فریب کو کبھی نہیں سمجھ ...۔ ایسا نہ ہو تم بھی کسی دن اس بھول بھلیاں میں پھنس جاؤ اور اپنا انمول موتی گنوا بیٹھو۔"

"...میں سب سمجھتی ہوں سجّو! مجھے اتنا بے وقوف نہ جانو۔ مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہیں ...اس کھیل میں ضرور مزا آتا ہے۔ تم جانتی ہو میرے پاس ہمیشہ اپنے خرچ سے زیادہ ...ہوتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟"

پھر اُس نے سجّو کو تذبذب میں دیکھ کر خود ہی کہنا شروع کیا۔

"...میری آپا مجھے ہر مہینے ضرورت سے زیادہ پیسے بھیجتی ہیں۔ میں چاہوں تو بینک میں ...اؤنٹ کھول سکتی ہوں۔ مگر مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی وجہ میں پھر کبھی ...بتاؤں گی۔ اس لئے میں سارے پیسے ان عاشقوں پر خرچ کر دیتی ہوں۔ میں نے ...ے کہہ رکھا ہے کچھ دیکھنی ہوگی تو ٹکٹ میں خریدوں گی تو ہم باکس میں نہیں گیلری میں ...بیٹھیں گے۔ اگر کوئی مجھے کھانے کے لئے باہر لے جانا چاہتا ہے تو پھر بھی شرط یہ رکھتی ہوں ...ادا کروں گی۔ مگر اپنے پسندیدہ ریسٹورانٹ میں جاؤں گی۔ جہاں کھُلے بندوں بیٹھ ...۔ مجھے کسی سے کوئی چوری نہیں ہے۔ میں بُری نیّت سے اُن کے ساتھ نہیں جاتی ...نے ذریعہ آمدنی نہیں بنا رکھا۔ بلکہ یہی لوگ وقتاً فوقتاً میرے مقروض رہتے ہیں! اس

لئے مجھ سے دبتے ہیں۔ میرے ذکر بنے رہتے ہیں . . . یہ راز کی بات ہے جو میں تمہیں
بتا رہی ہوں۔ وہ لڑکیاں بکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، جن کے لئے یہ اپنے بٹوے کھولتے
ہیں۔ ورنہ اُن کی توفیق ہی کیا ہے۔ احمق درجۂ اوّل ہوتے ہیں یہ لوگ۔ جدھر موڑو
مُڑ جائیں گے۔"

"کتنے عاشق ہوں گے تمہارے؟"

"اس وقت تقریباً ہر ڈپارٹمنٹ میں ایک لڑکا رکھا ہوا ہے۔ میں نے ـــــ"

"وہ کیوں بھئی؟"

"ساری یونیورسٹی کے حالات سے باخبر رہتی ہوں۔ ایک پیچ کھا کر وہ مجھے اپنے پارٹی
کے سب خفیہ راز اور درون خانہ ہنگامے بتا جاتے ہیں۔"

"بھئی تم اتنی پُراسرار بننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟"

"تاکہ اگلی بار الیکشن لڑ سکوں۔"

"کس لئے سمی۔ تم نے محسوس نہیں کیا یونیورسٹی الیکشن میں کس قدر گندگی ہوتی
میرا دل تو چاہتا ہے لڑکیاں اس سے الگ تھلگ ہی رہیں۔"

"میرے پاس بہت ووٹ ہیں۔ میں تو زندگی کے لئے کوئی ہنگامہ پرور مشغلہ چاہتی
پتہ ہے جب مجھے کچھ بھی نہیں سوجھتا تو میں اپنے دو پرستاروں کو ایک دوسرے سے لڑا
ہوں۔ ایک بار تو غضب ہو گیا تھا۔ ایک لڑکے نے سچ مچ دُوسرے کا سر پھاڑ دیا تھا"

"اور تمہیں کتنے نفلوں کا ثواب ہوا تھا؟"

"پتہ نہیں۔ بعد میں تو میں خود بھی ڈر گئی تھی۔"

"سمی! زندگی کے ساتھ ایسے مذاق اچھے نہیں ہوتے۔ اگر شادی ہی کرنا چاہتی ہو تو
سیدھے سیدھے کسی ایک کا انتخاب کرو۔ ورنہ کوئی اور نیک کام کرو۔"

"کونسا نیک کام شروع کر دوں بی مُلّانی! اور اس عمر میں ـــــ کیا قرآن شریف

نے کی ایک درس گاہ کھول لوں؟ تم اس دُنیا کو جانتی ہو۔ اس معاشرے میں کوئی
لڑکی بغیر تحفظ کے دامن بچا سکتی ہے۔"

"پھر شادی کر لو نا ـــــ؟"

"وہ کم بخت مجھ سے شادی نہیں کرتا۔"

"کون ـــــ؟" سجّو بہت حیران ہو کر بولی۔

"جس سے میں محبت کرتی ہوں۔"

"تم بھی کسی سے محبت کرتی ہے۔" سجّو اور بھی بوکھلائی۔ "کیا واقعی ـــــ؟"

"ہاں سجّو!" پہلی بار سجّو نے سمی کے چہرے پر ایک سایہ سا اُمنڈتا دیکھا۔
"سجّو! مجھے ایک آدمی سے محبّت ہو گئی ہے۔ وہ چالیس سے بھی اُوپر ہے۔ اُس
کے بچے ہیں۔ اُسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ مجھ
سے محبت نہیں کرے گا۔"

"آخر ہے کون وہ ـــــ؟" سجّو نے کریدا۔

"میں نے ابھی بتایا تھا نا! کہ میری ایک آپا ہیں۔ وہ کراچی میں سروس کرتی ہیں بڑی معقول
تنخواہ لیتی ہیں اور مجھے تین چار سو روپے ہر ماہ بھیجتی ہیں۔ وہ آدمی میری آپا کا باس ہے۔ بس
اسی سلسلے میں میری اس سے مُلاقات ہوتی تھی اور میں دل ہار بیٹھی۔"

"پھر تم نے اُس پر اپنے جذبات ظاہر کر دیئے۔"

"ہاں۔ بہت سوچ سمجھ کر ایک دن میں نے آپا سے چوری چھپے اُسے سب
بالکل صاف صاف ٹیلیفون پر کہہ دیا۔"

"وہ کیا بولا ـــــ؟"

"کیا کہتا وہ۔ کوئی اور آدمی ہوتا تو محض فلرٹ کرنے کے لئے دو چار مُلاقاتوں کی
اجازت دے دیتا۔ مگر اُس نے بڑے مہذب اور بڑے مشفقانہ انداز میں مجھے سمجھا دیا۔ کہ

وہ اپنی گھریلو زندگی سے بہت مطمئن ہے۔ اُس نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اُس کی لاڈلا
مجھ سے کچھ تھوڑی چھوٹی ہو گی ——— اُسے اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ ذہنی
طور پہ وہ ایسے کھیل کھیلنے کا اہل نہیں ——— اس عمر میں وہ صرف اپنے کیرئرے
عشق کر سکتا ہے اور کسی سے نہیں ——— !"

"پھر ——— ؟"

"پھر ——— اُس کی عظمت نے میرے دِل میں گھر کر لیا۔ اور میں نے بددل ہو کر
کراچی کو چھوڑ دیا اور لاہور آ گئی۔ اور دِل کی جلن مٹانے کی خاطر یہ شغل اختیار کر رکھا ہے!"

او ! سبجو ——— بھئی تم تو بال کی کھال اتارتی ہو۔ تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں۔ کیا تم
ایک ایسی لڑکی کا تصور کر سکتی ہو جس کو والدین کی محبت نہ ملی ہو۔ تنہائی کی پروردہ ہو۔
زندگی کا کوئی واضح نصبُ العین نہ رکھتی ہو۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہ ہو۔ آخر وہ کیا کرے۔

"سبجو !" وہ افسردہ ہو گئی۔ "جب دیس چھوٹی سی تھی میری ماں مرگئی۔ ابّو نے مجھے
اور حمیرا آپا کو بہت محبت سے پالا۔ حمیرا آپا کو ابّو بہت چاہتے تھے۔ دُنیا کی ہر آسائش ابّو
نے ہمیں دی۔ ہمارے لئے پیسہ بنانے کی مشین بنے رہے۔ مگر اُن کے پیسے نے
ہمیں کیا دیا۔ شدید احساسِ تنہائی ———

"کیا تمہاری آپا شادی شدہ ہیں ؟"

"شادی شدہ تو نہیں۔ صرف شُدہ ہیں۔"

سمی اِس سے زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے اُس کی رگِ ظرافت پھر
پھڑکنے لگی۔

"بھئی یہ کیا واہیات جواب ہے۔"

"تم نے پوچھا ہے۔ شادی شدہ ہیں۔ میں نے کہا ہے شادی شدہ تو نہیں صرف
"شُدہ" ہیں۔"

"شُدہ" سے تمہاری کیا مُراد ہے ؟"

"شادی شدہ بھی ہو سکتی ہیں اور طلاق شدہ بھی ———"

"سمی ! خُدا کے لئے پہیلیاں نہ بجھواؤ اور صاف صاف کہو۔"

"یہ بھی ایک دردناک داستان ہے۔ پھر کسی دن سناؤں گی۔ آج تم نے میرا موڈ بہت
خراب کر دیا ہے۔ اُس وقت سے وکیلوں کی طرح جرح کر رہی ہو۔ اب کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں اپنے متعلق ——— ؟"

"اب بھولی نہ بنو۔ یہ چاند سا چہرہ۔ قیامت کی جوانی ——— اس پر زاہدِ خشک کا سا
رویہ۔ اب میں یہ تو ماننے سے رہی۔ کہ تمہاری زندگی کے ساتھ کوئی ٹریجڈی وابستہ نہیں
ہے۔ نہ بتاؤ تو میں سمجھوں گی۔

تمہیں اعتبارِ اُلفت جو نہ آسکا ابھی تک
میں سمجھ گیا یقیناً ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے

سبجو ہنس پڑی۔ "بڑے باموقع شعر سناتی ہو۔ دیکھنے میں تو صرف شو کیس کی گڑیا لگتی ہو"
"بات ٹالو نہیں۔"

"ایسی ایک بدقسمتی میری زندگی کے ساتھ وابستہ تو ہے۔ لیکن خدا کی قسم مجھ میں اسے دہرانے
کی ہمت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے۔ جس دن میں خودکشی کا فیصلہ کر لوں اسی روز یہ راز بھی
اُگل دوں یا جس روز بھی مجھ میں یہ ہمت پیدا ہو سکی۔ وعدہ کرتی ہوں کہ تم پہلی ہستی ہو گی جس کو
میں سب کچھ بتا دوں گی۔ تم جیسے سچے اور کھرے لوگ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ بلند کردار
ہوتے ہیں۔ سمی میری بات کا یقین کرو۔ اور اس کے بعد فضول سوال و جواب سے مجھے بچا لینا۔"

"بس اب خوشامد نہ کرو۔ آؤ باہر چلیں۔"

ایک روز سبجو ڈیپارٹمنٹ سے واپس ہوسٹل میں آئی تو اُس نے دیکھا کہ گیٹ کے پاس
ایک خوبصورت سی خاتون بڑی اسٹائلش ساڑھی باندھے کھڑی ہیں۔ اور ہوسٹل کی ایک لڑکی

یہ ہمارا اپنا پروفیسر ہے نا! کہہ رہا تھا۔ جب سے یونیورسٹی میں آیا ہوں۔ میں نے ایک سیدہ بانو ہاشمی کے حسن کے چرچے بہت سُنے ہیں۔ سنا ہے۔ جتنی حسین ہے اتنی ہی بدمزاج بھی ہے۔

پھر تم نے کیا کہا؟

میں کیا کہتی ______؟ ابھی میں کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ تم ہوا کے گھوڑے پر سامنے آرہی تھیں۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے کہا۔ یہ ہے وہ تندخُو۔ کافر ادا حسینہ المعروف بہ زاہدہ ہاشمی ______ اور جس طریقے سے تم نے مجھے اٹھایا ہے اُسے پتہ چل گیا ہوگا کہ تم نہ صرف یہ کہ بدمزاج ہو بلکہ بدتمیز بھی ہو۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

اتنے میں ہوسٹل آگیا۔

وہ دوڑ کر حمیرا آپا سے ملی۔ پھر وہ اُسے ساتھ ہی لے گئیں۔

وہ جب بھی دو چار دن کے لئے لاہور آیا کرتیں سمی کو ساتھ ہی لے جاتی تھیں۔ یہاں اُن کے عزیز تھے۔ انہی کے ہاں رہتیں۔ خوب گھومتی پھرتیں۔ اور سمی کو ڈھیر ساری شاپنگ کرا کے چھوڑ جاتیں۔ وہ سمی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اس لئے اپنی تنخواہ میں سے ______ ایک معقول رقم ہر ماہ اسے بھیجتیں۔ تاکہ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

سمی کو بھی آبائی جائیداد میں سے اُن کے برابر حصہ ملا تھا۔ مگر وہ اُس کی شادی سے پہلے اُس میں سے کچھ بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

دو دن سمی ہوسٹل سے باہر رہی۔ اور یہ دو دن سجو پہ بہت بھاری گذرے۔ اُسے پہلی بار لگا کہ سمی اپنی ذات میں انجمن ہے۔ سجو بہت اُکھڑی اُکھڑی اور اُداس رہی۔ ہوسٹل میں بالکل دل نہ لگتا۔ اُسے تو یوں لگتا جیسے اُس کا دِل دُنیا سے ہی اُچاٹ ہو گیا ہے۔

تیسرے دن صبح ہی صبح اُس کے نام ایک تار آئی۔ اُس نے خوف زدہ دھڑکتے دِل

سے باتیں کر رہی ہیں۔ سجو کو دیکھتے ہی وہ لڑکی بولی۔

"لیجئے سمیرا کی رُوم میٹ آگئی ہے۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی۔"

سجو اُن کے قریب چلی گئی۔ سلام کیا۔

ساڑھی والی عورت بڑے شستہ اور شیریں لہجے میں بولی۔ "میں سمیرا کی بڑی بہن ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہوگی۔ میں کافی دیر سے اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"اوہ! حمیرا آپا۔" سجو انہیں دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی۔ "آپ کو دیکھنے کا تو مجھے شوق تھا۔ آیئے . . . کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں سمی کو ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔"

وہ انھیں ساتھ لے کر کمرے میں آئی۔ انھیں اندر بٹھایا۔ ایک کوک منگوا کر دیا۔ اور بجلی کی مانند سارے ہوسٹل میں دوڑی پھری۔ ایک ایک کمرے اور برآمدے میں سمی کو ڈھونڈا۔ کسی نے بتایا کہ شاید وہ کیفے ٹیریا کی طرف جا رہی تھی۔

اسے کیفے ٹیریا میں جانا پسند نہیں تھا۔ مگر اس وقت وہ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اُسے سمی کی آپا بہت پسند آئی تھیں۔ بہت ہی خوبصورت۔ نازک سی۔ جیسے شیشے کی بنی ہوئی ہوں۔ پتلی کمر۔ لمبی سی بل کھاتی ہوئی چٹیا۔ اُداس اور خاموش آنکھیں۔ عمر اُن کی تیس سے کچھ اوپر ہوگی مگر کتنی شاندار اور رُوح پرور لگتیں۔ سمی تو اُن کے بالکل برعکس تھی۔ وہ یہی سوچتی ہوئی کیفے ٹیریا میں گھس گئی۔ دیکھا تو سمی اپنے ایک نئے اُستاد کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی سمی کو اٹھایا اور واپس ہوسٹل کو بھاگی۔

"خدایا! میری آپا ہی آئی ہیں نا؟ کوئی طوفان تو نہیں آگیا۔ تم تو پاگلوں کی طرح بھاگ رہی ہو۔"

"وہ بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ اب بھی کمرے میں اکیلی بیٹھی ہیں اور تم یہاں گلچھرے اڑا رہی ہو۔ اپنے کرتوتوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ آپا کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

سمی جانتی تھی کہ وہ یونہی ڈراوا دے رہی ہے۔ ہنس کر بولی۔ "ایک مزے کی بات بتاؤں۔"

"بتاؤ۔"

کے ساتھ کھول کر پڑھی تو جان میں جان آئی۔ بلی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اور بجو کی لکھا
مطابق شیر افگن نے بذریعہ تار اطلاع دی تھی اور ساتھ ہی لکھا تھا نام بھی تجویز کر دیں۔ بجو بہت
خوش ہوئی۔ اُس کی چھوٹی سی بلی ماں بن گئی تھی۔ شکر ہے اُس کی زندگی تو مکمل ہوئی۔ سارا
دن اُس نے بلی کو خط لکھنے میں گذارا۔ اُس نے بلی کے بیٹے کا نام ضوفگن تجویز کیا۔ اور لکھا
کہ اُسے پیار سے ضوفی بلایا جائے۔

پھر وہ بے چینی سے سمی کا انتظار کرنے لگی تاکہ اُس کے ساتھ بازار جائے اور بلی کے بچے
کے لئے خوبصورت کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر لائے۔

اِتنے میں سمی ڈھیر سارے لفافے اٹھائے ہانپتی کانپتی۔ کمرے میں داخل ہوئی۔

"خیر باشد ——— !" اُس نے آتے ہی سارے لفافے پلنگ پر گرا دیئے۔

"اکھیاں تھک گئیں تمہارا انتظار کرتے کرتے . . . میں تو ——— خدا کی قسم اب تو
میں اب تمہارے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔" سجّو نے روہانسی آواز میں کہا۔

"اللہ اللہ ——— یہ عشق کی کونسی منزل ہے۔" سجّو ہنسنے لگی۔

"اچھا پہلے جلدی سے گرما گرم چائے پلوا دو۔ پھر آج تم کو ایک دھماکہ خیز خبر
سُناتی ہوں۔"

"دھماکا خیز ——— ؟ کیا معنے ؟"

"ہاں ہاں بہت بڑی اور مزے کی خبر۔"

سجّو نے جلدی جلدی چائے کی دو پیالیاں بنائیں۔ اور ایک سمی کو پکڑا دی۔

"آپا چلی گئیں ——— ؟"

"ہاں صبح کی فلائٹ سے گئی ہیں۔ اور اللہ نے اُن کو اُن کے صبر کا صلہ بھی دے
دیا ہے۔"

"صبر کا صلہ ——— ؟ آج تم پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہو۔" سجّو جزبز ہو کر بولی۔

ذرا بھی بتاتی ہوں ———" جیسے سمی سے کوئی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنا
پرس کھولا۔ اور ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکالا۔ اُسے کھول کر ایک تصویر والا صفحہ سامنے کیا۔ پھر وہ
سجّو کے آگے رکھ کر بولی۔ "اسے پہچانتی ہو ——— ؟"

سجّو نے اخبار چہرے کے قریب لا کر دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا، اور اس کے جسم کا سارا
خون خشک ہو گیا۔ جیسے اُس نے کھلی آنکھوں سے عزرائیل کو دیکھ لیا ہو۔ بار بار آنکھیں جھپک
جھپک کر دیکھنے سے کیا حاصل تھا۔ اس تصویر کو تو وہ زندگی کے ہر موڑ پہ پہچان سکتی تھی۔ مگر پھر
بھی اس نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا نام بار بار پڑھا ——— اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ ہر چند
تصویر کے نیچے شیخ عابد حسین ہی لکھا ہوا تھا۔ اور وہی بنی سنوری طرحدار دلکش مورت تھی۔
زیر وقوف خبر کا حاشیہ تو پڑھ ہی نہ رہی تھی۔ مگر اُس کے اندر ہی اندر جھکڑ چلنے لگے۔ یہ سوچ
کہ کسی طرح سمی کی "گل افشاں" تک رسائی ہو گئی ہے، اور اُسے میرے حالات کا بھی
علم ہو گیا ہے۔ اب میرے منہ سے اُگلوانا چاہتی ہے۔

وہ چور کی داڑھی میں تنکا بنی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اور اُس کا ذہن اس قدر
ماؤف ہو رہا تھا کہ یہ بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کر رہی تھی۔ کہ آخر یہ تصویر اخبار میں کیوں چھپی
سمی نے اُسے یوں گم صُم دیکھ کر تصویر اس کے ہاتھ سے چھین لی اور بولی۔

"تم بھی شاید اس آدمی کی ظاہری خوبصورتی اور وجاہت سے مسحور ہو گئی ہو۔ ؟"

سجّو حیران و ششدر کھوئے کھوئے انداز میں بس اتنا ہی کہہ سکی کہ . . . . "یہ شیخ
عابد حسین . . . ."

"ہاں ہاں یہ شیخ عابد حسین کی تصویر ہے۔ مگر تم کیا جان سکو گی کہ یہ شیخ عابد حسین کیا شے
ہے۔ اللہ کس قماش کا آدمی ہے۔ تم جیسی لڑکی اگر سوئے اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ جائے
تو اس کے ہاتھ لگنے سے پہلے پہلے وہ تمہیں کچا چبا جائے۔ جناب اسے عرفِ عام میں "فراڈ اعظم"
کہتے ہیں۔ لیکن خیر . . . میں تمہیں سارا قصہ شروع سے سُناتی ہوں۔"

اب سجّو نے بھی ذرا سنبھلنے کی کوشش کی۔ بات میں سے کوئی اور بات نکل آئی تھی۔ مگر دل میں اب بھی راز کے افشا ہو جانے کا ڈر تھا۔

تم ایک دن مجھ سے میری آپا حمیرا کے متعلق بہت سے سوال کر رہی تھیں کہ وہ شادی شدہ ہیں یا ——

سجّو نے اثبات میں سر ہلایا —— اور ایک نئے چرکے کے لئے خود کو تیار کر لیا۔

حمیرا آپا نے پاپا کی تمام تر مخالفت کے باوجود۔ بڑے ارمانوں سے شیخ عابد حسین سے شادی کر لی تھی —— داوکھ.... تو یہ ہیں۔ شیخ عابد حسین کی عتاب زدہ بیوی۔ ہا

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ —— ہم صرف دو بہنیں ہیں"۔ سمی کہے گئی: "ممی کے مرنے کے بعد پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔ ہم دونوں بہنوں کو حد درجہ محبت دی۔ ہمارے لئے باعزت طور پر پیسہ کماتے رہے۔ انجام کار انہوں نے ایک لاکھ روپیہ نقد ہمارے لئے بنک میں جمع کرا دیا۔ اور دُنیاوی آسائشوں کے علاوہ ہمارے نام ایک خوبصورت کوٹھی بھی تعمیر کرا دی۔ جس کا ایک پورشن آپا کے نام اور دوسرا میرے نام یہ ہمارا جہیز تھا۔ ظاہر ہے اس جہیز کے ساتھ کون تھا جو آپا کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا آپا کی بدقسمتی کہ انہی دنوں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں شیخ عابد حسین کراچی آئے۔ کسی محفل میں اُس کی آپا سے مُلاقات ہو گئی۔ اور آپا اُس کی ظاہری شخصیت، مردانہ وجاہت اور نشست و برخاست سے اس حد تک مرعوب ہوئی کہ اس کو اپنا دین و ایمان سمجھ بیٹھی۔ مگر میں تو یہ کہوں گی بقول پاپا کے، عابد حسین نے آپا کو ایک موٹی آسامی سمجھ کر شیشے میں اتار لیا تھا۔

سجّو۔ تم نے شیخ عابد حسین جیسے لوگ کبھی نہ دیکھے ہوں گے اور خدا نہ کرے کبھی دیکھو.... اس قدر عیّار اور شاطر ہوتے ہیں یہ لوگ۔ کہ جب چال چلتے ہیں تو تمہیں

پتہ نہیں ہوتا۔ یہ اتنے مہربان، پُرخلوص اور میٹھے بن کر چال چلتے ہیں کہ اُن کی ...ین جانا ہی تم زندگی کی معراج سمجھ بیٹھتی ہو۔ ہاں جب بازی ہار جاتی ہو تو تمہیں ...ہو آتی ہے۔

...ی حال کچھ آپا کا ہوا۔ شیخ عابد حسین کچھ ایسا شادی کے حق میں نہ تھا۔ آپا کو تو اُس ...ہی لیا تھا۔ مگر آپا تو اُس کی دیوانی ہو چکی تھیں۔ اس لئے اس نے ملاقاتوں کو بڑھانے ...دی رکھی۔ کہ وہ شادی کر لیں۔ پاپا نے اس مختصر سے عرصے میں اُن کے متعلق جو ...ٹھی کیں وہ کوئی تسلی بخش نہ تھیں۔ بظاہر اُن کے کاروبار کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا کرتے ...ں طور سے کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ رئیسوں کی مانند رہتے تھے۔ بہت سے اچھے ...رگ ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ کوئی اُن کے متعلق کچھ کہتا۔ اور کوئی کچھ ...حمیرا کو بہت سمجھایا۔ مگر بے سُود۔ انہوں نے پاپا کی لازوال محبت کو ٹھوکر مار دی۔ ...مہینے کے اندر اندر عابد حسین سے شادی کر لی۔ اور چھ مہینے بعد طلاق لے کر واپس ...پاس آگئیں۔

کیوں ——؟" سجّو نے پہلی بار کچھ پوچھنے کی جرأت کی۔ اُسے اپنی آواز کنوئیں ...ول سے آتی ہوئی محسوس ہوتی۔

کیوں ——؟" سمی ہنسی۔

ان چھ مہینوں میں کونسا ظلم تھا جو آپا پر نہیں توڑا گیا —— اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ...بار کو وسیع تر کرنے کا لالچ دے کر عابد حسین نے آپا سے ایک لاکھ روپے ہتھیا ...لئے اور جب آپا کے پاس روپیہ نہ رہا تو ان میں عیب نکل آئے۔ شیخ عابد حسین تو یہ ...چاہتا تھا کہ آپا اپنی کوٹھی کا پورشن بیچ کر اس کو دے دے۔ مگر پاپا نے ایسا نہ ہونے ...ہر قدم پر حمیرا آپا کو سمجھاتے رہے کہ مجھے یہ شخص فراڈی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ...کھلونا مت بنو۔ مگر آپا اتنی معصوم تھیں کہ اُس کے داؤ پیچ نہ سمجھ سکیں۔ اگر اتنی بات

ہوتی تو وہ سہہ لیتیں لیکن اُنہیں تو اُن کے گھر کا ماحول ہی پسند نہ آیا تھا۔

اتنے عجیب و غریب ہیں یہ لوگ ۔ اور ماڈرن بن جانے کے شوق میں تو شرم و حیا
سے بھی عاری ہو گئے ہیں۔ گھر میں بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی زندگی بسر کرتے ہیں
بہنیں بہت ہی آوارہ ہیں۔ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے یہ بے غیرت لوگ اپنی بہو
کی جوانی سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ بس تمہیں کیا بتاؤں ان کے گھر میں کتنی گندگی ہے
(سجو دل ہی دل میں ہنسی۔ میں اسی گندگی میں ڈوب کر ابھری ہوں) پر جب عابد حسین نے
اپنے کام نکلوانے کے لئے آپا کو استعمال کرنا چاہا۔ تو وہ بدک گئی۔ گو ہم دونوں بہنوں کی
پرورش بہت آزاد ماحول میں ہوئی ہے۔ پاپا نے کسی قسم کی ناجائز روک ٹوک نہیں کی
مگر ہمیں سچی مسلمان عورتوں جیسی تربیت دی ہے۔ مسلمان معاشرے میں رہنے کے
آداب بھی بتاتے ہیں۔ چونکہ آپا جوان تھی۔ خوبصورت تھی۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی
اس لئے عابد حسین نے چاہا کہ وہ سرکاری افسروں اور بڑے بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے
لئے، اور عابد حسین کے ذریعۂ آمدنی کو پردے میں رکھنے کے لئے بے حیائی کی چادر
اوڑھ لیں۔ تاکہ اُن کا مذموم کاروبار پھلتا پھولتا رہے ــــ جب لڑائی جھگڑے بڑھے تو بڑا
آخری شرط اُس نے رکھی۔ آپا کو ساتھ رکھنے کی ــــــ

یہی نہیں اور بھی بہت ظلم کئے۔ بہنوں نے الگ کچھ کے لگائے۔ وہ تو چاہتی تھیں
تھیں کہ عابد حسین شادی رچا کے الگ دُنیا بسا لے تو اُس کے ساتھ سب گھر والوں کا مفاد
وابستہ تھا۔

آپا کے جب پہلا بچہ پیدا ہونے والا ہوا تو عابد حسین دھوکے سے اُسے اپنی ایک
واقف لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور بچہ ضائع کروا دیا۔ یہ کہہ کر کہ مجھے بچے کی ضرورت
نہیں دولت کی ضرورت ہے اور تمہارے حسن و جوانی کو میں دولت حاصل کرنے کیلئے
لایا ہوں۔ بچے پیدا کرنے کے لئے نہیں۔ اور تم جانتی ہو ہر مشرقی لڑکی کی طرح آپا کی زندگی

بھی صرف اپنا گھر اور بچے تھے۔ اس صدمے سے آپا کا نروس بریک ڈاؤن ہو
گیا۔ پاپا انہیں گھر لے آئے۔ طلاق آخری علاج ٹھہرا۔
سجو۔ آپا کی طلاق کا حادثہ پاپا برداشت نہ کر سکے۔ اور ایک ہفتے کے اندر اندر

سمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور سجو بھی زار و قطار رونے لگی۔
سمی کے ایک پرانے پھوڑے کا مُنہ کھُل گیا تھا۔
تھوڑا سا رو کر جب سمی کی طبیعت ذرا سنبھلی تو پھر گویا ہوئی۔
ان منحوس لوگوں کی وجہ سے ہم نے باپ کھویا۔ دونوں اس دُنیا میں بے یار و مددگار رہ
گئیں۔ پھر آپا نے خود کو سنبھالا اور جینے پر آمادہ ہو گئیں۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے
کہیں نوکری کر لی۔ وہ اس ملک سے چلی جانا چاہتی ہیں۔ مگر ابھی میرا مسئلہ در پیش ہے
جب تک میں شادی نہ کر لوں وہ نہیں جائیں گی۔ یہ تو خیر بیک گراؤنڈ تھا۔ اب اِس
کا تازہ قصہ سُنو۔
سمی کے چہرے پر بشاشت لوٹ آئی۔ میں نے تمہیں اخبار دکھایا تھا نا؟ تم نے
پوچھا نہیں کہ اس منحوس عابد حسین کی تصویر اس میں کیوں چھپی ہے۔
قدرت نے بے گناہوں کو ستانے کا انتقام لینا شروع کر دیا ہے۔
پچھلے دنوں وہ کسی اسمگلنگ کیس میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔
اسمگلنگ ــــ؟ سجو کو جیسے بچھو نے ڈنگ لگایا۔
جی ہاں۔ ایک پارٹی سے مل کر تینوں بھائی اسمگلنگ کرتے تھے۔ وہ جو انکل اُن کے
ہاں آتا تھا نا ــــ جس کے ساتھ ڈولی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر خیر۔ تم ان باتوں کو کہاں سمجھو گی۔
اسی آدمی کو جو اپنے آپ کو ایران کا بتاتا تھا۔ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن دے رکھی
تھی۔ وہ اسمگلنگ کا سرغنہ تھا۔ یوں یہ لوگ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔

انکل تو کافی عرصہ ہوا ڈولی کو لیکر بیروت بھاگ گیا تھا۔ امجد حسین کو ضمانت پر رہا کر
گیا ہے۔ ساجد حسین کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ مگر عابد حسین پر جرم ثابت ہو گیا ہے۔ اس
لئے اُسے چودہ سال کی قید بامشقت کا حکم سُنا دیا گیا ہے۔

سجّو نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس چھوڑی ——— اس دُنیا میں دیر ہے
اندھیر نہیں ———

"اور مزے مزے کی خبر سُنو ———

اور وہ محل بھی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور اُن کی شاندار زندگی کی
ہر شے قرق ہو چکی ہے۔ بچاری جبینی کو شادی سے قبل ایک بچّہ دے کر سُلطان ہمیشہ کے
لئے چھوڑ گیا ہے۔ بفیضی آپا کو ایک آشنا کے پاس ٹھکانہ مِلا ہے۔ راضی آپا اسکول کے ہوسٹل
میں منتقل ہو گئی ہیں۔ باپ فوت ہو گیا ہے۔ اور ماں پتہ نہیں کہاں ہے۔ پورے
خاندان کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔

"بھئی تمہیں اتنی معلومات کیسے ہوئیں سمی ——— ؟" سجّو ابھی تک غیر یقینی حالت
میں تھی۔

"اجی۔ میں پچھلے ایک سال سے لاہور میں ہوں۔ اور اُن کے پیچھے مخبر لگا رکھے ہیں
اب تو اللہ نے میری سُنی ہیں۔ بہت بد دعائیں دی تھیں ان لوگوں کو ———
اُن کے گھرانے کا حشر خراب ہونے والا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا۔ مگر اصل خبر تو
کل کے اخبار میں آئی ہے۔ اور کل سے میں بہت خوش ہوں۔ آپا تو بچاری خاموش ہیں۔
کہتی ہیں کسی کی بربادی پر خوش نہیں ہونا چاہیئے ——— اونہہ .... میں تو کہتی
ہوں۔ ایسا ہوتا ہے اللہ کا انتقام۔ اور جو لوگ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ اُن کا
بدلہ ضرور لیتے ہیں۔

"ہاں۔" سجّو نے سر ہلایا۔

بھی اپنے ٹوٹے ہوئے دِل میں خوشی کی ایک لہر اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی۔
انصاف زبردست ہے۔
انسان کیوں زمین پر خدا بن جاتا ہے۔ جبکہ آسمان پر ایک منصف و عادل ہر وقت
ہے۔

عابد حسین نے نہ معلوم کتنے جسم پامال کئے تھے اور نہ جانے کتنے دِل چور چور کئے
ان پر اللہ کا عذاب نازل ہونا تھا۔ لیکن شکر ہے اُس نے اپنے کانوں سے یہ سب
اب وہ خوبصورت شہزادہ کال کوٹھری میں پڑا ہوگا اور اپنے ایک ایک فعل کو یاد
پچھتا رہا ہوگا۔ اُس روز کہتا تھا میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
کاش سجّو اُس کے سامنے جا کے اُس سے کہہ سکے کہ "اب بتاؤ کہاں گئی وہ تمہاری
انیت ——— ؟

"تم کیا سوچ رہی ہو ——— ؟" سمی نے اپنے کپڑے الماری میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"چل سمی۔ آج شہر کو چلیں" وہ ایک دم جوش میں کھڑی ہو گئی۔

"کیوں خیریت تو ہے یہ بِن بادل برسات کیوں ہونے لگی ....؟"

"میں آج بہت خوش ہوں سمی .... بہت خوش .... عرصہ دراز کے بعد اپنے
کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ اور آج دِل چاہ رہا ہے۔ کوئی انوکھی سی عیاشی
جائے۔ جکڑی ہوئی روح کو بندشوں سے آزاد کر دیا جائے۔"

"یعنی ——— ؟"

"چلو۔ باہر چل کر گھومتے ہیں۔ کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھاتے ہیں۔ پھر
کوئی فلم دیکھتے ہیں۔"

"یا اللہ۔ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔" سمی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ بی مُلّانی آج
باتیں کر رہی ہے۔ ذرا پتہ تو چلے ایسی کون سی بات ہو گئی ہے جس نے تیرا دھارا

ہی موڑ دیا ہے۔ وہ بات تو میں ضرور سُنوں گی جس کی تمہیں اتنی خوشی ہو رہی ہے
سنجو ایک دم ڈر گئی۔ اُسے اس موقع پر اپنی خوشی کا یوں کھلم کھلا اظہار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اب تو سمی کو اُس کی زندگی کے اس حادثے کا کبھی علم نہیں ہونا چاہیئے سمی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔ اور اُس کی اپنی حقیقت دو کوڑی کی رہ جائے
جلدی جلدی وہ بات بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُسے صبح کی تار یاد آگئی۔

"ہاں سمی ——— ضرور ضرور ——— تمہیں تو میں بتانا ہی بھول گئی تھی۔ کہ آج میری خوشی کا سبب کیا ہے صبح تار آئی تھی۔ میری پیاری مُنّی سی بلّی کے ہاں خوبصورت سا بیٹا ہوا ہے۔ اور میں اتنی خوش ہوں کہ میرے پیر زمین پر نہیں ٹکتے۔"

"اچھا ———" سمی بھی خوش ہو گئی۔ "واقعی یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مٹھائی کھلاؤ پھر ———"

"اسی لئے تو خود ہی کہہ رہی ہوں۔ چلو باہر چلیں۔ پہلے بازار چلتے ہیں۔ بچے کے لئے کچھ تحائف خریدیں گے۔ پھر تھوڑی تفریح کریں گے۔"

"مجھے تیار ہی سمجھو ———" سمی جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

اُنہوں نے بازار میں تھوڑی سی شاپنگ کی۔ اچھے سے ریستوران میں کھانا کھایا اور عرصہ دراز کے بعد سنجو نے پکچر دیکھی۔

پکچر دیکھتے وقت بھی اُسے ماضی کے بہت سے واقعات یاد آکر ڈستے رہے ——— پچھتاووں کے ساتھ اس مرتبہ خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔

جو کچھ بھی ہوا افسوسناک سہی۔ مگر اللہ کا شکر ہے وہ اُن سے بچ کر نکل آئی۔
اگر عابد حسین بادلِ ناخواستہ شادی پر رضامند ہو جاتا تو اُسے بھی اُن سب کا آلۂ کار بنا پڑتا ... باقی اپنے وجود کو ریزہ ریزہ کرنے میں اُس کا بھی قصور تھا۔ اس کی سزا وہ پاتی رہے گی ... بہر حال ایک بوجھ ذہن سے ضرور اُتر گیا تھا اور اس خلش میں بھی

تھی جو ہمہ وقت تڑپاتی رہتی تھی۔
آج .... آج اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا وہ اُس وقت لاہور میں آزاد ہے بالکل آزاد ہے .... نہ جانے اُس نے کیوں سمجھ لیا تھا کہ اُس کے پاؤں میں ایک زنجیر ہے ..... وہ ڈر کے مارے باہر نہ نکلتی ..... مبادا کہیں ——— کسی موڑ پر ...وں یا بہنوں میں سے کوئی سر راہ مل جائے تو ——— تو ——— کیا ہو ——— ؟ ...ہو وہ اُسے بلیک میل کرنا چاہیں۔ جیسا کہ کتابوں اور ناولوں میں ہوتا ہے۔

...و کیا رہ جائے گی۔
اُسے لاہور شہر سے خوف آنے لگا تھا۔ ہر موڑ اور ہر چوراہا جیسے اُس کے کالے ...وں کا عینی گواہ تھا ... اُس نے خود کو ہوسٹل کی چار دیواری میں بند کر دیا تھا ——— مگر آج ——— آج وہ بے خوف ہو گئی تھی۔ یہ چوراہا ہے اور یہ موڑ اِن لٹیروں سے ہو چکے تھے۔ جن کا اُسے کھٹکا تھا۔ اور جنہوں نے اُسے لوٹا تھا۔
لیکن بہت سارے دن گزر جانے کے باوجود سنجو کو محسوس ہوا کہ اُس کا ٹوٹا ہوا ...ابھی تک بکھرا ہوا ہے۔ یکایک اُس کا دل یونیورسٹی کی فضا سے بھر گیا۔ کسی بات ...ئی سچائی کوئی خلوص اُسے نظر نہ آتا۔
نہ ہی پڑھنے کو جی چاہتا۔
یونیورسٹی میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے۔
شور و غل، جلوس، توڑ پھوڑ .... نعرے۔ فضولیات!
وہ اس شہر سے کہیں دُور نکل جانا چاہتی تھی۔
مگر کہاں ——— ؟
جلال پور ——— وہ کوئی ایسی پناہ گاہ نہ تھی۔ بلکہ وہاں تو پا بہ جولاں ہونے

کا ڈر تھا۔

ایک دن وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کی لائبریری میں بیٹھی تازہ اخبار دیکھ رہی تھی کہ ایک اشتہار دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اُس نے سوچا۔ غور کیا ———

پھر دھیرے دھیرے اس اشتہار کو اخبار سے الگ کیا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔ ہوسٹل میں آئی تو پتہ چلا آج سمی پہلے ہی آچکی ہے۔ کمرے میں گئی۔ سمی بیڈ پر کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُس نے اشتہار پرس میں سے نکالا اور سمی کے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ———؟"

سمی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اشتہار کو اچھی طرح سے پڑھا اور پھر بولی۔

"یہ کیوں لائی ہو۔؟"

"دیکھو بھئی مخالفت مت کرنا۔ آج اچانک ہی یہ اشتہار سامنے آگیا اور میں APPLY کر رہی ہوں"

"کیا تمہیں گھر سے اجازت مِل جائے گی۔؟"

"اجازت کا سوال بعد میں پیدا ہوگا۔ ذرا پہلے انٹرویو دے کر تو دیکھوں کہ کتنے پانی میں ہوں — اور کچھ نہیں تو زندگی میں تھوڑی سی ہلچل ہی پیدا ہو جائے گی۔ میں آج کل اپنی زندگی کے جمود سے خود بھی اکتائی ہوئی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے ———" سمی بھی جلدی سے رضامند ہو گئی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ APPLY کروں گی۔"

"تم ———؟" سجو ہنسی ——— "بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے۔"

"اور تمہیں کیا ضرورت ہے ایئر ہوسٹس بننے کی۔"

"میں زندگی کی یکسانیت سے تنگ آگئی ہوں سمی۔ مجھے تیز تر زندگی چاہیے۔ پلٹنے جھپٹنے والی۔۔۔ تاکہ لہو گرم رکھنے کا کوئی بہانہ تو ہو۔۔۔ ہر روز نیا دن ———

نیا سفر ——— اِدھر ——— اُدھر ——— ہنگامہ ——— افراتفری ——— یہ راتیں مجھ پر بھاری گزرتی ہیں۔ یہ صبحیں بے کیف ہیں۔ یہاں تو زندگی رینگ رہی ہے۔"

"ہائے اللہ! میں بھی اس ماحول سے اُکتا گئی ہوں۔" سمی نے کہا۔

"چلو دونوں ہی بیٹھ کے عرضیاں لکھتے ہیں ———"

"ویسے تو ماشاءاللہ ہم دونوں ہی قابلِ قبول ہیں۔۔۔۔"

پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھِلکھلا ہنسنے لگیں۔

یہ کیا ——؟

اب سجو کو اپنی سوچوں پر خود اُلجھن ہونے لگی تھی۔ جانے اس مُسافر میں کیا بات تھی؟ وہ مسلسل اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ خُدا جانے اُس کی شخصیت جادو بھری تھی۔ یا وہ کسی مافوق الفطرت قوّت کا مالک تھا۔ کچھ بات تھی اس میں۔ لیکن جب سے وہ جہاز میں سوار ہوا تھا۔ سجو کی نظر بار بار اُس پر جا کر رُک جاتی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں سوچنے لگتی۔ کون ہے —— ؟ کہاں سے آیا ہے ——؟ کہاں جائے گا —— ؟ اُس کی منزل ؟

حالانکہ ایئر ہوسٹس بنتے ہوئے سجو کو چار سال ہو گئے تھے۔ ٹریننگ کے زمانے سے لے کر اب تک سجو نے سارے عملے میں بہت نیک نامی پیدا کی تھی۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بڑی با اصُول اور باوقار لڑکی ہے۔ اس کے اعلیٰ کردار کی قسم عملے کا ہر چھوٹا بڑا آدمی کھا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے سینئر اور جونیئر سبھی اسے بہت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مستعدی، فرض شناسی، اعلیٰ کارکردگی۔ اور خوش اخلاقی۔ اِن سب صفات نے

ہت ہردلعزیز کر دیا تھا۔ جلد جلد وہ ترقی کی جانب پرواز کرنے لگی۔ ہر اہم پرواز پر اُس بھیجا جاتا۔ بڑی بڑی مقتدر شخصیتوں کی پروازوں کے ساتھ وہ جاتی۔ بارہا وہ مُلک سے ر جا چکی تھی۔ وہ ایک انتھک لڑکی تھی۔ یوں معلوم دیتا اُس کی زندگی کا مقصد پرواز اور ف پرواز ہے۔

اُوپر ہی اُوپر ——

فضاؤں میں ——

خلاؤں میں —— اُڑتے پھرنا۔ چہکتے رہنا۔ . . . کتنی لمبی پرواز کیوں نہ ہوتی وہ تھکتی۔ مُسافروں کو اُس سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی۔ وہ اتنی زمانہ بیں ہو چکی تھی۔ کہ نظر ہی میں سب مُسافروں کے مزاج کو پہچان جاتی۔ اور پھر اپنے رویئے کو بھی ہر مُسافر مزاج اور مصلحت کے مُطابق ڈھالتی رہتی۔

اپنی موجودہ روش سے وہ بہت مطمئن تھی اور سارا عملہ اس سے خوش تھا۔

آج وہ کافی دنوں کے بعد ایک بیرونی پرواز سے وطن واپس آ رہی تھی۔ لندن سے مُسافر جہاز میں سوار ہوا تھا۔ اُس میں بظاہر ایسی کوئی بات نہ تھی کہ سجو اُس کی طرف متوجہ تی۔ اُس نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مُلکی و غیر مُلکی مُسافر دیکھے تھے۔ ہر عُمر کے مردوں کا مشاہدہ تھا۔ وہ اس دور سے گزر چکی تھی۔ جب لڑکیوں کے دل بات بے بات دھڑکا کرتے ہیں۔ اور کے ظاہری محاسن اُن کی باطنی خواہشوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

اُس کی زندگی کا ایک ہی حسن تھا۔

اُس کی کارکردگی، نیک طینتی۔ اور خدمتِ خلق۔ اس لئے یہ کہنا بے جا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہو گئی تھی۔ یا وہ اُسے جان بوجھ کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا نہیں۔ دونوں جانب ایسی کوئی کاوش نہیں کی گئی ——

بس —— ایک عجیب سا اتفاق ہو گیا —— کہ وہ مُسافر یکایک سجو کو بڑا عجیب

اور پُرکشش لگا۔ جب جہاز اُڑنے میں چند سیکنڈ رہ گئے تھے۔ تو وہ سب سے آخر میں بھاگتا ہوا آیا تھا اور جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ اس کا سامان بھی عجیب و غریب تھا یعنی صرف کتابوں سے بھرے ہوئے دو تھیلے بازوؤں میں لٹکائے ہوئے تھے اور بس ——

اُس کی سیٹ بھی سب سے آخر میں تھی۔ وہ دھم سے آکر اس پر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے اردگرد کا جائزہ لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ جیسا عام طور پر مُسافر کرتے ہیں۔ تھیلے سے ایک کتاب نکالی اور اُس میں گم ہو گیا۔

جہاز کی پرواز کے ابتدائی مراحل طے ہُوئے —— پھر وہ اپنی رفتار پر پہنچ گیا۔ مُسافروں نے پیٹیاں کھول دیں۔ جہاز میں چہل پہل ہونے لگی۔ کھانے پینے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔۔۔۔ سگریٹ، کتاب، شراب، چائے، کافی۔ وغیرہ کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ ایئر ہوسٹسیں اور اسٹوارڈ آنے جانے میں مگن ہو گئے۔۔۔۔۔ مگر وہ بدستور کتاب میں کھویا رہا۔

جتنی بار سجّو نے فرض کے طور پر اُسے کھانے پینے کی پیشکش کی۔ اُس نے نظریں اٹھائے بغیر۔ اُسے دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے انکار کر دیا ——

عجیب آدمی ہے۔ سجّو کو اُلجھن سی ہونے لگی، جبکہ دُوسرے مُسافر ذرا ذرا سی چیز کی فرمائش کر کے انہیں مصروف رکھے ہوئے تھے۔ یہ کس بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ سجّو نے دُوسری ایئر ہوسٹس کو بھی ایک بار اُس کے پاس بھیجا۔ مگر وہ بھی ویسا ہی جواب لائی۔

مجھے کیا —— ؟ دُنیا عجیب آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور آدمی تو سارے ہی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔۔۔۔ اب سجّو اس بات پر ایمان لے آئی تھی۔۔۔۔ کوئی کیسا بھی ہو۔ ہمیں کیا لینا دینا ——

وہ ایک طرف بیٹھ گئی

مگر انہیں کون بیٹھنے دیتا ہے۔ مُسافر تو چاہتے ہیں کہ وہ سارا وقت دست بستہ کھڑی رہیں

پیش کرتی رہیں۔ ایک مُسافر کی فرمائش پر جب وہ سگریٹ لے کر تیزی سے اُس کے پاس سے گزرنے لگی۔ تو اس عجیب و غریب مُسافر نے پہلی بار نظر اُٹھا کر اُس کو دیکھا اور کہا۔

پلیز ——

لیکن اس مرتبہ سجّو اُسے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہہ کر آگے نکل گئی۔ جب سگریٹ دے کر سجّو پلٹی تو اُس کے پاس آئی ——

وہ بڑے ادب سے بولا۔

"اگر ممکن ہو سکے تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لا دیں۔"

سجّو پانی لینے چل دی —— فرسٹ کلاس کے مُسافر چائے اور کافی مانگتے تھے —— جِن اور وہسکی کی فرمائشیں کرتے تھے —— ووڈکا مارٹینی کا سنگم چاہتے تھے۔ کوک اور سیون اَپ یا کوئی اور کولڈ ڈرنک —— مگر اُس نے صرف ایک ٹھنڈے پانی کا گلاس مانگا تھا۔

وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔۔۔۔ اب کے اس نے مُسافر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ خوب صحت مند اور چاق و چوبند آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب میں سے ایک ڈبیا نکالی۔ ایک گولی ہتھیلی پر رکھ کر منہ میں ڈالی پھر پانی کا گلاس پکڑ کر غٹ غٹ پی گیا۔ سجّو اُسے یونہی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ جب وہ گلاس تھام کر جانے لگی۔۔۔۔ تو وہ جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی پھل وغیرہ مِل جائے گا۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو زحمت نہ ہو تو۔۔۔۔"

"ضرور ——" سجّو خوش اخلاقی سے بولی۔ "موسم کا جو پھل بھی آپ کو پسند ہو میں لاؤں ——"

"مہربانی کر کے مجھے ایک سیب لا دیجئے" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا۔

"بس ایک ——— ؟" سجّو ہنسنے لگی۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سجّو بھی دوسری طرف لپکی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوبصورت سی باسکٹ میں موسم کے سارے پھل لگائے ٹرالی پر لا رہی تھی۔ خوبصورت، سُرخ سُرخ اور صحت مند سیب اُن میں سب سے نمایاں تھے۔

کتاب سے نظریں اٹھا کر کچھ دیر کے لئے مُسافر نے پھل والی باسکٹ کو دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر صرف ایک سیب اٹھا لیا۔ نہ چھُری نہ پلیٹ ——— ساتھ اُس نے کچھ نہیں لیا ——— اور سجّو کے دیکھتے ہی دیکھتے۔ اُس نے اپنے دانت سُرخ سُرخ سیب میں گاڑ دیئے۔ اور بڑی بے نیازی سے اُجڈوں کی طرح سیب کھانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ مطالعے میں غرق ہو گیا۔ . . . واقعی عجیب آدمی ہے۔ سجّو بہت حیران ہوئی کم از کم جہاز میں ہر طبقے کے مُسافر زیادہ سے زیادہ مہذّب بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کٹلری کا استعمال بھی نہ جانتے ہوں۔ تو بھی بیچارے اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے کہاں یہ مسافر ——— لندن سے سوار ہوا ہے ——— فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہے۔ بیش قیمت انگلش سوٹ زیبِ تن کر رکھا ہے ——— اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ سے کافی تعلیم یافتہ لگتا ہے۔ مگر. . . کیا مزے سے دانتوں سے سیب کھا رہا ہے۔ جیسے کسی گاؤں کے باغ میں بیٹھا درخت سے کچّے امرود توڑ کر کھا رہا ہو . . . . .

سجّو اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور خواہ مخواہ اُس کے متعلق اندازے لگانے لگی۔ شاید لوگ اپنے آپ کو اس طرح منفرد بنانے کی کوشش کرتے ہیں. . . . . اور حقیقت میں وہ ان سب مُسافروں سے بالکل الگ لگ رہا تھا۔

اس کی عمر. . . ہو گی کوئی چالیس کے لگ بھگ. . . . . کنپٹیوں پر کچھ بال سفید تھے۔ اور اُن کے ساتھ وہ کچھ اور بھی وجیہہ اور دلکش لگ رہا تھا۔

جب وہ جہاز میں سوار ہوا تھا تو اُس نے کالی عینک لگا رکھی تھی۔ مگر اب وہ اس کے بائیں جیب میں پڑی تھی۔ کلائی پر ایک بیش قیمت اور خوبصورت گھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی نہ تھی . . . جس کا مطلب تھا کہ . . . لیکن اب تو شادی شدہ مرد بھی مارے شرم کے انگوٹھی نہیں پہنتے۔ اُس کی آنکھوں کے گرد باریک باریک لکیریں تھیں۔ مگر چہرہ صحت مند اور توانا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ گندم کے خوشوں ایسا سنہری تھا۔ اور چہرے پر کردار کی پختگی اور ذہانت کی چمک تھی۔ اس عمر میں عام طور پر مردوں کے چہرے مرجھا جاتے ہیں۔ مگر اس کا چہرہ ——— بہت تر و تازہ اور زندگی سے بھرپور تھا۔ گویا زندگی کے اتنے برسوں کے طے کرنے کی تھکن اُس پر طاری نہ ہوئی تھی ——— اس دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں ——— ؟

کون ہے ——— ؟ کہاں سے آرہا ہے ——— ؟ کہاں جائے گا؟ ویسے پاکستانی لگتا ہے۔ بڑی شستہ اُردو بول رہا تھا۔ اتنا عرصہ کہاں رہا ہے ——— کیا کرتا ہے ——— ؟ ایسے ہی سوال زاہد خشک جیسی سجّو کے دل میں سر اٹھانے لگے۔

بھلا مجھے کیا پڑی ہے۔ جو اُس کے متعلق سوچتی رہوں. . . . ہاں اس بات کا اُس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ زندگی میں بعض انسان ایسے ضرور ملتے ہیں۔ جن کے اندر ایسی کشش ہوتی ہے یا جن سے آدمی بے اختیار متاثر ہو جاتا ہے۔ متاثر ہو جانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ یہ انسانوں سے بھری دُنیا ہے ——— اور اچھے بُرے سب انسانوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہر آدمی سے مل کر کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہیئے۔ اس طرح اچھے انسانوں سے مل کر دل میں جینے کی اُمنگ جاگتی ہے۔ اس طرح بُرے اپنی اصلاح کی طرف مائل کرتے ہیں۔ خود اپنے کردار میں استقامت ہونی چاہیئے درخت کی لچکیلی شاخ کی مانند نہیں ہونا چاہیئے کہ جس رُخ ہوا چلی اُدھر مڑنے لگے۔

پھر سجّو کا ایمان اس بات پر بھی تھا کہ اچھے اور مخلص لوگوں کو وہی لوگ بھلے لگتے ہیں جن کی فطرت میں وہی صفات پائی جاتی ہیں۔ کشش کشش کو کھینچتی ہے۔ جس طرح شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے —— اور رذیل انسان بھری محفل میں اپنے جیسا آدمی تاڑ لیتا ہے اور جھٹ مِل بیٹھتا ہے۔

اس لئے جب کبھی سفر میں یا کسی محفل میں سجّو کو کوئی ایسا مرد یا عورت نظر آتے جو کی طرف اُس کا دِل کھنچتا تو وہ ضرور اُن سے جا کر ملتی۔ اور یہی سوچتی کہ باطنی طور پر یہ لوگ ضرور اسی کی طرح پُرخلوص، دیانت دار اور اعلیٰ کردار کے مالک ہوں گے۔

وہ جو اتنی دیر سے اس مُسافر کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اپنے آپ کو اُس نے اس وقت بھی یہی جواز پیش کیا کہ ممکن ہے یہ مُسافر بھی عام لوگوں سے مختلف ہو۔ اور اپنے اندر انسانیّت کی اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ صفات رکھتا ہو۔ ورنہ اس کے بارے میں سوچنے کی تو کوئی اور وجہ بالکل نہ تھی اور اس کے بعد اس نے اس مُسافر کے بارے میں سوچنا بالکل بند کر دیا۔ اور اپنے معمُولات میں مگن ہو گئی۔

جب اُن کا جہاز پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تو خوشی سے سجّو کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ اسے پہلے بھی کئی مرتبہ جہاز کے ساتھ بیرونِ مُلک جانا پڑا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہی بھی تھی۔ مگر اس بار نہ معلوم کیوں اُسے یہ ایک ہفتہ ایک سال لگ رہا تھا اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے وطن سے۔ اپنے لوگوں سے۔ اپنے دیس کی ہواؤں سے۔ مُدّتوں کی بچھڑی ہوئی ہے۔

دیس —— وطن —— شہر —— اپنے عزیز —— کہاں تھے ؟

سب ——

سجّو کی آنکھ بھر آئی۔

اس بھری پُری دُنیا میں سب نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اپنی ایک لغزش

اُس نے اپنی زندگی کو دینا چاہی تو ساری دُنیا اُس سے رُوٹھ گئی۔ پھر سب نے اپنے طور پر اُسے سزا سُنا دی۔ اُس نے سب کی سزا کو۔ آنکھوں سے لگا لیا——

بابا ——

بابا نے جو سزا سجّو کو دی وہ پھانس کی مانند اُس کے کلیجے میں اٹک گئی تھی۔ بابا نے یہ سُنا کہ سجّو ایئر ہوسٹس بن گئی ہے تو وہ دل کو پکڑ وہیں دہلیز پر بیٹھ گئے۔ وہ تو سجّو کی مزید پڑھائی کے خلاف تھے۔ کہاں سجّو نے اتنا بڑا قدم اُٹھا لیا۔ دِل ایسا بیٹھے کہ انہیں دِل کا روگ لگ گیا۔

صبح و شام روتے اور سجّو کو یاد کرتے۔

بہن بھائیوں نے سجّو کو تار دیئے کہ نوکری چھوڑ کر فوراً واپس آجاؤ۔ مگر سجّو تو ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ کیسے بدلتی۔ ؟ زندگی بار بار فیصلہ کرنے کی مہلت دیتی۔

اور بابا کو اپنی لاڈلی سے اس نافرمانی کی اُمید نہ تھی۔ چند دنوں کے اندر اندر سب سے منہ موڑ گئے۔ مرتے وقت بھی ان کے لبوں پر سجّو کا نام تھا۔ اور انہوں نے اپنے سب کو وصیت کی تھی کہ سجّو سے کوئی بھی کسی قسم کا ناطہ نہ رکھے اور نہ اُسے اُن کے مرنے کی اطلاع دی جائے۔ اور نہ وہ اُن کی آخری رسُوم میں شریک ہو سکتی ہے۔ گویا سجّو کا گاؤں میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ . . . اور پیار و محبّت کے وہ دروازے جنہوں نے اُسے جنم دیا تھا جسم دیا تھا۔ روح دی تھی، سب اُس پر بند ہو گئے۔

اس سے تو بہتر تھا بابا اُسے سنگسار کرنے کا حکم سُنا دیتے۔ پھانسی پر لٹکا دیتے۔ یا اپنے پستول سے اُس کا سینہ چھلنی کر دیتے —— یہ کتنی کڑی سزا تھی——

مگر اُس پر سزا کا حکم کیا سُنانا —— ؟ اُس نے تو خود ہی بن باس لے لیا تھا۔

بہت عرصے بعد جب بلّی نے اپنے مفصّل خط میں اُسے بابا کی وفات اور اُن کی

وصیت کی اطلاع دی تو وہ پاگل سی ہوگئی۔ وہ بابا کی موت کا باعث بن گئی تھی۔ بابا اُس سے ناراض ہی چل دیئے ـــــ بابا جو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ اُسے چاہتے تھے۔ لاڈ میں اُسے بگاڑ رکھا تھا ـــــ بچپن میں اُس کی ہر ضد مان لیا کرتے تھے جس کی پیدائش پر انہوں نے مسجد میں گھی کے چراغ جلائے تھے ـــــ وہی بیٹی کی نافرمان نکلی تھی ـــــ اُس نے بابا کی اُمیدوں کو پامال کیا تھا۔ اُن کے بڑھاپے کو دھچکا لگایا تھا۔ اپنے عظیم بابا کو شکستہ دِل کر کے موت کے حوالے کر دیا تھا وہ اُسے دیکھے بنا ـــــ بُلائے بنا ـــــ سر پہ ہاتھ پھیرے بنا رخصت ہو گئے تھے ـــــ اور وہ ان لمحوں میں اُن کے قریب نہ تھی ـــــ اُن کے قدموں پر سر رکھ کے اپنی گنہ گار آنکھوں سے جھرنے نہیں بہا سکی تھی ـــــ اُن کی قبر کی مٹی کو اپنی آنکھوں سے نہ لگا سکی تھی ـــــ نہ لگا سکے گی ـــــ بابا نے وہ راہیں بند کر دی تھیں۔ بیٹی کو کسی بابل نے کاہے کو ایسی سنگین سزا دی ہوگی۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا ـــــ

رونے چلانے، چیخنے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا ـــــ فریاد بھی کرتی کس کے رُوبرو ـــــ

بھائیوں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس گاؤں میں داخل ہوئی تو اُسے گولی سے اڑا دیں گے۔ باقی رشتے دار بھی اُن کے ساتھ تھے۔

ایک بلی تھی جو خفیہ طور پر کبھی کبھار اُسے خط لکھ دیا کرتی تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ اور اپنی آپا کی کوئی خطا نہ سمجھتی تھی۔ ایسے میں غنیمت کہ شبیر بھی بلی کا ہم خیال تھا۔ اور سجو اِن دونوں کی بہت شکر گزار تھی۔ بلی کے اب چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ سجو کو بلی کے سب بچے پیارے لگتے تھے۔ اُن کے نام بھی اُسی نے رکھے تھے۔ اور ہمیشہ اُن کے لئے نت نئے فیشن کے ملبوسات خرید خرید کر بلی کو بھیجا کرتی

کمرے میں ہر طرف اُس نے بلی، شبیر اور اُن کے بچوں کی تصویریں لگا رکھی تھیں جو اُس کی زندگی کا محور تھے۔

کبھی بلی اور شبیر مع بچوں کے چند دن کے لئے کراچی آتے اور سجو کے مہمان بنتے۔ وہ دن سجو کی زندگی کے مسرور ترین دن ہوتے۔ مگر گاؤں میں کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی۔

اس کی ضروریات کے لئے اس کی تنخواہ بہت کافی تھی۔ اور زیادہ کی اُسے طلب نہ تھی۔

اب بھی اس نے لندن سے بلی اور اُس کے بچوں کے لئے بیشمار تحائف خریدے تھے۔ وہ جلد انہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ انہیں کراچی بُلانا چاہتی تھی۔ اس مرتبہ وہ سارے سفر کے دوران بہت اُداس رہی تھی۔

ویسے تو جب سے بابا کا انتقال ہوا تھا وہ بہت اُداس رہتی تھی۔ مگر اُس کے مسکراتے چہرے سے کبھی کسی نے اُس کے دل کے اتھاہ غم کو نہ پایا تھا۔

جب بھی پرواز پہ ہوتی اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے بابا بھی کہیں بادلوں میں اُس کے ساتھ محو پرواز ہیں۔ پھر وہ سارا راستہ بابا سے تصوّر ہی تصوّر میں باتیں کرتی جاتی۔ دیکھ رہے ہو بابا ـــــ میں کوئی بُرا کام کر رہی ہوں ـــــ کتنی اچھی ہے یہ نوکری ـــــ کہیں کوئی آلودگی نہیں ـــــ لوگ تو خواہ مخواہ اس پہ تنقید کرتے ہیں ـــــ بھلا برائی اور کس شعبے میں نہیں ہے ـــــ لوگ اپنا اصل مقام کھو دیتے ہیں ـــــ آپ نے دیکھا آپ کی بیٹی نے بھی اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ لڑکی ہر نوکری اور ہر دفتر میں پیدا کر سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے خون کی لاج رکھے اور اپنے نفس کو برقرار رکھے۔

سب مجھے بہت قابلِ احترام ہستی سمجھتے ہیں ـــــ پھر آپ نے کیوں مجھ سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

منہ موڑ لیا بابا ——— یہ آپ ہی کے مقدس خون کا اعجاز ہے۔ کہ اس ایک ٹھوکر کے بعد میرا دامن کبھی آلودہ نہیں ہوا ———

مصفا اور پاک ———

اور اگر وہ بدترین حادثہ زندگی میں رونما نہ ہوتا تو بابا آپ کی سجو اپنے وجود سے اتنا بڑا انتقام کبھی نہ لیتی۔ اپنے جسم کو تابوت بنا کر اس میں سرد مہری اور بے حسی کی کیلیں نہ ٹھونکتی ——— بابا ——— اب تو مجھے معاف کر دو ——— یا پھر اپنے ہی پاس بلا لو

کئی دفعہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کا دل چاہتا۔ جہاز کا دروازہ کھول کر باہر بادلوں میں کود جائے ——— اور اپنے بابا کی آغوش میں پہنچ جائے اور جب اُس پر وحشت سوار ہوتی تو وہ جنونی انداز میں بابا کے پاس پہنچ جانے کی تمنا کرتی ——— اسی طرح وہ اپنی تنہا زندگی اور اپنے رنج و غم کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر اب اُس کی زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا تھا۔

نہ کوئی منزل نہ کوئی مقصد
سفر برائے سفر ہے جاری

یکایک سجو خیالوں کی دُنیا سے نکل آئی۔ اُسے اپنے فرائض کا خیال آگیا۔ اور یہ بھی کہ وہ اس وقت جہاز میں ہے۔ اپنے کمرے کے بستر پر نہیں لیٹی ہوئی۔

شاید چائے کا وقت تھا۔ اُس کی ساتھی ائیر ہوسٹس ٹرالی میں کافی کا جگ رکھے۔ مسافروں کو کافی دے رہی تھی۔ دوسرے راؤنڈ میں سجو نے اُس کے ہاتھ سے کافی کا جگ لے لیا۔ اور مسافروں کی طرف بڑھی۔

پچھلی سیٹ پر جو عجیب و غریب مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے جونہی سجو کو کافی لاتے ہوئے دیکھا۔ تو اُسے بلایا ——— اور بولا۔

"پلیز ایک کپ کافی ———"

سجو جب اپنے اُداس گلابی چہرے کے ساتھ اُس کی پیالی میں کافی انڈیل رہی تھی۔ ...نی کے سراپے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"میں جب پاکستان سے گیا تھا تو یہاں کچھ اور فیشن تھے۔ اب آیا ہوں تو سب فیشن بدلے نظر آرہے ہیں۔ ماشاء اللہ ہماری لڑکیاں فیشن میں دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہیں۔"

سجو صرف مسکرانے لگی۔

"کیا یہاں بھی فیشن جلد جلد بدلنے لگے ہیں۔؟"

"جی ہاں ———" سجو ایک ہلکے سے طنز سے بولی۔ "فیشن اور مرد بدلتے رہتے ہیں۔"

"آپ نے درست فرمایا محترمہ" مسافر نے شرمندہ ہونے کے بجائے خندہ پیشانی سے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو تھوڑی سی تصحیح کروں گا، یعنی ——— فیشن کے بدلنے پر تو وقت لگتا ہے۔ مگر مرد بڑی جلدی بدل جاتا ہے۔"

دونوں ہنس دیئے۔

"آپ تو سچ بولتے ہیں۔" سجو متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نے آج تک کسی مرد کو اس انداز میں سچ بولتے نہیں سنا۔"

یہ کہہ کر سجو اگلے مسافر کی طرف لپکی۔

"آپ نے پھر مرد ہی نہ دیکھے ہوں گے۔" جاتے جاتے اُس نے مسافر کا فقرہ سُن لیا۔ اُس کا دل ایک دم ڈوب گیا۔ اور ذہن کمبخت سالوں پیچھے دوڑ گیا۔

نہ جانے کیوں آج اس اجنبی کو دیکھ کر اُس کے پرانے زخم دکھنے لگے تھے۔ ..... بابا بابا ..... میری مدد کرو ——— بابا مجھے سہارا دو ——— میں اور دُکھی نہیں ہونا چاہتی۔

وہ مختلف مسافروں کو کافی دیتی پھری ..... پھر آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی ..... اس کے

ساتھ ہی دُوسری ایئر ہوسٹس بھی آکر بیٹھ گئی۔

دونوں باتیں کرنے لگیں۔

سائرہ بولی۔"یہ جو سب سے آخر میں مسافر بیٹھا ہے نا! بڑی دلچسپ باتیں کرتا

"کون ——— ؟" سجّو چونکی۔

"وہ . . . سب سے آخر میں" ——— جب سائرہ نے اسی مُسافر کی طرف اشا

تو سجّو کو خواہ مخواہ غصّہ آگیا۔

بیوپاری ——— اُس نے دل میں کہا۔ یہ سب کمبخت ایک جیسے ہوتے ہیں۔

جانے کیسی لچھے دار باتیں اُس نے سائرہ کے ساتھ بھی کی ہوں گی . . . . . . مگر وہ

خاموش رہی۔

سائرہ نے خود ہی کہنا شروع کیا" کہہ رہا تھا ——— ایئرہوسٹس کا یہ یونیفارم مجھے

پسند نہیں آیا۔ جب میں پاکستان سے گیا تھا تو ایئر ہوسٹس بہت خوبصورت لباس پہنتی

اُن کے لباس میں مشرقیت بہت زیادہ تھی۔

"تو کیا یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔" سجّو نے جل کر کہا۔ جانے آج وہ جلنے کڑ

آمادہ کیوں بیٹھی تھی۔ ایسے ہی ان لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ فضول بک بک ک

سائرہ کو حیرت ہوئی کہ سجّو کبھی ایسی نہ ہوا کرتی تھی۔ ہر بات بڑی خوش خلقی سے

تھی اور خندہ پیشانی سے جواب دیتی تھی۔

مگر اس سفر کے دوران سجّو نے خود بھی محسُوس کیا تھا کہ وہ خود سے بھی اکھڑی ا

رہی تھی۔ جیسے اُس کا بہت بڑا زیاں ہوگیا ہو۔ یا وہ اس بوجھ سے تھک گئی ہو۔ جو ا

عرصے سے اُٹھا کر پھر رہی تھی اس تمام سفر میں اسے بابا بہت یاد آتے تھے۔ ا

دِل چاہتا بادلوں کا پردہ ہٹا کر اپنے بابا کا نورانی چہرہ دیکھ لے۔ ایک بار اور صرف ایک

——— اُس نے اکثر بابا کو اپنے قریب محسُوس کیا تھا۔ کئی بار انہیں خواب میں بھی

یں وہ بہت شفیق اور مہربان نظر آتے تھے۔ ذرا بھی شک نہ گزرتا کہ وہ اُس سے

ہیں۔ اس لئے سپنا ٹوٹ جانے کے بعد وہ بے چین ہو جاتی۔ اور چاہتی کہ اسی

یں رہے۔ کم از کم بابا کی شفقت سے تو قریب رہے گی ———

ب ——— یہ عجیب و غریب مُسافر اسے بابا کی یاد دلا رہا تھا۔ عرصہ دراز کے

ا کیلے پن کا خوف سوار ہو گیا تھا۔ اپنے انجانے مستقبل کا خوف ——— گوناگوں

. . . گھور اندھیرے!

راچی کا ایئرپورٹ آگیا ———

افروں نے سگریٹیں بجھا دیں اور پیٹیاں کس لیں۔ ایئر ہوسٹسیں اور سٹوارٹ مستعد

جہاز کے ساکت ہوتے ہی اُترنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب کون کہاں جائے

مُسافر بکھر جائیں گے ——— روز ہی تو مُسافر بچھڑنے کو یکجا ہوتے ہیں۔

رسٹم کا چکر شروع ہوا۔ ہر کوئی نفسا نفسی کے عالم میں گویا اپنا اپنا اعمالنامہ لئے

ریں جا کھڑا ہوا ———

دیر گذر چکی تھی۔ سجّو اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد۔ ہوسٹل جانے کے لئے لاؤنج

اُس کی ایک سہیلی نے اپنے گھر پیغام بھجوانا تھا۔ اس لئے اسے وہاں رُکنے

انتظار کے عالم میں کھڑی تھی۔ کہ وہی عجیب سا مُسافر اپنا سامان اُٹھائے جھومتا

ن کے پاس آکھڑا ہوا۔ اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور بولا۔

یں آپ کا نام پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہوں؟"

ریہ گستاخی آپ کس سلسلے میں کرنا چاہتے ہیں۔؟" سجّو اپنی روایتی خوش

بولی۔

لاجی! انسان خطا کا پُتلا ہے۔ اور بار بار خطا کرنی چاہتا ہے۔ اسی سلسلے

میں ———

سجّو کو پھر ہنسی آگئی۔

کچھ بھی ہو یہ آدمی بہت سچّا اور دیانتدار معلوم ہوتا تھا۔

"جی۔ میرا نام سجیلہ بانو ہاشمی ہے۔"

"بہت خوب صورت اور بہت لمبا نام ہے۔"

"ویسے سب لوگ سجّو کہتے ہیں۔"

"بہت خوبصورت اور نہایت موزوں نام ہے۔"

سجّو سنجیدہ ہوگئی۔ اور کچھ ——— ؟

"اور یہ کہ ——— کیا آج شام آپ ——— تھوڑا وقت ——— میرا مطلب اس عاجز کے ساتھ گزار سکتی ہیں؟"

"دیکھئے مسٹر ———" سجّو کے اوپر وہی اپنا فطری دبدبہ طاری ہوگیا۔ بڑی سنجیدگی اور بردباری سے بولی۔

"آپ کافی عرصے بعد پاکستان آتے ہیں۔ اس لئے مجھے غالباً کوئی غلط لڑکی سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"جی نہیں... جی نہیں ——— میں تو ——— ؟"

مگر سجّو اُس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔

"فلرٹ کرنے کے لئے آپ کو اس شہر میں بھی کافی لڑکیاں مل جائیں گی۔ مگر اپنے اندر انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیّت بھی پیدا کیجئے۔" سجّو کو دُکھ سا ہونے لگا۔ کہ اس نے اس اجنبی کے متعلق جو خوش آگیں اندازہ لگایا تھا۔ وہ غلط ثابت ہوا۔

وہ بڑے سکون کے ساتھ کھڑا سجّو کی ڈانٹ سُنتا رہا۔ اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دس سال میں میں جن مُلکوں کی خاک چھان کر آیا ہوں۔ وہاں بھی ان لڑکیوں کی کمی نہ تھی جن کے ساتھ آدمی جب چاہے لمحات کا سودا کرلے اور جس طرح چاہے انہیں استعمال کرلے۔

لعنت ہے میری ہستی پر اگر میں ناشناس جوہری ہوں۔ خدا کی قسم میں نے آپ کو ایسی نہیں جانا۔ شاید میں آپ کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ کہ ہمارے ہاں بھی ایسی ذہین اور حاضر جواب لڑکیاں ہیں۔

پھر ——— اُس کی آواز گہری اور اُداس ہوگئی۔

آپ کی آنکھوں میں اِتنا تقدّس ہے ———

آپ کی پیشانی پر آپ کے اعلیٰ کردار کا نُور ہے ———

اور آپ کے چہرے پر ایک انجانا سا حزن ہے ——— سوز ہے ———

جیسے زندگی کی کسی بڑی ٹھوکر نے آپ کو جلا بخشی ہو ———

خدا کی قسم اتنی عظیم اور مقدّس لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرنے کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے؟

سجّو جیسے سکتہ سا ہوگیا.... پھر ایک دم اُس نے اپنا بیگ کھولا ——— پن نکالا ——— اور ایک کاغذ پر اپنے ہوسٹل کا فون نمبر لکھا۔ اور بولی "آپ کل صبح نو بجے مجھے اس نمبر پر فون کرلیں۔"

یہ پرچہ مسافر کے ہاتھ میں تھما کر وہ ایسے بھاگی جیسے جہاز کے نکل جانے کا خطرہ ہو مُسافر اُسے دیکھتا رہ گیا۔ مگر وہ مختلف راہداریوں سے گزر کر سیدھی ایک غسلخانے میں گھس گئی۔

اندر سے اچھی طرح کنڈی لگالی۔ غسل خانے کے شیشے میں اپنی شکل کو بہت غور سے دیکھا۔ اپنی آنکھوں کو ——— اپنی پیشانی کو ——— اپنے چہرے کے ایک ایک

نقش کو —— اپنی پیشانی کو بار بار ہاتھ سے رگڑ کر دیکھا . . . . اور پھر پھوٹ پھوٹ
رونے لگی۔

بار بار پیشانی کو دیوار سے ٹکراتی اور روتی —— روتی جاتی ——

بابا . . . . بابا . . . . سُنا تم نے یہ اجنبی کیا کہہ رہا تھا۔ کیا واقعی میری پیشا
نورانی ہے۔

کیا واقعی میری پیشانی نورانی ہے۔

کیا واقعی میری آنکھوں میں تقدیس ہے۔

بابا۔ بابا —— سُنا تم نے لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ میرا کردار
چہرے پر لکھا ہے کیا؟

شاید اللہ نے مجھے مُعاف کر دیا ہے بابا۔

پھر تم کیوں مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے —— او بابا بولو۔ جواب دو۔ تمہ
اپنی لاڈلی کا یقین آیا ہے کہ نہیں۔ بابا۔ تم نے اپنی بجّو کو معاف کیا ہے یا نہیں۔

بابا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ اور غمگین بھی۔

بابا۔ آج اس انوکھے مُسافر نے یہ کیا کہہ دیا۔ وہ تو میرا ماضی نہیں جانتا تھا۔ وہ تو
میرے ساتھ فلرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کو بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی
یہ کتنی بڑی خوشی ہے بابا —— یہ جو میں نے اپنے کانوں سے سُن لیا۔ اور یہ
آج میں تمہیں سُنانا چاہتی ہوں۔

بابا تم نے سُنا کہ نہیں ——

بابا تم نے جانا کہ نہیں ——

بولو جواب دو نا ——

کتنی دیر تک وہ غسل خانے کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتی رہی۔ اُس کا دل چاہ

پڑا ابھی اور روئے۔ اتنے سالوں کی تھکن اور افسردگی کو ان آنسوؤں میں بہادے
ر زندگی بھر رونے کی حاجت نہ رہے۔

غسل خانے میں کوئی اور ضرورت مند آ سکتا تھا۔ زیادہ دیر دروازہ بند رکھنے
باہر کھلبلی مچ سکتی تھی۔ اُس نے نل کھول دیا اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنی آنکھوں
نے لگی۔

اپنی آنکھوں پر بار بار پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد اُس نے منہ کو اچھی طرح دھو لیا
رح اس کی طبیعت کو قدرے سکون ملا۔

اُس نے تولیے سے منہ صاف کیا۔ اپنا بیگ کھول کر میک اپ کا سامان نکالا
روتے ہوئے سُرخ چہرے پر بڑے قرینے سے میک اپ کی تہہ چڑھانے لگی۔
ب وہ باہر نکلے تو کسی کو شک نہ ہو کہ وہ اتنا رو کر آئی ہے۔

رات بھر وہ بڑی بیکل رہی۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ اُس نے اس اجنبی کو اپنا نام اور وا
نمبر بتا کر اچھا نہیں کیا۔ اور کبھی سوچتی کوئی حرج نہیں۔ وہ کوئی غیر معمولی شخصیت کا آدمی لگ
تھا اور ایسے آدمی اذیت کا باعث نہیں بنتے۔ غرض ایک عرصہ بعد وہ بڑی بے چین نظ
آرہی تھی۔ جیسے اب صحیح فیصلہ کرنے کی بھی قوّت نہ رہی ہو۔ اچھی خاصی بسر ہو رہی تھی
خواہ مخواہ اُس نے خود کو مضطرب کرنے کا سامان کر لیا تھا۔

آج اسے چھٹی تھی۔ اور اگلا سارا ہفتہ بھی چھٹیاں تھیں۔ اُس نے آج کے لئے کوئ
پروگرام نہیں بنایا تھا۔ جیسے اُن کا ہر پروگرام اس اجنبی مسافر کے فون پر منحصر تھا۔

نو بجے تک وہ فون کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ عام مردوں کی طرح وہ
وقت سے ذرا پہلے فون کر دے گا۔ مگر سوا نو بج چکے تھے اور اُس کا فون نہیں آیا تھا
تب اُسے جی ہی جی میں بڑی خفت محسوس ہونے لگی۔ اگر واقعی اُس نے فون نہ کیا تو اُ
کتنی ذلت محسوس ہو گی؟ اور پھر سارے دن کا کیا پروگرام ہو گا۔ اور اس قنوطیت کے عالم
میں وقت کیسے گذرے گا۔؟

آج پھر عرصۂ دراز کے بعد اس پر یاسیت کا غلبہ تھا۔ اور وہ اس صورتِ حال سے

...ہی تھی۔ کیونکہ اگلے ہفتے وہ ایک نہایت اہم پروانہ پر بیرونِ ملک جا رہی تھی۔ اور
...نی کی خاطر اُس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ اور اب اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی
...یک ہفتہ کیونکر گزارے گی۔

...جب ساڑھے نو بجے تو میٹرن کی طرف سے اُسے پیغام ملا کہ اُس کا فون آیا ہے۔
...لے۔ پہلے اُس کا دِل چاہا سننے سے انکار کر دے۔ پھر کسی زبردست قوّت نے اُسے
...مجبور کر دیا۔

جب اُس نے ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا تو ———
...مس سجیلہ بانو ہاشمی عرف سجّو بول رہی ہیں؟" وہ اپنی دلکش آواز میں پوچھ رہا تھا۔
"جی...." اُس نے آہستگی سے کہا۔
"جی ہیں.... مگر آپ نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں؟"
"نام کے بغیر ہی میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ ویسے آپ اب بتا دیں۔"
"دیکھیئے نا؟ نام تو پہچان کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے مجھے بغیر نام کے
پہچان لیا ہے تو پھر نام بتانے کا مقصد ———؟"
"جی۔ انسان اپنی پہچان خود ہوتا ہے۔ لیکن پہچان کے علاوہ ناموں کا ایک اور
...مقصد بھی تو ہوتا ہے۔"
"وہ کیا ———؟"
"بُلانے کے لئے ——— آخر کسی کو کیا کہہ کر بُلایا جائے؟"
"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ آخر ہر آدمی کو چچا، ماموں، بھائی جان یا ابا جان کہہ کر تو نہیں
بلا سکتا۔ اور ہر عورت کو آپا جان، باجی جان، چچی جان، پھوپھی، ممانی وغیرہ کہنا بھی
...مناسب نہیں۔"
"اب ———" سجّو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ تو نام بتاتے ہوئے عورتوں کی

طرح شرما رہے ہیں۔"

"شاید میرا نام بھی عورتوں والا ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی ذات میں اچھے خاصے مرد ہیں۔ نام سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"آپ بہت ذہین خاتون ہیں۔"

"پلیز چاپلوسی نہیں۔" سجو نے جلدی سے کہا۔

"آپ واقعی بہت تیز ہیں ——— میرا نام حماد احمد ہے۔ یعنی منشی حماد احمد!"

"حماد احمد ———؟" سجو نے دہرایا۔ اس نام میں اُسے بڑا رس اور بڑی موسیقیت محسوس ہوئی۔ "یہ تو کوئی زنانہ نام نہیں ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"بھئی وہ ساتھ منشی بھی تو ہے۔"

"یہ منشی کیا ہوتا ہے؟"

"یہ میرا خاندانی نام ہے اور اسی کی مناسبت سے میں سمجھ رہا تھا کہیں آپ مجھے بھی نشی، نوشی یا گوشی کی قبیل کی کوئی شے نہ سمجھ لیں۔"

سجو کو یہ بات سُن کر اتنا مزہ آیا کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ اُس کی کھنکتی ہوئی ہنسی حماد بھی فون پر سُن رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔

"آپ واقعی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" سجو نے ہنسی روک کر کہا۔

"چاپلوسی نہیں پلیز۔"

دوبارہ سجو کو ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔

واقعی آج اُس کے لئے ایسے آدمی کی صحبت بہت ضروری تھی۔ ورنہ وہ یاس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی چلی جا رہی تھی۔

"آج کی دوپہر آپ فارغ ہیں ———؟" حماد نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا ———؟"

"خاص تو نہیں۔ لیکن اگر "نازک مزاج شاہان" گوارا کریں تو دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔"

سجو خاموش ہو گئی۔ شاید کچھ سوچنے لگی تھی۔ اُس نے آج تک کوئی ایسی پیشکش قبول نہ کی تھی۔ سب لوگ اُس کی اِس عادت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ اس بے اصُولی کا ارتکاب کرے یا نہیں ———

"آپ کیا سوچنے لگیں ———؟ خفا ہو گئیں ———؟" حماد نے پھر پوچھا۔

"آپ کہاں ٹھہرے ہوتے ہیں؟"

"انٹرکانٹی نینٹل میں۔"

"کہاں کھانا کھانے کا ارادہ ہے ———؟"

"جہاں آپ کہیں ———"

"اچھا ———" سجو نے فیصلہ کر لیا۔ "آپ میرا انتظار کریں۔"

"شکریہ بہت بہت ———" حماد نے انکساری سے کہا

"خدا حافظ ———"

"خدا حافظ ———"

ٹھیک گیارہ بجے حماد تیار ہو کر ہوٹل کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں تھا آئے گی اس لئے وہ بے یقینی کے عالم میں سڑک پر نکل آیا تھا۔ ایک طویل مدت بعد اپنے وطن میں واپس آیا تھا۔ سڑک پر ہر راہ گیر کو غور سے دیکھتا۔ اس کا جائزہ عمارتوں اور دکانوں کو دُور دُور تک دیکھتا۔ واقعی اُس کے جانے کے بعد اس شہر میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ لوگ بھی کچھ تیز اور مصروف تر لگ رہے تھے۔ اور وہ

اس اتنے بڑے شہر میں تنہا سڑک پہ کھڑا ایک اجنبی سی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔ بے مقصد بے سُود ———

اتنے میں ایک ٹیکسی ہوٹل کے مین گیٹ پہ آکر رکی۔ حماد ذرا فاصلے پر کھڑا ہو کر اس ٹیکسی کو دیکھنے لگا۔ واقعی اس میں سے سجّو اُتر رہی تھی۔ اُس نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے اور اپنا سفید پرس جھلاتی آگے کو بڑھی۔

اِدھر سے حماد چند قدم آگے بڑھا تاکہ اس کو بتا سکے کہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔

سجّو نے تیز گلابی رنگ کی باریک ساڑھی اور اس کا ہم رنگ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ساڑھی کے کناروں پر سفید لیس ٹکی تھی۔ ساتھ میں سفید پرس اور سفید جُوتے پہنے ہوئے تھے۔ سارا چہرہ گلابی لگ رہا تھا۔ پیچھے چھوٹا سا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ جس پر موتیا کی چند تازہ کلیاں مہک رہی تھیں۔ حماد اُسے اس رُوپ میں دیکھ کر کافی مرعوب ہوا۔ آگے بڑھ کر سلام کیا اور بولا:

"معلوم ہوا یہاں بھی ابھی وقت کے پابند لوگ ہیں۔"

سجّو مسکرانے لگی۔

"اس ہوٹل میں کھانا کھائیں گی یا کہیں اور ———"

"کہیں اور ———" سجّو نے جواب دیا۔

"تو پھر اسی ٹیکسی کو روک لیتے ہیں۔" ٹیکسی والا ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ابھی مڑنے ہی والا تھا کہ حماد نے اُسے ہاتھ کا اشارہ کر کے روکا اور پھر دونوں چلتے ہوئے اس کے قریب گئے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"کہاں چلوں ———؟" ٹیکسی ڈرائیور نے آگے بیٹھتے ہوئے حماد کی طرف دیکھ کر پُوچھا۔

حماد نے مڑ کر استفہامیہ نظروں سے سجّو کو دیکھا۔

بولی: ہاکس بے چلو ڈرائیور ———؟

اکس بے کے ایک ریسٹوران میں انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران وں اتنی دلچسپ باتیں کرتے رہے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ تا تھا جیسے دونوں ایک عرصے کے بعد ملے ہوں۔ اور اب ایک دوسرے کی ہو ایک دوسرے کے وجُود سے زندگی حاصل کر رہے ہوں۔

ہو کے جی میں کئی بار آئی کہ اب وہ اجازت چاہے۔ بھلا یہ اجنبی کیا کہے گا؟ مگر جانے اس کے دل کو کیا ہو گیا تھا۔ اپنے سب فولادی اصولوں کو اُس نے پسِ پُشت یا تھا۔

زندگی پر اس قدر جمُود طاری ہے ———

زندہ دلی ختم ہو چکی ہے ——— اس بھرے پُرے شہر میں چند لمحے مانگنے وہ کس جائے۔ سب سوداگر ہیں۔ لمحے لمحے کی قیمت مانگتے ہیں۔ یہ اجنبی ———

اس کی نگاہوں میں ہوس نہیں ——— مانگ نہیں ———

شاید یہ بھی میری طرح تنہا ہے۔ حالات کا ستایا ہوا ہے۔ دو گھڑی میں اس کا کیوں نہ مانگ لوں۔

ل سے تنہائی کا احساس شدید ہو گیا ہے۔

ادھر حماد بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس مُلک میں، اس شہر میں وہ کس قدر تنہا ہے۔ یار دوست نہ جانے کہاں ہوں گے۔ کس عالم میں ہوں گے ——— اور کن ماہ نکل گئے ہوں گے۔

عزیز و اقارب ——— تھے ہی کب ———؟

ایک جذبے کے تحت وہ اپنے ملک میں واپس تو آ گیا ہے۔ مگر یہاں کی زندگی نئے سرے سے کرنی ہو گی۔ اور جانے اس میں کتنا عرصہ لگے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اچھی ہے یہ لڑکی —— اور کتنی پیاری ہے ——

کوئی غم زدہ معلوم ہوتی ہے۔ غنیمت ہے اس کی صُحبت بھی۔ یہ نہ ہوتی تو آج کا پہلا دن، کتنا بور اور کٹھن لگتا۔ اچھا ہے۔ اگر یہ کچھ دیر اور بیٹھی رہے۔ یا جب تک وہ نہیں چلا جاتا اگر اس کی محبت میسّر رہے۔

تھوڑی دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔ شاید اپنی اپنی جگہ پر ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

پھر حماد نے بیرے کو قہوہ لانے کے لئے کہہ دیا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے، ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے۔" سجو نے کہا۔ حماد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی ساری زندگی کے اصولوں کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔" سجو نے تھوڑی دیر ٹھہر کر فلسفیانہ انداز میں پوچھا۔

"گھٹن ——" حماد نے مختصر سا جواب دیا۔

"یا پھر ہم اپنے آپ کو اپنی ذات پر اس حد تک حاوی کر لیتے ہیں کہ ہمارا اپنا آپ ہم سے بغاوت کر دیتا ہے۔"

"فلسفہ ——!" حماد پھر مُسکرایا۔

"آپ اختصار سے کیوں کام لے رہے ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کچھ نہیں —— شاید ان دِنوں مجھے اپنی زندگی کے منجمد ہو جانے کا بہت زیادہ احساس ہو رہا ہے۔"

قہوہ آگیا۔ دونوں پینے لگے۔ حماد چُپ ہی رہا۔

جب قہوہ ختم ہو گیا۔ تو سجو بولی۔ "چلئے ساحلِ سمندر کی طرف چلتے ہیں۔"

چلو ——"

دونوں کافی دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے۔ لہروں کا کھیل دیکھتے رہے۔ ...ی خوش فعلیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ . . . اور پھر سارا آسمان سُرخ ہو گیا۔ شاید ...ج اپنا رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ سمندر کا نظارہ بھی بدل گیا۔ پانی کی لہریں سُرخ اور نارنجی ...یں نہانے لگیں۔

سجو جھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور جُوتے اتار کر اپنے پاؤں ٹھنڈے پانی کے ...ے کر دیئے۔

حماد اس کے سامنے ہی خشک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے جُوتے نہیں اتارے ...پنے پاؤں ایک اور چھوٹے پتھر پر رکھ لئے۔

سجو کے گورے گلابی پاؤں پانی میں بہت بھلے لگ رہے تھے اور سُورج کی بنفشی ...اعوں کا رنگ اُس کے اُداس پیکر کو شعلہ سا بنا رہا تھا۔

اُسے اپنی اس بے تکلفی پر خود بھی حیرت ہوئی۔ جب سے وہ ملازم ہوئی تھی کسی سے ...ے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ کسی کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا۔ کسی کے ساتھ اتنی دیر تک ...پ بازی نہیں کی تھی۔

...ہ جانے اس اجنبی میں کیا بات تھی ——؟

...ی چاہ رہا تھا زندگی کی ساری تھکن اور اعصابی تناؤ اس کو سونپ دیا جائے۔ شاید ...ہ صُورت سے بہت زیادہ تازہ دم۔ سچا۔ اور کھرا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے کبھی کسی ...کے پاس بیٹھ کر اس طرح طمانیت نہیں محسوس ہوتی تھی۔

...اپنا چہرہ ہتھیلیوں پر رکھے۔ وہ سوچ رہی تھی یہ لمحے کدھر کو کھسک رہے ہیں۔ ...ہ کون ہے جس کو لمحے کھینچ کر میرے پاس لے آئے ہیں۔ اور آنے والے لمحے ...مجھے کیا عطا کریں گے؟

"کیا سوچ رہی ہو ——؟ شاید تم تھک گئی ہو ——؟" حماد نے بالآخر سکوت بے معنی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تھک گئی ہوں حماد صاحب۔" سجو نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تو چلو واپس چلتے ہیں۔"

"واپس چلے گئے تو شام پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیا مطلب ——؟" حماد معنی خیز انداز میں ہنسا۔

"مطلب یہ ہے حماد صاحب۔ کہ میرا جی چاہ رہا ہے کہ اپنی تھکن اتار دوں اپنا بوجھ ہلکا کر دوں۔ آج سارا دن آپ کے ساتھ گذارنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ آپ سے مدد لوں۔ پھر شاید مقدر سے ایسا کوئی دوست نہ ملے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"جناب! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ مدت سے میں ایک بوجھ اٹھائے پھرتی ہوں۔ اب تھک گئی ہوں۔ اس کو ہلکا کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو سیدھا سادا ہے۔ کہ کسی دن بن ٹھن کے آؤں اور اپنے خوبصورت وجود کو حسرتوں کے کفن میں لپیٹ کر اِن لہروں کے سپرد کر دوں۔ یا پھر —— آج شام کو ہاتھ سے نہ جانے دوں اور آپ جیسے سچے اور مخلص آدمی کے رُوبرُو اپنا سارا ماضی اُگل دوں۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی صُورت نہیں ہے؟" حماد نے پوچھا۔

"نہیں —— تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ میں تنہائی اور خود شکستگی سے تھک چکی ہوں اور کسی شخص کو اپنا راز داں بنانا چاہتی ہوں۔ شاید اس طرح مجھے کوئی سکون ملے۔"

"تو بندہ حاضر ہے۔" حماد نے پہلو بدلا۔ اور پائپ میں نئے سرے سے تمباکو

رنے لگا۔

"بڑے تحمل کی ضرورت ہے۔"

"ضرورت سے زیادہ پاؤ گی۔"

اور سجو بہتی ندی کی مانند رواں ہو گئی۔ جانے یہ سب کچھ اُس نے سوچ رکھا تھا۔ یا اُسے پاتے چھپاتے واقعی تھک گئی تھی۔

بڑے تسلسل اور ربط کے ساتھ اُس نے اپنی کہانی شروع کی۔ وہاں سے جب وہ اپنے بھائیوں کی پیدائش کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی تو بابا نے مسجد میں گھی کے چراغ ائے تھے۔ کئی لوگوں سے فالیں نکلوا نکلوا کر اُس کا نام سجیلہ بانو رکھا تھا اور پیار سے اُسے جی پکارا کرتے تھے۔

سجی سے سجو بننے تک —— راہ میں جو نشیب و فراز آئے۔ جن جن راہوں سے زری —— اور واقعات نے جس طرح اسے توڑا پھوڑا —— اُس نے من و عن بتا دیا۔

شیخ عابد حسین کی جلوتوں سے لے کر خلوتوں تک کی کہانیاں سُنائیں۔

شیرے اور بلی کی شادی کے حالات بتاتے —— بابا کی موت پر روشنی ڈالی بڑی سُبک رفتار میں —— بڑے دھیمے لہجے میں —— کبھی آواز کو ڈوبنے ے بچا کر —— کبھی گلوگیر آواز کو پُرسکون بنا کر —— کبھی ہونٹوں پہ دم توڑتی سسکیوں دبا کر ——

بڑی مہارت سے ——

بڑی چابکدستی سے —— اُس نے اپنی درد بھری کتھا سُنا ڈالی۔

کئی بار تو حماد کو اس پر شک گذرا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اتنا کڑوا سچ بھلا کوئی وئی بول سکتی ہے۔

اور پھر یہ لڑکی ———

سرمئی پتھر پر بیٹھی ہوئی۔ گلابی گلابی لڑکی۔ جس پر ڈوبتی شام کی آخری نارنجی کرنیں نثار ہو رہی تھیں وہ کسی مقدس اور معزز دیوی کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ غم کا سایہ تک اُس کے پاس سے نہیں گذرا۔

قدرت نے اُسے سیپ میں بند کر رکھا ہے۔

جس کی موجودگی ایک مجسّم زندگی ہے۔

اور جس کا چہرہ سچائی اور پاکیزگی کی تصویر ہے۔

اور جو خار زارِ حیات میں تھک چکی ہے۔

فریب خوردہ ہے ———

چور چور ہے ———

مگر پھر بھی کتنی مسحور کُن ہے ——— کتنی دل میں اتر جانے والی ہے ——

کیسی پیاری شے ہے۔

اُس کا دل چاہنے لگا کہ اس اندھیرے اُجالے کے سماں میں وہ اِس دُکھیا لڑکی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے اور ذرا سا ہاتھ اونچا کر کے اللہ میاں کو پکڑا دے! ورکہے اگر تو اُس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا تو اسے دُنیا میں کیوں بھیجا۔ لے اب اسے فرشتوں کی دُنیا میں پھولوں کی طرح رکھ۔!

داستان ختم ہو چکی تھی۔

اور سجو بھی چُپ ہو گئی تھی۔

حماد سے کچھ نہ کہا جا سکا۔ وہ جو نگر نگر اور دیس دیس پھرا تھا۔ جس کی آنکھیں مشاہدے کے دو آئینے تھے۔ اور زبان ایک مؤثر ہتھیار۔ وہی اس وقت گنگ ہوا بیٹھا تھا۔

ہمدردی کے بول ——— فضول ———

اظہارِ محبت ——— بے ہودہ ———

اُس کی عظمت کے گُن ——— چاپلوسی ———

خاموشی ......

سکوت کامل ———

اُلجھے لمحات ......

بہت سی باتیں خاموشی بھی تو سمجھا دیتی ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہو کر خود کو بے بس پا رہا تھا۔

اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس نڈر اور بے باک لڑکی کو تشفّی دینے کے لئے الفاظ۔

کچھ کہنے کو الفاظ ——— صحیح اور موزوں ———

وہ خود اس وقت بہت عظیم اور مضبوط لگ رہی تھی۔

حماد کو اپنا آپ کچھ کمزور لگ رہا تھا۔

بھلا ایسے میں کیا کہتے ہیں ———؟

اور پھر اُس کے پاس اسے دینے کو ہی کیا ہے ——؟

یکایک سجو نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ حماد نہ دیکھ سکا کہ وہ رو رہی تھی یا نہیں۔

وہ اداس آواز میں خود ہی بولی۔

"حماد میرا جی چاہتا ہے اب میں شادی کر لوں"

"ضرور کر لو" بڑی مشکل سے حماد صرف اتنا کہہ سکا۔ "مگر کس سے کر لوں۔ مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ایک مکمل عورت ہوں حماد ——— میرا ہدف گھر اور بچے ہیں۔ میرے اندر جو عورت ہے وہ آجکل بہت مچل رہی ہے۔ اب میں اس عورت کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ خدا کی قسم شادی کے بعد میں ایک گھریلو عورت

بن کر چار دیواری کے اندر رہوں گی۔ وہیں میرا جنم ہوگا۔ وہیں میرا مرن ہوگا۔ مجھے صرف چار دیواری
سے نسبت ہے۔ میں صرف ایک عورت ہوں اور کچھ نہیں ہوں۔ باہر کی فضا مجھے راس
نہیں ہے۔ پسند نہیں ہے۔ دیکھو قدرت کی کتنی ستم ظریفی ہے۔ کہ میں راندۂ درگاہ ہوا
باہر کی فضاؤں کے لئے مخصوص ہو گئی ہوں تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں حماد —— ؟

"ہمدردی —— ؟ ہمدردی سے کچھ زیادہ ہی ——"

"تو پھر تم خود مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"شادی —— ؟" حماد چونک گیا۔

"کہہ دو کہ ایسی لڑکی سے ——"

"نہیں نہیں سجو ——" حماد نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آگے کچھ مت
میں تو تمہاری ہمت اور تحمل و بردباری سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ اس وقت سے بہوں
بیٹھا ہوں۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ میرے خیال میں اب تم دنیا کی سب عورتوں سے زیادہ
قابلِ احترام بن چکی ہو ——

تم نے جس طرح حالات کا مقابلہ کیا۔ اور اپنے وجود کو جلا بخشی کم دیکھنے میں آیا
میں تو تمہارے آگے گنگ ہوا بیٹھا ہوں۔

اور شادی —— شادی کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے ؟

اب تمہیں کیا بتاؤں —— میں بھی ایک بنجارہ ہوں —— گلی گلی کوچہ کوچہ
کھوئی ہوئی منزل تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ میں یہاں ایک مشن کے تحت آیا تھا۔ مگر اپنے
ملک میں قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے پہلو میں ابھی تک وہ آگ جل رہی ہے
جس پر میں نے نو سالوں کے ٹھنڈے پھاہے رکھ چھوڑے تھے۔"

"تم نے میری کہانی تو ابھی سنی نہیں۔"

"دنیا میں کوئی کہانی میری کہانی سے اثر انگیز نہیں حماد۔ اب تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت

ہے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے تم سے بھیک مانگ لی۔ تمہارے ظرف کے خزانے
خالی کشکول کے لئے کوئی سکہ نہیں تھا۔ یہ میری قسمت —— !" سجو نے
گھٹنوں پر رکھ لیا اور رونے لگی۔

حماد کو جانے کیا ہونے لگا۔

تم مرد ہو کر وہ شان نہ دکھلا سکے جو ایک عورت نے آنچل پھیلا کر دکھلا دی ہے۔

اور خود غرض !

کسی کا تار تار دامن پکڑ لینا اور ڈوبتے کو بچانا خدا کے پسندیدہ فعل ہیں۔

اب تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟

یہ دکھی، پھیکی، آوارہ اور بے خانماں زندگی کسی کو دے دو۔ کسی کا آنگن اس ابھرتے
ہے سورج سے سجا دو۔

کل کا کیا بھروسہ ؟ ——

اور وہ —— وہ ——

حماد کا دل ڈوبنے لگا —— وہ جو نو سال سے میرا پیچھا کر رہی ہے ——

....

وہ کہاں ہوگی اب۔ اور کہاں ملے گی تمہیں —— تم تو بالکل افسانوں اور فلموں
کی باتیں کرنے لگے ہو ——

اس بحر بیکراں میں جو کھو گیا سو کھو گیا۔

سمندر کے کنارے بیٹھے ہو۔ اب جو گھونگا موتی ہاتھ آتا ہے اپنا مقدر سمجھ کے اٹھا لو۔"

بھیک مانگنے والے نے تمہارے ظرف کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے دل کا نہیں۔

اور مرد بڑی عظیم اور بلند شے ہے۔

اس کے مضبوط ارادے جذبات کی کمزور دیواروں کو ڈھا دیتے ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تمہاری مردانہ آن بان کا سوال ہے ——

اور تم ——

اور حماد نے جیسے یک بیک ایک فیصلہ کر لیا۔
آنکھیں بند کر کے اور جذبات کے منہ پر ہاتھ رکھ کے۔

"سجو! میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔"

سجو نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اور پھر —— اپنے ٹھنڈے اور بھیگے ہاتھوں سے اُس کے دونوں قدم پکڑ لئے۔

"تم بہت عظیم ہو حماد! —— میں تمہارے قدموں کی خاک بن کر رہوں گی۔ میرے داغدار ماضی کو تم نے اپنے شاندار مستقبل میں پناہ دی ہے۔ میں اپنی جان تم پر نچھاور کر دوں گی۔ حماد میں جانتی ہوں میں تمہارے قابل ہرگز نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

"ایسا نہ کہو سجو!" حماد نے اُس کے دونوں ٹھنڈے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لئے ——

دونوں کھڑے ہو گئے۔

اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹہلنے لگے۔

دونوں پر ہیجان طاری تھا۔ سجو تو باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ اور حماد —— حماد ایسے اچانک طوفانوں کا عادی تھا۔ زندگی نے اُسے ہر قدم پر نئے حادثے اور اچنبھے عطا کئے تھے۔ وہ ان سے بچ کر کہاں جاتا؟ ہمیشہ کی طرح اُس نے خود کو اس نئے حادثے کے سپرد کر دیا —— جو موت کی طرح بالکل غیر متوقع تھا۔

اور سجو رو رہی تھی۔

کانپ رہی تھی ——

تھر تھر کانپ رہی تھی ——
یا اتنی بڑی خوشی، جس کا اُس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا، اُس کا مقدر بن رہی تھی۔
اور حماد اُس کا تھر تھراتا ہوا خوبصورت ہاتھ تھامے چُپ چاپ اُس کے ساتھ ٹہل

اسے چُپ بھی نہیں کرا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آج اس لڑکی کو جی بھر کر رو لینے
دے ورنہ وہ نارمل اور پُرسکون نہ ہو سکے گی۔

اچھا خاصا رو لینے کے بعد سجو واقعی پُرسکون ہو گئی۔ اُس نے اپنے رومال سے اپنا
دامن کر لیا۔ مگر حماد کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اُس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا
کہیں یہ آخری آسرا بھی نہ چھن جائے۔

ان سب مایوس کن حالات کے باوجود۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک دن بابا
کی خواہش پوری کر دوں گی۔ انہیں دُلہن بن کر دکھا دوں گی۔ اور یہ میری کتنی بڑی خوش نصیبی
کہ مجھے تم جیسا آدمی مل گیا ہے۔ تم اسے چاپلوسی نہ سمجھنا حماد! تم میرے ہر تصوّر سے
عظیم اور خوبصورت ہو تمہیں پتہ ہے۔ تم ان مردوں میں سے ہو جنہیں دیکھ کر جن
کو یک دم خدا کی عظمت اور بزرگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے
کہ باری تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی۔ مجھے عام مردوں سے مل کر ہمیشہ غصّہ
آیا۔ وہ اپنے قول و فعل میں اتنے گھٹیا ثابت ہوتے ہیں کہ عورتیں ان کے سامنے
عظیم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سب تمہارے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہے۔ مگر میں تم سے
نہیں پوچھوں گی کہ یہ سب تم نے کیسے اور کیونکر حاصل کیا —— ؟ مجھے ڈر ہے
وہ کہانی مجھ سے بھی زیادہ اثر انگیز ہو گی۔ اور پھر میرے امتحان کا وقت آ جائے گا۔
بس اب یہ باب نہ کھولو۔" حماد اداسی سے بولا۔ "ہم نے جس کہانی کا آغاز کیا ہے —
ہم اسی کی بات کریں گے۔"

"میں نے سُن رکھا تھا کہ عظیم اور وسیع ظرف مرد جب دینے پہ آتا ہے تو خدا کی طرح سخی بن جاتا ہے۔ آج تمہیں دیکھ کر اعتبار آ ہی گیا —— مجھے معاف کر دینا حماد اگر میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔ مگر حالات نے مجھے خود غرض بنا دیا ہے۔ میں تمہارے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی۔ اِس وقت صرف اپنی ذات پیشِ نظر ہے۔ میری بات پہ یقین کرنا حماد! میں تمہاری بہت اچھی بیوی ثابت ہوں گی۔ میں تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہاری خوبصورتیوں اور خوب سیرتیوں کو کلیجے میں چھپا کر رکھوں گی۔ سارا سکھ تمہیں دوں گی۔ اور تمہارے بچوں کو خادمہ بن کر پالوں گی تم دیکھ لینا ——"

اندھیرے میں حماد ہنس پڑا۔ اُس کی معصومیت پہ۔ مگر اُس نے محسوس نہ ہونے دیا۔

"حماد تم چُپ کیوں ہو۔ ! مگر میں تمہیں بات کرنے کا موقع ہی کب دے رہی۔ میری اس خطا کو بھی معاف کر دینا۔ . . . کچھ دن مجھے دے دو —— میں باتوں بوجھ سے مری جاتی ہوں۔ یہ تمام باتیں مجھے کہہ لینے دو —— اپنا بوجھ ہلکا کر لینے دو اس کے بعد میں ہمیشہ چپ رہا کروں گی —— تم پسند کرو گے تو میں گھر میں بولا کروں ورنہ چُپ چاپ تمہارے اشاروں پر ناچتی رہوں گی —— ساری عمر ——"

سجّو! تم ساری عمر جی بھر کے باتیں کرتی رہنا۔ مجھے عورتوں کی باتیں کرنے والی عادت سے چِڑ نہیں ہے۔ اس سے گھر میں خوب رونق رہتی ہے —— میں تو ویسے کم گو آدمی ہوں۔"

"شکریہ حماد!" سجّو خوش ہو کر بولی۔" اچھا تو کب کر رہے ہو شادی ——" وہ کچھ شرما بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔

"طے کر لیں گے۔"

"کر لیں گے۔ کیا مطلب —— ؟ کل ہی کیوں نہیں۔ ؟"

"کل —— ؟ اتنی جلدی ؟ بھلا سب انتظام کیسے ہو گا ؟"

بھلا انتظام —— ؟ ہماری کون سی بڑی برادری ہے۔ اور پھر میں تو چپ چاپ جانا چاہتی ہوں کل شادی کرنا چاہتی ہوں اگر تم شادی محض میری خوشنودی کی وجہ سے کر رہے ہو تو پلیز کل ... کل جمعہ بھی ہے۔ اور ہمارے ہاں شادی کے لئے جمعہ کا دن مبارک سمجھا جاتا ہے مجھے ایک ہفتے کی چھٹیاں بھی ہیں۔ میں یہ سب چھٹیاں تمہارے ساتھ گذارنا ... اس کے بعد مجھے ایک اہم فلائٹ پر جانا ہے۔ جس کا شیڈول کافی عرصہ پہلے ہے اور اس افتتاحی پرواز پر جانے کی میری اپنی بھی خواہش ہے —— ایک ... لئے غالباً جاؤں گی —— وہاں سے واپس آ کر میں استعفے دے دوں ... اور پھر تمہارے قدموں میں تمہارے گھر کے اندر رہا کروں گی . . . میرے آنے ... ہی گھر کا بندوبست کر چھوڑنا۔ خواہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو —— ہمارا اپنا ایک چاہیئے —— مگر تم اس قدر خاموش کیوں ہو —— ؟ میری کسی بات کا بھی ... نہیں دیا۔

... یہ سوچ رہا ہوں۔ کل کیسے بندوبست ہو گا۔ میرے پاس تو فی الحال اتنے ... نہیں ہیں۔ باہر سے میرا سرمایہ آنے میں وقت لگے گا اور یہاں میرا اکاؤنٹ ... ہو رہا ہے۔ میرے پاس تو صرف زادِ راہ ہے۔ اور گھر کی تم بالکل فکر نہ کرو ... ہو ... آبائی حویلی ہے۔ ہم وہیں چل کر رہیں گے۔"

... پیسوں کا فکر نہ کرو۔ میرے پاس جو ہیں —— مگر حماد خدا کے لئے میری بات ... مجھے ایسے لگ رہا ہے۔ جیسے اب زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے ... سارا وقت پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ بھلا تم پہلے کیوں نہ آ گئے۔"

... حماد کو ہنسی آ گئی۔

... اس نے سجّو کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا اور بولا۔

"... تمہاری مرضی پہ ہوں۔ جو تم چاہو گی، اور جس طرح چاہو گی، ویسے ہی ہو گا۔"

"حماد! دیکھونا۔ پیارا خدا مجھ پر کس طرح مہربان ہوا ہے۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ اُس نے
میرے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں"

"اب فلسفہ چھوڑو۔ آؤ واپس چلیں۔ رات اُتر آئی ہے" حماد نے اس کی کمر میں بازو ڈالا
اور وہ سڑک کی جانب چلنے لگے۔

اگلا دن نکاح کے لئے مقرر ہوا۔

مگر صبح کے وقت انہوں نے شاپنگ کا پروگرام بنایا۔ اور نکاح کے لئے شام کا وقت
سجو سرخ جوڑا پہننا چاہتی تھی اور اتنی جلدی آرڈر پر نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے بنا بنا
سُرخ جوڑا ڈھونڈنا تھا۔

دُوسرے دن صبح نو بجے اپنا بڑا سا پرس جھلاتی سجو حماد کے ہوٹل میں آ گئی۔
حماد پہلے ہی تیار تھا۔ دونوں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر صدر بازار کی طرف
روانہ ہو گئے۔

حماد کے گلے میں ایک بیش قیمت کیمرہ لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں اُس نے ایک اعلیٰ قسم
ریکارڈ پلیئر اور ٹیپ ریکارڈر تھام رکھا تھا۔ ایک دکان کے آگے حماد نے ٹیکسی رکوائی۔ سجو
انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ وہ دکان میں رہا۔ اور سجو ٹیکسی میں بیٹھی
سے پہلو بدلتی رہی۔

حماد جب دکان سے باہر نکلا تو اُس کے پاس کیمرہ اور ٹیپ ریکارڈر نہیں تھے۔
مگر اُس کی جیب بھاری لگ رہی تھی۔
ٹیکسی چلی تو سجو نے کہا۔

"یہ کیا کیا تم نے حماد۔ اگر ان چیزوں کو بیچنا ہی تھا تو مجھے بتاتے۔ میں اچھا سودا کروا دیتی
میرے پاس تو ضرورت مندوں کی فہرست ہوتی ہے۔ یوں اونے پونے میں اتنی قیمتی
اشیاء دے آئے"

اب تم خاموش بیٹھی رہو۔ مرد اپنے معاملے ہمیشہ خود طے کرتے ہیں ——— آج
شادی ہے ——— اور تم آج بھی خاموش نہیں رہ سکتیں۔ مشورہ پہ مشورہ دیئے جا
حماد نے بڑی خوش دلی سے کہا۔

پہلی بار سجو ذرا سا شرمائی ——— اور پھر واقعی چپ ہو گئی کہ کہیں حماد بُرا نہ مان جائے۔
والا ہوتے ہوئے اُس نے بینک سے اپنی ساری جمع شدہ رقم نکلوالی تھی۔ اس وقت
کے پرس میں تھی۔ مگر وہ حماد سے کچھ بھی نہ کہہ سکی ——— وہ جانتی تھی کہ حماد کس قسم
ہے۔ اتنا بڑا ایثار کرنے والا آدمی ——— اتنی ذرا سی بات پر بگڑ سکتا ہے۔ عورتوں
بڑے احسان کرنے والے مردان کے چھوٹے چھوٹے احسان نہیں لیتے۔

سجو کو اُس کی یہ ادا بہت پسند آئی۔

مگر وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ آنے والی رات اُس کی زندگی میں انوکھی خوشیاں لے
تھی اور وہ طرح طرح کے وسوسوں میں اسیر تھی۔ ذرا سی بدمزگی بھی پیدا کرنا نہیں چاہتی
چاہتی تھی پل نہ بیتے اور رات آ جائے۔ وہ رات جو جنم جنم سے اُس کے تصور میں بسی تھی
رات نے اُس کو پرانی سجو لوٹانی تھی۔

ہر حال اپنے آپ کو بڑے وقار سے سنبھالے سنبھالے وہ اس کے ساتھ شاپنگ کرتی
بڑی مشکل سے سجو کا پسندیدہ کمخواب کا غرارہ سوٹ ملا۔ اس کے ساتھ اس نے نورتن
فلیٹ خرید لیا۔ سوٹ کے ساتھ میچ کرتا ہوا پرس اور جوتا لیا ———
انہی بازار میں انہیں دوپہر ہو گئی۔ تو انہوں نے چائنیز ریستوران میں کھانا کھا لیا۔
اس سے سجو نے ایک بیوٹی سیلون کو فون کر کے اُس سے چار بجے کا وقت لے لیا کیونکہ
کافی مضطرب تھی کہ میک وغیرہ نہ کر سکتی تھی۔

حماد نے اپنے ہوٹل کے منیجر کی مدد سے ہوٹل میں ہی نکاح کا بندوبست کر لیا تھا۔ اور
حماد دونوں کے اقربا اور قریبی دوست شہر میں نہ تھے اس لئے اُس نے باہر سے آدمی

بلُانے کے بجائے ہوٹل کے سارے عملے کو مع بیروں کے رات کے کھانے پر مدعو کر لیا گیا۔ اُن کی اس جدت کو بھی سجّو نے بنظرِ احسن دیکھا تھا۔

شام بخیر و خوبی گذر گئی۔ سجّو اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نئی نویلی دُلہن بن کر آئی تھی۔ نکاح میں گواہ بھی ہوٹل ہی کی جانب سے پیش ہوئے ——— بڑی خوبصورت اور گھریلو تقریب لگ رہی تھی۔ ہر کوئی خوش ہو ہو کر ان دونوں کو مبارک باد دے رہا تھا ——— اور پھولوں کے اتنے بے شمار تحفے اِنہیں موصُول ہوئے کہ اُن سے اٹھانا مشکل ہو گئے۔

حمّاد بھی اپنے قیمتی سیاہ سوٹ میں بہت وجیہہ اور پُر وقار لگ رہا تھا۔

آج رات کے لئے انھوں نے ہاکس بے پر ایک "ہٹ" کرائے پر لی تھی۔ یہ سجّو کی تجویز تھی۔ کیونکہ وہ اپنی سہاگ رات اس سمندر کے دامن میں گزارنا چاہتی تھی۔ جس کے ساحل پر پہلی بار کے حماد نے اُس کا ہاتھ تھاما تھا اور حماد بے چُون و چرا اُس کی ہر خواہش پر سر جھکاتا چلا جا رہا تھا ———

اور اُف وہ رات ———

ایسے معلوم دیتا تھا جیسے آج رات سجّو نے کبھی نہ سونے اور کبھی نہ چُپ رہنے کی قسم کھائی ہے۔ جو کردار اُس رات سجّو کو ادا کرنا چاہیئے تھا۔ وہ حماد کو کرنا پڑا۔ وہ ایک سچے عاشق کی طرح اپنا بیکراں پیار حماد پر نچھاور کر رہی تھی۔ اور حماد کو اتنی عمر گزر جانے کے باوجُود پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ عورت محبت کے معاملے میں بحرِ بیکراں ہوتی ہے۔ کتنے ہی سمندر اُس کی محبّت کی وسعت میں سما سکتے ہیں ——— جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات ——— کی وہ مکمل تفسیر بنی ہوئی تھی۔ اس قدر اُمنگ تھی اُس کے اندر ——— اتنی حدت تھی اُس کے شعلہ نما پیکر میں ——— اتنی توانائی و رعنائی تھی اُس کے وجُود میں کہ حماد حیرت زدہ سا رہ گیا۔ اُس نے حماد سے خوُب خوُب باتیں کیں۔ سارا وقت حماد کو اس سیماب صفت لڑکی پر ترس آتا رہا۔ اور وہ سوچتا رہا ——— میں جو پاؤں پاؤں چلتا زندگی کا فاصلہ طے کرتا

...خدا جانے اس دوڑ میں اُس کا ساتھ بھی دے سکوں گا یا نہیں ——— کس قدر ... کس قدر بے کل ——— کتنی سیمابی ہے یہ لڑکی ——— کبھی شعلہ ——— کبھی ... کبھی آگ کبھی آنسو ——— کبھی محبُوبہ ——— کبھی ماں کبھی ایک فریب خوردہ سی ...

...ہو گئی۔

...کے لئے وہ رات ایک عجیب رات تھی۔ جبکہ سجّو کے لئے وہ رات اپنی تمام تر ...یوں کے ساتھ - زندگی کی انوکھی نرالی سُہاگ رات تھی۔ تمام شب وہ جاگتے رہے ...بلکہ سجّو نے حماد کو بھی جگائے رکھا۔ اور اپنی گزشتہ زندگی کی بے شمار باتیں کیں۔ اور اب ...کے دس بج رہے تھے اور وہ تھک ہار کر اُس کے بازوؤں میں سو رہی تھی۔ اسے اس ...پن اور پیاری سی لڑکی کے ساتھ ہمدردی سی محسُوس ہو رہی تھی۔

ابھی ابھی اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ اور وہ گذری ہوئی رات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سب کچھ ...نے کے باوجُود ——— یہ سب انہونا سا لگ رہا تھا۔ اُس نے تو کبھی تصوّر تک نہیں کیا تھا ...طرح اتنی جلدی وہ کسی لڑکی سے شادی کر لے گا۔ زندگی میں اُسے اور بھی بہت سی لڑکیاں ...۔ اُنہوں نے اسے پسند کیا تھا۔ چاہا تھا۔ مگر شادی کے نام پہ وہ ہمیشہ دُور بھاگتا رہا۔ ...کیوں ——— ؟ جانے کس موہوم سی آس پر ——— اور سرِ راہ مِل جانے والی یہ لڑکی! ...جو زندگی کے اس چھوٹے سے پڑاؤ میں اچانک اُسے مل گئی تھی۔ اب زندگی بھر کے لئے ...کی ہمسفر بن گئی تھی۔ جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی۔ کہ وہ انکار کر ہی نہ سکا۔ یا اُس کا زخمی ...اُڑنے کی اُس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

کیا واقعی وہ اس کی محبّت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے دِل کو بار بار ٹٹولا۔

مگر ہر بار نفی میں جواب مِلا۔

یہ لڑکی حسین ہے۔

خوُب سیرت ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دل میں اُتر جانے والی ہے۔ اچھی بیوی ثابت ہوسکتی ہے۔

مگر محبت ——————

نہیں اُس کے لئے محبت کی گرمی اس کے جذبات میں نہیں تھی۔ یوں ایک جوان لڑکی کا ساتھ مرد کو خوشیاں ضرور عطا کرتا ہے۔ مگر محبت کا اپنا ایک رنگ اور ایک ڈھنگ ہوتا ہے جُداگانہ حدت اور شدت ہوتی ہے۔ وہ حماد کے جذبات میں نہ تھی۔

لیکن وہ پچھتا بھی نہیں رہا تھا —— اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی بارونق بازار میں چلتے ہوئے اس نے بچوں کی سی شرارت کے ساتھ ایک لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ اور اب لاٹری میں ایک خوبصورت اور بیش قیمت شئے نکل آئی ہے۔ جو ہر حال میں میں کام آسکتی ہے۔

ہاں اس لڑکی سے بھی محبت کی جاسکتی ہے۔ یہ محبت کے قابل ہے۔ دل میں رکھنے کے اہل ہے ——————

رفتہ رفتہ زندگی اُسی کے محور کے گرد گھومنے لگی۔ اُس کا دل چاہا۔ وہ اس سوئی ہوئی تھکی ہوئی سیماب صفت لڑکی کو جگا دے اور بے چین کردے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر سنبھل گیا اور اٹھ کر غسل خانے کو چل دیا۔

ہفتے کے باقی دن بھی انہوں نے اسی "ہٹ" میں گزارے۔ وہاں وہ دونوں تنہا تھے۔ سارا سارا دن ہنسی مذاق میں گزرتا۔ کبھی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ساحل سمندر پہ ٹہلتے کبھی ریت پر بیٹھ کر بچوں کی طرح گھروندے بناتے رہتے۔ اور کبھی مستقبل کے خوش آئند خیالوں میں کھو جاتے —— کہ وہ کہاں رہیں گے۔ کس طرح رہیں گے؟

حماد کا خیال تھا کہ وہ لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرے گا۔ کیونکہ وہ جدید ترین پریس کی اعلیٰ ترین مشینری اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور لاہور میں پریس لگا کر صحافت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔

سجو کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو حماد کی ہر بات ماننے کو تیار تھی۔ اس کا تو دل چاہتا وہ نوکری چھوڑ دے۔ اور دونوں لاہور میں جاکر اپنا گھر بسائیں ——————۔

مگر حماد اپنے سامان کے لئے یہاں رُکا ہوا تھا۔ اور سجو کو بھی ایک انتہائی اہم فلائٹ ا تھا۔ چنانچہ دونوں کو ابھی کچھ دن اور کراچی میں رہنا تھا۔

وہ چھ سات دن بھی ہوا کی طرح اڑ گئے۔ ان چھ سات دنوں میں سجو بہت زیادہ خوش اُس نے حماد سے اس قدر پیار کیا کہ بعض اوقات حماد گھبرا اٹھتا تھا۔ وہ محبت کا ایک سمندر لگتی تھی۔ اور حماد سوچتا۔ اُس کا جلدی سے ایک بچہ ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ اس گن ہو جائے۔ اس بے پرواہ اور لااُبالی آدمی کو بھلا اتنے ناز اٹھوانے کی کہاں عادت یعنی ساری اس کو بگاڑنے والی باتیں تھیں۔

تاہم وہ بھی خوش تھا۔ اُس کی ازدواجی زندگی ہمیشہ ہنگامہ خیز گذرنے کے امکانات اور جمود اسے پسند نہیں تھا۔

اور وہ دن بھی آگیا۔ جب سجو نے فلائٹ پہ جانا تھا۔ آج رات کے نو بجے کا وقت ہوا تھا۔ سجو نے صبح ہی اپنا سارا سامان پیک کرکے حماد کے ہوٹل میں پہنچا دیا تھا۔ اور سے کہا تھا وہ اسے چھوڑنے ایئرپورٹ ضرور جائے۔

رات کا کھانا انہوں نے جلدی کھا لیا۔ آج ایک ہفتے بعد سجو نے اپنا یونیفارم پہنا تا۔

اور حماد کے سامنے کھڑی ہوکر بولی۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔ یعنی اس لباس میں ——؟"

"اس لباس میں ہی تو تم نے مجھے متاثر کیا تھا۔"

"ویسے یہ لباس میں آخری بار پہن رہی ہوں۔ وہاں سے آکر ماضی کے ساتھ اُسے دفن کردوں گی۔" اُس نے وثوق سے کہا۔

"بھئی مجھے تمہارے لباس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خواہ تم گھر پر بھی اُسے پہنے رکھو۔ مجھے تو تمہاری ذات سے غرض ہے۔ جب تم خود اتنی اچھی ہو تو کسی لباس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔"

"سچ حماد!" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ "میں تو سارا وقت یہی سوچتی رہتی ہوں۔ کہیں میں نے تمہارے ساتھ زبردستی تو نہیں کی۔ ایسا نہ ہو میرے آنے تک تمہارا ارادہ ہی بدل جائے۔"

"واہ۔ میرا ارادہ کوئی تمہارا لباس تو نہیں ہے کہ ہر روز —— بلکہ صبح و شام بدلنا چاہیئے۔"
سجو ہنسی۔

"تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ مرد فیشن سے جلدی بدل جاتا ہے۔"

"ہاں کہہ تو رہا تھا —— مگر یہ بھی تو کہا تھا کہ تم نے صحیح مرد نہ دیکھے ہوں گے۔"

"تو تم صحیح مرد ہو؟"

"جناب ——!" اُس نے سجو کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "سجو جانی! مرد ایک ہی بار فیصلہ کرتا ہے۔ اور تمام عمر نبھاتا ہے۔ آزماتی رہنا —— کہو تو پورے سات دن ہوائی اڈے پر کھڑا تمہارا انتظار کرتا رہوں۔"

"ہائے نہیں۔" سجو نہال ہو گئی۔ "مجھے خُدا کے بعد تم پر بھروسہ ہے حماد! اب تو اللہ نے بھی مجھے مُعاف کر کے تم سا انعام عطا کیا ہے۔ اور یقیناً بابا بھی خوش ہوں گے۔"

حماد —— وہ ذرا سا اُداس ہو گئی۔

"جب میں واپس آؤں گی نا، تو ہم جمال پور چلیں گے۔ میں تمہیں بابا کی قبر پہ لے جاؤں گی۔ انہیں اُن کا داماد دکھاؤں گی اور کہوں گی۔ اتنا اچھا داماد پا کر وہ مجھے معاف کر دیں اور اپنی وصیت واپس لے لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے ——" حماد اُسے آبدیدہ دیکھ کر جلدی سے

"جیسے تم کہو گی۔ میں ویسے ہی کروں گا۔ اب جلدی کرو۔ تمہارا وقت ہو گیا ہے۔"

تیار ہو کر دونوں ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئے —— سجو بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ راستہ بھر اُس نے حماد کا ہاتھ ہاتھ میں تھامے رکھا۔

جہاز کی طرف جانے سے پہلے اُس نے حماد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"ہفتے کے بعد یہیں اسی وقت میرا انتظار کرنا۔"

"ضرور۔ تم جب اپنی رعنائیوں کے ساتھ یہاں اُترو گی تو مجھے بڑی بے چینی سے منتظر پاؤ گی۔ ڈر ہے کہ کہیں سب کے سامنے میں تمہیں اپنے بازوؤں میں نہ لے لوں۔"

"ہائے اللہ ایسی باتیں نہ کرو۔ کہ میرا سفر میں جی ہی نہ لگے اور میں اُڑتے جہاز سے چھلانگ لگا کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔"

"ایسا ارادہ ہو تو بتاتی جانا۔ تاکہ میں آغوش وا رکھوں۔"

دونوں کھل کھلا کر ہنس دیئے۔

اُنہوں نے انتہائی محبت سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

جب تک جہاز نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ حماد وہیں کھڑا رہا۔

جانے کیوں اُس کا دل بیحد اُداس ہو گیا تھا اور سارا شہر ابھی سے ویران لگ رہا تھا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ چند دنوں کی قربت میں وہ اتنا جذباتی ہو جائیگا۔ اُس کا دل اتنا بے تاب ہو کر بے اختیار چاہنے لگا، لپک کر سجو کو جہاز سے اُتار لے اور اپنے بازوؤں میں چھپا کر گھر لے جائے۔ مگر اب تو جہاز بھی خلاؤں میں گم ہو چکا تھا۔ ایئرپورٹ کی رونق ماند ہونے لگی تھی مسافر اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے۔ اُس نے جلتا ہوا سگریٹ فرش پر پھینکا اور پاؤں سے مسل دیا۔ اور پھر بے تُلے قدموں سے باہر کی طرف جانے لگا۔

تمام رات حماد کی اضطراب میں کٹی۔ جانے اُسے نیند کیوں نہیں آرہی تھی۔ اور وہ خود بھی حیران ہو رہا تھا کہ چند دنوں کی رفاقت میں کیا اسے واقعی سجّو سے بہت محبت ہوگئی ہے۔ یا وہ اس پھولوں سے گندھی ہوئی معطّر معطّر لڑکی کا عادی ہوگیا ہے۔

ایئرپورٹ سے آتے ہوئے اُس نے ڈھیر سارے مُلکی وغیر ملکی رسالے خرید لئے تھے۔ رات دو بجے تک وہ اُن کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ ایک رسالہ ختم کرنے کے بعد سونے کی کوشش کرتا۔ نیند نہ آتی تو دُوسرا اُٹھا لیتا۔ بیچ بیچ میں وہ سجّو کے متعلق بھی سوچتا جاتا۔ جتنا اُس کے متعلق سوچتا اتنا ہی عجیب و غریب اور طلسمی نظر آتی۔

وہ اس کا بے تکان باتیں کرنے کا انداز ——— بچّوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو جانے کی ادا ———

پھر حماد سے محبت کرنے کا انداز ——— اُسے سُلانے کا طریقہ ——— اٹھانے کا طریقہ ———

اُس کے سب چھوٹے چھوٹے کام وہ بڑے چاؤ سے' اپنے ہاتھوں سے کرتی اُس کے منع کرنے یا ٹوک دینے پر جذباتی ہو جاتی۔

...نی کس قدر شدّتِ جذبات کی ماری ہوئی لڑکی تھی؟ اور کہاں بھٹکتی بھٹکاتی۔ اُس کی ...اور بے رس زندگی سے ٹکرا گئی تھی اس کی زندگی بھی یک دم ہیجان خیز ہوگئی تھی۔ وہ گھبرا...

...پچھا نہیں رہا تھا ———

...شاید زندگی میں اُسے ایسی ہی شعلہ صفت لڑکی کی ضرورت تھی۔ اُس کی زندگی میں شاید ...نہیں رہی تھی۔ اور یہ سرتاپا آگ تھی۔

...خدا کی ایک خوبصورت مصلحت سمجھ کر اُس نے اُسے قبول کر لیا تھا۔

...اور زندگی میں نئے واقعات کا متمنّی بن بیٹھا تھا۔

...اب تو یونہی ہوگا۔

...دو الگ الگ مزاج کے افراد ریشمی ڈوری میں باندھ دیئے جائیں۔ اور وہ ایک دوسرے ...بت کرتے ہوں۔ یا عزّتِ نفس کو زندہ رکھنے میں یقین رکھتے ہوں تو پھر زندگی میں ٹھہراؤ ...ہی نہیں۔ ہاں غیر متوقع واقعات کا رُونما ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔

...یوں ازدواجی زندگی ایسی ہنگامہ پرور اور خوشگوار ہو جاتے تو زندگی کا سفر آسانی سے ...جاتا ہے ———

...زندگی کا سفر ——— باقی کتنا رہ گیا ہے ———

حماد اپنی عمر کا حساب لگانے لگا۔

جب وہ پاکستان چھوڑ کر گیا تھا تو چھبیس برس کا تھا۔ اور اب نو سال بعد ——— وہ بہت ...بار، سنجیدہ، باوقار اور تجربہ کار بن کر لوٹا تھا۔

...جانے اُس کے لاشعور میں کیا تھا۔ اور وہ کیا سوچ کر آیا تھا۔ بہرحال اُس کی زندگی کے ...پروگراموں میں، لڑکی ڈھونڈنا اور شادی رچانا، جیسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ یہ پروگرام ...قدرت کے رجسٹر میں درج تھا۔ اس لئے وہ اس سے انکار کر ہی نہ سکا اور منزل پر

پہنچنے سے پہلے اسیر ہو چکا تھا۔

اور آج رات، اُسے بار بار سجو یاد آ رہی تھی۔ پہلے تو خوب خوب اُس کا مغز چاٹا گیا
اور پھر اسے اچھی طرح تھکا کر، کتنی محبت اور چاہت سے سُلاتی تھی۔ شاید بچپن میں اُسے اُس
کی ماں نے ایسے نہ سُلایا ہو گا۔

واہ کتنی عجیب لڑکی تھی۔

وہ بار بار سوچتا۔ پھر سوچتے سوچتے اُسے اس لڑکی کی شدت سے طلب ہونے لگتی
اس کا دل چاہنے لگا۔ اُسی وقت وہ کہیں سے —— جادو کے زور سے نمودار ہو جائے
کمرہ خوشبوؤں سے بھر جائے۔ بتی بجھا دینے کے باوجود چاروں طرف اُس کے وجود کی
بکھری ہوئی نظر آتے..... اور پھر وہ تھک ہار کر سو جاتے۔

لیکن ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اُس نے ایک ہفتے کے بعد آنا تھا اور حماد نے دل میں
تہیہ کر لیا کہ اب ہفتے کے بعد وہ اُس کو کبھی نہ جانے دے گا۔

زندگی کا طویل سفر تنہا کاٹنا واقعی بڑا کٹھن کام ہے۔ اس عمر میں تنہائی کا احساس
اُسے شدت سے ہونے لگا تھا۔ اُس نے سوچا۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے
اس لئے ایک دُوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

اپنی اس سراسیمگی اور بے چینی کو وہ کوئی نام نہ دے سکا۔ رسالے پڑھ پڑھ کر، کروٹیں بدل
بدل کر اور خیالوں سے کھیل کر غالباً وہ ڈھائی تین بجے سو گیا۔

اب صبح نو بجے اُس کی آنکھ کھُلی تھی۔ اُس نے وقت دیکھا اور بیرے کو فون پر کہہ دیا
کہ اُس کا ناشتہ اور اخبار کمرے میں لے آئے۔

تھوڑی دیر بعد ٹرے اٹھائے بیرا نمودار ہوا چائے کے برتنوں کے اوپر اخبار رکھا تھا
حماد اٹھ کر غسل خانے میں دانت صاف کرنے چلا گیا اور بیرا تپائی پر اخبار اور چائے رکھ کر نیچے چلا گیا
حماد واپس آ کر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ تپائی قریب کھسکا کر چائے کی پیالی بنائی اور

ہاتھ سے اخبار اُٹھا لیا۔ اخبار کے پُشت والے صفحے پر کچھ ایسی دلچسپ خبریں تھیں
پچھلے صفحے کو پہلے پڑھنے لگ گیا۔

چائے کی پیالی خالی کر کے اُس نے میز پر رکھ دی۔ سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر ایک
سگریٹ سُلگایا۔ اسے مُنہ میں رکھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تاکہ شروع صفحے سے سارا اخبار تسلی
سے پڑھ سکے۔

اُس نے اخبار کو سیدھا کیا۔ سیاہ حاشیہ اور موٹی موٹی سرخیاں.....

پہلے تو خبر پڑھ کر وہ کچھ سمجھا ہی نہیں ——

پھر اُس نے دوبارہ اس خبر کو پڑھا ——

سہ بارہ پڑھا ——

اوہ !

یہ کیا ہو گیا ——

اس جہاز کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس میں سجو گئی تھی۔

حماد کو کچھ بھی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کس کو بلائے۔ کس سے پوچھے —— ؟ اخبار میں اگرچہ
مکمل خبر تھی۔ مگر حادثے میں ہلاک ہونے والوں کے نام نہیں تھے۔ ہاں اتنا لکھا تھا کہ تقریباً
سارے مسافر زخمی ہو گئے ہیں۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بچنے والوں کی تعداد
نہایت کم اور مایوس کُن تھی۔

اور سجو۔

وہ عطر بیز، برق آسا، خوبصورت، نازک اندام لڑکی۔ وہ لڑکی کہاں ہے۔

وہ جس نے اُسے اتنے دن لبھائے رکھا۔

اُس کے خلوت کدے میں محبت کی بے شمار شمعیں جلائیں۔ اُسے نئے سرے سے
جینا سکھایا۔ محبت کرنا سکھایا —— اور یہ سب کچھ اُس نے اتنی جلدی کیا کہ وہ ششدر

رہ گیا۔

خدا کرے وہ زندہ سلامت بچ گئی ہو۔

وہ بچ گئی ہو۔

خداوندا! اس پر رحم کرنا۔

اُس نے گھبراہٹ میں سلیپر پہنے۔ کمرے میں بے چینی سے دو چار چکر لگائے۔ اور پھر جلدی سے ایرپورٹ فون کرنے لگا۔

اُس نے پژمردہ لہجے میں حادثے کے بارے میں دریافت کیا۔

ابھی تک کوئی تازہ اطلاع نہیں آئی تھی۔ اُنہوں نے وہی خبر بتائی جو اخبار میں آئی تھی۔ جب حماد نے سجو کے بارے میں خصوصیت سے پوچھا تو انکوائری سے بولنے والا خاموش ہو گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد بولا۔

ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تھوڑی دیر بعد ہلاک ہونے والوں کا پتہ چل جائے گا۔"

حماد کے دل میں آگ سی جلنے لگی۔

اسی طرح نیچے کی طرف بھاگا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر ایک ٹیکسی روکی۔ اور ایرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

خداوندا! یہ معجزہ رونما ہو گیا ہو۔

خداوندا! وہ سب سے اچھی۔ وہ سب سے سچی اور سب کی خدمت گزار لڑکی معجزانہ طور پر بچ گئی ہو۔ تو نے اُسے حفاظت سے زمین پر اُتار لیا ہو۔

تمام راستہ وہ دُعائیں مانگتا آیا۔

جب ایرپورٹ پہنچا تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ مسافروں کے عزیز و اقارب روتے کراہتے ہوئے تفصیلات معلوم کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

اں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اور کوئی خدا سے فریاد کر رہا تھا۔

انکوائری کی جانب بڑھا۔

ب تک غالباً ہلاک ہونے والوں کی فہرست آچکی تھی۔ اس میں سرفہرست سجو کا

جو!

پیاری سجو!

دخدا ____

مجھے خدا ____

یں اس طرح اسے تجھ سے بچھڑانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اسے تیری حفاظت میں ہا تھا۔ مگر تو نے خود اسے میری تحویل میں دے دیا تھا۔ پھر اس طرح بادلوں کے ل کر اُسے کیوں اُچک لیا۔

خدا ____

ل ____

اب دے ____

ں فرشتہ صفت لڑکی کو حماد کے علاوہ کوئی پوچھنے نہیں آیا تھا۔

لا جو سفر کی آخری منزلوں میں اچانک اس کا ہمسفر بن گیا تھا۔

زبردستی اُس نے اسے اپنا بنا لیا تھا۔ جیسے بس یہی ایک کام کرنا اُس کے لئے رہ گیا تھا۔

لڑکی کو اس کا انتظار نہیں تھا۔

ں کے اپنے سب اس سے کوسوں دُور تھے۔

ور حماد کو ____ پُرسکون، رواں دواں رہنے والے حماد کو چند دنوں کی قربت

بخش کردہ درد کے ایک بوجھل سمندر میں پھینک گئی تھی۔

انتظار لاحاصل تھا۔

وہ اُسے ہنستے مسکراتے ہوئے چکمہ دے گئی تھی۔

حماد کو اپنی شعبدہ گری سے پاگل کر گئی تھی۔

سجو!

تجھے بابا کے پاس جانے کی جلدی تھی ———

او بابا کی سجلی!

انہیں داغِ دل دکھانے کی جلدی تھی ———

تو کہاں چلی گئی ——— تیرے ہاتھ لہو رنگ تو ہیں مگر یہ مہندی کا رنگ نہیں ———

سجلی! تیری لال چنریا تھامے ماں اب تک تیرے پلٹ آنے کا انتظار کر رہی

اور بابا! گھوڑی والے کی باگ پکڑے تیرا منتظر ہے۔ اور تو کہاں چلی گئی ———؟

اجنبی دیس کی قہر آلود فضاؤں نے تیرا تن ریزہ ریزہ کر دیا۔

اے سہیلیوں کی دلاری سجو!

تو اجنبی سرزمین میں بکھر کر ذرہ ذرہ ہو گئی ——— تیرے من کا نازک شیشہ کس نے چور چور کیا تھا۔

پگلی! تو تو خود پتھروں کے اس دیس میں کانچ کی نازک گڑیا تھی۔ تیرا من کرچی کرچی!

تیرا تن کرچی کرچی ہوا۔

دیکھ کرچیاں کتنی دور دور تک بکھر گئی ہیں......

کہ راہگیروں کے تلوے اور آنکھیں لہولہان ہو رہی ہیں......

اتنی دور کی پرواز ——— اور اپنی ذات سے اتنا بڑا انتقام ———؟

[...]ں دمجبور سجو!

[...]ے سجانے والی سجو!

[...]ں اس جگ میں کوئی شیشوں کا مسیحا ہوتا ———؟

[...] بابا کی گود میں کیوں جا چھپی ———؟ اس دنیا کی گود تیرے بنا ویران ہو گئی ہے!!

[...]یں منانے کی جلدی تھی ———

[...] بابا کی سجلی!

جب تجھے ساجاں کہہ کر بلایا کرتے تھے تو تو کتنا برا منہ بنایا کرتی تھی۔ تیرا خیال تھا [...]ں جیسا نام ہے۔ تجھے تو سجو رانی ایسے سندر نام پسند تھے اور اماں جب تجھے گودی [...]یری سجلی بیٹی کہا کرتیں تو تو کتنا خوش ہوتی تھی۔

[...]ں کو سدا تیری شادی کا ارمان رہا ——— جب صبح کو اپنے جھوٹے سے دوپٹے [...]بکل مارے تو اماں کے پہلو سے لگ کر سیپارہ ناالقرآن پڑھا کرتی تھی تو اماں تیرے [...]ت چہرے پر دم کر کے تجھے سینے سے لگا لیتی تھی۔ اور پھر کہتی میری شہزادی بیٹی! [...]ل کا بیاہ ہو گا۔ اس کے گورے گورے ہاتھوں میں مہندی لگے گی۔ اُسے سہاگ [...] پہناؤں گی اور اپنے ہاتھ سے ڈولی میں سوار کرا دوں گی۔ تو سجلی شرما کر اپنا گورا گورا مکھڑا [...]ل میں چھپا لیتی تھی......

[...]جلی! تیری ماں کو تو تیرے بیاہ کا بڑا چاؤ تھا۔ تو نے اُسے بھی یہ خوش خبری نہ سنائی۔

[...]جلی! تیرا سوہا جوڑا کہاں ہے۔

[...]یری ڈولی کدھر ہے ———

[...] چند راتوں کی دلہن ———

سرائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تیرا پنڈ اپوری توُت دی تیری لغراں وَرگی باہنہ !
تیرے بُل نے پھُل کریندے تیرا جوبن وُن دی چھاں
ایہ چھاواں سدا نہ رہندیاں رہ جاندے پچھے ناں
اسی رب سببی گوئیے اَج آ گئے ایس گراں
اُساں جھٹ دوپہر گذارنی اساں بہناں نہیں پڑاں
اساں پنڈ نہ پانے جوگیاں اساں گل نہ بہنی تھاں
کُس پچھے پا کے بیٹھنا ایہ دُنیا اِک سراں
تیرے جوبن دا انگوں گوئیے اسی کل مُسافر ہاں

(شریف کنجاہی)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اِتنے میں پڑا ایک ننھا سا بچہ پاؤں کا انگوٹھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چوس رہا تھا۔ اس
ے پر صحت و توانائی کی چکا چوند تھی۔ اور اُس کی مسکراہٹ میں محبت کے تمام عنصر
ے۔ اس خوبصورت گول مٹول اور دل میں اُتر جانے والے بچّے نے سیاہ آنکھیں اور
ال اپنے باپ سے پائے تھے۔ مگر گوری شہابی رنگت اور باریک ہونٹ ستواں
ی ماں سے لے لئے تھے۔ یہ بچہ مشرق و مغرب کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔
اور یہ گھر بھی۔ جس میں وہ لیٹا ہوا تھا مشرق و مغرب کے سنگم کا ایک حسین و دلکش نمونہ تھا
باپ دونوں نے مل کر اپنے اپنے ذوق کو خوب نکھارا تھا۔ بہت بڑا ڈرائنگ روم۔
بڑے جھالروں والے پردے۔ بیش قیمت ایرانی قالین۔ ولایت سے آئے ہوئے قیمتی
جدید ڈیزائن کے بڑے بڑے صوفے۔ یہی حال ڈائننگ روم کا تھا۔ کراکری ولایتی تھی
ر کانٹا چمچ کے بغیر نہیں کھایا جاتا تھا۔ ہر بیڈ روم کی شان الگ تھی۔ اور ممی ڈیڈی کا بیڈ روم
ور شاندار تھا۔ کہ اس کی انوکھی مسہری اور جھالروں والے فانوس دیکھ کر تو اس پر ہمیشہ حجلۂ
گمان ہوتا تھا۔ پھر ممی ہمیشہ اُس کی سجاوٹ بدلتی رہتیں اور چاہتیں کہ ہر موسم میں یہ کمرہ
سے زیادہ رومان پرور اور دلکش دکھائی دے۔ ننھا جب بھی اس کمرے میں جاتا۔ سُرخ

پڑے اور جھولتی بتیوں کو دیکھ کر خوب خوب کلیلیں کرتا۔ ممی ڈیڈی سے اس کی ملاقات کم ہی
ہوتی تھی۔ ایک خوش مزاج آیا اُس کی نگرانی پر مقرر تھی۔ مگر پھر بھی وہ ممی ڈیڈی کی چاپ یا محبت
بھری صدا سننے کو بے قرار رہتا تھا۔ اگر کسی کونے سے ممی یا ڈیڈی کی آواز آجاتی تو وہ اپنی تیز
طرار کالی آنکھیں اِدھر اُدھر گھمانے لگتا۔ آواز کا تعین کرتا اور بیقراری سے رونے لگتا۔ ممی اگر آس
پاس ہوتیں تو لپک کر آجاتیں۔ اُن کی آواز میں اتنی مٹھاس اور اتنی شفقت ہوتی کہ ننھے کا دل
چاہتا ہمیشہ کے لئے ان کے بازوؤں میں سما جائے۔ ڈیڈی بھی کم پیار نہ کرتے تھے۔ مگر ان کا
کام ایسا تھا کہ زیادہ تر باہر رہتے۔ گھر پہ ہوتے تو آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ پھر بھی
وہ سونے سے پیشتر ننھے میاں کے کمرے میں جاتے۔ سو رہا ہوتا تو پیشانی چوم کر آجاتے
جاگ رہا ہوتا تو کچھ دیر اُس کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ ڈیڈی مصروف تھے۔ تو ممی بھی کچھ کم نہ
نہ تھیں۔ اکثر انہیں بھی ڈیڈی کے ساتھ باہر محفلوں میں جانا پڑتا۔ یا دوروں پر ڈیڈی کے ساتھ
ہوتیں۔ تب ننھے میاں نوکروں کی ایک فوج کے ساتھ گھر پہ اکیلے ہوتے ان دنوں اُن کے
دو ہی کام ہوتے۔ بھوک لگنے پر رونا۔ اور ممی ڈیڈی کی چاپ کا منتظر رہنا۔

گھر میں بھی دو قسم کی زبان بولی جاتی تھی۔ اس کے کان ان دونوں زبانوں سے آشنا تھے
ممی اُردو صحیح نہیں بول سکتی تھیں۔ وہ اظہارِ محبت اور لاڈ پیار انگریزی میں کرتیں تب اُسے
بڑا مزہ آتا۔ ماں کی تو کوئی الگ زبان نہیں ہوتی۔ مامتا ہر زبان میں ایک جیسی میٹھی، مخلص اور دل
کو بھانے والی ہوتی ہے ــــــ مامتا کا تعلق احساسات سے ہے۔ ماں کسی بھی زبان میں
بولے۔ احساسات میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

اُسے ممی کی چہلیں بھی پسند آتیں۔ اُن کی صورت بھی بھاتی اور زبان بھی اچھی لگتی۔
ڈیڈی کی میٹھی باتیں بھی بہت اچھی لگتیں۔
ممی ڈیڈی کے علاوہ دو مشفق ہستیاں اور تھیں جو کبھی کبھی اس سے ملنے آتیں۔ اُن
کی شفقت بھرپور ہوتی۔ وہ دادا جان اور دادی جان تھیں۔ دادا جان کی لمبی سی سفید

...حیرت سے تکا کرتا۔ اور بعض اوقات نوچ بھی لیتا۔ مگر دادا جان ذرا بُرا نہ مناتے جب
...رو تا یا چلاتا تو وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگتے پھر تھوڑا سا لعاب دہن انگلی پر لگا
...لو لگا دیتے۔ جیسے وہ کوئی مزے دار شے سمجھ کر کتنی دیر تک زبان چوستا رہتا۔ دادی
...البتہ بہت ہی عجیب تھی۔ گرم گرم۔ نرم نرم۔ پیاری پیاری۔ خوشبودار ــــــ وہ
...دادی جان کی گود میں جاتا۔ مگر وہاں جا کر وہ مدہوش ہو جاتا۔ جب وہ بھینچ کر اُسے
...لگاتیں تو اُسے بڑا مزہ آتا۔ اس کا دِل چاہتا وہ ہمیشہ ان حفاظتی دیواروں میں رہے
...محفوظ۔ ایسی گود تو ممی کی بھی نہ تھی ــــــ ایک مکمل گود ــــــ
...دادا جان اور دادی جان اِن دنوں بہت آتے تھے۔ جن دنوں ممی اور ڈیڈی کہیں
...گئے ہوتے۔ اس کا دِل چاہتا محبت سے بھرپور ہستیاں کبھی نہ جائیں۔ ہمیشہ
...مگر اُس کی ممی یہ پسند نہ کرتی تھیں کہ بچے کے ساتھ زیادہ لاڈ پیار کیا جائے ــــــ
...کے لئے مناسب پیار اور متوازن دیکھ بھال کی قائل تھیں۔ اور وہ ممی کے اصولوں
...ماہوا پڑا تھا۔
امیدوں اور آنسوؤں سے مانگا ہوا بچہ۔!
پیارا پیارا ــــــ گھر بھر کا تارا ــــــ
...پھر ہوا یوں کہ ایک دن بڑے زور کا دھماکہ ہوا ــــــ ایسا دھماکہ کہ اُس کی ننھی سی
...لرز اٹھی ــــــ
...دھماکہ اُس کے شعور میں جاگزیں ہو گیا ــــ اس طرح کہ اُس کی روح تک سہم گئی
...مسکرانے اور کلیلیں کرنے والا بچہ چڑچڑا اور ضدی بن گیا۔ بات بات میں رونے والا
...اور راتوں کی نیند اڑا دینے والا ــــــ
...اس روز ممی اور ڈیڈی گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لئے کلو جا رہے تھے۔ وہ لوگ
...ایک ماہ کی چھٹی لے کر کسی پہاڑ پہ جاتے تھے۔ اس بار ننھا بھی اُن کے ہمراہ تھا ــــــ

اور انہوں نے کلو جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

پُرپیچ راہوں۔ سبزہ زاروں اور اونچے نیچے پہاڑوں کا لُطف لیتے ہوئے وہ ا
پہنچ گئے تھے مگر مسلسل بارش کی وجہ سے راستے کافی خراب ہو گئے تھے۔ ایک لو
ڈھلان پر گاڑی کے پہیئے پھسل گئے۔ آگے ڈرائیور اور ڈیڈی بیٹھے تھے۔ پیچھے ممی اَور
ننھا ـــــ ڈرائیور نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔ مگر حادثہ پیش آگیا۔ ممی نے گھبراہ
کے مارے دروازہ کھول دیا۔ گرتی ڈولتی موٹر میں سے وہ لڑھکتی ہوئی دُور کھڈ میں جا گر
اُن کو لپک کر پکڑنے اور بچانے کی دُھن میں وفا شعار آیا بھی اُن کے پیچھے لڑھکتی ہوئی ج
گئی۔ ننھے میاں سیٹ پر پڑے روتے رہ گئے۔

اور جب اُنہیں ہوش آیا۔ تو زندگی کا رُخ ہی بدل چکا تھا ـــــ ڈیڈی ایک خو
باش آدمی سے انتہائی سوگوار آدمی بن چکے تھے۔ اور وہ دادا اور دادی کی گود میں آن گر
یہ گود اسے اچھی لگتی تھی۔ پیاری لگتی تھی۔ مگر چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں والی۔ اور میٹھے ب
والی ممی اسے اکثر یاد آتی۔ اور وہ بے چین ہو جاتا ـــــ تب دادی اماں سراپا شفقت ب
جاتیں۔ اور اسے اس طرح اپنی گود میں چھپا لیتیں جیسے مرغی اپنے بچّوں کو پروں میں چھ
لیتی ہے۔

ایک ننھی سی خلش اور دل میں میٹھی میٹھی ٹیس لیکر ننھے میاں عُمر کی اگلی منزلیں طے کرن
لگے۔

ننھے میاں جو نوکروں کی ایک فوج کی زیرِ نگرانی، دادا اور دادی کی شفقت کے زیرِ سایہ
پل رہے تھے۔ جن کا نام حماد احمد تھا۔

باپ کا نام سجاد احمد تھا۔ جو ضلع کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور دادا کا نام زیاد احمد تھا۔
مُنشی زیاد احمد جن کی تمام زندگی جد و جہد کی ایک عظیم داستان تھی۔

نشی زیاد احمد لاہور کے رہنے والے تھے۔ پشتوں کے رئیس تھے۔ لاہور میں اُن کی
یاں اور دو کانیں تھیں۔ طبیعت درویشانہ پائی تھی۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ اور سب
ی بات یہ کہ حُبّ الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کا آبائی پیشہ تو زراعت
مگر منشی زیاد احمد لکھنے پڑھنے کے بہت رسیا تھے۔ اسی شوق کے پیشِ نظر پہلے
ہوں نے کتابوں کے نادر نسخے اکٹھے کرنے شروع کئے۔ عربی، فارسی، انگریزی، اردو
زبانوں پر عبور تھا۔ کباڑیوں سے۔ اِدھر سے اُدھر سے۔ جہاں کہیں سے بھی انہیں
ی کتاب کا قلمی نسخہ یا اصل کتاب دستیاب ہو جاتی ہر قیمت پر لے آتے۔ اس
ان کی ایک بہت بڑی لائبریری بن گئی تھی۔

بہت سی کتابیں ناپید تھیں۔ کچھ قلمی نسخے ناقدری کی نذر ہو چکے تھے۔ اہلِ دانش
بیش قیمت سرمائے وہ نئی نسل تک پہنچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک
لگالیا۔ یہ چھاپہ خانہ آہستہ آہستہ بہت مشہور ہو گیا۔ اور ملک کے نامور اہلِ قلم
ل بھی چھاپنے لگا۔

جب غیر منقسم ہندوستان میں انگریز دشمن سرگرمیاں شروع ہوئیں تو منشی زیاد احمد نے

بھی بڑے جوش و خروش سے حصّہ لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنا ایک ذاتی اخبار بھی نکالنا شروع کر دیا۔ اور اپنا پریس ان سرگرمیوں کے لئے وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ کئی بار ان کے اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ ہوا۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہ جیل سے چھوٹ کر آتے تو ایک نئے نام سے ایک نئے اخبار کا اجراء کرتے۔

شام کو اُن کی بڑی سی حویلی کی بیٹھک میں اہلِ سُخن و اہلِ قلم حضرات کی مجلسیں ہوتیں سیاسی یا نیم سیاسی بحثیں ہوتیں۔ ہر طبقۂ خیال کے لوگ اُن کے ہاں آتے۔ اچھا خاصا جمگھٹا رہتا۔

شہر میں ان کا بہت رسُوخ تھا۔

اُن کا ایک ہی بیٹا تھا۔ منشی سجّاد احمد۔

کئی پشتوں سے اُن کے ہاں ایک ہی بیٹا چلا آتا تھا۔ منشی زیاد احمد کے کئی بچے پیدا ہوئے مگر سجّاد کے سوا سب ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سجّاد ان کا اکلوتا بیٹا اور آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ اُسے کسی قسم کی تکلیف میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اُسے بہترین اسکول میں تعلیم دلائی جب اُس نے علی گڑھ سے گریجویشن کر لی تو اُسے قانون کی تعلیم دلانے کے لئے انہوں نے ولایت بھیج دیا۔ خود تو وہ انگریز کے جانی دشمن تھے۔ مگر اپنے لڑکے کو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔

سجاد احمد سات سال تک ولایت میں رہے اور جب تعلیم ختم کر کے واپس ہندوستان آئے تو ولایت کا ایک حسین تحفہ بیوی کی صُورت میں ان کے ساتھ تھا۔ سجّاد احمد بہت وجیہہ اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ اس لئے ایک اچھّے خاندان کی فرنگی دوشیزہ ان پر مر مٹی ان دنوں وہ ہندوستان آنا اپنی خوش قسمتی سمجھا کرتی تھیں۔ سو اُن کے آتے ہی سرکاری ملازمتوں کے دروازے اُن پر وا ہو گئے۔ اور وہ ضلع کے ڈپٹی کلکٹر لگ گئے۔

اُن کی بیگم ہر چند کہ با وفا اور مخلص تھیں۔ دو سال سے زیادہ اُن کا ساتھ نہ دے سکیں حماد ابھی دس ماہ کا تھا۔ جب کلو جاتے ہوئے اُن کی کار کو حادثہ پیش آ گیا۔ اور وہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسم نہ نبھا سکیں۔

سجاد احمد نے پُورے پانچ سال اپنی بیوی کا سوگ منایا۔ حماد تو دادا دادی کے پاس جا کر مستقل اِنہیں کے پاس رہتا۔ اور اُن کے دل کا سُرور بنا ہوا تھا۔ البتہ سجّاد احمد کی دنیا ویران ہو گئی تھی۔ انہیں اپنی بیوی فلورِنیا سے بہُت محبت تھی۔ اور اب شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر تابہ کے ——— والدین اور عزیز و اقارب کے مجبُور کرنے پر انہیں ایسا فیصلہ کرنا پڑا۔ یہ اُن کے عہدے کا بھی تقاضا تھا اور ایک گھر عورت کے بغیر ہوٹل تو بن سکتا ہے گھر نہیں بن سکتا۔

پانچ سال بعد انہوں نے لاہور کی ایک بڑی فیشن ایبل فیملی کی ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد بھی وہ حماد کو گھر میں نہیں لائے۔ کیونکہ دادا دادی اُس کے بغیر زندہ رہنے کا تصوّر نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ بھی دادی کو اماں جان اور دادا جان کو ابا جان کہتا تھا۔ اور پھر کچھ عاصمہ نے بھی زور نہیں دیا۔ اس لئے وہ خاموش ہو رہے۔ ویسے وہ روز شام کو سرکاری رہائش گاہ سے بطورِ خاص اپنے والد منشی زیاد احمد کی حویلی میں آتے اپنے باپ کے نیاز حاصل کرنے اور بیٹے کو سینے سے لگانے کے لئے۔

وقت آگے کو سرکتا رہا۔

اور ہندوستان کے پہلو میں پاکستان کی ننھی سی چنگاری سُلگ اُٹھی۔ جو دیکھتے دیکھتے شعلہ بن گئی۔ اور آخر کار اس شعلے کے جلو سے سبز چاند تارے والا ایک جھنڈا طلوُع ہوا۔ اور ایک خطّہ زمین پاکستان کے نام سے اس کرّۂ ارض پر نمودار ہوا۔ منشی زیاد احمد اور ان جیسے لاتعداد بوڑھے بزرگوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ کہ انھوں نے دامے، درمے، سخنے، قدمے اور قلمے۔ اس خطۂ پاک کو حاصل کرنے کی تگ و دو کی تھی اور خدا کا صد لاکھ شکر کہ لاہور پاکستان میں آیا تھا۔

حالات کے سُدھرتے ہی سرکاری مُلازمین بھی اپنے عہدوں پر فائز ہو گئے

تھے۔ اب سجاد احمد ڈپٹی کمشنر لگ گئے تھے۔

منشی زیاد احمد نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا تھا اور زیادہ وقت یادِ الٰہی پر صرف کرتے تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو تو سرکاری ملازمت دلائی تھی مگر چاہتے تھے ان کا پوتا صحافت میں نام پیدا کرے اور اُن کے چھاپہ خانے اور بڑی لائبریری کو سنبھال لے۔ جو اب تک ایک دفینے کی صورت اختیار کرچکی تھی۔

اس لئے وہ معصوم سے حماد کو لے کر گھنٹوں اپنی لائبریری میں بیٹھے رہتے۔ نئی پرانی کتابوں سے اُس کا تعارف کراتے اور کتابیں نکال نکال کر اُسے دکھاتے اور بتاتے کہ انہوں نے یہ کتاب کب اور کیسے حاصل کی تھی۔ اسے اُنہوں نے کیسا پایا؟ گو وہ یہ بات سمجھنے کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ مگر اتنا وہ ضرور جان گیا تھا کہ کتابیں ایک بیش قیمت سرمایہ اور بہترین دوست ہوتی ہیں۔ ورنہ اُس کے معظم اور مقدس باباجان انہیں اتنی محبت اور پیار سے یوں سنبھال کر نہ رکھتے۔ بچپن ہی سے اُسے کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد باباجان اُسے اردو، فارسی کی تعلیم دیتے تھے۔ انگریزی کی طرف دیسے ہی اُس کی طبیعت مائل تھی۔ اس لئے وہ اپنی جماعت کا ذہین ترین بچہ مانا جاتا تھا۔

باباجان زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتے۔ ان کی تمام تر شفقت اور محبت بس حماد کے لئے وقف ہوگئی تھی۔ نہ جانے وہ اُس کے مستقبل میں کیا دیکھتے تھے کہ صبح و شام اپنے ساتھ رکھتے اور اپنے دل کی سب باتیں بتاتے۔ پریس اور کتب خانے کو وسیع تر کرنے کے لئے نئے نئے منصوبے اس کے سامنے رکھتے۔ اُن کا خیال تھا۔ جب بچہ جوان ہوجائے گا تو اُس کے لاشعور میں کوئی نہ کوئی بات ضرور رہ جائے گی۔ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے دادا کے نقشِ قدم پہ چلے۔

مگر حماد کی بدنصیبی کہ جب وہ نو سال کا تھا۔ باباجان کی عمرِ طبعی پوری ہوگئی۔ وہ اُسے روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔ اب اُس کی توجہ کا مرکز صرف اماں جان تھیں۔ وہ اُن سے کم شفیق

[وہ] ہر وقت بیمار رہتی تھیں۔

[ا]یک ایک سال بعد وہ بھی حماد کو چھوڑ کر باباجان کے پہلو میں جا لیٹیں۔ تب پہلی بار [تنہائی] کا شدید احساس ہوا۔ باپ سے وہ زیادہ مانوس نہیں تھا۔ سوتیلی ماں سے بس صاحب سلامت تھی۔ نہ اُنہوں نے کبھی جذباتی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ نہ اُس نے [ا]ن کا دامن تھامنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ضرورت ہی کیوں محسوس کرتا۔ دادا اور دادی کا لینوس اتنا وسیع تھا کہ زندگی کی ہر آرزو اور تمنا اس میں سما سکتی تھی۔

اب ——— سجاد احمد چاہتے تھے حماد کو اپنے گھر لے جائیں۔ یہاں اس حویلی میں [کس] طرح رہ سکتا تھا۔ پھر انہیں یہ بھی خیال تھا کہ حماد اُن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ عاصمہ کے اُوپر تلے چار بیٹیاں تھیں۔ مگر بیٹا کوئی نہیں ہوا تھا۔ سجاد احمد اپنے والد کا بہت [احترام کرتے] تھے اس لئے اپنے جگر گوشے کو دس سال تک اپنے سے دُور رکھا ہوا تھا۔ [اب] چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا اُن کے ساتھ اُن کی سرکاری رہائش گاہ پر رہے۔ بہترین اسکول [میں پڑھے] دُنیا کے ساتھ بھاگے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ ہر چند کہ حماد کا معصوم [دل] حویلی کے در و دیوار سے مانوس ہوچکا تھا۔ وہ تو اسی گھر کو اپنے جنم کا گھر سمجھتا تھا اس [لئے وہاں سے] کہیں نہ جانا چاہتا تھا۔ مگر جب اُس کے ڈیڈی نے اُسے مجبور کیا۔ اور اس کے سوا [کوئی چارہ نہ] رہا۔ تو وہ ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔

حماد کو اپنے ڈیڈی کی سرکاری رہائش گاہ پر آئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اس کے
کے کچھ عرصہ بعد سجاد احمد کمشنر بنا دیئے گئے تھے۔ اسے انہوں نے حماد کی خوش بختی
محمول کیا تھا۔ مگر حماد ــــــ گیارہ سالہ سنجیدہ اور باوقار لڑکا ابھی تک اس گھر
پوزیشن سمجھ نہیں پایا تھا۔ گھر تو یہ اس کے ڈیڈی کا تھا مگر سکہ یہاں ممی کا چلتا تھا۔ ڈیڈ
اس گھر سے برائے نام تعلق تھا۔ اکثر وہ گھر سے باہر دوروں پر رہتے ــــــ کبھی ممی کو
ساتھ لے جاتے ــــــ گھر میں بے شمار ملازم تھے۔ گھر ہر وقت ایک منظم حالت
کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ جاتی۔ ملازم سارے ممی سے بہت ڈرتے تھے اور ان
اشاروں پر ناچتے تھے۔ گھر میں کبھی کبھی دعوتیں اور پارٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ مگر بچوں
میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی چار چھوٹی بہنوں کے لئے کالی آیا مقرر تھی
کا کام تھا کہ بچیوں کے کھانے پینے کا خیال رکھے اور ماں سے دور۔ زیادہ تر ان
کمرے میں رکھے۔ حماد کو بھی اتنی بڑی کوٹھی میں ایک کمرہ مل گیا تھا۔ بیش قیمت قالین
مسہری، پردے۔ خوب سجا سجایا کمرہ تھا۔ مگر اس کمرے میں آتے ہی اس پر تنہائی
احساس شدید ہو گیا تھا۔ پھر یہ صرف کہنے کو اس کا کمرہ تھا۔ اپنی مرضی سے وہ اس کو

کوئی شے نہیں ہلا سکتا تھا۔ ہر چیز جہاں رکھی تھی۔ وہیں کے لئے مخصوص تھی۔ اگر وہ لیمپ
یا پلنگ کی کوئی شے اِدھر اُدھر کر دیتا۔ تو فوراً ملازم آ کر اسے یاد دلاتا کہ بیگم صاحبہ کا حکم ہے
ہر شے کو اپنی جگہ پر رہنے دیا جائے۔ صبح کو بستر سے اٹھنے کے بعد ملازم آ کر بستر ٹھیک
پھر سارا دن اس بستر پر لیٹنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ شکن آلود چادریں بیگم صاحبہ کو پسند نہ
تھیں۔ رات کو اپنے مقررہ وقت پر ملازم آتا اور بیڈ کور اٹھا کر بستر ٹھیک کر جاتا۔ اور لگے ہوئے
بستر پر وہ ڈرا سہما سیدھا دراز ہو جاتا، جیسے یہ گھر نہ ہو کوئی ہسپتال ہو۔ اپنائیت کا کوئی احساس
تھا یہاں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ویسا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سن سن کر وہ تھک گیا تھا۔ یہ اس
کے باپ کا گھر تھا۔ مگر وہ ایسے رہتا تھا جیسے چند دنوں کے لئے مہمان آیا ہو۔ بابا جان کی
حویلی میں یہ بات نہ تھی۔ اس کا کمرہ سارا دن کباڑ خانہ بنا رہتا۔ محلے کے بچوں کو اکٹھا کر کے
وہ اودھم مچاتا کہ الاماں۔ تکیے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کے منہ پر مارے جاتے۔ تھوڑی
دیر میں سارا بستر زمین پر آ رہتا۔ اور کمرے کا حشر خراب ہو جاتا۔ مگر اماں ذرا برا نہ مانتیں جب
سب بچے کھیل کر اور تھک ہار کر چلے جاتے تو وہ دھیرے سے اٹھتیں اس کا بستر
ٹھیک کرتیں۔ کتابیں اپنی جگہ پر جماتیں اور پھر اسے پہلو میں لٹا کر کہانی سنانے لگتیں۔ وہاں
محلے کے بے شمار بچے اس کے دوست تھے۔ مگر یہاں ــــــ یہاں تو ہر چیز پہ پہرے
تھے۔ یہاں عام لوگوں کے بچوں کو کمشنر ہاؤس کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی اور جو خاص لوگ
یہاں آتے تھے۔ وہ حماد کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ کبھی اگر کوئی بچہ اپنے والدین کے
ساتھ آ جاتا تو وہ عجیب انداز میں اپنے غیر ملکی کھلونوں کا ذکر کرتا۔ حماد کو یہ سب مصنوعی لگتا۔
اس لئے وہ حتی الوسع ایسے بچوں سے ملنے سے کتراتا۔ ایسے موقعوں پر ممی ہمیشہ ڈیڈی
سے کہتیں۔

"تمہارا یہ بچہ شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ کیونکہ اس کی تربیت شروع
سے صحیح نہیں ہوئی۔ اب یہ اس ماحول میں اپنے آپ کو

نہیں کر سکتا۔"

مگر ڈیڈی ہمیشہ کہتے۔ "رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" ڈیڈی نے خود کبھی اس کی طرف مائل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے تو وہ دن اچھے تھے جب وہ بابا جان کی بیٹھک میں ہر شام آتے تھے اور دس پندرہ منٹ اس سے گفتگو کرتے تھے۔

اب اوّل تو وہ گھر پہ نظر ہی نہ آتے تھے اور جو آتے بھی تو اُس سے نظریں چُرا جاتے ——— دُور دُور سے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ——— ممی سے اُس کے بارے میں سوال کرتے۔ مگر ایک دن بھی اس کے کمرے میں آ کر نہ بیٹھے تھے۔ نہ اُس کے دل کا حال جاننا چاہا تھا۔ یہاں اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے ڈیڈی صرف کمشنر صاحب ہیں۔ ڈیڈی بالکل نہیں ہیں۔ اس کا دِل چاہتا وہ واپس بابا جان کی حویلی میں چلا جائے تاکہ ڈیڈی باپ بن کر اُس سے ملنے آتے رہیں۔ شاید اس گھر میں وہ ممی سے بہت دبتے تھے یا شاید مصروف بہت زیادہ رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے۔ گھر میں آتے ہی تھکاوٹ اُن پر غالب آجاتی ہو ——— کہ وہ ایک دم بدل جاتے تھے۔

جہاں تک ممی کی ذات کا تعلق تھا۔ وہ عجیب و غریب شے تھی۔ حماد کا دِل بھی ہیں چاہا کہ انہیں ممی بُلائے۔ لیکن چونکہ اُس کی بہنیں اُسے ممی کہہ کر پکارتی تھیں اور اُس کے ڈیڈی نے بھی یہی سمجھایا تھا کہ یہ ہی تمہاری ممی ہیں۔ اس لئے وہ انہیں ممی کہتا ——— ممی کہتے وقت اُس کا چہرہ اتنا سپاٹ ہو جاتا اور آواز اتنی بے اثر ہوتی کہ اُسے خود اس لفظ سے گھن آنے لگتی۔ کیا ممی اس طرح کی ہوتی ہے ——— نہیں ——— وہ تو کوئی راتوں کو خوابوں میں ڈرانے والی شے لگتی تھیں۔ چھ فٹ سے کچھ کم ہی ہو گا اُن کا قد۔ جسم بالکل سیدھا اور لمبا تھا درمیان میں کوئی خم یا گداز نہیں تھا۔ اس کے جسم کی طرح اس کا چہرہ اور لہجہ بھی بالکل سپاٹ تھا۔ رنگت گوری تھی۔ مگر سارے چہرے پر بھورے بھورے تل تھے۔ کندھوں تک کٹے ہوئے بال تھے۔ صبح اٹھتے ہی وہ رولرز لگا لیتیں۔ اور سر پہ ایک باریک رومال

لمبا سا گاؤن پہننے نوکروں کو ہدایات دینے لگ جاتیں۔ شام ہوتے ہی خوب ...نگ کی لپ اسٹک لگا کر بیٹھ جاتیں۔ جتنی روانی سے انگریزی بولتی تھیں۔ ...سے سگریٹ بھی پیتی تھیں۔ حماد کو وہ سگریٹ پیتی ہوئی بہت بُری لگتی تھیں۔ ...ں نے ابھی تک سُنا ہی نہ تھا کہ عورتیں بھی سگریٹ پیتی ہیں۔ کیونکہ بابا جان کہتے تھے ...نوجوانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اُس نے اپنے ہوش میں پہلی بار کسی عورت ...ٹ پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں سگریٹ پکڑ کر کش لیتیں ...اں لمبے ناخنوں کی مدد سے سگریٹ سے راکھ جھاڑتیں تو اُسے گھن آنے لگتی۔ جانے ...کیسے برداشت کرتے تھے۔ اور پھر اُسے ممی کے ملنے جلنے والے بھی نہیں بھاتے ...اُن کے ملنے جلنے والوں میں۔ مرد اور عورتیں سبھی شامل تھے۔ وہ مردوں سے بڑی ...سے ملتیں اور بات بات میں اُونچے اُونچے قہقہے لگاتیں۔ ان کے سارے انداز ...مردانہ لگتے۔ ایسے میں ڈیڈی بالکل خاموش اور شرمائے شرمائے انداز میں بیٹھے ...۔ اُسے بہت تعجب ہوتا کہ یہ ڈیڈی ——— جو دفتر میں بڑے دبدبے والے ہیں۔ ...بڑے بڑے فیصلے کرنے کا دماغ رکھتے ہیں۔ ممی کے سامنے کیوں بھیگی بلّی بن جاتے ...جیسے وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ جو کچھ ہیں اس گھر میں ممی ہیں۔

...ممی سے وہ کیا شکوہ کرتا۔ ممی تو اپنی بچیوں سے بھی سوتیلی ماں جیسا سلوک کرتی تھیں ...پیار سے اُن کے ساتھ نہیں بولتی تھیں۔ اگر وہ مچل کر گود میں آنا چاہتیں تو انہیں ...دیتیں۔ بس دن میں ایک بار اُن کے کمرے میں جاتیں۔ کھڑے کھڑے آیا کو اُن ...لئے دن بھر کی ہدایات دیتیں اور پھر اُلٹے پاؤں واپس آجاتیں۔

جس ماں کو اپنی بچیوں سے پیار کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ بھلا حماد کے دکھتے ...کیسے پھاہا رکھ سکتی تھی؟

شروع شروع میں ایسا بھی ہوا کہ اُن کی کوئی سہیلی یا ملنے والی آتی۔ اور حماد کو دیکھ

کر استفسار کرتی کہ یہ کون ہے ۔ تو عاصمہ بڑی بے پرواہی سے کہتی۔

"یہ سجاد کی پہلی بیوی میں سے ہے ۔"

"ہائے کتنا پیارا بچہ ہے" اُس کی ایک سہیلی ادا سے کہتی ۔ تو حماد کو اس کے مصنوعی انداز پر اور بھی غصہ آتا ۔ جیسے کہ اُس پر احسان کیا جا رہا ہو۔

مگر اب حماد ان سب باتوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا ۔ جو ماں اپنی بچیوں کو کلیجے لگانا معیوب سمجھتی ہو۔ اُس سے کوئی توقع رکھنا عبث تھا۔ البتہ بچیاں حماد سے بہت ہو گئی تھیں۔ وہ بھی اپنا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتا۔ انہیں تصویریں بنا کر دیتا۔ کتابوں میں سے کہانیاں پڑھ کر سناتا۔ اچھے اچھے لطیفے سناتا۔ اس لئے وہ بار بار بھائی جان کے کمرے میں آتیں۔ کبھی کبھی جب عاصمہ کو خبر ہو جاتی کہ بچیاں اُس کے کمرے میں ہیں، و غصے سے بھری ہوئی آتیں اور آیا کو ہزار صلواتیں سناتی کہ وہ اس کے گھر کے ڈسپلن کو خراب کر رہی ہے۔ کوئی بچہ کسی کے کمرے میں نہیں جائے گا۔

اسکول کا کام کرنے کے بعد۔ حماد کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے ۔ وہ تنہا اپنے کمرے میں لیٹا ننھی منھی کتابیں پڑھا کرتا۔ اسے جو بھی پیسہ ملتا۔ وہ اس کی کتابیں خرید لاتا۔ اور بابا جان کی طرح اپنی ایک ننھی منھی سی لائبریری اس نے اپنے کمرے میں بنانی شروع کر دی تھی۔ وہ ان کتابوں کو ترتیب سے رکھتا۔ اور پھر رات گئے تک کتابیں پڑھتا رہتا۔

کبھی کبھی۔ گھر کے کسی کمرے سے اٹھنے والے قہقہے اور کھنکتے ہوئے برتن اس کا سکون منتشر کر دیتے ۔ اس کا دل چاہتا۔ وہ اُٹھ کر دروازے میں سے جھانک کر دیکھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے ۔ مگر ممی کے خوف سے وہ ایسا نہ کر سکتا۔ اگر انہوں نے اُسے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تو نہ جانے کتنی بڑی سزا دیں۔

ویسے گھر میں رات گئے تک کیا ہوتا رہتا ہے ۔ ؟ اُس کے ننھے سے ذہن میں کھد بد ہونے لگتی ۔ جب ڈیڈی دورے پر ہوتے تب بھی ۔ رات کو گھر میں ہنگامہ

برتن کھنکتے رہتے اور قہقہے اُبلتے رہتے۔

اس کو کوئی پُر اسرار سی جادو گرنی لگنے لگی تھی۔ جس کا رات کو کوئی اور رُوپ دن کو کوئی اور۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ان دنوں حماد کے ڈیڈی کراچی میں تعینات تھے۔ پچھلے سال حماد نے بڑے اچھے نمبرے کر میٹرک پاس کیا تھا۔ اور اب اُنہوں نے اسے ایک مقامی کالج میں داخل کرادیا تھا کالج میں داخلہ لینے کے باوجود حماد ابھی تک اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکا تھا وہ ابھی تک وہی بند بند اور کھنچا کھنچا لڑکا تھا۔ جس کی صورت دیکھتے ہی ایسے لگتا جیسے گھر سے لڑ کر آیا ہے۔ مگر گھر میں تو کبھی لڑنے کا موقع ہی نہ آیا تھا۔ لڑتا بھی تو کس سے۔ ہاں البتہ وہ ایک دن دل کھول کر جھگڑا کرلیتا تو شاید اُس کے چہرے کا یہ سوناپن اور کھردرا تاثر مٹ جاتا۔ مگر وہاں تو کسی کو اس سے بات کرنے کی فرُصت ہی نہ تھی۔ بلکہ اُس کی ضروریات کی چیزیں بھی اُسے بن مانگے مل جاتیں۔ ممی جب شاپنگ کے لئے جاتیں اپنی بچیوں کے کپڑوں کے ساتھ اُس کے کپڑے بھی موسم کے مطابق لیتی آتیں۔ اُنہوں نے کبھی اُس سے نہیں پوچھا تھا۔ آیا کپڑوں کا ڈیزائن یا رنگ اُسے پسند آیا ہے یا نہیں۔ یا نئے ڈھنگ کے کپڑے پہننا وہ پسند بھی کرتا ہے یا نہیں ——— البتّہ یہ بات اُس کے لئے واقعی حیران کن بھی کہ ممی کو اس کی تمام ضروریات ... تہ تھا۔ عمر کے مُطابق جس جس شے کی ضرورت اُسے پڑ سکتی تھی، ممی لا دیتیں۔ اور پھر اس کے کمرے میں بھجوا دیتیں ——— ہر شے اگرچہ اپنی جگہ

...اہم ہوتی۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے اتنی چیزیں دیکھ کر ایک دم غصّہ آنے لگتا۔ ممی ...سمجھتی ہیں کہ میں ایک کٹھ پتلی ہوں۔ میری اپنی پسند ناپسند کوئی نہیں۔ یا مجھے کوئی ...نے کی تمیز نہیں۔ پہچان نہیں۔ میں لڑکا ہوں۔ مجھے بھی اپنی لڑکیوں کی طرح سمجھتی ...جو کچھ لادیا وہی پہن لیا۔ آخر وہ مجھے بھی تو ساتھ لے جاسکتی ہیں۔ لڑکیوں کی طرح مجھے ...پردوں میں چھپا کر کیوں رکھنا چاہتی ہیں۔ یا وہ مجھے اتنا حقیر سمجھتی ہیں کہ اپنے ساتھ ...پسند نہیں کرتیں۔ یا سارے گھر کی طرح مجھ پر بھی اپنی پسند ٹھونسنا چاہتی ہیں۔ ہاں سارے ...وہ مالکہ ہیں۔ ڈیڈی کے لئے شاپنگ کا اختیار رکھتی ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ میں بھی ...پسند و ناپسند کا شکار ہو جاؤں۔ معاشرے کا ایک جیتا جاگتا فرد ہونے کی حیثیت ...بری اپنی بھی ایک رائے ہے۔

...جب بھی ممی اُس کے لئے چیزیں خرید کر لاتیں وہ ایسی باغیانہ باتیں سوچنے لگتا۔ ...لی سے ان چیزوں کو دیکھتا اور بیدردی سے استعمال کرتا۔ بٹن ٹوٹ جاتے تو وہ کبھی ...جوتا پھٹ جاتا تو وہ بھی کسی نوکر سے نہ کہتا کہ منوالائے۔ جانے کیسے اس کی چیزیں آپ ...پ مرمت ہو جاتیں۔ پھٹے کپڑے کوئی اٹھا لیتا۔ جوتے پالش ہو جاتے ——— کبھی ...وہ سُنتا ممی ڈیڈی سے اس کی شکایت کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔

...اس قدر لاپرواہ اور غیر ذمّے دار لڑکا ہے کہ اپنے مُنہ سے کچھ نہیں کہتا۔ کسی روز اگر ...کا بٹن ٹوٹ جائے تو مجال ہے کسی نوکر سے کہہ کر لگوالے۔ اسی طرح بٹن کے بغیر ...پہن کر چلا جاتا ہے ——— اس عمر میں لڑکوں کو اپنے لباس وغیرہ کا شعور آجاتا ...کھ سال ہوئے اسے اس گھر میں آئے ہوئے۔ مگر ابھی تک اُس نے خود کو اس ...گھر نہیں سمجھا۔ جب کبھی مجھے فرصت ملتی ہے میں ہی نوکروں سے کہہ کر اُس کی ...صاف کراتی ہوں۔ اور ناقابلِ استعمال کپڑے نکال کر اُن کی جگہ نئے لادیتی ہوں ...چاہیئے یہ اب اپنا مدُعا بیان کرے۔ گھر میں اتنے نوکر ہیں۔ اگر اپنے ذاتی کا مول

پاک سوسائٹی

کے لئے مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے تو نوکروں سے کرا لیا کرے۔" جانے آگے سے
ڈیڈی نے کیا جواب دیا تھا اُس نے نہیں سُنا ——— اُسے تو ممی کی یہ شکایت سُن کر
بڑا مزہ آیا جس طرح ممی اُسے اپاہج سمجھ کر اُس کا ہر کام اپنے ذمے لئے ہوئے تھیں۔ وہ
بھی انہیں خاموش رہ کر ایک تکلیف پہنچا رہا تھا۔ اور اس کے لئے یہ بات کافی سکون بخش
تھی۔ اس گھر میں آ کر وہ ایک پر کٹی چڑیا کی مانند ہو گیا تھا۔ ناشتے کے وقت ناشتہ ———
کھانے کے وقت کھانا ——— چائے کے وقت چائے ——— آگے پیچھے اگر تمہارا
دل چاہے بھی تو تم نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ یہ کمشنر ہاؤس کے آداب کے خلاف ہے
ہر وقت کپڑے بدل کر بنے ٹھنے رہو۔ شام ہو تو شام کا لباس پہنو۔ رات پڑ جائے تو
سلیپنگ سوٹ پہنو ——— کیونکہ تم کمشنر کے بیٹے ہو۔ اور یہ بھی کمشنر ہاؤس کے آداب
میں شامل ہے۔ مہمان آتے ہوں تو سلام کر کے اُٹھ جاؤ۔ وہاں ایک پل بیٹھنے کی تمہیں
اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی سے دل نہیں ملتا تو بھی اس سے ضرور باتیں کئے جاؤ۔ کیونکہ
سرکاری ملازمین کے بچوں کو بھی ایک دوسرے کے مرتبے کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ اور ہر کام کے
لئے نوکر کو بلاؤ۔ جیسے وہ تمہارے اعمال کے فرشتے ہیں۔ کہیں پر تم بے اعتدالی نہیں کر
سکتے۔ کیونکہ تم کمشنر ہاؤس میں رہتے ہو۔ اور کمشنر ہاؤس کے باہر ہمیشہ ایک دربان رائفل
اٹھائے پہرے پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ تمہارے باپ کی شان اور دبدبے کا مظہر ہے۔ اس
لئے تم جب بھی گھر سے باہر نکلو تو سینہ تان کے نکلو۔ اوّل تو موٹر میں بیٹھ کر جاؤ۔ اور تم سے
جتنے لوگ ملنے آئیں، تمہارے شایانِ شان ہوں۔ کوئی تم سے کمتر نہ ہو۔ حماد کو یوں محسوس
ہوتا۔ یہاں صرف گیٹ پر ہی ایک رائفل بردار دربان پہرے پر نہیں ہے۔ بلکہ اس گھر
میں ہر جگہ ایسے ہی سنگین پہرے ہیں ——— یہ پہرے دلوں پر ——— نگاہوں پر اور
احساسات پر بھی بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان سے مبرا بس ایک ممی کی ذات ہے۔ جو جادوگرنی
کی طرح سب پر مسلط ہو گئی ہے ——— اور جس کے آگے کوئی پَر نہیں مار سکتا ———

انا لئے اسے دُنیا کی ہر ماں سے نفرت ہو گئی تھی۔ ماں ایثار و قربانی کا منبع
ہے یا اولاد پہ اپنا آپ مسلط کر کے اس سے ہر احسان کی قیمت وصول کرتی ہے
لباس کی طرف سے بھی وہ لاپرواہ ہو گیا تھا۔ بلکہ اُسے اچھے اور خوبصورت لباس
رت ہو گئی تھی۔ جو محض دوسروں کو یہ بتانے کے لئے پہنا جاتا ہے کہ ہماری حیثیت
ں سے اونچی ہے۔ یا معاشرے میں ہم کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وقت پہ
انے سے بھی اُسے نفرت ہو گئی تھی۔ کھانا اسی وقت کھانا چاہیئے۔ جب جی
ہو گیا ——— کہ چونکہ میز لگی ہے اور سب کو اس پر بیٹھ کر کھانا ہے۔ اسی
ہ جاؤ۔ کیونکہ آداب کا یہ تقاضا ہے۔
نی گھٹن اس چھوٹے سے لڑکے کے اندر تھی۔ اور نکاس کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لئے
اچہرہ ہر وقت بور بنا رہتا۔ جیسے کہ لڑ کر آیا ہو۔ کالج میں بھی اُس نے دوست
بنائے تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتا۔ گاڑی اُسے کالج چھوڑ آتی۔
اسے گھر لے آتی۔ لڑکے سمجھتے چونکہ وہ کمشنر صاحب کا لڑکا ہے۔ اس
مغرور ہے۔ ایسی بات نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ وہ بھی عام لڑکوں کی طرح رہے سائیکل
پر کالج آئے۔ جس طرح باقی لڑکے اچھل کود کرتے ہیں اور خوب ہاؤ ہو مچاتے ہیں
ایسا ہی کرے۔ وہ عام لڑکوں کو دوست بنانا چاہتا تھا۔ جن میں طبقاتی شعور نہیں
کھلے اور صاف دل کے لڑکے تھے ——— مگر اُس کی ممی کا حکم تھا کہ ایرے غیرے
اس گھر میں نہ آئیں۔ اپنے سے اونچے مرتبے کے بچوں کو دوست بناؤ۔
ایک بار اُس نے ڈرتے ڈرتے ڈیڈی سے کہہ ہی دیا کہ اُسے سائیکل لے دیں
ئیکل پر کالج جانا چاہتا ہے۔
اسی وقت ممی اوپر سے آ گئیں اور جھٹ بولیں۔
دیکھا! تمہارا بیٹا کتنے گھٹیا خیالات کا مالک ہے۔ اس لئے میں شروع سے کہتی

تھی اسے اپنے پاس رکھو۔ لوگوں کے بچوں کو شوق ہوتا ہے کہ اُن کے پاس کار ہو
ڈرائیور انہیں چھوڑنے جاتے۔ اور یہ اس زمانے میں سائیکل کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اِسے
باپ کے مرتبے کا بھی خیال نہیں ہے اسے —— لوگ کیا کہیں گے —— باپ کے
پاس دو کاریں ہیں۔ اور بیٹا سائیکل پر مارا مارا پھرتا ہے —— مجھے تو یہ لڑکا کبھی سمجھ
میں نہیں آئے گا —— اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھو —— بن مانگے ہر چیز مہیا
کرو —— یہ پھر بھی خوش نہیں ہے ——"

ممی کی تقریر سُن کر اُس نے سر جھکا لیا تھا۔ اور ڈیڈی پائپ کا لمبا کش لے کر رہ گئے
تھے۔

"تمہاری ممی ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا۔" اور ڈیڈی بھلا کیا کہہ سکتے تھے۔ ممی کے
آگے تو وہ بول ہی نہ سکتے تھے۔ پھر ممی جو کچھ اپنی مرضی سے کرتی رہتی تھیں۔ اسے احسان
کہتی تھیں۔ اس کی قیمت وصول کرنا چاہتی تھیں۔ اپنی مرضی اس پر ٹھونسنا چاہتی تھیں
وہ اس کمشنر ہاؤس پر تمام تر اپنا حق سمجھتی تھیں۔ وہ حماد کو بھی ایک عضوِ معطل بنا دینا چاہتی
تھیں۔ وہ اپنی فطرت کو بدل تو نہیں سکتا تھا اُسے اپنے ڈیڈی بھی ڈیڈی نہیں لگتے تھے۔ وہ
حیران ہوتا —— کیا یہ بابا جان کے بیٹے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بابا جان ایک بہادر
عالم اور صاف گو، صاف باطن انسان تھے۔ ڈیڈی تو ایک دم بزدل —— کمزور
ڈھیلے سے آدمی لگتے ہیں۔ اس عمر میں بھی اماں جان بابا جان کی تابعداری کرتے نہ تھکتی
تھیں۔ ایک بار بُلاتے تو سو بار دوڑی آتی تھیں۔ جب تک بابا جان گھر پر رہتے وہ اُن
کے آگے پیچھے پھرتی رہتیں۔ کھانا اپنے ہاتھ سے آگے لا کر رکھتیں۔ انہیں کپڑے نکال
کر دیتیں۔ شلوار میں آزار بند خود ڈالتیں۔ جب وہ مسجد جانے لگتے نمازِ جمعہ کے لئے
تو جلدی سے اُن کا عصا اٹھا کر کانپتے ہاتھوں سے اُن کے ہاتھوں میں تھما دیتیں
اور پھر گھر کے دیگر دھندوں میں محو ہو جاتیں۔ اتنی خدمت کے باوجود جب کبھی بابا جان

غصہ آجاتا تو خوب اُنہیں ڈانٹتے۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے سُنا کرتیں جب
غصے میں بپھرے باہر نکل جاتے۔ تو حماد آکر اماں جان کی گردن میں جھول جاتا۔
اُن کا چہرہ دیکھتا کہ ڈانٹ سننے کے بعد کہیں وہ رو تو نہیں رہیں ——
اماں ڈانٹ کھانے کے بعد آپ روتی نہیں۔" تو وہ مُسکرا کر ہلکے سے چپت
اور کہتیں۔ "پگلے یہ کوئی ڈانٹ ہے۔ مجھے سمجھانے کا تو اُنہیں حق پہنچتا ہے۔"
حماد کو تعجب ہوتا کہ یہ سمجھنے یا سمجھانے کا کیا انداز ہے۔ اور کونسی عمر ہے؟
لیکن اب حماد کو اور ہی قسم کا تعجب ہوتا۔ یہاں تو ڈیڈی ممی کے ساتھ اونچی آواز
نہیں سکتے تھے۔ ڈانٹنا تو الگ رہا —— ہاں ممی ہر وقت ڈیڈی کے پیچھے
ہیں۔ دن کے وقت کبھی اگر انہیں ایک ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھنے کا موقع
تو اُسے ممی کے اونچا اونچا بولنے اور لڑنے کی آوازیں آنے لگتیں۔
ڈیڈی کی جگہ اگر ممی کمشنر ہوتیں تو کیا تھا۔ ؟
اب حماد سیانا ہو گیا تھا۔ اُس کے زرخیز ذہن کو زیادہ توانائی کتابوں نے بخشی تھی
وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا۔ اُن میں جاسوسی ناول، رومانوی ناول اور معاشرتی
بھی کچھ شامل ہوتے۔ اپنے اِرد گرد کے ماحول کو سمجھنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔ اور
اُسے تعجب بھی ہوا تھا اور دُکھ بھی کہ اُس کے ڈیڈی شراب پیتے ہیں۔ اور
اُن کے ہاں جو دیر تک محفلیں ہوتی ہیں۔ وہ شراب کی محفلیں جمتی ہیں۔ قہقہے
ہیں۔ اور بوتلیں کھلتی ہیں۔
ممی کا جو انتظام اس گھر میں تھا۔ اس کے تحت تو شاید اُسے ساری زندگی علم نہ ہو
اُن کے ڈیڈی پیتے ہیں۔ مگر ایک رات وہ ڈیڈی سے پوچھ کر فلم کا آخری شو
چلا گیا تھا۔ جب واپس آیا تو —— ڈرائنگ رُوم سے آوازیں آ رہی تھیں۔
سوچا ذرا جھانک کر دیکھتا جاؤں۔

جھانکا تو ـــــ ڈیڈی اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے پی رہے تھے۔ پہلے تو اسے یہ نظر کا دھوکا لگا۔ مگر اُس نے دوبارہ جھانکا۔ تو تصدیق ہو گئی۔ لمبی لمبی خوبصورت بوتلیں۔ وہ اب انہیں اچھی طرح پہنچاننے لگا تھا۔ انگریزی رسالوں میں ان کی تصویریں ہوتیں۔ انگریزی فلموں میں بھی یہی بوتلیں دکھائی جاتیں۔

اور یہی بوتلیں ٹرالی پر رکھی تھیں۔ ڈیڈی کی نگاہیں بدل چکی تھیں۔ اُن کے دوست بھی بدمست حالت میں تھے ـــــ مگر وہ لوگ پی رہے تھے ـــــ بڑے سکون اور بڑی محویت سے ـــــ شاید ممی ادھر آ رہی تھیں۔ اُن کے پاؤں کی چاپ سن کر اُس نے جھانکنا بند کر دیا۔ اور بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ تو ڈیڈی ممی کے سامنے پیتے ہیں۔ ممی اُن کو منع نہیں کرتیں۔ بستر پر لیٹ کر وہ سوچنے لگا۔ یکایک بابا جان اپنی سفید داڑھی اور لمبی تسبیح کے ساتھ اس کے تصوّر میں آ گئے ـــــ

"بیٹا۔ فرنگیوں نے ہمیں تباہ کرنے کے لئے جو تحفے دیئے ہیں۔ اُن میں سگریٹ اور شراب سرِفہرست ہیں۔ سگریٹ نوجوانوں کی صحت و توانائی کا دشمن ہے۔ مگر دوست بن کر سینے سے چمٹ جاتا ہے اور شراب اس سے بھی بُری ہے۔ یہ تھوڑی دیر کے لئے انسان کو دنیا کی الجھنوں سے دُور ضرور کر دیتی ہے۔ وہ لمحہ بھر کو خود کو جوان اور اس دُنیا کا شہنشاہ سمجھنے لگتا ہے۔ مگر یہ سب فریب ہوتا ہے۔ دیکھنا بیٹا! اگر تم سچے مسلمان ہو تو ـــــ اپنی قدرتی صلاحیتوں کو شراب کے حوالے مت کرنا!"

بابا جان! آپ نے ڈیڈی کو یہ نصیحت کیوں نہ کی تھی۔ کیا تب آپ کے پاس اپنے بیٹے کے لئے ایسے ہی وقت نہیں ہوتا تھا۔ جیسے میرے ڈیڈی کے پاس اپنے بیٹے کے لئے وقت نہیں ہے ـــــ"

پچھلے دو سالوں میں حماد کے ذہن و دل میں عجیب طرح کا انقلاب آیا تھا۔ اب وہ سہما ڈرا ڈرا ـــــ اور کھردرا سا خشک مزاج لڑکا نہیں بنا رہتا تھا۔ بلکہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگ گیا تھا۔ یعنی بات بے بات نوکروں سے اُلجھ پڑتا۔ اُن پر حکم چلاتا۔ جو احکامات ممی صادر کر کے جاتیں۔ بالکل ان کے متضاد احکامات جاری کر دیتا۔ نوکر الگ پریشان ہوتے اور جو کوئی اس کا کہنا نہ مانتا تو جو چیز بھی اُس کے ہاتھ لگتی۔ توڑ دیتا۔ کپڑا ملتا پھاڑ دیتا کپڑوں کے علاوہ اُس نے کئی بار اپنے تکیے بھی پھاڑ دیتے تھے۔

ان دو سالوں میں وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح خوب لمبا تڑنگا نکل آیا تھا۔ چہرے پر داڑھیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ چہرے پر کہیں کہیں دانے نکل آئے تھے۔ سُنہری بال بھی سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ اور نیلی آنکھیں جو ورثے میں ماں سے ملی تھیں۔ اب کچھ کچھ بھوری ہوتی جا رہی تھیں اور ہمہ وقت اُن میں غصّہ اور نفرت رہتے۔ جتنا لمبا ہو گیا تھا اتنا ہی دُبلا بھی ہوتا جاتا تھا۔ اپنے جلنے کڑھنے کی عادت کی وجہ سے ماس تو اس کے جسم پر چڑھتا ہی نہ تھا۔ اس لئے چلتے میں ڈولتا کئی دفعہ یوں محسوس ہوتا۔ ابھی گرا کہ گرا ـــــ جتنا بے ڈھنگا اس کا حلیہ ہو گیا

تھا۔ اتنا ہی بے ڈھنگا اس کا برتاؤ ہو گیا تھا۔ نوکر اُس سے عاجز آئے رہتے اور ممی بے زار رہتیں۔ کوئی دن نہ جاتا جب ممی ڈیڈی سے اس کی شکایت نہ کرتیں۔ ڈیڈی حسبِ معمول سُن کر خاموش ہو رہتے۔

مگر جب اُس نے گھر کے برتن توڑنے شروع کر دیئے اور تکیوں کے غلاف پھاڑنے شروع کئے تو ممی کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اُنہوں نے ڈیڈی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس جنگلی کو اپنے گھر میں نہیں رکھیں گی۔ اُس کی بُری صحبت کا اثر اُن کی جان ... لڑکیوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اور اگر ڈیڈی نہ مانے تو وہ خود گھر سے نکل جائیں گی۔ حماد دل سے چاہتا تھا کہ وہ اس گھر سے نکل جائیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ گھر ممی کے بغیر کیسا لگ... ہے۔ ممی جو اپنے آپ کو افلاطون سمجھتی تھیں اور ہر شے کو اپنی ذاتی ملکیت گردانتی تھیں اِ... کبھی اس گھر سے دست بردار ہو جائیں تو کتنا مزہ آئے۔ لیکن ممی اتنی آسانی سے دستبردار ہونے والی شے نہ تھیں۔

ممی تو اصل میں حماد کو اس گھر سے ہمیشہ کے لئے نکالنا چاہتی تھیں۔ اُس کی ایک ... وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ نہ جانے انہیں کیسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ حماد نے اُن کی جاسوسی شروع کر رکھی ہے ۔ ۔ ۔ اُن کی ہر بات کی خبر رکھتا ہے ——— کون آیا تھا۔ کیوں آیا تھا۔ نوکروں سے ایسے سوالات کرتا ہے۔ خاص طور پر جب سجاد احمد دورے پر ہوتے تو وہ یوں دندناتا پھرتا جیسے وہی کمشنر لگا ہوا ہے۔ ورنہ کمشنر کا نائب ضرور...

ادھر حماد کے ذہن میں ایک اور طوفان جاگ اٹھا تھا۔ اسے ممی کا سارا کردار اور طرزِ عمل مشکوک لگ رہا تھا۔ خصوصاً جب سے اُس نے ممی کو بھی شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کھلم کھلا باغی ہو گیا تھا۔ اس رات جب اُس نے ڈیڈی کو ڈرائنگ رُوم میں پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو جانے کیا ہوا۔ اکثر راتوں کو اس کا دل چاہتا اُٹھ کر جھانکے اور دیکھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اپنی اس خواہش کو وہ دبا نہ سکا۔ اور یہ اس کا معمول بن...

...ت کو جب سب نوکر چاکر چلے جاتے۔ اور خم و ساغر کی محفل جمتی تو وہ خاموشی سے ...بستر سے اٹھتا۔ چوروں کی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا جاتا اور ان کے کمرے میں ...کوئی ایسی راہ ضرور ڈھونڈ لیتا جس میں سے پینے والے نظر آ رہے ہوں۔ پھر وہ ...گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ اسے ان پر غصہ بھی آتا مگر زیادہ سے زیادہ انہیں دیکھتے رہنے ...رہتا۔ پھر وہ دل میں یہ بھی سوچتا کہ یہ لوگ پیتے ہوئے اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے ...کس قدر بُرے اور احمق لگ رہے ہیں۔ کاش کوئی انہیں بتا سکے یا کم از کم آئینہ ...دکھا سکے۔ کہ تم اس وقت دُنیا کے بے وقوف ترین لوگ دکھائی دے رہے ہو اندر ہی ...کڑھنے کے باوجود دیکھتا رہتا۔ شاید اُسے دیکھتے رہنے کا چسکا پڑ گیا تھا اور جب اُن ...کی حالت غیر ہونے لگتی تو وہ بھی چپکے سے بھاگ کر آتا اور اپنے بستر پر لیٹ جاتا۔

ایک بار یہ محفل ڈیڈی کے کمرے میں جمی تھی۔ اس رات باہر سے پینے والے نہیں تھے۔ مگر اُس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر ڈیڈی کے کمرے کے دروازے میں ...والا سوراخ ہوتا ہے۔ وہاں سے دیکھنے کی جگہ بنا لی اور یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا ...ڈیڈی کے ساتھ ممی بھی پی رہی ہیں۔ بلکہ ڈیڈی ہی ان کے گلاس میں شراب انڈیل رہے ...کس قدر بے غیرت ہیں ڈیڈی۔ اُس نے دل میں سوچا "میں نے تو سنا تھا شراب پینے ...والے مردوں سے عورتیں مارے نفرت کے طلاق لے لیتی ہیں۔ کہاں یہ بے غیرتی کہ ...بیوی شراب پی رہی ہے اور شوہر اس کو جام پر جام بنا کے دے رہا ہے"

اُسے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی ڈیڈی کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ ڈیڈی وہ ڈیڈی ...نہیں رہے ——— ممی کا کالا جادو ان پر چل چکا ہے۔

واقعی ممی کا کالا جادو اُن کو پوری طرح محیط کر چکا تھا۔ کیوں کہ اُن کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ممی ...کس طرح رہتی ہیں اور اُن کے کس کس سے کیا کیا مراسم ہیں۔

...دنوں میں اُن کو کئی بار غیر مردوں کے فون آتے تھے۔ اب چونکہ وہ سیانا ہو گیا تھا———

اور متجسّس بھی رہتا تھا۔ اس لئے فون کی گھنٹی بجتے ہی فوراً دوڑ کر جاتا۔ حالانکہ ممی نے نوکرو
کو سختی سے منع کر چھوڑا تھا کہ حماد کوئی فون نہ سننے پائے۔ کئی نوکر اس سے اُلجھ چکے تھے
مگر گھنٹی بجتے ہی وہ بھی دوڑتا اور بعض اوقات نوکر کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیتا۔ او
اُسے تعجّب ہوتا کہ اکثر مرد فون پر ممی کو بُلاتے۔ اُن میں شہر کے بڑے بڑے رئیس،
سیاست داں اور قانون داں قسم کے لوگ بھی ہوتے جن کا ملک میں چرچا تھا! اور جو
اپنی اپنی جگہ بہت کچھ سمجھے جاتے تھے۔ بھلا ممی کو اُن سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر
یہ لوگ ڈیڈی کو فون کرتے تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی۔

اب وہ اس دھن میں رہتا کہ وہ چھپ کر سُنے کہ ممی اُن سے کیا باتیں کرتی ہیں اور کس
قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ کئی بار ممی نے اُسے چھپ کر اپنی باتیں سنتے ہوئے پکڑا بھی تھا اور
اُس کی ان فضول عادتوں کی شکایت بھی ڈیڈی سے کی تھی۔

لیکن حماد کے اوپر تو ایک ہی دُھن سوار تھی۔ کہ کسی روز وہ اس عورت کا پتہ چلا
کر کے رہے گا جس نے ہر ایک پر اپنا سحر پھونک رکھا ہے اور جس کے جادو کے زیر اثر
یہ گھر چل رہا ہے۔ اس کو اُن کا کردار شیکسپیئر کے ڈرامے کی چڑیلوں جیسا لگتا۔ جو ہمیشہ
بھیانک پیش گوئیاں کرتی تھیں۔

ممی کا بظاہر وہ ابھی تک لحاظ کرتا تھا۔ نظر جھکا کے بات کرتا۔ اور جو کسی بات پر تُو تُو مَیں مَیں
کی نوبت آنے لگتی تو جلدی سے سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلا جاتا ——— وہ سمجھتا تھا اس گھر
میں ممی کا جو مرتبہ ہے وہ اُسے نہیں جھٹلا سکتا۔ اس کے علاوہ کب اُنہوں نے اُس
کی سگی ماں بن جانے کا دعویٰ کیا تھا۔ انہوں نے تو اُس کے گھر آتے ہی ملنے جلنے والوں
سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ "یہ سجّاد کی پہلی بیوی میں سے ہے۔" اور اُس کے معصوم ذہن میں
ماں کا جو معصوم سا ہیولیٰ یا تلاش تھی وہ اس گھر میں آتے ہی ختم ہو گئی تھی۔
اماں جان نے تو کبھی اُسے ماں کی کمی محسوس ہونے ہی نہ دی تھی اس لئے وہ ابھی

...م ماں بھی سمجھنے لگ گیا تھا۔ اور جب ذرا سیانا ہونے پر اُسے اِدھر اُدھر سے معلوم ہو
...ں کی دادی ہیں تو اُس نے استفسار شروع کر دیا کہ ـــ
...ماں اگر دادی اماں آپ جیسی ہوتی ہیں۔ تو ماں کیسی ہوتی ہے؟ آپ سے اچھی تو نہ
...ہوگی؟ مگر اماں نے ہمیشہ اس بات کو اس خوبصورتی سے ٹالا کہ اُس کے معصوم ذہن
...بھی اس بات کو اہمیّت ہی نہ دی۔ ماں اگر ہوتی ہے تو ہوتی ہوگی۔ اماں جان اور باباجان
...پیاری تو دُنیا میں کوئی شے نہیں ہو سکتی ——— ڈیڈی اُس کے ابّا تھے اور جس طرح
...ے کھڑے ملنے آتے اور رسمی سی باتیں پوچھتے اور پھر اٹھ کر چلے جاتے۔ یہ سب اُسے
...اچھا نہ لگتا۔ اگر ماں بھی اس قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے تو اُسے بالکل تمنّا نہ تھی اسے دیکھنے
ـــ وہ جب ذرا اور بڑا ہوا تو کبھی کبھار ممی کو بھی دیکھا جو ڈیڈی کے ساتھ ذرا کی ذرا اپنے
...سُسر کے ہاں آتی۔ ڈیڈی کہتے تمہاری ممی آئی ہیں۔ بیٹا ممی کو سلام کرو ———
...ب ہی انہیں ڈیڈی کی بیگم کا مرتبہ دیتے تھے۔ اس لئے وہ انہیں لاشعوری طور پر
...کے رُوپ میں دیکھنے لگا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو ذرا نہ مچلا

———

...اچھا ماں ایسی ہوتی ہے۔ خشک، سرد مہر اور اکھڑی اکھڑی ——— نہ کبھی اُنہوں نے
...ماں کی طرح بڑھ کر کلیجے سے لگایا۔ نہ پیار محبّت کے نئے نئے انداز دکھائے ———
پیار محبت اور بے اندازہ شفقت تو جیسے اماں جان اور باباجان کا ہی خاصہ تھا اس
...وہ اُن کی ٹھنڈی میٹھی چھایا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہی چھوڑ کر چل دیئے
...ڈیڈی کے سوا کون تھا۔ جس کے پاس وہ جاتا۔
وہ چلا آیا۔ مگر یہاں آ کر اُسے کھُلے بندوں معلوم ہو گیا کہ وہ ڈیڈی کی پہلی بیوی
...کا بیٹا ہے ——— کون تھی اُن کی پہلی بیوی؟ اور کہاں چلی گئی؟
اُسے معلوم کرنے کا تجسّس ہی نہ تھا۔ اگر بیویاں سب ممی جیسی ہوتی ہیں اور ایسی

عورتوں کو ہی ماں بولا جاتا ہے۔ تو پھر ہو گی۔ وہ بھی ایسی ہی کوئی عورت ورنہ وہ اُسے چھوڑ کر کیوں چلی جاتی۔ لیکن پھر یہ بات بھی اُسے ایک دن ممی کی زبانی ہی معلوم ہوئی کہ اُس کی ماں مر چکی ہے۔ کیونکہ اپنی ایک سہیلی کے پوچھنے پر وہ اُسے بتا رہی تھیں ـــــ اور حماد کہیں قریب ہی کھیل رہا تھا ـــــ یہ سُن کر اُسے ایک عجیب سا دُکھ نہیں ہوا۔ بلکہ بہت اطمینان ہوا کہ اُس کی ماں مر چکی ہے۔

پھر اسے اس خیال نے کبھی بے چین نہ کیا کہ وہ ممی کی تصویر دیکھے۔ یا دیکھنا چاہیئے وہ کیسی تھیں ـــــ اس گھر کے ہر کمرے میں اِس ممی کی رنگین تصویریں لگی تھیں۔ یا ڈیڈی کے سرکاری فنکشن کی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ جن میں وہ اکثر ملکی و غیر ملکی مقتدر شخصیتوں کے ساتھ کھڑے دکھائے گئے تھے۔

گھر میں ایک جیتی جاگتی ممی کو دیکھنے کے بعد ایک مری ہوئی ممی کی تصویر دیکھنا چہ معنی وارد ـــــ؟

وہ اپنے بے سروپا خیالات کی طرح خود بھی بہت اُلجھ گیا تھا اور دُنیا بھر کی ماؤں پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔

اور ڈیڈی ـــــ ڈیڈی تو اسے بالکل بھوے نظر آتے تھے۔

ڈیڈی کی نجی زندگی اتنی کھوکھلی اور بے پھسپھسی تھی کہ اُسے اُن پر تاسف ہوتا۔ اور کبھی کبھی وہ سوچتا کہ یہ کمشنر کس طرح بنا دیئے گئے ہیں۔ جبکہ گھر کی راجدھانی کو صحیح طریق پر نہیں چلا سکتے۔ یقیناً یہ سب بابا جان کی مخلص دعاؤں کی بدولت تھا۔ پھر تو اسے بھی اپنے باپ کی مخلص دُعاؤں کی ضرورت تھی۔؟ مگر کیا کبھی ڈیڈی نے نماز پڑھی ہے ـــــ؟ عیدین کے علاوہ اُس نے کبھی انہیں نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ شاید عید کی نماز بھی وہ ایک سرکاری فریضہ سمجھ کر ادا کرنے چلے جاتے تھے۔ کیونکہ وہاں ملک کی کچھ بڑی ہستیوں کو اُن سے بغلگیر ہونا ہوتا تھا۔ اور دوسرے دن اخباروں میں اُن کی تصادیر شائع ہوتی تھیں۔

جب یہ اللہ کا نام نہیں لیتے تو بھلا اِن کی دُعا میں کیا اثر ہو گا ـــــ

بابا جان کہا کرتے تھے پانچ وقت نماز پڑھنے والا شخص دنیا کے شر سے محفوظ رہتا اور اُس کی زبان اور دُعا میں بڑی تاثیر آجاتی ہے ـــــ"

خود بابا جان نے کوئی نماز قضا نہیں کی تھی۔ حماد کو ترجمے کے ساتھ نماز انہوں نے سارے کلمے انہوں نے یاد کرائے ـــــ اور تیسویں پارے کی کئی سورتیں یاد کرائیں۔ جب وہ فوت ہوئے تو حماد تیرھواں پارہ پڑھتا تھا۔ اُن کے مرنے کے بعد اُنہوں نے مولوی صاحب سے اُس کا سارا قرآن ختم کروا دیا ـــــ اور یہاں ممی کی بیٹیاں بڑی ہو گئی تھیں۔ مگر کسی کو پہلا کلمہ بھی نہیں آتا تھا ـــــ

اور اس گھر یہ ڈیڈی کی حکمرانی تھی ـــــ یہ کیسا حکمراں ہے۔ وہ سوچتا ـــــ چراغ تلے واقعی اندھیرا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈیڈی کی تاریک زندگی کے کئی رُخ اُس کے سامنے آئے ـــــ اُس نے رات کی تاک جھانک نہیں چھوڑی تھی۔ اس لئے کچھ اور بدمزہ سی باتیں اُس کے مشاہدے میں آگئیں ـــــ مثلاً جب کوئی باہر کا ساتھی نہ ہوتا تو ممی اور ڈیڈی دونوں بیڈ روم میں بیٹھ کر خوب شراب پیتے ـــــ اور جب دونوں کو اچھی طرح چڑھ جاتی تو دونوں ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگتے ـــــ ابتداء ہمیشہ ڈیڈی کرتے ـــــ وہ ممی کو اتنی فحش گالیاں دیتے کہ حماد کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ نشے میں برملا کہتے ـــــ کہ

تو چڑیل ہے۔ ڈائن ہے۔ تو نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ نکل جا میرے گھر سے اور پھر ان گالیوں کے جواب میں ممی بھی شروع ہو جاتیں ـــــ جتنی مغلظ گالیاں ڈیڈی دیتے ـــــ اتنی ہی غلیظ زبان ممی استعمال کرتیں۔ دونوں ایک دوسرے

کے عیب اُچھالتے ــــــ گویا ایک دوسرے کو ننگا کرتے۔ اور اُن کی ایسی گفتگو سے حماد پر عجیب و غریب انکشافات ہوتے۔ اس بات کا پتہ بھی حماد کو ان کی ایک ایسی ہی لڑائی سے چلا تھا کہ ڈیڈی رشوت بھی لیتے ہیں۔ تبھی اُسے بابا جان کی یاد آ گئی ــــ جو کہا کرتے تھے۔

"بیٹے ہمیشہ کوشش کرنا کہ اپنے بچوں کو رزقِ حلال کھلاؤ ــــــ یاد رکھو بیٹا حرام کی کمائی انسان کی آئندہ نسلوں کو تباہ کر دیتی ہے اور ناجائز طریقے سے روپیہ کمانے والا شخص دُنیا و آخرت میں بے سکون ہی رہتا ہے ــــــ"

اوہو! اسی لیئے تو اس گھر میں سکون اور سرور نہیں ــــ!

وہ دل میں سوچتا۔ کاش وہ چھُپ کے ڈیڈی اور ممی کی باتیں سننے کا جُرم نہ کرتا اور نہ اتنی مکروہ باتیں اُس کے سامنے آتیں۔ کتنی بار اُس نے تہیہ کیا۔ کہ اب وہ یہ غیر اخلاقی حرکت نہیں کرے گا۔ مگر نہ جانے کیا ہوتا جب رات کے سناٹے میں اُسے ممی اور ڈیڈی کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں سنائی دیتیں ــــــ تو وہ یہ ڈرامہ دیکھنے کو مچل اٹھتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لڑتے لڑتے دونوں کی ہاتھا پائی ہو جاتی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مارتے۔ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیتے۔ ایک دوسرے کے مُنہ پہ تھوکتے۔ ایک بار تو اس سے غضب ہونے لگا تھا ــــــ جب اُس نے دیکھا کہ ممی کا زبردست تھپڑ کھا کر ڈیڈی اوندھے مُنہ بستر پہ جا گرے ہیں۔ تو وہ بے اختیار اندر کو لپکنے لگا تھا تاکہ دو چار تھپڑ لگا کر ممی کی طبیعت درست کر دے۔ مگر شکر ہے خدا کا اس کو جلدی ہوش آ گیا۔ کہ وہ تو چھُپ کر یہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اگر انہیں اس کی اس حرکت کا علم ہو جائے تو پھر دونوں اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔

شروع شروع میں جب وہ یہ ڈرامے دیکھتا تھا۔ تو سمجھتا تھا ــــــ صُبح اُٹھتے ہی وہ کوئی بُری خبر سنے گا۔ ممی طلاق لے کر چلی جائیں گی یا ڈیڈی انہیں کان پکڑ کر نکال

دیں گے۔ مگر یہ دیکھ کر اُسے بے حد تعجب ہوتا کہ دونوں صبح کو اس طرح شیر و شکر نظر آتے جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہیں ــــــ بلکہ وہ ہمیشہ سے زیادہ خوش نظر آتے ــــــ وہ اپنی دونوں آنکھیں ملنے لگتا ــــــ کہ میں نے رات کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ یا صبح کو یہ دونوں میاں بیوی ایک اور ڈرامہ کر رہے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ اسے علم ہو گیا کہ یہ اس گھر کا معمول ہے یا میاں بیوی کے پیار کا انداز ہی یہ ہے۔ یا لاشعوری طور پہ جو ایک دوسرے سے نفرت تھی۔ یا غصہ ہوتا۔ وہ اُسے غصے کے عالم میں نکال لیتے۔ ہاتھا پائی بھی کر لیتے ــــ مگر صُبح کو پھر نارمل نظر آنے لگتے۔

ایک بار تو غضب ہو گیا۔ رات کو ایسی خوفناک لڑائی ہوئی کہ ڈیڈی نے نشے میں ممی سے کہہ دیا۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ ابھی نکل جاؤ ــــــ اور ممی غصے میں سامان باندھنے لگیں۔ آدھی رات کے وقت اپنی سوتی ہوئی بچیوں کو جگا کر لے آئیں اور بولیں۔ میں اپنی بچیوں کو لے جا رہی ہوں۔ اب وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا وہاں کھڑی ہوئی چاروں بچیاں زار و قطار رو رہی ہیں۔ آیا بچاری مجرم بنی دروازے پہ کھڑی ہے۔ اور ممی چیخ رہی ہیں کہ میں انہیں ساتھ لے جا رہی ہوں۔ اور ڈیڈی کہہ رہے ہیں کہ یہ میری بچیاں ہیں تم انہیں ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔

ممی کہتی ہیں۔ "تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری لڑکیاں ہیں ــــ؟"

"اور حرام زادی! زبان بند کر ــــ" ڈیڈی کہتے ہیں۔ میرے پاس ہر ثبوت موجود ہے۔ میں ابھی تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔" اور پھر بچیوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "میری بچیاں میرے پاس رہیں گی نا؟" ــــــ بچیاں روتے جاتی ہیں۔ ممی بچیوں کے پاس جا کر کہتی ہیں ــــــ "میری پیاری بچیو کہہ دو تم ڈیڈی کے پاس نہیں رہو گی۔ بلکہ ممی کے پاس رہو گی ــــــ"

اور ڈیڈی چہرہ اُٹھا کر اُن کے قریب آجاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"نہیں یہ میری بچیاں ہیں۔ شاباش فوراً کہہ دو ہم اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہیں گی۔

بچیاں زار و قطار روئے جاتی ہیں۔ کبھی باپ کو دیکھتی ہیں۔ اور کبھی ماں کو۔

اور آپا اس موڑ پہ آکر خود بھی رونے لگتی ہے۔

افوہ!

کس قدر مکروہ ——— دل شکن اور مایوس کن نظارہ تھا یہ نظارہ۔ اس سے زیادہ حماد نہ دیکھ سکا ——— اور دوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔

او خدایا ———

او خدایا ———

کیا یہ گھر ہے ———؟

اسے جہنم کہتے ہیں اور میں کس جرم کی پاداش میں اس جہنم میں آگیا ہوں۔ روتے روتے جانے وہ کس وقت سو گیا تھا۔

مگر سونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس بات کا فیصلہ رات کو ہی ہو جائے گا کہ بچیاں کس کے پاس رہیں گی۔ اور اس فیصلہ کن بات کے بعد ممی یقیناً صبح ہونے سے پہلے چلی جائیں۔

صبح وہ کافی دیر سے اٹھا۔ یوں بھی صبح اتوار تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ مگر جب وہ اٹھا تو گھر میں غیر معمولی سناٹا تھا ——— اس کا ماتھا ٹھنکا ——— اس نے سوچا ——— گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ لڑکیوں کی آوازیں بھی نہیں آرہی تھیں۔ یقیناً رات ایک طوفان گزر چکا ہے۔ اب اس گھر کے حالات ایک نیا موڑ لیں گے۔ وہ اٹھ کر چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکل گیا۔

مگر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ناشتے کی میز پہ ممی ڈیڈی اور

لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ اور خوب ہنس ہنس کر سب ناشتہ کر رہے ہیں۔ اور آپا ایک ڑی سب کو ہنس ہنس کر دیکھ رہی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے رات کو کچھ ہوا ہیں تھا۔ ڈیڈی بات بات میں ممی کو ڈارلنگ ڈارلنگ کہہ کر بلا رہے ہیں۔ وہ اس ن ہوا کہ ساری حیرت اس کے چہرے پر عود کر آئی۔ اور جب وہ ناشتے کے لئے ی پر بیٹھا تو اس قدر بے وقوف لگ رہا تھا کہ سب اس کو دیکھ کر ہنس پڑے ڈی نے بے اختیار پوچھا۔ "کیا ہوا ہے حماد۔؟"

اب حماد کیا جواب دیتا ———؟

مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ کچھ تو آپ لوگوں کو ہوا ہے۔ جو مجھے پاگل کئے دے رہا ہے ہرمندگی سے گردن ڈال کر ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

اور پھر مزید برآں تھوڑی دیر بعد ممی بن ٹھن کے چاروں لڑکیوں کو ساتھ لے کر اچل دیں۔ اور واپسی پہ کھلونوں اور ٹافیوں سے موٹر بھری ہوئی تھی۔

حماد کو ایسے لگتا جیسے اس طلسمی گھر میں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اس گھر کا روپ ظاہر روپ کچھ تھا۔ رات کو کچھ تھا اور دن کو کچھ ———

جو کچھ یہ لوگ تھے۔ وہ ظاہر نہ ہونے دیتے تھے ———

اور جو کچھ نہیں تھے وہ بن کر لوگوں کو دکھاتے تھے۔

کچھ سال بابا جان کے ساتھ رہ کر اس کو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی نذ پڑ چکی تھی۔

ایسے گھر میں رہ کر اور ایسی اُلجھنوں کو ذہن میں جگہ دے کر بھی اپنی پڑھائی سے نہیں رہتا تھا۔ ویسے بھی وہ بہت زیادہ ذہین تھا۔ اسکول سے اس کی کبھی کوئی ت نہیں آئی تھی۔ اور کلاس میں وہ ہمیشہ اچھے نمبر لے کر پاس ہو جاتا۔ اس کا لے کا فائنل امتحان ہو چکا تھا۔ گو اُس نے حسب معمول دل جمعی سے پڑھا تو

نہیں تھا۔ مگر اس کے پرچے حسبِ توقع بہت اچھے ہوگئے تھے۔

آج کل گھر میں کوئی خاص شغل نہ تھا۔ اس کے باہر آنے جانے پر اوقات کی پابندی تھی کہ اتنے بجے جانا ہے اور اتنے بجے واپس آنا ہے۔ اس لئے وہ کہیں جاتا ہی نہ تھا۔ اب گھر میں اس کا صرف ایک ہی شغل رہ گیا تھا کہ ممی کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھے

انہی دنوں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ جب ڈیڈی دورے پر گئے ہوتے ہیں۔ تو ممی کو کچھ لوگ خاص طور پر ملنے آتے ہیں۔ یا ممی اُن کو فون کر کے بُلاتی ہیں۔ کبھی ان کے ساتھ باہر بھی جاتی ہیں۔ خدا جانے یہ بات ڈیڈی کے علم میں تھی یا نہیں۔ وہ یہ جاننے کے لئے سخت بے چین تھا۔ پینے پلانے کا شغل ممی کا اُن کے ساتھ بھی جاری رہتا ——

لیکن جب ممی کسی غیر مرد کے ساتھ بیٹھ کر پیتی تھیں تو بہت احتیاط برتتیں۔ کمرے کے دروازے کنڈیاں اچھی طرح چڑھا لیتیں۔ بلکہ دروازوں کے آگے پردے بھی گرا لیتی تھیں۔ اس لئے وہ تاک جھانک تو نہ کر سکتا تھا۔ مگر کان ہر دم اُن کے کمرے کی طرف لگائے رکھتا۔

ایک رات عجیب اتفاق ہوا۔

شاید وہ جلدی سو گیا تھا —— سوتے میں یا شاید جاگتے میں اُسے ممی کے کمرے سے باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آئیں —— ڈیڈی دو دن کے دورے پر گئے ہوتے تھے۔ پھر ممی کے کمرے میں کون تھا ——

اس جذباتی لڑکے کی غیرت نے جوش مارا —— اور بستر سے اُٹھ کر ایک دم ممی کے کمرے کی طرف دوڑا —— اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانے لگا —— اور پھر ساتھ ہی زور زور سے چلّانے لگا ”ممی دروازہ کھولو۔ نہیں تو میں توڑ دوں گا ——“

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔

دروازے میں ممی کھڑی تھیں۔ انہوں نے آئینے کی طرح شفاف اور نازک نائٹی پہنی تھی۔ نشے میں دُھت تھیں۔ مگر حماد کو اس طرح گھور رہی تھیں۔ جیسے بلی اپنے شکار کو گھورتی ہے۔

انہیں اس عالم میں دیکھ کر وہ بھول گیا کہ اُس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت کی تھی۔ یا اگر وہ اس جرأت کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ تو اب بلا جھجک اندر جا کر دیکھے اور شبہے کی تصدیق کرے۔ مگر وہ تو بزدلوں کی طرح زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

اس ممی کی طرف آنکھیں اٹھانے کا اُس کو حوصلہ نہ ہوا۔

ممی نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے ڈیڈی کی صبح سیر والی چھڑی اٹھائی اور اُسے گھسیٹتے ہوئے اُس کمرے میں لے آئیں۔ اور بولیں ”تمہاری یہ جرأت کہ تم آدھی رات کو میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ نہیں اس گستاخی کا مزہ چکھا دوں گی۔“

پھر اسی چھڑی سے انہوں نے حماد کو پیٹنا شروع کر دیا۔

اُف اللہ اُن میں جیسے بجلیاں بھری ہوتی تھیں۔ اور ایسا فولادی ہاتھ تھا اُن کا جب وہ چھڑی لگتی اُس کی چیخیں نکل جاتیں۔ جب حماد درد کے مارے زور زور سے رونے لگا اور وہ مارتے مارتے ہانپنے لگیں۔ تو ذرا رُک کر پوچھا۔

”پھر ایسی حرکت کرو گے کبھی۔“

”جی نہیں —— جی نہیں ——“ حماد درد سے ملبلاتا جاتا۔ اور کہتا جاتا۔

مبادا وہ پھر نہ مارنا شروع کر دیں۔

آخر تھک کے اُنہوں نے اُس کے سر کے بال جھنجھوڑ کر اُس کا خون آلود منہ اُونچا کیا اور بولیں: ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یاد رکھو اگر پھر تم نے مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع دیا تو میں جان سے مار ڈالوں گی۔ سمجھے ——“

اور روتے روتے حماد نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیئے۔ اس کے سوا کوئی
چارہ ہی نہ تھا۔

نازوں سے پلنے والے حماد کو کبھی کسی نے بھول بھی نہ مارا تھا۔ مگر آج اتنی مار
اور اس قدر بے دردی سے!

ممی تو چلی گئیں —— اور پھر اُن کے دروازہ بند کرنے کی آواز بھی اُسے آئی۔
لیکن اسے سونے کے قابل نہیں چھوڑ کر گئی تھیں۔ اب اگر وہ روتا بھی تھا تو اُسے
درد ہوتا تھا —— وہ اسی سزا کا مستحق تھا ——

اُس نے بھی خود کو اذیت پہنچانی شروع کر دی۔ چھپ چھپ کر باتیں سننے اور کسی
پر شک کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ اور جب ڈیڈی نے ممی کو اتنی ڈھیل دے رکھی
ہے تو وہ کون ہوتا ہے۔ باز پُرس کرنے والا۔ یا سراغ رسانی کرنے والا۔ بالفرض اس کے
شبہے درست بھی نکل آتے تو کون اُس کی بات کا یقین کرتا۔؟

اسے اب بھی یقین تھا کہ ممی کے کمرے میں کوئی تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد پھر کسی
کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ خواب یا واہمہ نہیں تھا۔ اتنی مار کھانے کے
بعد کس میں ہمت تھی اب اُٹھ کر تصدیق کرتا۔ اور کس لئے کرتا ——

وہ تمام رات روتا رہا —— کرب و اضطراب میں کروٹ بھی نہ بدل سکتا تھا
ہائے وائے کرتا رہا۔ کوئی دوا پاس نہ تھی۔ جو اٹھ کر زخموں پر لگا لیتا ——

نہ جانے کس طرح رات تمام ہوئی۔ صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی ——

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو تقریباً دوپہر ہونے والی تھی۔ اُس نے گھڑی میں وقت
دیکھا۔ اُٹھ کر بیٹھا۔ تو اُس کے جسم کا ایک ایک عضو چیخنے لگا۔ پھر اُس کو رات والا واقعہ ایک
ایک کر کے یاد آنے لگا۔ آج اُس کے ڈیڈی کو بھی دورے سے واپس آنا تھا۔
مگر وہ تو پلنگ پر سرتاپا فریاد بنا بیٹھا تھا۔ ایسی فریاد جسے سننے والا دنیا میں کوئی نہیں

اتنے میں نوکر اسے بلانے چلا آیا۔

"ڑے صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں"۔

اس کا مطلب ہے ڈیڈی آ گئے ہیں۔ ڈیڈی کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں
و آ گئے۔ کیا وہ بھی میری فریاد نہ سنیں گے۔ اُس نے نوکر سے کہا وہ آ رہا ہے۔ اور
خانے میں چلا گیا۔

منہ دھو کر وہ غسلخانے سے نکلا۔ اور سوچنے لگا۔ شاید آج ڈیڈی کی محبت جوش
گئی ہے۔ وہ جو تمام رات تڑپتا رہا ہے۔ اس لئے وہ بھی اس سے ملنے کو بے چین
گئے ہیں۔ اُسے خواہ مخواہ ڈیڈی پر پیار آنے لگا! اور وہی اُسے دنیا میں اپنے ہمدرد و
سار نظر آنے لگے۔

جب وہ ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوا تو ممی بھی وہیں بن سنور کے بیٹھی ہوئی تھیں۔
حقیقت میں اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ منہ بھی
جا ہوا۔ کیونکہ رات ممی کا ہاتھ پاگل کی تلوار کی طرح چلا تھا۔ رخساروں پر نیل پڑ گئے
آنکھیں بھی رو رو کر سوج گئی تھیں۔ بازوؤں اور ہاتھوں پر چھڑیوں کے اَن گنت
ان تھے۔ وہ مظلومیت کی ایک زندہ تصویر لگ رہا تھا۔

اس کا خیال تھا اس کا حلیہ دیکھ کر ہی ڈیڈی کی شفقت جوش مارے گی اور وہ شفقتِ
ی سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگا لیں گے —— پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔

لیکن ڈیڈی تو غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔

جو کچھ عاصمہ نے اُن سے کہا تھا۔ اس پر انہیں یقین تو بالکل نہ آیا تھا مگر اُن کو
لے کی تہہ تک تو پہنچنا ہی تھا۔

حماد چپ چاپ جا کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا تو وہ حیرت میں ڈوب گئے۔ انہوں
اسے درست کرنے کے لئے بلایا تھا۔ مگر وہ تو پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ حماد سوچ رہا تھا۔ ابھی ڈیڈی اُس سے اُس کی حالتِ زار کا سبب دریافت کریں گے تو وہ اُن کے سینے سے لپٹ کر خوب روئے گا ——— اتنا روئے گا کہ زندگی کے سارے پچھلے گلے دھل جائیں گے۔ مگر ڈیڈی کا چہرہ تو بالکل سپاٹ تھا۔ اور آنکھیں مضطرب تھیں۔

جلدی سے عاصمہ بولی ——— "ہاں میں نے غصے میں آکر اُسے خوب مارا تھا۔ آپ ذرا اس سے پوچھیں تو سہی۔ یہ میرے کمرے میں کیوں آیا تھا۔"؟

سجاد احمد ایک دم باپ سے کمشنر بن گئے۔ اور بولے: "آدھی رات کو تم ممی کے کمرے میں گئے تھے۔"؟

"جی ہاں ——" اُس نے نظریں جھکا کر اعتراف کیا۔

"کیوں —— آخر کیوں ——؟" ڈیڈی آپے سے باہر ہو گئے۔

حماد مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا تاکہ رات کی بات بتا سکے —— مگر وہ بات بتانے کے لئے —— اس سے پہلے کی کئی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملانی پڑتی تھیں۔ اور سلسلے کی کڑیاں ملانے کے لئے بہت سے موزوں الفاظ کی ضرورت تھی —— اور سب سے پہلے اس اعتراف کی بھی ضرورت تھی کہ وہ یہ سب کچھ چھپ چھپ کر سنتا رہا ہے۔ اور حماد کے پاس نہ مناسب الفاظ تھے۔ اور نہ اتنا وقت کہ وہ اتنی بڑی بات آسانی سے باپ سے کہہ سکتا ———

اسے سوچنے اور بتانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ گئی —— ابھی وہ الفاظ مفہوم کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے زخمی رخسار پر آ کر لگا۔ وہ بُری طرح چونکا —— تیورایا —— اور دُور جا گرا —— گرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اُس کے باپ نے اُسے تھپڑ مارا ہے۔ مگر کیوں ——؟

یہ تھپڑ ان سب زخموں سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔

"حرامزادے —— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تو اتنی گندی ذہنیت کا نکلے گا اپنی ماں پر بھی نیت خراب کر بیٹھے گا۔ کمینے —— لفنگے —— تیری روز روز کی شکایتیں سُن سُن کر بھی میں چپ تھا۔ سوچتا تھا۔ کسی نہ کسی روز تجھے ضرور عقل آ جائے گی۔ باپ کو باپ اور ماں کو ماں سمجھنے لگ جائے گا۔"

"تیری یہ مجال —— کہ تو رات کو ماں کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ تیری ہستی ہی کیا ہے اس گھر میں ——

"حرامزادے —— ابھی ابھی اور فوراً اس گھر سے نکل جا۔ میں تجھے ایک منٹ کے لئے اس گھر میں گوارا نہیں کر سکتا۔"

اتنی باتیں سُن کر حماد جہاں گرا تھا —— اُٹھ نہ سکا —— یہ اس پر کس قسم کا الزام لگ رہا ہے۔ اسے بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ مگر وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا ——

"نکل جا میرے گھر سے ——" ڈیڈی چیخے۔ جیسے کہ انہوں نے در و دیوار کو سنانے کے لئے یہ سب کہا ہو ——

وہ کراہتا اور لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا —— اُس کا ایک ہاتھ اپنے رخسار پر تھا۔ اُس کی معصوم آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ذرا کی ذرا اُس نے ان چھلکتی آنکھوں سے ممی کی طرف دیکھا —— وہ جادوگرنی بنی سگریٹ کے کش لے رہی تھیں۔ سپاٹ مگر وہ چہرہ۔

ڈیڈی کو دیکھا۔

اُن کی نگاہوں میں نفرت اور انگارے تھے۔

جادوگرنی ——

نفرت ——

انگارے ——

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ان تینوں کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنے بھاری مایوس اور زخمی قدم اٹھائے۔ دروازے کا پردہ دوسرے ہاتھ سے اٹھایا——ڈیڈی کے کمرے سے باہر نکل آیا——

کمرے سے نکل کر اُس نے ایک سیکنڈ کا توقف کیا——

"کمینے نکل جا میرے گھر سے——"

"میرا گھر——"

ہاں یہ ڈیڈی کا گھر ہے۔ اس لئے انہیں اسے "میرا گھر" کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی——

کمرے سے نکل کر——وہ ڈیڈی کے گھر سے باہر نکل آیا——

گھر سے باہر نکل کر وہ ان کے دل سے بھی نکل آیا۔

لمنز ہاؤس کے گیٹ سے باہر نکل کر اُس نے اپنی آنسو بھری آنکھوں کو صاف
دھرتا۔
مڑک پہ کھڑے ہو کر راہ متعین کی کہ وہ کس طرف جائے یا شاید اس کے لاشعور میں یہ تھا
کا باپ ابھی کسی ملازم کو اُس کے پیچھے دوڑائے گا اور بڑی مصلحت اندیشی سے اُسے
نے گا۔ وہ پانچ منٹ تک سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ کوئی ملازم اُسے بلانے نہیں آیا
دقت تو سامنے باوردی دربان بھی کھڑا نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ کہیں اِدھر اُدھر
با تھا۔

پھر وہ ایک سمت کو چل پڑا۔

اس وقت تک اُس کے اندر کا باغی لڑکا نہیں جاگا تھا۔ وہ انتہائی مظلوم تھا۔

اور خود ترسی کی کیفیت میں مُبتلا تھا۔

یونہی اسی ویران حالت میں چلتا رہا۔ رات کا پاجامہ اور بش شرٹ اُس نے پہن رکھے

اُس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔

وہ رات سے بھوکا تھا۔

اور وہ اپنے باپ کو اس بے رحمانہ سلوک کی سزا دینا چاہتا تھا۔ یا عارضی طور پہ مُرجانا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اُسے ڈھونڈتا پھرے۔ چلاتا پھرے اور سارے شہر کی خاک اپنے سر ڈالتا پھرے۔ تب وہ کہیں سے مسکراتا ہوا نکل آئے اور کہے۔

"پھر میرے ساتھ ایسا برتاؤ کریں گے آپ ——"

"آپ کو میرے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیئے جو آپ کو زیب دیتا ہے۔"

اُسے اُمید تھی۔

اُس کے پیچھے نوکر بھگائے جائیں گے۔ موٹریں دوڑائی جائیں گی۔ اخبار میں اور ریڈیو مشتہر کروایا جائے گا۔ مگر پھر وہ بڑے ناز و نخرے سے واپس ڈیڈی کے بنگلے میں آ جائے گا اور اپنی کچھ شرائط بھی منوائے گا۔ سارا دن وہ اسی آس پر مارا مارا پھرتا رہا۔ بھوک سے کا بُرا حال تھا۔ تھک جاتا تو کہیں بیٹھ جاتا۔ زخموں میں زیادہ درد ہوتا تو اُٹھ کر چلنے لگتا۔

جانے کب تک وہ چلتا رہا ——

گھر سے دوپہر کے بارہ بجے چلا تھا۔ اور اب شام ہونے کو آئی تھی۔

مگر اُس کے پیچھے تو کوئی موٹر، نوکر، سائیکل نہ دوڑ رہا تھا۔

ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن تھا۔

سڑک پر جاتی ہر موٹر کو وہ پُراُمید نظروں سے دیکھتا۔ مگر وہ بھی آگے نکل جاتی۔

اب درد برداشت سے باہر ہو گیا تھا تھکن نے اعصاب کو شل کر دیا تھا ——

اور بھوک نے زندگی کی آس مٹا دی تھی ——

اور ایسے میں ایک باغی لڑکے نے جنم لینا شروع کر دیا۔

کمشنر ہاؤس کے سجے بجے ڈائننگ ہال کی بیش قیمت میز پہ سجی ہوئی چاندی کی کٹلری اور غیر ملکی نیپکنوں کے جلو میں —— جب لوگوں نے پُرتکلف کھانا کھایا ہوگا۔ مگر اُن میں سے کسی کو یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ وہ بن ماں کا بچہ —— جو رات سے بھوکا ہے جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔

ـب نے اُس کے بغیر کتنے سکون اور تسلی سے کھانا کھایا ہوگا اور ڈیڈی نے بھی۔

جو اُس کے باپ ہیں ——

اور صبح کیسی حقارت سے کہہ رہے تھے۔ ابھی نکل جا میرے گھر سے۔ میں تجھے یہاں ہٹ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے تو شکر ادا کیا ہوگا۔ میں وہاں سے چلا آیا ہوں۔ ں قدر بے غیرت ہوں میں۔ کہ وہاں دوبارہ جانے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ آس لیے ہا ہوں۔ جہاں سے ایک بار ذلیل ہو کے نکلوایا جا سکتا ہوں۔ وہاں سے بار بار دھتکارا

ـا گا۔

مجھے واپس نہیں جانا چاہیئے ——؟

خدا کی زمین بہت وسیع ہے —— یہاں کھڑے کھڑے اپنے ذہن سے نکال دالم تم ایک کمشنر کے بیٹے ہو —— پھر اس زمین کا ہر ٹکڑا تمہاری پناہ گاہ بن جائے گا۔ زنجر تم پہ سایہ فگن ہوگا۔ اور ہر بشر تمہیں سینے سے لگا لے گا۔

وہ ذرا سا لڑکھڑایا ——

اور پھر ایک تیز رفتار ٹرک کے نیچے آتے آتے بچا۔ ٹرک جب اُسے گرا کر آگے نکل گیا اُس نے دیکھا ٹرک کے پیچھے لکھا تھا "خیر نال آتے خیر نال جا" وہ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں ـے یہ فقرہ پڑھ رہا تھا اور اُٹھنے کی ہمت ہی کر رہا تھا کہ وہ ٹرک خود بخود رک گیا اور پھر اسی ا پیچھے کو چلتا ہوا اُس کے قریب آ کر رک گیا۔

ایک ادھیڑ عمر پٹھان نے منہ باہر نکال کر پوچھا۔ "خوچے تمہیں چوٹ تو نہیں آئی"

"چوٹ ——" وہ آزردہ سا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ کون سی چوٹ ہے۔ جو باقی ہے۔ اب تو وہ مسلسل دُکھنے والا پھوڑا بن چکا ہے۔

وہ منہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پونچھنے لگا۔ اس سنسان سڑک پر رات اُترنے والی تھی۔ اور اُسے معلوم نہ تھا کہ کدھر جائے گا۔ اور کہاں رات بسر کرے گا۔ کل تک جو بنے

سجے چھپر کھٹ پر سوتا تھا۔ آج سڑکوں پر دھکے کھا رہا تھا۔

"او چھوکرے۔ روتا کیوں ہے۔ کچھ بولو نا؟" پٹھان بابا ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ اور اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مگر وہ ایک چیخ کے ساتھ اُچھل کر دُور کھڑا ہو گیا۔

"او۔ تمہارا تو کندا کو چوٹ آیا ہے۔" وہ ہمدردی سے بولا۔ حالانکہ اس کندھے کو رات ممی کی چھڑیوں نے زخمی کیا تھا۔

"تمہارا گھر کدھر ہے۔ ام تم کو وہاں چھوڑ آئے گا۔ مگر حماد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور روتا رہا ——

پٹھان بابا نے بڑی محبت سے پکڑ کر اُسے ٹرک میں بیٹھا لیا۔ ٹرک پھر چل پڑا۔ وہ تمام راستے اُس کا اور اُس کے والدین کا اتہ پتہ پوچھتا رہا۔ مگر حماد نے ایک ہی ضد پکڑ لی تھی۔ بس یہی کہے جاتا —— "میرا کوئی نہیں میں تنہا ہوں ——"

"پھر ام تم کو کدھر اُتارے۔" پٹھان بابا نے پوچھا۔

"جہاں تمہارا دل چاہے اُتار دو۔ کسی اور گاڑی کے تلے آ جاؤں گا۔" اُس نے اتنے دردناک لہجے میں کہا کہ اُسے ترس آ گیا۔

بولا۔ ظالم کا بچہ کیسی بیدردی کی باتیں کرتا ہے۔ اچھا ہمارے ساتھ چلے گا۔ ہم پشاور جا رہا ہے۔ تمہارا علاج بھی کرے گا اور کوئی چھوٹی موٹی کام کا بھی بندوبست کر دے گا۔" حماد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور ٹرک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرک میں ٹھنڈی ہوا لگنے سے اور ٹیک لگا کر بیٹھنے سے تھکے ہوئے حماد پہ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ جھٹکے کھاتے کھاتے لیٹ گیا۔ اور گہری نیند سو گیا اس سے بے خبر کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور اُس کی منزل کون سی ہے۔

یہاں سے اُس کی زندگی کا اصل اور نیا سفر شروع ہوا۔ پشاور میں لا کر پٹھان بابا نے

کچھ دن اپنا مہمان رکھا اور پھر اُسے ٹرک صاف کرنے پر لگا دیا۔ پہلے پہل اُسے یہ بہت گندہ لگا۔ مگر اُسے یاد آیا کہ اُس نے تو یہ تہیہ کیا تھا کہ وہ دل سے یہ بالکل نکال چکا کہ وہ کمشنر کا بیٹا ہے۔ اگر اس پٹھان بابا کو ہی معلوم ہو جاتا تو ابھی خوف کے مارے وہیں چھوڑ آتا جہاں سے اٹھا کر لایا تھا۔ اسی لئے تو اُس نے پٹھان بابا کو اپنا اصلی نام نہیں بتایا تھا۔ بلکہ اُسے کہا تھا کہ میرا نام منشی ہے۔

اور پٹھان بابا اس قدر ہنسا تھا کہ اللہ کی امان ——

"او خو چے یہ بھی کوئی نام ہوتا۔ تم ادھر امارے علاقے میں پیدا ہوتا تو تمہارے جیسے بہت چھوکرے کا نام خان گل۔ گلفام خان یا چنار گل خان ہوتا۔ یہ منشی بھی کوئی نام ہے۔" مگر حماد چپ بیٹھا رہا۔

پٹھان بابا سمجھا کہ خفا ہو گیا ہے۔ اس لئے بولا —— "غم نہ کرو باتی —— ام تم کو منشی گل بلائے گا۔ ٹھیک ہے۔"

حماد ہنس پڑا۔ "ٹھیک ہے۔"

تب سے بسوں کے اڈے کے تمام ڈرائیور اور چھابڑی والے اُسے منشی گل کہنے لگے تھے۔ اسے اپنا یہ نام بہت مزے کا لگتا۔

کچھ دن اُس نے پٹھان بابا کے ٹرک پہ کام کیا۔ وہاں اُس نے تھوڑا تھوڑا ٹرک چلانا سیکھا بھی۔ اس کے بعد پٹھان بابا نے اُسے اپنے ایک رشتے دار کے پٹرول پمپ پہ نوکر رکھوا دیا۔ اس کا خیال تھا۔ چھوکرا تمیز والا ہے۔ اس لئے اسے ذرا اچھا کام دلانا چاہیئے۔ ساتھ ہی اُس نے حماد سے وعدہ بھی کیا کہ روز دو گھنٹے کی چھٹی لے کر وہ اُسے موٹر چلانا سکھا دے گا۔ پھر اسے لائسنس لے دے گا۔ تاکہ وہ بھی ڈرائیوری کر سکے۔"

نئی زندگی کس قدر نئی۔ انوکھی، ہنگامہ خیز اور چونکا دینے والی تھی۔

وہاں بسوں کے اڈے پر ایک اور ہی زندگی تھی۔ جس کا اس نے کبھی تصوّر ہی نہ کیا

تھا۔ عام سے لوگ۔ گھٹیا باتیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جو اپنے والدین یا بہن بھائی کی خاطر چھابڑیاں لگا کر رات کے بارہ بارہ بجے تک بیٹھے رہتے۔

حماد کو اپنے آپ سے شرم آنے لگتی۔ وہ دس دس نوکروں کے رحم و کرم پر تھا! یہاں اُس سے چھوٹے بچوں نے ایک پورے پورے خاندان کا بوجھ اٹھایا ہوا تھا۔

یہ کیسی تقسیم ہے باری تعالیٰ!

وہ چلا اٹھتا ——

پھر وہ خوش بھی ہوتا کہ وہ چاندی کے جھولنے سے باہر نکل آیا ہے۔ اور اسے بھی دنیا دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ نہ صرف موقع ملا ہے۔ بلکہ وہ رزقِ حلال اپنے دست و باز سے کما کر کھا رہا ہے اور اس رزقِ حلال میں اور ہی طرح کی لذت تھی۔ رات کو سب ملازم لڑکوں اور ڈرائیوروں کے ساتھ جب وہ تنور پر بیٹھ کر روٹی کھاتا تو اُسے اور ہی قسم کا لُطف محسوس ہوتا۔ آپس میں وہ لوگ گھٹیا مگر ہلکا پھلکا مذاق بھی کرتے رہتے۔ یہاں پٹرول پمپ کی دُنیا کچھ اور ہی دُنیا تھی۔ دن بھر وہ لوگ قسم قسم کی موٹروں میں پٹرول ڈالا کرتے۔ ایک طرف گاڑیاں صاف کرنے کا ورکشاپ تھا۔ وہاں اُستاد کے ساتھ مل کر وہ گاڑیوں کی سروس کا کام کرتا۔ کچھ دِنوں کے بعد وہ خُود اس قابل ہو گیا کہ موٹر کار کے نیچے لیٹ کر اُس کے کل پُرزے درست کرے۔ سارا دِن اور لڑکوں کی طرح وہ بھی ایک نیلے سے رنگ کی تنگ موری کی میلی چکٹ ڈانگری پہنے رہتا —— ہاتھ اور مُنہ ڈیزل آئل اور پٹرول سے اَٹے رہتے —— بال اُلجھے رہتے۔ مگر وہ بغل میں تھیلا دبائے خوش خوش پھرتا رہتا —— یہاں اُسے معقول تنخواہ ملتی تھی۔ روٹی کھانے کے علاوہ جو پیسے بچتے اُن کے وہ اچھے کپڑے بنا لیتا۔ اور رات کو سونے سے پہلے وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا۔ اُس نے اپنا ایک صاف ستھرا بستر خرید لیا تھا۔ عادت کے مطابق کچھ کتابیں بھی خرید لی تھیں۔ بس جب سب لڑکے اور مستری لوگ خوش گپیوں میں مصروف

...کتاب کھول کر پڑھنے لگتا اور یہی ایک بات اُس کی سب کو بُری لگتی تھی۔ مگر ...وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

...لئے کہ اگر وہ نہ پڑھتا تو اُسے نیند نہ آتی۔ اور جو نیند نہ آتی تو ماضی کی ساری باتیں ...لگتیں۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک وقت —— دُنیا کی سرد مہری، اور بے مروّتی ...سا بن کر کھٹکنے لگتی۔ اور اُس کے سینے میں خلش سی جاگ اٹھتی۔ پھر وہ رات بھر ...اس خلش کو کم کرنے کے لئے اُس نے دوستوں کے ساتھ مل کر سگریٹ پینا ...دیا تھا۔ اور بابا جان سے معافی بھی مانگی تھی ——

...میں سُرور کے لئے نہیں پیتا۔ وقت گزاری کے لئے پیتا ہوں۔

سارا دن وہ پٹرول پمپ پہ کھڑا طرح طرح کے لوگوں کی کاروں میں پٹرول ڈالا کرتا۔ ...کے کاروبار اور رہن سہن کے متعلق اندازے بھی لگاتا رہتا۔ لیکن اُس کے حُلیے اور ...بلا کی بے نیازی اور لا اُبالی پن ٹپکتا —— کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ موٹر میں بیٹھی ...جوان لڑکیاں اُسے دلچسپی کی نظر سے دیکھتیں۔ اور ایک دوسرے کو ٹھوکا لگا کر ...اس لڑکے کو دیکھو کتنا ہینڈسم ہے۔ مگر مقدّر دیکھو۔ کہ پٹرول پمپ پہ کام ...ہے۔

...اگر یہ پڑھا لکھا ہوتا۔ اور سوٹ بوٹ پہنے ہوتا تو کسی بڑے آدمی کا بیٹا لگتا ——" ...دی کہتی۔

...سب سُن کر حماد آگ بگولا ہو جاتا۔ غصّے میں آ کر اور زیادہ سگریٹ پھونکنے لگتا: ...دُنیا میں صرف اس انسان کی عزّت ہے، جو کسی بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔" ...اندر خواہ ایک عظیم انسان بن جانے کے جوہر موجود ہوں۔ مگر چونکہ میں ...پمپ پہ ملازم ہوں۔ اس لئے قابلِ عزّت نہیں ہوں۔

...موٹروں میں گھومنے والی —— اور بنی سنوری عورتوں سے دِلی نفرت

محسوس ہوتی ——— یہ میک اَپ کے لاکھ پردوں میں اپنی ذات کو چھپانے والی عورتیں نہ معلوم حقیقت میں کیا ہوتی ہیں۔؟ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ——— اور جب وہ ممی کی قسم کی کوئی عورت دیکھ لیتا ——— تو گھنٹوں اُس کا خون کھولتا رہتا ———

بھلا اب اس کا ممی سے کیا تعلق رہ گیا تھا۔

اور ڈیڈی ———

ایک دُکھ کا انمٹ سا احساس بن چکے تھے۔

اُسے یقین نہ تھا کہ ڈیڈی ایسے نکلیں گے۔ بظاہر سب باپ سخت گیر ہی نظر آتے ہیں۔ مگر اُن کے پہلو میں بھی محبت بھرا دل ہوتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے۔ جب یہ دل پگھل کر موم ہو جاتا ہے۔

کیا واقعی ممی کے جادو نے ڈیڈی کے دل کو پتھر کا بنا چھوڑا تھا ———

پھر نہ جانے کون سی آس تھی۔ جس کے تحت وہ ہر صبح اُٹھ کر باقاعدہ اخبار پڑھتا ہر صفحہ اور ہر اشتہار پڑھ ڈالتا ——— کبھی کبھی اخبار میں کسی بھاگے ہوئے بیٹے کے کسی ماں یا باپ کی التجا چھپتی کہ "بیٹا گھر آ جاؤ تمہاری ماں کی حالت نازک ہے۔ ہم تمہارا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہیں۔"

تو وہ تڑپ اٹھتا ——— چونکہ وہ میری ماں نہ تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو اس کی حالتِ زار ڈیڈی جیسے پتھر دل انسان کو ضرور مجبور کر دیتی اور وہ مجھے ڈھونڈ نکالتے میں ہجوم میں گم ہو چکا ہوں۔ میرے باپ کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے ——— لیکن اب کون مجھے ڈھونڈے گا۔ جبکہ ڈھونڈنے والی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں اور تھامنے والے ہاتھ بے حس ہو گئے ہیں۔

مجھے اس ہجوم میں گم ہو کر ہی رہنا پڑے گا۔ میری پہچان گم ہو گئی ہے ——— اور کوئی چہرہ مجھے نہیں جانتا ——— ہر چہرہ اجنبی ہے۔ اور ہر چہرہ شناسا ہے ———

اچھی بات ہے کہ میں کسی کا نہیں ہوں۔ اور میرے گم ہو جانے کا افسوس بھی کسی کو نہ ہوگا ——— گم رہ کر ہی مجھے اپنی منزل تلاش کرنا ہے۔ جب میری منزل مجھے مل گئی۔ تو میری پہچان لوٹ آئے گی۔ میں پہچانا جاؤں گا ——— جانا جاؤں گا ——— اپنایا جاؤں گا ——— دنیا میں میرا مقام مجھے مل جائے گا۔

اچھا ہے کہ سہاروں کے فریب سے میں نکل آیا ہوں۔ اور پدرم سُلطان بُود والا خیال میرے سر سے ہٹ گیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ انسانوں کے اس ہجوم میں میں کیا بن کر نکلتا ہوں ——— ان سے حاصل کرتا ہوں۔ اور انسان کو کیا دے سکتا ہوں؟

اتنی چھوٹی عمر میں اس کا مشاہدہ بھی کافی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ مردم شناسی کی ابتدائی منزل اس نے طے کرنی شروع کر دی تھیں۔

چونکہ وہ ہر صبح باقاعدہ اخبار خرید کر پڑھا کرتا تھا۔ اس لئے ایک روز صبح ہی صبح اسے انکشاف ہوا کہ ایف اے کا رزلٹ نکل آیا ہے۔ تب اُسے یاد آیا کہ اُس نے ایف اے کا امتحان دے رکھا تھا ——— اُسے اپنا رول نمبر بھی یاد آیا۔ اور یہ بھی یاد آیا کہ اُسے گھر سے نکلے ہوئے پورے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اور اُس پر سے یہ تین ماہ تین صدیاں ہو کر گذر چکے تھے۔

اس دفعہ بھی وہ فرسٹ ڈویژن لے کر پاس ہو گیا تھا۔ پاس ہونے کے بعد اُسے منصوبے کو از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ کوئی بھی کام کرنا اُسے معیوب نہ لگتا تھا۔ مگر اُس نے سوچا۔ تعلیم حاصل کرنا افضل فریضہ ہے۔ بابا جان بھی کہا کرتے تھے۔

"جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے علم نقصان نہیں پہنچاتی۔ فائدہ ہی پہنچاتی ہے۔"

پیٹ کا دوزخ بھی سامنے تھا۔ اور تعلیم کے اخراجات بھی پورے کرنا تھے۔ اس

لیتے اُس نے کسی کالج میں داخل ہونے کا خیال چھوڑ دیا۔ مگر پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے ماہ کی تنخواہ ملنے پر وہ بی اے کے کورس کی کچھ کتابیں بھی لے آیا۔ اور ڈکشنری بھی خرید لی۔ رات کو وہیں پیٹرول پمپ کی روشنی میں بیٹھ کر اُس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

جب آدمی اپنی تعمیر کرنے پر تُل جاتے اور کسی کا زیر بار احسان بھی نہ ہونا چاہے۔ تو اُسے کوئی بات معیوب نہیں لگتی۔

اس نئے تجربے سے بھی اُسے بڑا سکون ملا۔

ایک رات پٹھان بابا پیٹرول پمپ پر آ نکلے۔ آدھی رات کے وقت حماد کو پڑھتے دیکھ کر بولے۔

"او منشی گل خان! خو یہ کیا کر رہا ہے رات کے وقت۔"

"جی۔ میں ایف اے میں پاس ہو گیا ہوں۔ سوچا اس طرح تھوڑا تھوڑا پڑھ کر بی اے کا پرائیویٹ امتحان دے دوں۔"

"اچھی بات ہے ——— پر اس طرح کیسے گذارہ ہو گا۔ ام تمہارا کوئی بندوبست کرے گا۔"

خان بابا نے یہ بات ذہن میں رکھ لی۔

انہوں نے حماد کو ڈرائیونگ تو اچھی طرح سکھا دی تھی۔ ایک دن اس کا ڈرائیونگ لائسنس بنوا کر لے آئے۔ اور بولے۔

"ام نے تمہارا سارا بندوبست کر لیا ہے ——— ادھر ایک بڑا اچھا گھرانہ ہے ان کو ایک شریف ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ ام نے تمہارا سفارش کر دیا ہے۔ تم ادھر کام کرے گا۔ وہ تم کو رہنے کی جگہ دے گا۔ اور تنخواہ بھی معقول دے گا۔ دن کو نوکری کرے گا۔ اور شام کو پڑھے گا۔ سمجھے۔"

ہنس پڑا۔

"بیٹا اب قسمت میں کسی صاحب بہادر کی ڈرائیوری بھی لکھی ہے۔"

خان بابا کے آگے اُس نے انکار نہیں کیا۔ اُن کے خلوص اور احسانات کے آگے ہی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر پیٹرول پمپ ہو یا کسی کا گھر۔ کام کرنے سے کیا فرق ہے۔ اُس نے حامی بھر لی۔

"جہانگیر لاج" میں اُسے واقعی بہت عزّت و آرام سے رکھا گیا۔ بیگم رقیّہ جہانگ
شہر کی مشہور ترین اور مصروف ترین سوشل ورکر تھیں۔ سیاست میں بھی کافی دلچسپی رکھ
تھیں۔ عرصہ ہوا اُن کے شوہر فوت ہو چکے تھے۔ مگر اتنی زیادہ جائداد چھوڑ گئے تھے ا
بیگم رقیّہ جہانگیر اور اُن کی اکلوتی لڑکی عمّارہ کے لئے دُنیا میں کوئی کمی نہ رہ گئی تھی۔ شا
جہانگیر خان کا غم بھلانے کے لئے۔ یا اُن کی کمی پوری کرنے کے لئے بیگم رقیّہ جہانگیر سوشل
ورکر بن گئی تھیں۔ شہر کے مقتدر اور مشہور لوگوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے آئے د
دعوتیں پارٹیاں ہوتیں۔ ملنے جلنے والوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ مرد عورتیں سبھی اُن
سے ملنے آتے۔ جھنڈے والی موٹریں بھی وہاں آتیں۔ بڑی بڑی کاریں بھی ہوتیں اسکو
بھی ہوتے۔ یوں معلوم دیتا کہ بیگم رقیّہ جہانگیر ہُن بانٹتی ہیں کہ ہر کوئی مُنہ اٹھائے یہاں چلا
آتا ہے۔ آنے والوں میں کون کون ہے اور جھنڈے والی کاروں میں کون لوگ ہوتے
ہیں۔ اور یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔ حماد کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ اُسے کسی سے
دلچسپی تھی۔ رات کے آٹھ بجے اُس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ اپنے کوارٹر میں
چلا جاتا۔ گھر کے پیچھے بڑے اچھے پکّے اور بجلی والے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ پٹھان بابا کو

ن پر کہ یہ لڑکا کسی اچھے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے اور پڑھنے کا شوقین ہے۔" بیگم جہانگیر
نے سب سے اچھا کوارٹر دے دیا تھا۔ صبح سات بجے وہ ڈیوٹی پر آجاتا! ور رات
بجے اُسے چھٹی مل جاتی۔ اس کے بعد اُس کا جو جی چاہتا کر سکتا تھا۔ اور جہاں جی چاہے
سکتا تھا۔ کھانا بھی اُسے بیگم کے ہاں سے پکا پکایا مِلتا تھا۔ مگر وہ بہت کم ان کا کھانا
صرف صُبح کی چائے پی لیتا۔ دوپہر کو وہ گاڑی کے ساتھ جہاں بھی ہوتا۔ وہاں سے
کھا لیتا۔ کبھی فلم دیکھنے چلا جاتا۔ اور کبھی یونہی دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر واپس آجاتا
رات کا کچھ حصّہ پڑھنے میں صرف کرتا۔ ویسے وہ اپنی کتابیں موٹر میں بھی رکھ چھوڑتا تھا۔
بیگم رقیّہ جہانگیر جہاں بھی جاتیں۔ کافی دیر لگا کر آتیں۔ وہ باہر موٹر میں بیٹھا اپنے
ں کی کتابیں پڑھا کرتا۔ وہ آتیں تو جھٹ کھڑا ہو جاتا۔ مستعدی سے دروازہ کھولتا۔
کار اسٹارٹ کر دیتا۔

اس لئے بیگم جہانگیر کو وہ بہت پسند آیا تھا۔ کبھی اُن کے دیر لگانے پر اُس نے
بت نہیں کی تھی۔ کبھی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ ورنہ پہلے ڈرائیور تو ہمیشہ یہ شکایت کر کے
جاتے تھے کہ بیگم صاحبہ پانچ منٹ کا کہہ کر جاتی ہیں۔ دو گھنٹے لگا دیتی ہیں۔ ہم اتنی دیر
لاز میں نہیں کھڑے ہو سکتے۔ مگر یوں لگتا جیسے حماد تو پیدائشی ڈرائیور ہے۔ دو گھنٹے
کیا بعض جگہوں پر اُسے چھ چھ گھنٹے کھڑا رہنا پڑتا۔ وہ اُف بھی نہ کرتا۔ موٹر میں بیٹھا
یں پڑھتا رہتا۔ تھک جاتا تو اُٹھ کر ایک آدھ چکر لگا لیتا۔ بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتا چائے
طلب ہوتی تو کسی نزدیکی دوکان سے چائے پی لیتا۔ ورنہ یونہی کھڑا سگریٹ کا
دھواں اڑاتا رہتا۔

مشاہدہ ——

مشاہدہ —— ؟

بھی اُس کی تنہائیوں کا ساتھی تھا۔ جہاں بھی جاتا مشاہدے کو کچھ نہ کچھ مِل جاتا۔

پھر وہ اللہ کی کون سی زمین ہے۔ جس پر انسان نہیں بستے۔ ہر آدمی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اگر کوئی آنکھیں رکھتا ہو۔ اور انسانی نقوش کو جو حروف کی صورت اُس پر مسلط ہوتے ہیں۔ پڑھنا شروع کر دے تو دُنیا میں اُس کے لئے اور کوئی اہم کام نہیں رہ جاتا ———

اچھوں کا مشاہدہ ———

بُروں کا مشاہدہ ———

عورتوں کا مشاہدہ ———

مردوں کا مشاہدہ ———

واقعی ——— ایک تنہا آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا شغل ہو سکتا ہے۔

بیگم جہانگیر جب مُسکراتی ہوئی باہر آتیں۔ اور اُسے پہلے کی طرح مستعد دیکھتیں تو بڑی واضح مُسکراہٹ سے اُس کا خیر مقدم کرتیں۔

"منشی گل! تم بہت اچھے ہو ———" وہ اکثر کہتیں۔

لیکن اُس کے جواب میں حماد ہمیشہ خاموش رہتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ———

"یہ ایک اور جادو گرنی ہے ———"

خون چوسنے والیاں بھی کہیں ہمدرد ہو سکتی ہیں۔

بیگم رقیہ جہانگیر کی بیٹی عمارہ جہانگیر بھی عجیب و غریب چیز تھی۔ ماں کی طرح وہ بھی موٹی اور گول مٹول چھوٹے سے قد کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ رنگ بے حد گورا تھا۔ اور گورے رنگ پر اُسے غرور بھی بڑا تھا۔ ماں کی طرح اُسے بھی بھاری بھرکم اور شوخ رنگوں کے کپڑے پسند تھے۔

حماد کا کام یہ تھا کہ صبح سات بجے "جہانگیر لاج" پہنچ جاتے۔ سب سے پہلے چھوٹی بی بی کو کالج سے لانا ہوتا تھا۔ اگر گاڑی فارغ نہ ہوتی۔ تو بیگم صاحبہ اُسے کہیں سے فون پر کہہ دیتیں کہ آج بس میں یا کسی کے ساتھ آجانا۔ ورنہ حماد کو اُسے لانے کے لئے جانا

...ی کی طرح کالج سے نکلنے میں وہ بھی بہت دیر لگاتی تھی۔ مگر حماد نے تو اُنا کے ناگ ...ل دیا تھا۔ کالج کے گیٹ سے نکلتی ہوئی بے شمار ایک جیسی لڑکیوں سے بے نیاز ...نے جا کر موٹر کھڑی کر دیتا۔ اور خود کتاب کھول کر اُس میں مگن ہو جاتا۔

...مارہ جب قریب آکر کار بجاتی یا دروازہ کھولتی تو اُسے پتہ چلتا کہ وہ آگئی ہے۔ بعض ...ن اُس کی سہیلیاں بھی اُس کے ساتھ ہوتیں۔ تمام راستے وہ عجیب اور فضول قسم کے ...ایک دوسرے سے کرتی رہتیں۔ خصوصاً وہ ایک دوسری کو لڑکوں کے نام لے لے کر ...ں۔ خود ہی ادئی۔ ہائے کرتیں اور خود ہی چھوئی موئی بن جاتیں۔ جب اُس کی سہیلیاں ساتھ ...یا عمارہ بی بی اگلی سیٹ پر حماد کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ پھر سارا وقت وہ حماد کی طرف ...ر کے بیٹھی رہتی۔ مگر باتیں پیچھے اپنی سہیلیوں سے کرتی رہتی۔ بیٹھنے سے پہلے اکثر وہ کہتی ...ور اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟"

...ب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔ پہلے پہل تو حماد کہتا تھا۔

...جی گاڑی آپ کی ہے۔؟"

...گر بعد میں اُس نے خاموش رہنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکیاں ہنستی رہتیں اور وہ ادا سے ...یٹ پر بیٹھ جاتی۔ مختلف زاویوں سے حماد کو دیکھتی رہتی۔ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے ...ی پوری کوشش کرتی۔ ذرا سے بریک لگنے پر جان بوجھ کر ہائے کر کے کبھی ادھر گر جاتی ...بھی اُدھر۔ "ہائے اللہ جی! یہ تم کار کیسے چلاتے ہو۔ بالکل اناڑی ڈرائیور معلوم ہوتے ہو۔"

...س ریمارک پر اُس کی سہیلیاں پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

مگر حماد خاموش بیٹھا رہتا۔ اپنے چہرے پر کرختگی طاری کر کے۔ جیسے اُس نے کچھ ...ا نہیں۔ اور نہ ہی کچھ سننے کا ارادہ ہے۔

...بھی کبھی وہ اس حرکت پر خود ہی جھنجھلا جاتی۔

پھر اُس کی سہیلیاں اُس کے ساتھ آنے سے کتراتے لگیں۔

وہ کیوں کتراتی ہیں ———

ایک روز حماد پہ اس کا انکشاف ہوا۔ اس روز وہ یونہی ٹہلتا ہوا گیٹ کے قریب جا کھڑا ہوا تھا ———

عمارہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آ رہی تھی۔ اور اُن کی منّت کر رہی تھی کہ اُس کے ساتھ کار میں چلیں۔

اُس کی ایک سہیلی بولی ———

"بس عمارہ تو اس فضول ڈرائیور کا خیال دماغ سے نکال دے۔ اگر اُسے تیری طرف مائل ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ چھ ماہ تو ہو گئے اُسے تیرے ساتھ آتے ہوئے۔ ایک روز بھی تو اُس نے آنکھ اٹھا کر تیری طرف نہیں دیکھا"

دوسری بولی۔

"اور ہم نے کتنی کوشش کی اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کتنے ریمارکس دیئے اُسے۔ اور اشاروں میں بتایا کہ وہ تجھ پہ عاشق ہو جاتے ——— مگر وہ نہیں ہوا"

تیسری بولی۔

"اور تو اگلی سیٹ پہ کتنا جڑ کر اُس کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ یوں معلوم دیتا ہے وہ کوئی پتھر ہے۔ اُس کا دِل کسی پر نہیں آئے گا۔ بہتر یہ ہے کہ تو کسی اور اچھے سے لڑکے کو پھانسنے کی کوشش کر۔ بھلا اس ڈرائیور کے پاس کیا ہے۔ تیرے لئے ——— ؟

"ہائے ———" عمارہ نے سینے پہ ہاتھ مارا ——— خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ ذرا اور کوشش کر کے دیکھو۔ میری تو زندگی کا چین اس ظالم نے لوٹ لیا ہے۔ دیکھو تو سہی کس قدر خوب صورت آدمی ہے۔ اُس کی یہی بے پرواہی اور غرور تو مجھے پسند ہے خدا کے لئے میرا ساتھ دو۔ میرے پاس بہت دولت ہے اور میں اُسے حاصل کر کے رہوں گی"

حماد دوڑ کر کار کے پاس پہنچ گیا۔

ہوں۔ تو یہ منصوبہ بندی ہے۔

اس روز عمارہ کی سہیلیاں اُس کے ساتھ نہیں گئیں۔ وہ منہ پھلائے ——— روٹھی پیچھے بیٹھی رہی۔ حماد کو جی ہی جی میں بہت ہنسی آتی۔ کم بخت سمجھتی ہو گی ے منانے کی کوشش کروں گا۔ ———

حماد گرنی!

حماد کو یہاں آئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اُسے یہاں بہت آرام تھا۔ سب سے ت یہ کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے بی اے کا داخلہ بھجوا دیا تھا۔ کتابیں اور نوٹس خرید لئے تھے۔ اور بڑی دلجمعی سے پڑھ رہا تھا۔ اس پہ ماں بیٹی مہربانیاں سوا تھیں۔ مگر وہ ان کو کوئی رنگ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُسے تو بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا تھا پھر اپنی تعلیم بھی تو مکمّل کرنا تھی۔

عمارہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ وہ ہمیشہ نوٹ کرتا کہ جب بھی وہ پیچھے بیٹھتی ہے ئینے میں سے عجیب عجیب زاویوں سے اُسے دیکھتی ہے۔ کبھی مسکراتی ہے اور کبھی بڑاتی ہے۔ مگر اسے وہ ایک بگڑی ہوئی بچّی کی احمقانہ حرکات پہ ہی محمول کرتا تھا۔ جب سے اُس نے اِن لڑکیوں کی باتیں سُنی تھیں وہ اور محتاط ہو گیا تھا۔ اچھا ہے اس نے کبھی ملازم بننے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ یہ بے وقوف لڑکی کسی غلط فہمی میں ہو سکتی تھی۔

یہ ضرور ہے کہ اس ڈیڑھ سال کی جفاکشی میں وہ ایک مضبوط اور توانا مرد بن گیا تھا احتیاطیوں اور مشقتوں نے اُس کا گورا رنگ سنولا دیا تھا۔ اور بال بھی سیاہی مائل ے ہو گئے تھے۔ مگر اُس میں اور زیادہ مردانہ وجاہت آ گئی تھی۔ پھر اُس کی بےنیازی م بےزاری نے اُسے اور بھی کشش بخش دی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں سے بالکل بےنیاز

رہتا۔ کسی دن تو بڑی اچھی طرح تیار ہو کر جاتا۔ اور کسی دن وہی پینٹ اور بش شرٹ پہن کر سو جاتا۔ صبح کو کنگھی کئے بغیر ہی چلا جاتا۔ چھوٹے بچے کی مانند اس کے بال سارے بکھرے ہوتے۔ چہرے پر روٹھے ہوتے بچے والا سوز ہوتا۔ آنکھوں میں نمناک سی سوچ ہوتی اور لبوں پہ گہری خاموشی۔ بہت سی باتیں کرنے کو وہ ترس گیا تھا۔ بچپن کی بے شمار محرومیوں کی وجہ سے وہ بہت تند خو اور تنک مزاج ہو گیا تھا۔ اس لئے اُس نے خاموشی کی عادت اپنالی تھی کہ کہیں کسی روز وہ اپنا مستقبل ہی نہ مخدوش کر بیٹھے۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد ——— ایک صبح عمارہ بی بی جب موٹر سے اُتر کر کالج جانے لگی تو کتاب میں سے ایک خط نکال کر اُس نے حماد کو دیا اور بولی ڈرائیور اس کو ذرا پوسٹ کر دینا۔ جب وہ چلی گئی اور حماد نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا تو اُس پر کسی کا نام و پتہ درج نہ تھا اور لفافہ بھی کھُلا تھا۔ اُس میں سے بھاری بھرکم خط صاف نظر آ رہا تھا حماد کی ذہانت نے اندازہ لگا لیا کہ یہ خط کس کے نام ہے۔ کتنی دیر تو وہ شش و پنج میں گرفتار رہا۔ اس کو پھاڑ دے یا لوٹا دے۔

پھر اُسے خیال آیا کہ پڑھ لینے میں کیا حرج ہے۔

اُس نے خط کھولا۔ کوئی بیس صفحوں کا خط تھا۔ خط کیا تھا۔ عشق و محبّت اور ہجر و فراق کی ایک لمبی داستان تھی۔ ایک فرسٹ ایئر کی طالبہ جس طرح اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی تھی۔ اسی طرح بے ربط، احمقانہ خیالات شدید جذباتی انداز میں لکھے گئے تھے۔ غلط سلط شعر اور فلمی گانے۔ اور مختلف رسالوں سے پڑھے ہوتے عشقیہ افسانوں کے ڈائیلاگ بھی درج تھے۔ اور اپنے خون سے اپنا اور ڈرائیور کا نام لکھا تھا اور آخر میں لکھا تھا۔ اگر تم نے میری محبّت کا جواب محبت سے نہ دیا۔ تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ وغیرہ وغیرہ ——— حمّاد کو ہنسی آگئی۔ یہ لڑکیاں کتنی ناعاقبت اندیش ہوتی ہیں ———

جلدی سے عاشق ہو جاتی ہیں ———

زہر کھانے پر تُل جاتی ہیں ———

اگر انہیں نزدیک ہی کوئی بدل مل جاتے تو بہل جاتی ہیں اور پھر ہنستی ہوئی ڈولی میں بیٹھ جاتی ہیں ———

ان کا مقصد دل لگی اور وقت گزاری ہوتا ہے ———

مگر دوسرے کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں۔

اُس نے خط جیب میں ڈال لیا ——— اس کو پھاڑ دے ——— خاموش ہو جائے ——— یا جواب دے ———

دوپہر تک اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ خط لوٹا دے گا۔

چھٹی کے وقت جب وہ کار میں آکر بیٹھی تو بڑی شرمائی۔ جی اور پُر امید تھی۔ اُس کے بیٹھتے ہی حماد نے لفافہ نکال کر اُس کے آگے رکھ دیا۔ اور بولا۔ یہ خط آپ نے مجھے پوسٹ کرنے کو دیا تھا۔ مگر اس کے اوپر نام و پتہ لکھنا تو بھول ہی گئیں۔ اس لئے میں نے پوسٹ نہیں کیا۔ اب پتہ لکھ کر آپ خود پوسٹ کر دیں۔

ارے ——— اُس کا گورا رنگ ایک دم نیلا اور پھر سُرخ ہو گیا۔

شرمندگی ——— ہزیمت ——— غصّہ ———۔

مگر تھوڑی دیر میں اُس نے خود پہ قابو پا لیا۔

اور شرماتے ہوتے بولی۔

"وہ تو میں نے آپ کے نام لکھا تھا۔"

"کیا مطلب ——— ؟"

"آپ کو دیا تھا۔" وہ اور شرمائی۔

"مگر میں تو جی پڑھا لکھا نہیں ہوں۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں جی۔ کئی بار جب میں موٹر میں بیٹھنے کو آئی ہوں۔ تو آپ انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو جی ——— بس انگریزی میں چند حروف اٹھالیتا ہوں۔ انگریزی پڑھنے کا شوق بہت ہے۔ اس لئے بڑی بڑی کتابیں دیکھ کر دل خوش کرتا رہتا ہوں۔"

"تو پھر اُردو میں بھی ضرور حروف اُٹھالیتے ہوں گے۔" وہ طنزیہ بولی۔

"جی نہیں اُردو تو مجھے بالکل نہیں آتی۔"

"اب پھر آپ نے جھوٹ بولا ہے۔ میں ہر روز اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں۔ آپ صبح صبح آکر باہر برآمدے میں پڑا ہوا اُردو کا اخبار ضرور پڑھتے ہیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔

"آپ نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

"میں نے یہ خط پڑھا ہی نہیں ———"

"تو اب پڑھ لیجئے۔"

"معاف کیجئے۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

"آپ اتنے مغرور اور پتھر دل کیوں ہیں۔؟" وہ غصّے سے بولی۔

"میں آپ کا مُلازم ہوں بی بی صاحبہ۔" وہ بھی غصّے میں بولا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ جب میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر اُسے الفاظ نہیں ملے۔ اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

حماد نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ لفافہ پیچھے پھینکا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

جب عمارہ بی اچھی طرح رو چکی اور اس نے دیکھا کہ اُس کے آنسوؤں کا بھی ڈرائیور پر اثر نہیں ہوا تو منہ صاف کر کے بولی۔

"آپ نے آج اگر میری بات نہ سنی۔ تو میں سارا راستہ چلاّتی جاؤں گی۔ اور جا کر ممی سے

میں شکایت کروں گی کہ آپ راستے میں مجھے تنگ کرتے ہیں۔"

حماد کا ہاتھ اسٹیرنگ پر کانپ گیا۔

سب عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔

"آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہیے۔"

اُس نے کار آہستہ کر لی۔

"ایسے نہیں۔ کسی پرائیویٹ جگہ پر چلیے۔"

"میں تو یہاں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ ویسے مجھے تو اس شہر کی پرائیویٹ جگہوں کا علم نہیں ہے۔"

"میں بتاتی ہوں وہاں چلئے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ اس سے پہلے بھی ایسی جگہوں پر جاتی رہی ہیں۔"

"میں کیوں جاتی۔" وہ جلدی سے تنک کر بولی۔ "وہ تو میری سہیلیاں بتاتی رہتی ہیں۔"

"اچھا تو بتائیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم ۔ ۔ ۔" وہ ایک دم سیانی بن کر بولی۔ "جہاں آپ کا دل چاہتا ہے چلیے۔"

اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ آج اس چڑیل سے پیچھا چھڑانا مہنگا پڑے گا۔ مگر وہ بڑے تحمل سے جواب دے رہا تھا۔

وہ کار کو ایک سنسان سی سڑک پر لے گیا۔ اور ایک طرف کھڑی کر کے بولا۔

"اس سے بہتر میری نظر میں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو کہہ ڈالیے ورنہ میں گھر کی طرف چلوں گا۔"

وہ پیچھے سے اُٹھ کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ اور ادا سے بولی۔

"پہلے بتلایئے آپ کا اصلی نام کیا ہے؟"

"جی۔ میرا نام کچھ نہیں ہے۔ مجھے آپ ڈرائیور کہیں۔"

"ڈرائیور کوئی پیدائشی تو نہیں ہوتا۔ آخر بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین بُرا بھلا کوئی نام تو رکھتے ہیں۔"

"میرے والدین نے میرا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔"

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ آپ کے دوست آپ کو کیا بلاتے ہیں؟"

"اوّل تو میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ جو واقف ہیں وہ مجھے منشی بلاتے ہیں۔"

"ہائے اللہ۔" وہ ادا سے ہنس پڑی۔

"اتنے خوبرو آدمی کا اتنا بور نام۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"ویسے آپ اگر پسند کریں تو میں آپ کو اپنے کسی پسندیدہ نام سے بلا لیا کروں گی۔"

"بلا لیا کریں۔"

"میں آج سے آپ کو شہزادہ کہوں گی۔"

وہ طنز سے ہنسا۔

"ڈرائیور بھی کبھی شہزادہ ہوا ہے۔"

"آپ کسی کے دل کے شہزادے تو ہو سکتے ہیں نا؟"

"یہ باتیں آپ کسی اچھے اور خاندانی آدمی کے لئے سنبھال رکھیے۔ اور مجھے بتایئے مجھ سے اور کیا کہنا ہے آپ کو۔"

"ہائے اللہ۔ میں آپ کو اپنے دُکھ درد کی اتنی لمبی داستان کیسے سناؤں۔ اس کے لئے تو بہت وقت چاہیئے۔"

ے پاس تو یہی مناسب وقت ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں مصروف آدمی ہوں اگر ہ نہیں کہنا تو گھر چلتے ہیں بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

آپ بڑے ظالم اور سنگدل ہیں۔ میرا خیال تھا آپ خود کوئی دُکھی آدمی ہیں اور میرا ناپسند کریں گے۔" اس نے دوسری طرح پانسا پھینکا۔

حماد نے سگریٹ سُلگا لیا۔ اور اُس کے داؤ پیچ دیکھنے لگا۔ کہ ایسی آسودہ حال لڑکی ھ ہو سکتا ہے۔ جس کے پاس ہر شے افراط سے ہے اور جو اپنی عمر سے بڑی لگ ہے اور کوئی فالتو شغل چاہتی ہے۔

اس نے حماد کو خاموش دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

آپ کو کیا معلوم میں کتنی دُکھیا لڑکی ہوں۔ جب میں چھوٹی سی تھی۔ تو میرے ڈیڈی پھر ممی نے مجھے نوکروں کے رحم و کرم پر رکھا۔ انہیں ہر وقت اپنے سوا کچھ نظر نہیں ساری دنیا سے زیادہ اہم اپنی ذات کو سمجھتی ہیں۔ اُن کے پاس سب لوگوں کے وقت ہے۔ لیکن میرے لئے وقت نہیں ہے۔ کبھی پاس بیٹھ کر مجھے پیار نہیں ے دل کی بات نہیں پوچھی۔ ویسے بے شمار کپڑے بنا دیتی ہیں۔ پیسے بھی دل کر دیتی ہیں۔ مگر کپڑوں اور پیسوں سے بھی کہیں کسی کا جی بہلا ہے۔

مجھے کہیں سے سچا اور بھرپور پیار چاہیئے۔ جو ماں اور باپ کے پیار کا بدل ہو۔ احساسِ تنہائی کی ماری ہوئی ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔۔۔۔ ممی کو آپ جانتے۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے اتنی مہربان اور شفیق عورت کے متعلق میں کیسی باتیں ہوں۔ مگر آپ کو کیا پتہ۔ آپ پر تو وہ خاص طور پر مہربان ہیں اس لئے آپ کو چالاکیوں کا کیا علم ہو سکتا ہے۔؟"

ان کو پتہ نہیں اپنے متعلق کیا غلط فہمی ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ساری دُنیا ان ہے۔"

اور وہ خود بھی چاہتی ہیں۔ اس شہر کا ہر آدمی ان پر عاشق ہو جائے ۔۔۔۔
دو چار لوگ جو کبھی میری طرف مائل تھے۔ ممی نے دولت کے زور پر ان کو بھی اپنا
مطیع کر لیا ہے ۔۔۔۔۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکتیں کہ کوئی آدمی میری طرف ملتفت ہو۔ یا مجھے
اپنانا چاہتا ہے۔ بہت حسد کی ماری ہوئی ہے میری ممی ـــــ

اب آپ ہی بتائیں۔ اس بھرے گھر میں۔ مَیں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔

ہائے اللہ۔ مجھے تو اس بات سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر انہیں ذرا سا بھی شک
گیا کہ میں آپ کو چاہنے لگی ہوں۔ تو وہ آپ کو بھی ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ـــ

حماد نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کر دی ـــــ اور پھر ذرا رک کر بولا۔

"اچھی بیٹیاں اپنی ماؤں کے متعلق ایسے کلمات زبان پر نہیں لاتیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ مَیں نے کوئی نصیحت سننے کے لئے تو آپ کو اپنے دل کی بات نہیں
بتائی۔ میں نے آپ کو اپنا غمگسار سمجھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔"

حماد نے آہستہ آہستہ موٹر چلانی شروع کر دی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس
بھٹکی ہوئی لڑکی سے کیا کہے اور کس طرح کہے۔ ؟

ایسے معاملات بھی اس دُنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ ؟

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ حمادہ بولی۔

"خدا کے لئے ممی کی وکالت کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ انہوں نے
آپ کو بھی خرید لیا ہے۔"

"بہر حال میں اُن کا ملازم تو ہوں نا ؟"

"ہوں گے مگر میرے تو نہیں۔ میں تو آپ کو اپنا مالک بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے
معلوم ہے ممی رستے میں ضرور آئیں گی۔
میں آپ کو سچ سچ بتاؤں کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ اپنی ممی کو سوتے میں قتل

کر دوں اور اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کروں۔ مگر افسوس میں ایسا بھی نہیں کر سکتی۔ پھر
مجھے بھی پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔

حماد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس انتہا پسند اور جذباتی سی بے راہ لڑکی کو
سمجھانا فضول تھا ـــــ جو باتیں اُس نے حماد سے کہی تھیں۔ اُن کے آئینے میں
گھریلو ماحول صاف نظر آ رہا تھا۔ حماد کی صاف ستھری طبیعت کے لئے اس کو
برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر وہ تا حال کہیں اور نہ جا سکتا تھا۔ اگلے مہینے اس کے امتحان
شروع ہونے والے تھے اور وہ یہیں رہ کر سکون سے امتحان دے سکتا تھا۔ اس لئے
اُسے بیٹی اور بیگم دونوں کے اعتماد کو برقرار رکھنا تھا۔

اگرچہ وہ بیگم جہانگیر کے گھریلو معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ ہر معاملے
سے دُور دُور رہتا تھا۔ پھر بھی اُس نے محسوس کیا تھا کہ لوگ بیگم جہانگیر کا ذکر اچھے الفاظ
میں نہیں کرتے۔ اس سے بھی بعض لوگوں نے مشکوک سے سوالات کئے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ
اسے اپنی غلط فہمی سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اور اب جیسے ہر بات اُس کے سامنے بے نقاب
ہو گئی تھی۔

"آپ کیسے ہمدرد ہیں کہ آپ نے میری کسی بات کا جواب محبت سے نہیں دیا۔"
حمادہ کہہ رہی تھی۔

"جی ـــــ وہ چونکا ـــــ واقعی مجھے آپ کے حالات سُن کر آپ سے ہمدردی
ہوئی ہے ـــــ"

"سچ مچ ـــــ وہ خوشی سے اچھل پڑی ـــــ میں نہ کہتی تھی۔ کہ آپ ایک بار میری
باتیں تو سنیں۔ شکریہ بہت بہت۔"

حماد نے سوچا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ مگر بہر حال امتحان تو اُسے دینا ہی
تھا۔ اس لئے جال پھینک دیا۔

"آپ یوں کریں۔ دل لگا کر پڑھا کریں۔ اور اچھی اچھی کتابیں خریدیں۔ کتابوں کو ہی اپنی تنہائی کا ساتھی بنائیں۔ یہ بہت اچھی دوست ثابت ہوتی ہیں ——"

"مگر میرا ایک دل اور ایک جسم بھی ہے ——"

"دیکھتے میں آپ کا ہمدرد ضرور ہوں۔ مگر اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ آپ کی باتیں سمجھ سکوں ——"

"آپ مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان دے رہے ہیں۔ میں نے آپ کے متعلق بہت معلومات حاصل کرلی ہیں۔ اور اگر آپ نے میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو میں غلط ہاتھوں میں چلی جاؤں گی اور اُس کا ذمّے دار آپ کو ٹھہراؤں گی۔ میں نے تو آپ کو انتہائی شریف آدمی سمجھ کر اپنا راز بتایا تھا۔"

"اچھا تو آپ میری ایک بات سُنیں —— حماد نے ایک فیصلہ کن انداز میں کہا۔ پہلے وعدہ کریں کہ مانیں گی۔ تب کہوں گا۔"

"ایک بار نہیں ہزار بار مانوں گی۔ کہیئے تو سہی" وہ جلدی سے بولی۔

"اب آپ کو معلوم تو ہو ہی گیا ہے کہ میں بی اے کا امتحان دینے والا ہوں۔ یہ دُرست ہے کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہوں اس لئے ضروری ہے کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں۔ آپ جانتی ہیں۔ مجھے کوئی پڑھانے والا بھی نہیں نوکری بھی کرتا ہوں اور خود ہی پڑھنا پڑتا ہے۔ اس لئے آپ وعدہ کریں کہ جب تک میرے امتحان نہیں ہو جاتے آپ کسی طرح بھی مجھے تنگ نہ کریں گی۔ نہ خط لکھیں گی۔ نہ راستے میں روک —— نہ زیادہ باتیں کرکے —— اگر آپ ایسا کریں گی تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ آپ یونہی مجھے بے وقوف بنا رہی ہیں۔"

"خدا کی قسم میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اور اس کا ثبوت دوں گی۔ اچھا

بتائیں —— جب آپ کے امتحان ہو جائیں گے تو پھر آپ کیا کریں گے؟"

"آپ اپنے وعدے پر قائم رہیں۔ اور اتنا عرصہ انجان بنی رہیں۔ اور مجھے بالکل ...لیا تو امتحانوں کے بعد وہی ہوگا۔ جو آپ چاہتی ہیں۔"

"سچ مچ ——" وہ بے حد خوش ہو گئی۔ "میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ اور ...تی ہوں کہ امتحانوں تک کوئی بات نہ کروں گی۔ اور نہ آپ کو تنگ کروں گی۔"

پھر وہ نہ جانے کیا اول فول سارا راستہ بکتی رہی —— حماد تو یہ جال پھینک کر ...ہو گیا تھا۔

پھر اُس کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ وہ سرکش لڑکی اوچھی حرکتیں کرنے سے باز آگئی اور ...بیٹے رہنے لگی۔ ویسے پیچھے بیٹھی آئینے میں عجیب و غریب زاویوں سے دیکھتی ...ی۔ اور کبھی کبھی —— جاتے جاتے حماد کی سیٹ پر گلاب کا پھول رکھ جاتی۔ ...صوم حرکتوں کو حماد درگزر کر دیتا —— وقت بھی تو گزارنا تھا۔

انہی دنوں حماد نے محسوس کیا کہ بیگم رقیہ جہانگیر کی مہربانیاں اس پر بھی زیادہ ہو گئی ...وہ اکثر اس کا حال پوچھتیں۔ اور اُس کے امتحان کے بارے میں بھی سوالات کرتی ...کہ ٹھیک سے تیاری ہو رہی ہے کہ نہیں —— جب اس نے بتایا کہ اپنے سر ...رہا ہوں —— کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تو انہوں اتنے ازراہِ شفقت اُسے شام کو ایک واقف پروفیسر کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ تاکہ وہ امتحان کی ضروری تیاری ...اسے بتا دے۔ یوں آخری مہینے اُسے باقاعدہ پڑھنے کا موقع مل گیا۔ بلا ...یا تھا۔ جلدی ہی اُس نے کتابوں کے اہم حصے ازبر کر لئے۔ اور بالآخر اُس کا ...شروع ہو گیا۔

بیگم صاحبہ نے اُس سے کہا تھا کہ جب تک اُس کے امتحان ہوتے رہیں گے ...پر حاضر نہ ہو۔ مگر وہ چونکہ نمک حلال قسم کا ملازم تھا۔ اس لئے جس دن اُس

کا پیپر نہ ہوتا۔ تو گھر پر حاضر ہو کر پوچھتا۔ کوئی کام تو نہیں ہے۔ اگر بیگم صاحبہ مناسب سمجھتیں تو اُس کے ساتھ کہیں چلی جاتیں۔ ورنہ اُسے چھٹی دے دیتیں۔

البتہ عمارہ نے امتحان کے پہلے روز علی الصبح مالی کی چھوٹی لڑکی کے ہاتھ اُ بہت سے پھول بھجوائے تھے۔ اور ایک چٹ پر لکھی ہوئی کامیابی کی دعائیں بھ

واہ میرے مولیٰ ——— اس تماشے کے لئے کیا میں ہی رہ گیا ہوں۔ اُس دل میں سوچا تھا۔

جس دن اُس کا آخری پیپر تھا۔ اسے بہت سخت بخار ہو گیا ——— بخار کی حا میں ہی وہ پیپر کرنے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اسے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ چارپا پہ بے ہوش ہو کر گر گیا ——— بیگم صاحبہ کو معلوم تھا آج اُس کے امتحان ختم ہو اس لئے انہوں نے اُسے رات کی ڈیوٹی پہ بُلایا تھا۔ مگر اُسے کچھ بھی ہوش نہ تھا۔ بخار میں پھ رہا تھا۔ رات ہوئی تو چوکیدار اُسے بلانے آیا کہ بیگم صاحبہ اُس کا انتظار کر رہی ہیں۔ اُس نے معذرت کر دی کہ وہ تو ہل بھی نہیں سکتا۔

ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور وہ مارے حیرت کے اس تیز بخار میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیگم صا حسبِ معمول بڑی بھاری بھرکم اور گہرے رنگ کی ساڑھی باندھے دروازے میں کھڑی انہوں نے بہت عمدہ میک اپ کیا ہوا تھا۔ اور ذرا موٹاپا بھی اُن کا کم لگ رہا تھا۔

"ڈرائیور! ابھی مجھے چوکیدار نے بتایا کہ تمہیں سخت بخار ہے۔ میں تمہارے لئے دوا لا ہوں۔ تم نے پہلے اطلاع کیوں نہ دی۔ میں ڈاکٹر کو بلوا دیتی۔"

"بس جی۔ مجھے تو دوپہر سے ہوش ہی نہ تھا۔" وہ احتراماً لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

وہ اندر آ گئیں۔ انہوں نے تین گولیاں اور ایک پانی کا گلاس میز پر رکھا اور بولیں۔

"بھئی تم لیٹے رہو۔ بیمار ہو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اور ابھی میرے سامنے گولیاں کھا لو۔ باقی کی گولیاں اس شیشی میں ہیں۔ چار چار گھنٹے بعد تین تین گولیاں کھاتے رہ

ضرور تمہارا بخار اُتر جائے گا۔ میں نے خانساماں سے کہہ دیا ہے۔ تمہیں اس وقت پھریری دے جائے گا۔ اگر زیادہ تکلیف ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اس وقت میں ید کے ڈرائیور کو بلوا لیا ہے۔ تم اب آرام کرو۔"

ادہ تابعدار بچے کی مانند بیٹھ گیا۔ اُن کے حکم کے مطابق تینوں گولیاں اٹھائیں۔ اور ساتھ حلق سے اُتار لیں۔

اپ کی نوازش کا بے حد شکریہ بیگم صاحبہ۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ یہاں تشریف ہ بڑے مہذب انداز میں بولا۔

بھی اب ایسی غیروں والی باتیں نہ کرو۔ تم بہت ہی فرض شناس آدمی ہو۔ اور ہمارا ہے کہ تمہاری اچھی طرح دیکھ بھال کریں۔" پھر جاتے جاتے انہوں نے اپنا پرس کھولا ا سے سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اور اُسے اُس کی میز پر رکھ دیا۔

جی یہ ———" وہ ہکلانے لگا۔

بھئی اگر تمہیں بیماری میں کسی شے کی ضرورت ہو تو لے لینا۔ بعد میں تنخواہ میں سے اں گی۔ اچھا اب تم آرام کرو۔"

وہ خوشبو اُڑاتی باہر چلی گئیں۔

اُس نے نوٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اور حیران ہو کر سوچنے لگا۔ اس دنیا میں فرشتے ستے ہیں۔

پھر وہ سو گیا۔

اگلے دن بھی دو دفعہ چوکیدار بیگم صاحبہ کی طرف سے اُس کا حال پوچھنے آیا۔ اور وہ ان تلے دب کر جی ہی جی میں شرمندہ ہوتا رہا ——— شام کو مالی کی بیٹی عمارہ بی بی لائی۔

نصیب دشمناں آپ بیمار ہیں اور میں تڑپ رہی ہوں۔ اگر کل تک آپ کو آرام نہ آیا۔

تو میں کل رات کسی طرح چھپ کر آپ کے کوارٹر میں آؤں گی۔"

سو کل رات سے پہلے پہلے ٹھیک ہونا ضروری تھا۔

دوسرے دن اُس کا بخار بالکل اُتر گیا تھا۔ وہ باہر لان تک بھی گیا۔ پھر اُس نے اظہارِ تشکر کے طور پر چوکیدار سے بیگم صاحبہ کو کہلوا دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر انہوں نے کہیں جانا ہو تو حاضر ہو۔

بیگم صاحبہ نے کہا۔ انہیں ایک جگہ جانا ہے۔ جب وہ تیار ہو جائیں گی بلوالیں گی رات کے دس بجے جب وہ سونا چاہ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کا بلاوا آ گیا۔ وہ جلدی سے جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔

چوکیدار نے بتایا کہ بیگم صاحبہ اُسے اندر بُلا رہی ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ جب سے اُن کے گھر میں آیا تھا کبھی گھر کے اندر نہیں گیا تھا۔ اور آج بیگم صاحبہ کے کمرے میں جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ باہر ہی کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے آواز دے کر اُسے اندر بُلا لیا۔

وہ ڈرتے جھجکتے اندر داخل ہوا۔ اور داخل ہوتے ہی اُس نے نظریں جھکا لیں —

بیگم صاحبہ اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھیں۔ بولیں۔

"بیٹھ جاؤ ڈرائیور۔ ابھی تم کمزور ہو کھڑے نہیں ہو سکتے۔" ان بیش قیمت صوفوں پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"بھئی بیٹھ جاؤ۔ تکلف کیوں کر رہے ہو۔؟" وہ مسکرائیں۔ "میں نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ تم ابھی اچھی طرح ٹھیک نہیں ہوئے اور مجھے وہاں دیر ہو جائے گی۔"

"جی نہیں ... میں تو ...." وہ دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ "بالکل ٹھیک ہوں۔ گاڑی چلا سکتا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے زور سے اُس کے کندھے کو دبا کر کہا۔ وہ ڈر کے مارے بیٹھ گیا۔ مسکراتی ہوئی گئیں اور ہاتھ میں کافی کی ایک پیالی لے کر آئیں۔ اور بولیں۔ "لو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پیو۔" حماد نے ڈر کے مارے وہ پیالی پکڑ لی۔

آج کچھ انہونی ہو جائے گی۔ وہ اس التفات سے جی ہی جی میں ڈر بھی رہا تھا .... حیران بھی ہو رہا تھا۔

"آج میں نے تمہیں اس لئے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ کہ تم سے تمہارے حالات معلوم کروں۔ مجھے تم کوئی بہت ہی غمزدہ لڑکے معلوم ہوتے ہو۔ کون ہے تمہاری ماں جس نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے ——" وہ آکر اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔

حماد کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ جب کوئی غیر ہمدردی کرتا ہے تو اپنوں کے ظلم اور زیادہ یاد آنے لگتے ہیں۔

حماد نے نظر اٹھا کر بیگم صاحبہ کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہاں شفقتِ مادری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ ایک ہوس اور کرختگی تھی۔

اور اگر اس عورت کے پاس ممتا ہوتی تو کیا اس کی اکلوتی لڑکی اس طرح بھٹک رہی ہوتی۔ دفعتاً حماد کے اندر ایک لال جھنڈی سی لہرائی وہ گھبرا گیا! ور گھبراہٹ میں کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے ڈرائیور۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تم میرے مہمان ہو۔"

"جی ہاں —— مجھے ایک دم سے یاد آگیا ہے کہ میں کوارٹر کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہوں کوئی میرے پیسے اُٹھا لے گا۔"

"بھئی ہم تمہیں اور دے دیں گے۔" اُنہوں نے ایک ادا سے اِٹھلا کر کہا۔

"بس پانچ منٹ کی مہلت دیں۔ میں ابھی دروازہ بند کر کے آتا ہوں۔" اُس نے جلدی سے کہا اور باہر کی طرف لپکا۔ اس سُرعت سے کہ وہ روکنے کے باوجود اُسے نہ روک سکیں۔ ٹھور ٹھور کرتی رہ گئیں۔ وہ سرپٹ بھاگا۔

جب وہ اُن کے کمرے سے نکل کر بھاگ رہا تھا تو باہر برآمدے میں اُس نے دیوانہ
ٹہلتا ہوا ایک سایا بھی دیکھا تھا۔اس سے وہ ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔۔۔۔مگر۔۔۔دیوانوں
کی طرح سر پہ پیر رکھ کر بھاگ آیا۔شاید وہ عمّارہ تھی۔اس وقت اُسے کسی کا ہوش نہ تھا سوا
اس کے کہ وہ اس جادُوگرنی کے جنگل سے دُور بھاگنا چاہتا تھا۔مڑ کر بھی نہ دیکھنا چاہتا تھا
مبادا وہ اُسے سیاہ پتھر میں بدل دے۔بھاگا اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔پھر جو سڑک سامنے
آتی اس پر دوڑتا چلا گیا۔کافی دُور بھاگ چکنے کے بعد وہ ہانپنے لگا۔دُور سے ایک ٹرک
کی بتیاں نظر آرہی تھیں۔اُس نے ہاتھ دے کر اس ٹرک کو روکا۔ڈرائیور اُس کا واقف ہی
نکلا۔وہ چھلانگ لگا کر ٹرک میں بیٹھ گیا۔اور ٹرک اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

کتنی دیر تک وہ ہانپتا کانپتا گم صُم سا ٹرک میں بیٹھا رہا۔ٹرک اپنی رفتار سے چلتا رہا۔
ی نے کوئی بات نہ کی۔وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔جب اُس کی دھڑکنیں ذرا ٹھیک
یں تو اُس کے اعصاب کا تناؤ بھی کم ہوگیا۔اُس نے لمبی سانس چھوڑ کر چاروں طرف دیکھا
پھر جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ماچس کہیں گر گئی تھی۔اپنے ساتھی سے جلتی ہوئی
ریٹ پکڑ کر اُس نے اپنی سگریٹ جلائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔
اُسے حواسوں میں آتا دیکھ کر ڈرائیور اور اُس کے ساتھی بھی گفتگو کے لئے آمادہ ہو
ے۔اس ڈرائیور سے حماد کی بہت جان پہچان تھی۔یہ بھی خان بابا کا دوست تھا اور اڈے
لا کو اکثر ملتا رہتا تھا۔یوں بھی یہ بسوں اور ٹرکوں کے ڈرائیور اور کلینر وغیرہ خود کو ایک ہی
ت برادری میں سے گردانتے ہیں۔
"کیا بات ہے یار! بہت خوف زدہ نظر آرہے ہو۔کیا کوئی حادثہ ہوگیا ہے تمہارے
ساتھ۔؟"
"حادثہ۔۔۔۔۔؟" حماد نے چونک کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔پھر اپنے جلیئے کی طرف
دیکھا۔اتنے میں اس کی ذہانت جاگ اٹھی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"حادثہ تو نہیں ہوا۔ البتہ میں اس سنسان سڑک پر ڈر گیا تھا۔"

"بھئی تم یہاں آئے کیسے ——؟"

"کچھ نہیں یار۔ کئی دن سے بخار تھا۔ آج طبیعت بہت گھبرا رہی تھی۔ خود ہی دوائی لینے نکلا۔ بازار میں دیر ہو گئی۔ واپس آ رہا تھا کہ غلط سڑک پر آ گیا۔ یہاں آ کے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چڑیل میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ بس میں سرپٹ بھاگا۔ جتنی تیز دوڑتا۔ یوں معلوم ہوتا وہ بھی اتنی ہی تیز بھاگی آ رہی ہے۔ ابھی مجھے دبوچ کر کلیجہ چبا جائے گی ——" حماد نے واقعی خوف سے ایک جھرجھری لی۔

ڈرائیور اور اس کے ساتھی زور سے ہنس پڑے۔

"تم تو ابھی تک ڈر رہے ہو۔ بھئی اب تم اس چڑیل سے بہت دور آ چکے ہو۔ تمہیں معلوم ہے ہم تقریباً دس میل آگے نکل آتے ہیں۔"

"مگر آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم لوگ تو لاہور جا رہے ہیں —— کوئی بات نہیں تم کو اگر واپس جانا ہو تو۔ اسی جگہ چھوڑ آئیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔" حماد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ لاہور جاؤں گا۔"

"لیکن یار! میں نے تو سُنا تھا تم ایک جگہ نوکری کرتے ہو۔ اور بہت مزے میں ہو" ڈرائیور نے پوچھا۔

حماد نے ڈرتے ڈرتے اُس کی طرف دیکھا کہ کہیں قلعی نہ کھل جائے۔ پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔

"میں نے بی اے کا امتحان دینا تھا۔ اس لئے کچھ دن ہوئے وہ نوکری چھوڑ دی —— اب لاہور جا کر نوکری کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا خان بابا کو تمہارے نوکری چھوڑنے کا علم ہے؟" دوسرے آدمی نے کہا۔

"نہیں یار!" اُس نے اُداسی سے کہا۔ "دو تین دن ہوتے میرا امتحان ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد میں بیمار ہو گیا تھا۔ انہیں اطلاع نہیں دے سکا۔ اگر وہ تمہیں کبھی ملیں تو میری طرف سے بتا دینا۔ اور نہ مل سکنے کی معافی مانگ لینا۔ میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح میرا کرایہ بچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" دوسرے آدمی نے سر ہلایا۔ پھر وہ تینوں خاموش ہو گئے۔

حماد نے آنکھیں موند لیں۔ اور خیالات کی دُنیا میں کھو گیا۔ اس کا وہاں سے بچ کر نکل آنا معجزہ تھا —— شکر ہے۔ ماں بیٹی دونوں کے چنگل سے نکل آیا —— مگر سامان وہیں رہ گیا۔ سامان ہی کیا تھا۔ چند کپڑے۔ صاف ستھرا خوب صورت بستر اور بے شمار کتابیں۔ اُس نے اپنی تنخواہ کے پیسے کبھی جمع تو کئے نہیں تھے۔ اچھے اچھے کپڑے لیتا۔ انہیں وہ کبھی سلیقے سے نہ پہن سکتا۔ اور اپنی پسند کی کتابیں خرید لیتا۔ البتہ اس کا بستر صاف ستھرا اور قیمتی نہ ہوتا تو اُسے نیند نہ آتی گندے بستر اور گندے تکیوں سے اسے گھن آتی تھی۔ اس لئے پہلے مہینے کی ساری تنخواہ تو بستر کی نذر ہو گئی تھی —— نفیس چادریں —— سنبل کے نرم تکیے —— ملائم کمبل —— قیمتی کھیس —— قیمتی دری —— خوبصورت گدا —— اور ایک چھوٹا سا پیارا سا ٹیبل لیمپ —— رات کا ساتھی اس کا بستر اور تنہائی کی دوست اُس کی کتابیں۔ وہ سب اس طرح کوارٹر میں بستر پر بکھری پڑی تھیں۔ پرسوں رات جو بیگم صاحبہ نے نوٹ دیا تھا وہ بھی وہیں تکیے کے نیچے پڑا تھا۔ اس کی جیب میں اُس کی پچھلی تنخواہ کے بچے ہوئے چند روپے اور ریزگاری تھی سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس —— یہ اُس کا اثاثہ تھا۔

کوئی بات نہیں۔ اُس نے دل میں سوچا۔ اللہ اسی طرح مدد گار رہا تو وہ اپنے دست و بازو سے کما کر اس سے اچھا ایک اور بستر بنا لے گا۔ کپڑے بھی اور کتابیں بھی اور آ جائیں گی ——

ایک دفعہ پہلے بھی وہ ایک عظیم الشان گھر سے اسی طرح دو کپڑوں میں نکل آیا تھا
یہ تو اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ چیزیں اس کی کمائی کی تھیں تو۔
اس میں ہنر ہوا تو وہ ایسی ہزاروں چیزیں بنا لے گا۔ شکر ہے اللہ کا۔

اس مرتبہ پھر وہ جادوگرنی کے چنگل سے بچ گیا۔ اُس نے اندر ہی اندر بابا جان کا شکر
ادا کیا —— جن کی دعائیں ایسے وقت میں اُس کی مددگار بن جاتی تھیں۔ بابا جان کے تصور
کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں لاہور کی یاد آ گئی۔ لاہور —— اُس کے خوابوں کا شہر جہاں
اس نے جنم لیا۔ اور بابا جان کے زیرِ سایہ نو دس سال گزارے۔ وہ بڑی حویلی —— وہ چار یار
وہ محلے کے بچے —— وہ سب بڑے ہو گئے ہوں گے۔ اور قسمت کی مہار کے اشارے
پر چل رہے ہوں گے۔

وہ کافی طویل عرصے کے بعد لاہور جا رہا تھا۔ جب سے ڈیڈی کے پاس آیا تھا
لاہور جانا نصیب نہ ہوا۔ اُن کی ٹرانسفر ایک خاص مدت کے بعد مختلف شہروں میں ہوتی رہ
تھی۔ یہ بات اُسے بہت اچھی لگتی تھی کہ اُسے مختلف شہر دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ مگر جو بات
اُسے بُری لگتی تھی وہ یہ تھی کہ —— ہر شہر میں کمشنر ہاؤس کا مزاج اور ماحول ایک جیسا ہوتا
تقریباً ایک جیسے گھر —— ایک جیسی سج دھج —— ایک ہی جیسا رکھ رکھاؤ —— وہی
دن رات —— اور وہی تقریبات —— اُسے اپنے گھر میں کبھی کوئی نئی بات یا دلکشی نظر نہیں
آتی تھی۔ پھر اُس کا دل مچلنے لگتا کہ وہ لاہور چلا جائے۔ گلیوں میں سے گزرے —— بازاروں
کی رونق دیکھے —— بھیڑ میں گھس جائے۔ روز گھر آ کر ایک نئی خبر سنائے۔ ——
نئی نئی چیزیں دیکھے —— اور نئی نئی خبریں سنانے کا اُسے جنون تھا —— بات میں سے
بات پیدا کرنا اور اپنے مشاہدے کے زور پر نتائج اخذ کرنا اُس کا خاص مشغلہ تھا ——
مگر یہاں اُس کی خاصیتوں کو کون پوچھتا تھا۔ وہاں تو بندھی ٹکی زندگی گذارنا تھی۔
پھر وہ بھی مقدر میں نہ رہی ——

تمام راستے وہ اپنے ماضی کے متعلق سوچتا آیا۔ کبھی کبھی وہ لوگ آپس میں گپ بازی کر
کہیں چائے پیتے۔ کہیں کھانا کھاتے۔ کہیں سگریٹ پیتے۔ اس طرح اُن کا سفر تمام

اگلے دن دوپہر کے وقت وہ لاہور پہنچ گئے ——

لاہور ——

حماد کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ٹرک سے نیچے اُتر آیا۔ اور سڑک پر کھڑا ہو کر نظارہ کرنے لگا۔
لوگ —— بے شمار لوگ —— تانگے۔ موٹریں۔ اسکوٹر۔ رکشا۔ سائیکلیں ——
دُھول —— ہاؤ ہو ——
لاہور اپنی تمام تر خاصیتوں سمیت موجود تھا اور اُسے معلوم نہیں تھا۔ لاہور آ کر کیا
ہے۔ کہاں جانا ہے۔ اور کس کے پاس ٹھہرنا ہے۔
پہلے اُس نے سوچا —— وہ بابا جان کی حویلی میں چلا جائے۔ کم از کم رہنے کو تو ٹھکانہ
جائے گا ——
پھر وہ رُک گیا —— حویلی میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ ڈیڈی کو کسی نہ کسی طرح اس
اطلاع مل جاتی۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے اُسے لینے آ جائیں گے۔ اور جب انھوں
نے پورے تین سال اس کی خبر نہیں لی۔ تو اب اُن کے ساتھ جانے کا فائدہ۔ یوں وہ سامنے
گئے۔ تو وہ انکار بھی نہ کر سکے گا۔ پھر اس زنداں میں جانے کا فائدہ ——؟ باہر کی
لی ہوا اُس کی باغی فطرت کو بھا گئی تھی۔ اور وہ بڑا من موجی بن چکا تھا۔ جب جو جی
ہا کیا —— جیسے جی چاہے رہا —— اب بھلا وہ پابندیوں کو کیونکر برداشت
کتا تھا۔ پھر اُسے اپنے باپ دادا کی جائیداد سے کوئی توقع ہی نہیں رکھنی چاہیئے۔
ڈی بھی سمجھیں گے۔ شاید اس جائیداد پہ وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ میں تو ایسے سنگدل ڈیڈی پہ
کا اپنا حق نہیں سمجھتا —— یہ پورا عرصہ وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھتا رہا تھا۔ اس کا

خیال تھا کسی نہ کسی روز ڈیڈی کی طرف سے کوئی اشتہار ضرور چھپا ہوگا۔ جسے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چھپوائیں گے۔ اشتہار تو نہ چھپ سکا تھا ——— البتہ اُسے ہر روز اخبار پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور اخبار کے ساتھ اُس کی دلچسپی بھی بڑھ گئی تھی۔

لیکن اس بدگمان کو یہ نہیں معلوم تھا ———

کہ اُس کے گھر سے نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد ——— ہی سجّاد احمد بے چین ہو اُٹھے تھے۔ انہوں نے اسے مارا تھا۔ گالیاں بھی دی تھیں۔ گھر سے نکل جانے کو بھی کہا تھا ——— مگر محض اپنی بیوی کی خوشنودی کی خاطر ——— وہ کبھی تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ کہ حماد اتنا ضدّی اور غیرت مند ہے کہ پہلی بار یہ باتیں سُن کر ہی گھر سے نکل جائے گا۔ اُن کا خیال تھا یہ ڈرا سہما اور بُزدل بچہ ہے۔ رو دھو کر چُپ ہو جائے گا۔ اور وہ کسی فارغ وقت میں اُسے منالیں گے۔ بلکہ انہوں نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اب اسے کسی ہوسٹل میں داخل کرا دیں گے۔ گھر کی فضا اُس کے لئے سازگار نہیں ہے۔

ایک گھنٹہ بعد ہی انہوں نے اپنے خاص نوکر کو بُلا کر کہا ——— جاؤ دیکھو ——— حماد کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے ——— ؟

نوکر نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ وہ کہیں نہ مِلا ———

وہ تھوڑے سے گھبرائے۔ بولے سڑک پر جا کر دیکھو۔ اور اُس کے دوستوں سے پتہ کرو ——— اس کا کون کون دوست ہے۔ گھر میں کسی کو پتہ نہ تھا۔ اردگرد کی سڑکیں دیکھ ڈالیں۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

جب عاصمہ کو اس بات کا علم ہوا۔ تو تنک کر آئی اور بولی۔

"کیوں باؤلے ہوئے جاتے ہو ——— اُس نے کہاں جانا ہے ——— بات تو اسے ٹھیک سے کرنی نہیں آتی ——— کہاں جائے گا۔ ایسے ہی نہیں ڈرا دینے کو کہیں چھپ گیا ہے ——— بھوک لگے گی تو خود بخود آجائے گا۔"

سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ مگر سجّاد احمد سے ایک نوالہ بھی نہ کھایا گیا۔ حماد کی خالی کرسی کو دیکھتے۔ پھر سر درد کا بہانہ کر کے اٹھ گئے ——— اپنے کمرے میں انہوں نے خوب وہسکی پی۔ اور جب دُھت ہو گئے تو ——— بے سُدھ ہو کر سو گئے صبح چھ سات بجے اُن کی آنکھ کھُلی ——— ہوش آتے ہی انہوں نے پوچھا ——— "حماد کہاں ہے ؟ ———" مگر اُس کی ابھی تک کوئی خبر نہ ملی تھی۔ اب کے انہیں خواہ مخواہ غصّہ آنے لگا۔ اور انہوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔

پھر عاصمہ آڑے آئی ——— اور بولی ———

"کہاں جا سکتا ہے۔ ؟ اُس کے پاس تو پھُوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ پہلے بھی کئی بار تیائے بارہا سارا دن غائب رہتا تھا ——— رات ہو گی تو خود آجائے گا۔ اب اپنے آپ کو زیادہ نہ ظاہر کرو۔ اس طرح تو وہ اور بگڑ جائے گا ———" جتنا عاصمہ تسلّی دیتی اتنا ہی اُن کا دِل گھبراتا۔ کوئی چور اُن کے دِل میں چھپا لعنت ملامت کئے جاتا۔ اور اپنی زیادتیاں انھیں یاد آئے جاتیں۔ گھر میں بُلا کر انہوں نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ——— ؟ ایک روز بھی باپ بن کر نہ دکھایا۔ کبھی اُس کا حال نہ پوچھا۔ اُس کے دل کی بات نہ جانی ——— اُسے سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ——— ایک ہی ——— اور آج اُسے گھر سے نکال دیا۔

رات دبے پاؤں آئی ——— اور دبے پاؤں گزرنے لگی ——— مگر حماد نہ آیا۔ رات کے بارہ ایک بجے تک اُن کا پارہ ہائی ہو چکا تھا ——— جیسے وہ وہسکی کے گلاس چڑھا رہے تھے۔ اور عاصمہ کو بے شمار گالیاں دے رہے تھے۔ بار بار کہتے۔ "اگر میرا بیٹا نہ آیا تو تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ تجھے اور تیری بچیوں کو زندہ دفن کر دوں گا۔ تم نے جان بوجھ کر میرے بیٹے کو گھر سے نکالا ہے۔"

اس طوفان کو شراب نے دبا لیا۔ جو اُن کے دل میں اُٹھ رہا تھا۔ اور صبح ہو گئی

صبح کو انہوں نے سنجیدگی سے صورتِ حال پر غور کیا۔ اور تلاش کرنے کے منصوبے بنائے۔ مگر اس مرتبہ بھی عاصمہ حائل ہوگئی۔ وہ پولیس میں رپٹ درج کرانے کے حق میں نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا۔ اس طرح شہر میں ایک سکینڈل بن جائے گا۔ اور بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ یوں اُن کے گھر کے اندرونی حالات بھی منظرِ عام پر آجائیں گے اور نوکری بھی مخدوش ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ اُسے پرائیویٹ طور پر تلاش کیا جائے۔ سو مختلف لوگوں کو سمندر کے کنارے۔ مختلف تفریحی مقامات پر کافی دن تک بھیجا جاتا رہا پھر سجاد احمد نے ایک خاص آدمی کو لاہور بھیجا۔ انہیں شک تھا وہ ضرور بابا جان کی حویلی میں چلا گیا ہوگا۔ مگر وہ یہاں سے بھی لوٹ گیا۔ اس کے بعد پھر شہر کے کالجوں سے نئے داخل ہونے والے لڑکوں کے کوائف منگوائے گئے ——— وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا ———

عاصمہ تو کہتی کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔ مگر باپ کے دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی۔ جسے ہر شام وہ وہسکی سے بجھاتا۔ اور ہر صبح وہ پہلے سے تیز ہوتی۔ آخر اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ تھک ہار گئے۔ دُنیا نے انہیں زیادہ ڈھونڈنے کی مہلت ہی نہ دی۔ انہیں احساس ہوگیا کہ اُن کا بیٹا بڑا خودار تھا۔ اب جب تک کچھ بن نہیں لے گا۔ اپنی صورت نہیں دکھلائے گا ——— لیکن وہ مر کھپ گیا ہے، اس کا انہیں یقین نہیں تھا ——— ہاں جب عاصمہ کی کوئی سہیلی آکر پوچھتی ———

"بھئی عاصمہ تمہارا وہ سوتیلا بیٹا اب نظر نہیں آتا" تو وہ بڑی معصوم شکل بنا کر کہتی۔ "انٹر کرانے کے بعد ہم نے اُسے باہر بھجوا دیا ہے۔ اُسے شوق بھی بہت تھا۔ اب تعلیم مکمل کر کے آئے گا۔"

اپنے گھر میں یہ بات سجاد احمد نے اتنی مرتبہ سُنی تھی کہ اب وہ بھی ہر پوچھنے والے سے یہی کہنے پر مجبور ہو گئے تھے اور لوگوں کو یقین آگیا تھا کہ عام طور پہ بڑے لوگ ایسا

...تے ہیں۔

...عماد اس صورتِ حال سے بے خبر تھا۔ وہ سمجھتا تھا ڈیڈی اور ممی نے منصوبہ ...ے گھر سے نکال دیا ہے۔ تو اب اُسے اپنی قسمت آزمانی چاہیئے اور اپنی صلاحیتوں ...ہ کرنا چاہیئے۔

...وہاں سڑک پر کھڑے کھڑے وہ تھک گیا۔ اور خیالات کی اُڑان اُسے کہیں سے ...لے گئی۔ تب اُس کا ڈرائیور دوست آکر اُس سے پوچھ رہا تھا کہ کھانا نہیں کھاؤ ...اُس نے ڈرائیوروں کے ساتھ جا کر ایک سستے ہوٹل میں کھانا کھایا ——— ساتھ ...بنچ پر ایک آدمی آج کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا اُس نے آج کا اخبار نہیں ...تھا۔ کھانا کھانے کے بعد جب اُس نے دیکھا وہ آدمی اخبار پڑھ چکا ہے۔ تو اُس ...اخبار مانگا۔ اور سگریٹ سُلگا کر ایک طرف ہو بیٹھا۔ ——— معمول کے مطابق ...پ سیاسی خبریں تھیں۔ کچھ اندرونِ ملک کی اور کچھ بیرونِ مُلک کی ——— سرکاری ...رکاری خبریں۔ البتہ جرائم وحادثات کی خبریں بڑی چٹ پٹی اور جاذبِ توجہ تھیں۔ ...نے درمیان والے صفحے پر فلموں کے اشتہار بھی دیکھے۔ آج کل لاہور میں بہت ...ئی نئی فلمیں چل رہی تھیں۔ پھر آخری صفحے پہ اُس کی نظریں ایک خاص خبر پہ جم ...اُس کے ڈیڈی کا نام لکھا تھا۔ اور ساتھ لکھا تھا اُن کا تبادلہ پشاور ہوگیا ہے۔

پشاور ——— جسے وہ کل رات چھوڑ آیا تھا ——— آج صبح اُس کے ڈیڈی پشاور ...گئے ہوں گے۔ کتنا عجیب اتفاق تھا یہ۔

اُس کے اور ڈیڈی کے ستارے نہ مل رہے تھے۔

کتنا مزہ آتا کہ۔ کہ وہ بھی اِن دنوں پشاور میں ہوتا۔ اور بیگم جہانگیر تو ویسے بھی ...ری دفاتر کے چکر لگانے کی شوقین تھیں۔ ایک دن اُسے ساتھ لئے کمشنر صاحب ...فتر پہنچ جاتیں۔ اور اُدھر سے ڈیڈی اپنی لمبی سی کار میں آوارد ہوتے۔ دونوں کی

نظریں ملتیں۔

کیا سارے دفتر کے سامنے ڈیڈی یہ اعتراف کر لیتے کہ "یہ میرا بیٹا ہے۔"

اگر وہ ایسا کر لیتے ——— تو وہ یقیناً مکر جاتا۔ صاف انکار کر دیتا کہ میں اُن کا بیٹا نہیں ہوں۔ کتنا مزہ آتا ———

لیکن یہ تو ساری فلمی باتیں ہیں۔ اچھا ہوا۔ اُن کا سامنا نہ ہوا ——— اور اب سامنا نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ وہ کافی گستاخ اور نڈر ہو گیا ہے ——— اور ڈیڈی آخر ڈیڈی ہیں ——— !

سو زندگی کا نیا سفر لاہور سے شروع کرنا پڑے گا ———

اُس نے اپنے ساتھی ڈرائیوروں کی مدد سے وہاں ایک اومنی بس میں نوکری کر لی ——— تین چار مہینے اس تجربے میں گذرے۔ پھر اُس کی سیلانی طبیعت اُکتا گئی۔

اگلے چھ ماہ اُس نے ایک ہوٹل کی منیجری کی ——— شروع شروع میں وہ نوکری خاصی ہنگامہ خیز تھی ——— پھر اُس سے بھی اُس کا جی بھر گیا ——— اتنے میں اُس کا بی۔ اے کا رزلٹ آ چکا تھا۔ اس بار بھی وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ کچھ اس قسم کی نوکری مل جائے کہ۔ وہ ایم اے میں داخلہ بھی لے سکے ——— صبح کو یونیورسٹی چلا جایا کرے۔ اور شام کو نوکری کر سکے ———

بی۔ اے کی ڈگری اس شہر میں کوئی شے نہ تھی۔ اُس کے بل بوتے پر کوئی نوکری نہ مل سکتی تھی۔ البتہ کسی بڑی سفارش کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑی سفارش اُس کا اپنا باپ تھا۔ مگر وہ ان کا نام بھی استعمال نہ کرنا چاہتا تھا ——— اس ادھیڑ بُن میں ——— بہت سے دن گزر گئے ——— کبھی کہیں کوئی کام مل جاتا ——— تو اُسے پسند نہ آتا ——— کبھی کئی کئی دن یونہی جوتے چٹخاتے گذر جاتے۔ کئی بار تو فاقوں پر بھی نوبت آ جاتی۔ مگر وہ ہمت ہارنے والا نہیں

جگہ نوکری کر کے کچھ پیسے بنا لیتا۔ اگر نوکری پسند نہ ہوتی تو چھوڑ دیتا۔ وہ اپنی جبر نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ اپنی طبیعت کے خلاف کسی ایسی جگہ نوکری کرنا ہاں پیٹ کی آگ مٹانے کے لئے ضمیر کی آواز دبانی پڑے۔ اس لئے وہ یک جگہ کبھی نوکری نہ کر سکا۔

دنوں بھی ——— وہ بالکل بے کار تھا ——— اُسے لاہور آئے تقریباً ایک سال اس شہر کے مزاج سے وہ کافی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ اور رات گذارنے کانے بھی بنا لئے تھے۔

آج کل وہ ایسی حالت میں تھا کہ ٹیکسی یا بس میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ جیب ھوڑے سے پیسے رہ گئے تھے اور وہ چاہتا تھا۔ جلد از جلد کسی نوکری کا بندوبست

وہ اپنی سگریٹ پھونکتا ہوا پیدل چلا جا رہا تھا کہ اُس کا گذر لاہور کے ایک بڑے دفتر کے آگے سے ہوا۔ وہ غور سے دفتر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک ایک ی کی طرح اُس کے ذہن میں لپکا۔ "مجھے اخبار کے دفتر میں نوکری کرنی چاہیئے۔" نی بڑی ڈگری اور سفارش کے بغیر اُسے دفتر میں مُلازمت مل سکتی ہے ۔ ں نے اپنے حُلیئے پر نظر ڈالی۔ ایک دم سے تھرڈ کلاس سا۔ اُس کا حلیہ اُس کی الی کی چغلی کھا رہا تھا ——— مگر پھر بھی اُس نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ر کے ٹلنے والا نہیں تھا۔ اور اپنی قدرتی صلاحیتوں پر بھی اُسے پورا پورا بھروسہ ———

اُس نے سوچا اندر جا کر پتہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ سو اُس نے دروازے پر کھڑے اسے ایڈیٹر صاحب کے متعلق پوچھا۔ جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ اور اُن کے کی طرف چل پڑا ———

اندر بیٹھا ہوا ہر شخص اُسے مشکوک سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ
مفلوک الحال نوجوان اپنی بے روزگاری اور پریشانی کی داستان چھپوانے کے لئے
چلا آیا ہے۔

بہت انتظار کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب نے اُسے اندر بلوایا اور سر سے لے
پاؤں تک اُسے حیرت سے گھورنے لگے۔ پھر ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا
اور بولے۔

"فرمایئے ــــــ"

ایڈیٹر صاحب شکل سے کافی معقول اور فہیم معلوم ہوتے تھے۔ مگر حماد کا حا
اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اور اگر صبح بھی اُس کے دماغ میں ایسا خیال آجاتا تو
اپنا حلیہ ٹھیک کر کے آتا۔

اُسے سو فیصدی یقین ہو گیا ــــــ کہ آج اُس کی بات نہیں بنے گی۔

اور بات بنانے کے لئے فوراً اُسے کوئی چکر چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ــــــ
لیکن چکر چلانے سے پیشتر ہی اُس کی فطری ذہانت عود کر آئی۔ اور ساتھ ہی بابا جا
کا نورانی چہرہ اُس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

"میں حاضر ہوں بیٹا مجھ سے مدد لو۔"

اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

سب سے پہلے اُس نے اپنا مدعا بیان کیا کہ وہ اخبار کے دفتر میں نوکری چاہتا ہے۔
اُس نے توقف کر کے ایڈیٹر صاحب سے اُن کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہا۔ ان کا چہرہ
سپاٹ تھا۔ جیسے انہوں نے اس بات کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا ہو۔

لیکن حماد نے ان کا جواب سننے سے پہلے اپنا مفصّل تعارف کرا دیا۔ آج ا
نے پہلی بار پدرم سلطان بود والی بات کرنی چاہی۔ مگر بابا جان کو سامنے رکھ کر جب

ے بتایا کہ وہ منشی زیبا داحمد کا پوتا ہے۔ تو ایڈیٹر صاحب اُچھل پڑے۔ اپنی کرسی سے
ملا کے مصافحہ کیا۔ اور بڑی عقیدت سے بولے۔
"صحافت کے میدان میں منشی صاحب میرے اُستاد تھے۔ میں نے اس کیریر کی ابتداً
کے دفتر سے کی تھی۔ اور ابتدائی ٹریننگ اُن سے حاصل کی تھی۔ اُن کے مجھ پر بہت
احسانات ہیں اور اب میرا فرض بن گیا ہے کہ میں آپ کو اپنے قریب رکھوں اور جو
ں نے حاصل کیا ہے۔ آپ کو سونپ دوں۔" اس کے بعد اُنہوں نے پُرتکلف چائے
ی۔

اور بڑی شفقت کے ساتھ بابا جان کا ذکر کرتے رہے۔ اُن کے ساتھ گزارے ہوئے
دہراتے رہے۔ اُن کا ذکر کرتے ہوئے کئی بار ایڈیٹر صاحب کی آواز گلوگیر ہوئی۔
اد کو اندازہ ہوا کہ اس کے بابا جان کتنے عظیم آدمی تھے اور کتنے لوگوں کے دلوں میں
ل رہے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب کہہ رہے تھے۔

"منشی صاحب نے صحافت کے میدان میں ایک شمع روشن کی تھی اور آج تک ہم
شمع کی روشنی میں چل رہے ہیں۔ اُن کے نہ صرف ہم سب پر احسانات ہیں، بلکہ پوری
افت کی تاریخ اُن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔"

پھر حماد نے انہیں بتایا کہ وہ اپنی تعلیم بھی مکمل کرنا چاہتا ہے اور صحافت کی ٹریننگ
لینا چاہتا ہے۔ تاکہ اپنے دادا کی خواہشات کو پورا کر سکے۔ اس لئے اُس کے سپرد اس قسم
کیا جائے کہ دن کو دو تین گھنٹے یونیورسٹی میں گزار دے۔"

اس وقت انہوں نے حماد کو مشورہ دیا کہ وہ جرنلزم میں ایم اے کرے اور یہ بھی وعدہ
داخلہ اسے وہ دلوا دیں گے۔ کیونکہ یونیورسٹی میں اُن کا خاصا رسوخ ہے۔ پھر انہوں
سے کہا کہ فی الحال وہ انہیں رپورٹر کے طور پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ابتداء میں یہ نوکری

ضروری ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا کام دیکھ کر اُس کا رتبہ اور تنخواہ بڑھا دیں گے ـــــ پھر چلتے چلتے انہوں نے حماد سے اُس کے ڈیڈی کے متعلق پوچھ لیا۔

اسی بات سے وہ گھبرا رہا تھا کہ کہیں وہ ایسا ویسا سوال نہ کر دیں۔ اور جو کہیں انہیں شک ہو جاتے کہ وہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ تو پکڑ کر کہیں ڈیڈی کے حوالے نہ کر دیں۔

لیکن شکر ہے اُسے پتہ چل گیا تھا کہ ڈیڈی آج کل پشاور میں ہیں۔

جلدی سے بولا۔ "ڈیڈی پشاور میں ہیں اور ٹھیک ٹھاک ہیں"

"میاں تم نے پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیوں نہیں کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ـــــ مجھے ـــــ لاہور میں پڑھنے کا شوق تھا۔ اور ڈیڈی نے بھی کہا تجربے اور مشاہدے کے لئے گھر سے باہر رہنا بہتر ہے۔

"اچھا ـــــ اچھا ـــــ" وہ شفقت سے بولے۔ "تمہارے ڈیڈی سے ملے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ جب لاہور میں تھے تو اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب وہ بڑے معروف آدمی ہیں۔ دورے پر ایک دو دن کے لئے آتے بھی ہیں۔ تو ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔"

حماد بس مسکرا کر رہ گیا۔ اور اُسے علم بھی ہو گیا کہ ڈیڈی دورے وغیرہ پر لاہور بھی آتے ہیں۔ سو بندوبست ایسا ہونا چاہیئے کہ ایڈیٹر صاحب کو بھی علم نہ ہو سکے۔ کہ اُس کے اپنے ڈیڈی سے تعلقات خراب ہیں۔ حماد جب دفتر سے باہر نکل رہا تھا۔ تو ایک فاتح کی شان سے۔ ایڈیٹر صاحب اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے ـــــ یہ یقیناً بابا جان کی وجہ سے تھا۔ اُس کی اپنی خوبی نہ تھی۔ مگر اب بابا جان کا نام استعمال کر کے وہ بہت خوش تھا اور اُسے فخر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے دل میں کہا۔

بابا جان! آپ نے جو مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ کہ مجھے میری منزل دکھا دی۔ اب میں آپ کے نقشِ قدم پہ چلنے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ کے خوابوں کی تعبیر بن کر دکھاؤں گا۔ انشاءاللہ ـــــ"

لاہور میں رہتے ہوئے اُسے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اُس نے ایم اے کر لیا تھا۔ اخبار میں ...ے مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ اب وہ ملک کا جانا پہچانا کالم نویس تھا۔ ہر اہم موضوع پر وہ ...اُٹھاتا۔ عمیق مشاہدہ۔ ہمیشہ اُس کا ساتھی رہا۔ لاہور میں اُس کے بے شمار دوست بن ...ے تھے۔ اُس نے زندگی کا ایک چلن بنا رکھا تھا۔ اور انہی راہوں پر اُسے آگے بڑھنا تھا۔ ...ت آگے ـــــ

اُس کے دوستوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ اچھے بُرے۔ امیر غریب۔ مگر وہ خود ...شہ ایک عجیب سی درویشانہ شان میں رہتا ـــــ اپنے کئی دوستوں کے ہاں بھی رہا ...یلانی طبیعت کی وجہ سے۔ پھر اپنے ٹھکانے پر آ رہتا۔

ایڈیٹر صاحب اس پر بے حد مہربان تھے۔ سچی بات تو یہ ہے انہوں نے جو کچھ کہا ...کر دکھایا تھا۔ انہی کی نوازشوں نے اُسے یہ اچھے دن دکھلائے تھے۔

وہ اپنی اسی قلندرانہ شان میں زندگی کی جانب رواں دواں تھا کہ ایک دن سفر کے ...ران اس کی ملاقات اسمٰعیل سے ہو گئی۔ اس سادہ لوح آدمی میں اُسے نہ جانے کیا بات ...ائی کہ وہ اس کے ساتھ اُٹھ کر اُس کے گھر چلا گیا۔ وہاں اُسے آمنہ ملی ـــــ

آمنہ ———

جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے عورت کا کوئی رُوپ اس طرح نہیں دیکھا تھا

وہ تو ہمیشہ عورت سے متنفر رہا۔ اُسے مکر و ریا کی دیوی اور خود پرست و ظالم سمجھتا رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اب تک نہ تو وہ ذہن میں عورت کا کوئی صحیح مقام متعین کر سکا تھا اور

نہ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھ سکا تھا۔ پچھلے چھ سات سالوں میں ——— بے شمار لڑکیاں اور

عورتیں اُس کی زندگی میں آئی تھیں ———

اُس نے سب کو ایک ہی آئینے میں ایک ہی نگاہ سے دیکھا تھا۔ عورت کی اگر کچھ اہمیت

اُس کی نظر میں تھی۔ تو وہ یہ تھی۔ کہ وہ مرد کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔

بس جس طرح کسی کپڑے یا جُوتے کو استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح عورت

کے ساتھ سلوک کرنا چاہیئے۔

خریدا ———

پہنا ———

دِل خوش کیا ——— اور پھینک دیا۔

وہ اتنا عرصہ عورت سے عورت ہونے کا انتقام لیتا رہا۔ اُس نے عورت کو جی بھر کے

دیکھا اور پامال کیا تھا۔ اُس کے آنسوؤں کو مکر و ریا کی پہلی کڑی جانتا تھا۔ اُس کے حُسن و جمال کو

اس کا بہترین اسلحہ جانتا تھا اور اُس کی محبّت بھری باتوں کو قتل کی طرف پہلا قدم جانتا تھا۔ اس

لئے آج تک نہ تو اُس نے کسی لڑکی کی محبّت کا جواب محبت سے دیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی کے

ساتھ محبت اور شادی کے بارے میں ہی سوچا تھا۔

اُس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ شادی کے اہل نہیں ہے۔ وہ عورت ذات پہ اعتبار

نہیں کرتا۔ اس لئے اُس کی ازدواجی زندگی ہمیشہ کشمکش کا شکار رہے گی۔ تو پھر خواہ مخواہ کی

زنجیر پاؤں میں ڈالنے سے فائدہ ——— ؟

وہ تو سمجھتا تھا اُس کے قابل اللہ تعالیٰ نے کوئی عورت ہی پیدا نہیں کی۔ مگر جب اُس نے

یکھا۔

ہیں سکتے میں رہ گیا ———

ں رات جب وہ سوئی سوئی معصوم اور سادہ دل لڑکی اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی تو وہ

پہلی بار چونک اُٹھا۔

یا بات تھی ———

ے دیکھ کر سب سے پہلے اُسے خدا یاد آیا۔

ا ———

لیم ———

تر ———

بلند ———

جس نے ایسی مُورت بنائی تھی ———

پھر اُس کے ذہن میں سفید براق ایسی مسجدیں ——— اُن کے گنبد اور مینار گھومنے لگے

سجد کے سفید اور سر بُلند مینار ———

جن سے پانچ وقت کی اذانیں آ کر لپٹ جاتی ہیں۔ اور جو صراطِ مستقیم کا ایک پیغام بنے

ے رہتے ہیں۔

اور اُن کے بعد اسے بابا جان کا خیال آیا ——— سفید داڑھی والے ——— نُورانی

ے والے ——— پُر شکوہ آنکھوں والے ——— اور ایک آسمانی دبدبے والے بابا جان ———

اور بابا جان کے بعد ———

اُسے امّاں جان کا خیال آیا ———

ایک امّاں جان ہی تو اُسے اس دُنیا میں سچی اور صحیح عورت ملی تھیں۔ ورنہ باقی تو سیاہ

چادروں میں لپٹے ہوئے چاندی وسونے کے مجسمے تھے۔

اُسے اپنے بچوں کے لئے ایسی ماں چاہیئے تھی ـــــ مستعد، اطاعت شعار

باوفا ـــــ نیک خُو، باحیا ـــــ باوضو ـــــ اور پھر دل لُبھانے والی بھی ـــــ

اِتنی خوبیاں فی زمانہ کہاں ملتی ہیں؟

لیکن یہ آمنہ کون تھی ـــــ؟

کہاں سے آئی تھی ـــــ؟

اُس کا اماں جان اور بابا جان سے کیا ناطہ تھا ـــــ

کوئی ناطہ نہیں تھا۔ پھر وہ اُن کے سلسلے کی ہی ایک کڑی کیوں لگی؟

گھریلو ملگجے کپڑوں میں ملبوس ایک کمزور سی لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی ـــــ ہر آرائش سے اُس کا چہرہ پاک تھا۔ مگر کس قدر تقدس اور کس قدر نور تھا اُس کے معصوم چہرے پر ـــــ جلد گو زیادہ گوری نہ تھی ـــــ مگر یُوں تھی جیسے چاندنی میں وضو کر کے آئی ہو ـــــ آنکھیں اُ

اُس کی آنکھیں ـــــ

اُس کی جھلکتی ہوئی، مصفّا اور مقدّس آنکھوں میں جھانک کر ایک دم خدا کی عظمت کو سج کرنے کو جی چاہتا ـــــ جب وہ سادگی سے نگاہ جُھکاتی ـــــ تو یوں لگتا ـــــ کڑ دُھوپ میں بادل چھا گئے ہوں۔ اور زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان میں سرسبز درختوں سے ڈھکی گھنی چھاؤں والی وادی آگئی ہے۔

اُس کا باتیں کرنے کا انداز کتنا سادا اور سچا تھا۔

اس لئے اُس کی ہر بات دِل میں اثر کرتی تھی۔

وہ عام عورتوں کے عشوہ و غمزے سے بالکل نا آشنا تھی۔ مگر جب وہ ہنسی کو ہونٹوں م دبا کر پلکیں جھپکاتی تو حماد کا جنگلی دل دھک دھک کرنے لگتا۔

اُسے دیکھ کر ایک عرصہ بعد حماد کو خُدا یاد آیا۔

اور اُسے سجدہ کرنے کو دل چاہا۔

اُسے دیکھ کر اُس کے ذہن میں صرف نیکی کا تصوّر آیا ـــــ

وہ جو مشاہدے کا شہنشاہ بنتا تھا ـــــ اور تجربے کرنا زندگی کا بڑا شغل بتاتا تھا۔

وہ جو انسانی نقوش کو پڑھنے والی آنکھ رکھتا تھا۔

اور وہ جو ـــــ

اپنے تئیں ـــــ بہت ہوشیار اور فطین سمجھا جاتا تھا ـــــ اور کہتا تھا ـــــ کہ عورت جھنجھٹ سے بہت دُور ہے۔ اور بنتِ حوا کی اداؤں کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اور ہر عورت ن مرد کے پاؤں کی جُوتی ہے ـــــ اور ایک کمزور اور کم ظرف سی عورت کس طرح اتنے ے اور مضبوط مرد کی واحد تمنا بن سکتی ہے۔ غلط ہے ـــــ

وہی جیالا مرد ـــــ

پہلی نظر میں دو زانو ہو گیا تھا ـــــ

اور جب دل پر بس نہ رہا ـــــ تو صاف اعتراف کر لیا کہ ـــــ

"آمنّا وصدّقنا ـــــ"

آمنّا وصدّقنا ـــــ اُس کا دِل بار بار کہہ رہا تھا۔ اور وہ بہت خُوش تھا۔ بے حد ـــــ ہاں اس شکست پر ـــــ یا شاید وہ پچیس سال سے تنہا چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ ہار گیا اور لاشعوری طور پر خوب صُورت آسرا مانگ رہا تھا۔

کچھ تو تھا۔ جس نے اُسے منہ کے بل گرا دیا تھا ـــــ

گرا تو پھر وہ اُٹھ نہ سکا ـــــ

اپنی سب حکایتیں ـــــ شکایتیں ـــــ گھمنڈ اور مصلحتیں وہ بھول چکا تھا۔

وہ بس اس کے در پہ گر پڑا تھا۔

اُس کا دِل چاہتا تھا کوئی پل نہ گزرے اور اُس کی آمنہ سے شادی ہو جائے ـــــ

شادی کرکے وہ اُسے اپنے کلیجے میں چھپا لینا چاہتا تھا۔ وہ آج تک کسی سے محبت نہیں کر سکا تھا ——

اتنی بے شمار محبتیں اُس کے اندر ہلچل مچا رہی تھیں۔ وہ سب آمنہ کی جھولی میں ڈال دینا چاہتا تھا۔

کتنی بے شمار باتیں وہ بہادر بن کر سینے میں دفن کرتا رہا تھا —— اب وہ اکھڑ رہی تھیں۔

جی ایک غمگسار کو ترسنے لگا تھا۔

چاہنے لگا تھا ——

اور اُس نے اپنی بے کراں چاہتوں کے خزانے اُس پر لٹانے شروع کر دیئے۔

پھر اُسے معلوم نہیں کب صبح ہوئی اور کب شام ڈھلی —— اُس کی صبح تو اس پیاری سی لڑکی کا مکھ دیکھنا تھا —— اور اُس کی شام اُن کالی گھنیری پلکوں والی آنکھوں میں چھا جانا تھا ——

آمنہ کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اُسے ہر شرط منظور تھی۔ اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ آمنہ نے دونوں بازو پھیلا کر اُسے قبول کر لیا تھا۔

اُس کی محبت کا انداز کتنا خوبصورت تھا —— کتنا انوکھا تھا۔ اس بے زبان نے تو کبھی اظہارِ محبت نہ کیا تھا —— مگر پھر بھی وہ سارا دن اُسے محبت کے پیام دیتی رہتی۔ گھر کا کام کرتے ہوتے —— اُس کے پاس کوئی جادوئی طاقت تھی کہ اُس کا ہر پیغامِ محبت حماد کو مل جاتا۔

وہ اُسے ہر دم اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا۔ اُس کے لئے وہ ایک ماورائی قوت بن چکی تھی۔ جو زندگی کو رعنائی اور توانائی بخشتی ہے۔

اُسے مل کر حماد کا فلسفۂ حیات ہی بدل گیا تھا۔ بلکہ اُس کی زندگی کا سارا فلسفہ وہ خود بن گئی تھی۔ باقی مقاصد جانے کہاں جا چھپے تھے۔ اس لئے وہ جلد اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے بہت سی لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کیا تھا —— وہ لڑکیوں کو اسی قابل سمجھتا تھا
آمنہ بھی ہمہ وقت اُس کے سامنے تھی۔ کئی بار تنہائی میں وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ اِن دونوں کے سوا کوئی نہ ہوتا۔ اور وہ ایک دوسرے میں گم دُنیا کو بھلائے رہتے۔ مگر اُس کا جسم حاصل کرنے یا اُسے چھونے کی اُسے کبھی خواہش نہ ہوئی تھی۔ جب وہ پاس ہوتی تو کوئی فاسد خیال اُس کے ذہن میں نہ آتا۔ بس اُس کا وجود —— اچھوتا —— اَن چھوا۔ خوشبوئیں بکھیرتا ہر سمت چھایا رہتا ——

وہ خدا کی قدرت کا ایک دلکش مظہر تھی۔

اُس کے ساتھ کون فلرٹ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ اُس کے ساتھ تو صرف محبت کی جا سکتی تھی۔ اٹوٹ —— بے لوث ——

اُس کو تو صرف پُوجا جا سکتا تھا۔

اُس کے لئے تو زندگی وقف کی جا سکتی تھی۔

اور —— اُس کے پیکر کو سہروں اور پھُولوں کی لڑیوں میں گوندھ کر عطر بیز چھپر کھٹ میں چھُوا جا سکتا تھا۔

اُس کے ساتھ صرف شادی کی جا سکتی تھی۔

شادی!

ایک مقدس اور مضبوط بندھن!

شادی!

دو اجنبی دلوں کا ملاپ ——

دو دھاروں کا ایک ساتھ مل کر بہنا۔

اک دُوجے کے لئے جینا —— اک دوجے کے لئے مرنا ——

اس دُنیا کو ایک خوبصورت گھر —— اور صحت مند بچے دینا ——

گھر۔۔۔۔

پیارا سا گھر ——— جس میں محبت کی گرمی ——— جدوجہد کی حرارت ——— اور بچوں کی دلکشی ہو۔

گھر کے لئے تو وہ ترس گیا تھا۔

اُسے سجی سجائی کوٹھیاں نہیں چاہیئے تھیں۔ وہ کوٹھیاں جن میں سجاوٹ کی چیزوں کی بچوں سے زیادہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

جہاں بچوں کو کمروں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اور معزز مہمانوں کو ——— دُور دیس سے خریدی ہوئی گڑیاں دکھائی جاتی ہیں۔

جہاں ننھے مُنّوں کو ڈرائنگ رُوم کے قالین پر گھوڑا گھوڑا کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جہاں چاندنی راتوں میں بچے اور بچیاں باہر میدان میں جا کر اس لئے آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتے۔ کہ ان کے بیش قیمت سلیپنگ سوٹ خراب ہو جاتے ہیں۔ اور گندے پاؤں سے ڈنر کے بستر گندے ہو جاتے ہیں۔

جہاں بچوں کو بے وقت بھوک لگے تو اُنہیں کچھ چرانا پڑتا ہے۔ جہاں قیمتی اور لذیذ کھانے صرف مہمانوں کے لئے ہوتے ہیں۔

جہاں بچوں کو حکم دے کر اُن پر اپنی مرضی ٹھونسی جاتی ہے۔

نہیں اُس کے ذہن میں تو اور ہی طرح کا گھر تھا۔

اُسے ایسا گھر نہیں چاہیئے تھا۔

گھر ——— جو بہت سی محبتوں کا گہوارہ ہوتا ہے

باپ کا دبدبہ ———

ماں کی ممتا ———

بہن کی ضدیں ———

بھائیوں کے جھگڑے ———

شور، ہنگامہ ——— مُسکراہٹیں ——— قہقہے ——— توڑ پھوڑ ——— بھُول ———

چہکار ———

اور ——— سِلسلہ وار کڑیاں!

فرائض کی، ذمہ داریوں کی ———

ملے ——— بہت سے ——— کچھ اچھے کچھ بُرے ———

روایتیں نئی و پُرانی ———

روشنیاں اور زندگی!

وہ سوچتا۔

اُس کا گھر مثالی گھر ہو گا۔ اگر کہیں اُس نے اپنا گھر بنایا تو ———

اور۔ گھر تو ہمیشہ گھر والی پر منحصر ہوتا ہے۔

اُسے شوکیس کی گڑیا نہیں چاہیئے تھی۔ جو فیشن جانتی ہو ——— گھر سجانا جانتی ہو اور رعب جمانا جانتی ہو ——— یہ سب نہ بھی ہو مگر اُس کے دل میں سوز و گداز کا خزانہ ہو۔ بنا جانتی ہو تو مٹنا بھی جانتی ہو۔

وہ ایسی لڑکی ———

اور جب آمنہ کو اُس نے دیکھا۔ تو وہ ہو بہو اُس کے گھر کی رانی تھی۔

وہ لاکھ خود کو فریب دیتا کہ اُس نے تو اپنی زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی گنجائش ہی نہ رکھی تھی اُس کے خوابوں میں کسی لڑکی کی شبیہہ نہ تھی۔ تو یہ غلط تھا ———

اُس کے لاشعور میں ایک شبیہہ تھی۔

اور اُس کی نگاہ میں ایک تلاش تھی ———

اور دل میں لاتعداد تمنائیں ———

اب وہ شبیہہ مل گئی تھی۔
تلاش ختم ہو گئی تھی۔
اور تمنائیں کھلکھلا رہی تھیں۔
اور وہ ایک دم اُس سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔
مگر ——
جتنی جلدی انسان سوچ لیتا ہے —— خواہش کا پورا ہونا اتنا ہی مشکل بن جاتا ہے بعض اوقات۔
حالات اُس کے موافق تھے۔
اسمٰعیل اس پر مہربان تھا۔
آمنہ کی وہ زندگی بن چکا تھا۔
پھر جانے تقدیر نے ایسا وار کیوں کیا ——؟
کہ اُسے منہ کی کھانی پڑی —— اپنی ہر تمنا پامال کرنا پڑی —— ہر خواہش روندنی پڑی ——
وہ تو سمجھتا تھا کہ اگر آمنہ کو کسی نے اُس سے چھین لیا تو وہ اس دُنیا کو تہس نہس کر دے گا۔ طوفان اٹھا دے گا —— یہ کر دے گا —— وہ کر دے گا ——
مگر اُس نے کچھ بھی نہیں کیا۔
بس ——
نظریں جھکائے —— سر ڈالے چپ چاپ وہ راہ گذر چھوڑ آیا ——
دلِ شکستہ —— اشک ریز —— خون آلود!
وہ کیا کرتا ——
اُس کی آمنہ پر حرف آ رہا تھا۔

اُس کی آمنہ کو داؤ پر لگایا جا رہا تھا۔
اور اُسے یہ کسی بھی صورت میں گوارا نہ تھا۔

اُس کا دِل لہُو لہان ہو رہا تھا۔ ساری تدبیریں زمیں بوس ہو چکی تھیں۔ اور ارمان سسک رہے تھے۔

مگر وہ سر جھکائے اس گھر سے نکل آیا۔ جس گھر میں اُس نے اپنی زندگی کی آرزو پائی تھی۔

اور جس گھر میں اُسے جینے کا چلن آ گیا تھا۔

اُس گھر کو اُس نے چشم زدن میں چھوڑ دیا۔

انسان کتنا کمزور ہے ——

وہ کہتا ہے وہ اس دُنیا کو تہہ و بالا کر دے گا۔ وہ راہ کی ہر چٹان کو پاش پاش کر دے گا۔ وہ اپنے مضبُوط ارادے کے سامنے ہر شے کو ہیچ سمجھتا ہے۔

مگر خُود تقدیر کے آگے سر جُھکا دیتا ہے۔

مُسافر ——

کہاں جا رہے ہو —— ؟

پتّے اُس کے قدموں تلے چُرمُراتے ..... چیخے ..... اور پھر بکھر بکھر کر ٹھٹے

ی

یہ تم ہی نہیں —

نیا نے ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

ں تنا سے تم نے محبت کی تھی؟

اں کس مایُوسی سے گردن ڈال کر جا رہے ہو۔

ہاں جا رہے ہو —— ؟

رکو..... رکو.....

و دیوانے مُسافر رکو!

ہ تمہیں پُکار رہی ہے۔

اُس کی پیشانی خون آلود ہو گئی ہے۔

یہ تمہارا نام لے لے کر اُس نے دیواروں میں ٹکریں ماری ہیں۔

اُس کے سہاگ کے جوڑے تار تار ہیں..... وہ دیوانوں کی طرح سر ٹپک رہی ہے۔

ہ تمہارے پیچھے بھاگتی آ رہی ہے۔

دیکھو تو سہی.....

او مجنوں

او مجنوں

تری لیلیٰ کا محمل کوئی اور اتار کر لے گیا ہے۔

تری لیلیٰ تجھے پکار رہی ہے۔

ذرا مڑ کر تو دیکھو ——

یہ ناکامی کیوں —— ؟

او بزدل ——

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تُونے تو اُس کے ساتھ زندگی بتانے کا عہد کیا تھا۔

تُونے اُسے کانٹوں سے نکال کر پھولوں کی وادی میں لے جانے کا وچن دیا تھا۔

وہ تمہاری زندگی تھی۔

رُوح تھی!

اب اُسے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟

کہاں کھو جو گے اس کو.....

دل کے قریب ہی تو کھو دیا ہے تم نے۔

او جانے والے راہی!

رکو.... رکو.....

اُس کے بِنا ان راہوں پر کیسے چل سکو گے۔

ہمسفری کا دعویٰ کر کے چوروں کی طرح نکلے جاتے ہو۔ دل کے اس جذبے کو آزما تو

ٹھہرو ———

ٹھہر جاؤ۔

یادوں کا قافلہ تمہارے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اُس کا ہاتھ ہی تھام لو ———

اے سادھو!

تُونے کیسی دُھونی رمائی ———

اُس کے گھونگھٹ میں آگ لگا کے۔

اُس جوگن کو بن باس دے کر کہاں جا رہے ہو ——— ؟

کہاں جا رہے ہو ——— ؟

کہاں جا رہے ہو ——— ؟

کیا کوئی ایسی زمین ہے۔ جس پر اُس کے بغیر رہ سکو گے ———

کیا کوئی ایسا سائبان ہے۔ جو اُس بن تم پر سایہ کر سکے گا۔

پھر ———

پھر ———

رک جاؤ .....

لوٹ آؤ ..... !"

اُس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور تیز تیز چلنے لگا۔

آج چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں.... وہ اُن آوازوں کو سُننا چاہتا تھا۔ وہ جان بُوجھ کر دل ہار گیا تھا۔

وہ کسی کی گود میں مُنہ چھپا کر رونا چاہتا تھا۔ مگر کون تھا اُس کا ——— ؟

ایک ماں اُسے چھوڑ کر مر گئی تھی۔

ایک ماں نے اُس کی معصوم اور نوخیز جوانی پر سیاہی پھینکی تھی ———

اور آج ———

ایک ماں نے اُس کی زندگی کی ساری خوشیوں اور آرزوؤں کو نوچ کھسوٹ کر اُسے درخت کی مانند خزاں کے حوالے کر دیا تھا۔

کیسی ہوتی ہیں یہ مائیں ——— ؟

میں نے تو سُن رکھا تھا ماؤں میں جنت ہوتی ہیں۔

محبت کے سرچشمے ہوتی ہیں۔

دودھ کی نہریں ہوتی ہیں۔

کیا دودھ کی نہر میں زہر بھی ہوتا ہے۔ ؟

کیا محبت کے سرچشمے بخیل ہوتے ہیں ؟

اور کیا جنت میں بھی عذاب دیا جاتا ہے۔؟ وہ یہی کچھ سوچتا رہا ——— چلتا رہا ——— اور تیز تیز چلتا رہا۔

دفتر میں بھی اُس کا دِل نہ لگا۔ دل تو ساری دُنیا سے اُچاٹ ہو رہا تھا ــــ رات کا لکھا ہوا فیچر اُس نے ایڈیٹر صاحب کے حوالے کیا اور دفتر سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔

کائنات ساری بجھی بجھی اور ویران لگ رہی تھی۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ اُس وقت بارہ بجے تھے۔ معًا اُسے خیال آیا۔ وہ چھٹی کے وقت اسکول سے باہر آمنہ کو مِل سکتا ہے اور اُسے صورتِ حال سے مطلع کر سکتا ہے۔ چھٹی میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اور اُس نے صبح سے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ چائے پینے کے لئے وہ کسی ہوٹل کا انتخاب کرنے لگا۔

ابھی وہ ہوٹل کے باہر ہی پہنچا تھا کہ وہاں اُس کا ایک پُرانا دوست شیراز مِل گیا ــــ شیراز کی اور اُس کی جان پہچان بہت پُرانی تھی۔ جن دنوں وہ لاہور نیا نیا آیا تھا۔ اور ایک ہوٹل کی منیجری کر رہا تھا۔ انہی دِنوں اُس کی شیراز سے شناسائی ہوئی تھی۔ جو بڑا لاُابالی اور فضول خرچ سالڑ کا تھا۔ دو چار دن بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ اس ہوٹل کے مالک کا اکلوتا بیٹا ہے اس لئے بے دھڑک چلا آتا تھا اور اندر آ کر بیروں پر چلاتا تھا۔ دوستوں کو دعوتیں کھلاتا تھا۔ اور خوب ہاؤ ہُو کرتا تھا۔ ہوٹل کے ماحول کو حماد نے پسند نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ مگر شیراز سے اُس کی صاحب سلامت رہی۔ اپنی تمام تر بُری

ں کے باوجود شیراز دِل کا بہت اچھا تھا۔

وہ نت نئی لڑکیوں کو لے کر اپنی موٹر میں گھوما کرتا۔ گانا بھی سُنتا۔ اور شراب بھی پیتا تھا۔ حماد کی بہت عزت کرتا تھا۔ کیونکہ حماد محنت مشقت کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا لال کی روزی کا قائل تھا۔ وہ کبھی بغیر بِل دیئے ہوٹل سے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ شیراز کی یں شامل ہونے کے باوجود شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ مانگے کا سگریٹ نہیں پیتا تھا ز کو اُس کی یہ آن و خودی بہت پسند تھی۔ اس لئے جب حماد ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر جا رہا ؤ شیراز نے اُسے روکا نہیں۔ وہ جانتا تھا ایسا آدمی اپنی طبیعت کے خلاف کوئی کام نہیں ملتا۔ البتہ اُس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

"یار نوکری چھوڑ کر جا رہے ہو۔ دوستی تو نہیں چھوڑ رہے ــــ"

"ہرگز نہیں" حماد نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔ "اب تو ہماری دوستی اور بھی مضبوط ہو جائے گی۔"

سو دونوں کبھی کبھار ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ہاں پچھلا ایک سال جب سے اد کو آمنہ کے آنچل کی چھایا مل گئی تھی اُس نے ساری دُنیا ہی چھوڑ دی تھی۔ اس لئے وہ پچھلے ایک سال سے اپنے کسی پُرانے آشنا دوست کو نظر نہیں آیا تھا۔ آج جو سڑک پر شیراز کو مل گیا۔ تو اُس نے اُسے بازو سے پکڑا۔ اور اپنے ہوٹل کے اندر لے گیا۔ پہلے تو غائب رہنے کے شکوے شکایات کرتا رہا۔ پھر اُس کو دِل شکستہ اور گو مگو کی حالت میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اور بولا۔

"کیا بات ہے یار، تمہاری تو ساری زندہ دلی ہی غائب ہو گئی ہے۔ کچھ کہو، کیا گذری ہے تم پر۔"

"کچھ نہیں یار۔ . . بس ایسے ہی ــــ" حماد نے ٹالا۔

"میں ایسے چھوڑنے کا نہیں ہوں۔ جلدی بتاؤ۔ پھر میں بھی تمہیں ایک خبر سُنانے والا ہوں۔"

"کوئی خاص بات نہیں یار! بس یوں سمجھ لو میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے حادثے سے دوچار ہوا ہوں۔ یُوں تو میری ساری زندگی غیر متوقع حادثات سے اَٹی پڑی ہے۔ مگر اس بار یُوں لگتا ہے۔ یہ صدمہ سہہ نہ سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شیراز لاابالی پن سے بولا۔

"اس لڑکی نے انکار کر دیا ہوگا شادی کرنے سے ——— یہ آجکل کی سالی لڑکیاں سب ہی مادہ پرست ہو گئی ہیں۔ کار ہو تو بغیر جان پہچان کے بھی جھٹ ساتھ بیٹھ جاتی ہیں اور آدمی پیدل جا رہا ہو تو مدتوں کی شناسائی سے منہ پھیر لیتی ہیں۔"

حماد خاموش بیٹھا رہا۔

"بھئی ہم سب دوستوں نے مل کر ایک پروگرام بنایا تھا۔ مگر تمہاری کمی بہت محسوس کرتا رہا۔ آج تم اچانک مل گئے ہو تو بتا رہا ہوں۔"

"کیسا پروگرام؟"

"اصل میں میں نے ایک ٹریلر کاروان خریدا ہے اور کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر مڈل ایسٹ کا چکر لگانے کا پروگرام بنایا ہے۔ سب انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ مگر عین وقت پر ایک دوست نے جانے سے انکار کر دیا ہے۔ اب میرا خیال ہے تم ہمارے ساتھ چلو۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور دوبارہ تازہ دم ہو کر آؤ گے تو صحیح فیصلہ کر سکو گے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میرا تو کوئی بندوبست ہی نہیں۔ نہ کپڑے۔ نہ روپے پیسے کا انتظام۔"

"بس مجھے اتنا بتاؤ تمہارے پاس پاسپورٹ تو ہے نا؟"

"ہاں وہ تو ہے۔" حماد نے بھلے وقتوں میں ایک دوست کی معرفت اپنا پاسپورٹ بنوا چھوڑا تھا۔

"بس وہ میرے حوالے کر دو۔ اور میرے ساتھ اسلام آباد چلو۔ جن ملکوں کے لئے ویزا

ہے ہم وہاں سے لے لیتے ہیں۔ میرے بہت واقف ہیں۔ تمہارے لئے پیسوں کا انتظام میں کر دوں گا۔ تم واپس آکر چکاتے رہنا۔ بس انکار مت کرو۔"

"تم لوگ کب جا رہے ہو ———؟"

"ہم کل صبح جا رہے ہیں۔"

"اتنی جلدی۔ ذرا مجھے سوچنے کا موقع تو دو۔"

"کوئی موقع نہیں ہے سوچنے کا۔ میں تو دوپہر کی فلائٹ سے پنڈی جا رہا ہوں۔ تم ے ساتھ چلو گے۔"

"مگر آخر کس طرح۔ یوں خالی جیب ———"

"بس تم چلو۔" اُس نے پیالی حماد کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی کار میں بٹھایا اور ائیرپورٹ کی طرف دوڑا ——— راستے میں وہ حماد کو اُن کی تفصیل بتاتا رہا۔ جہاں انہوں نے جانا تھا۔ مگر حماد ان سب باتوں کو مذاق سمجھتا بھلا یُوں بھی کسی نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے۔ اُس کا خیال تھا اوّل تو جہاز کا ٹکٹ نہیں ملے گا اتنی جلدی ——— اور اگر مل گیا تو وہ اسلام آباد سے واپس آجائیگا ——— لیکن خدا کی قدرت۔ شیراز اسے لاؤنج میں چند منٹوں کے لئے چھوڑ کر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو ٹکٹ تھے۔ اور مائیکروفون پہ فلائٹ جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس نے حیران و ششدر حماد کا بازو تھاما اور جہاز کی طرف دوڑا۔

جب جہاز فضا کی وسعتوں میں محوِ پرواز تھا، حماد سوچ رہا تھا۔ اس وقت آمنہ کی ہو گئی ہوگی اور وہ گھر جا رہی ہوگی۔ کاش وہ آج اس سے مل سکتا۔ مگر یہ شیراز نہ جانے ے ناگہانی بن کر کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہ کتنا بے بس ہو گیا ہے۔

لیکن ہو سکتا ہے اس میں کچھ بہتری ہو۔ حالات تو بالکل اُس کے اختیار میں نہ تھے۔ پھر اُس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

شیراز بہت اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ رات تک اُس نے حماد کے لئے ویزا وغیرہ سب حاصل کرلیا اُس کے لئے کچھ ریڈی میڈ کپڑے اور ایک اٹیچی کیس لے آیا اور بولا "بچُو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ یہ میرے بندوبست ہیں تمہارے نہیں۔ اب علی الصبح تیار رہنا۔"

"علی الصبح" حماد کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں بھئی ہم نے کابل کے رستے جانا ہے۔ میں نے لاہور فون کردیا ہے۔ لاہور والا ساری پارٹی ٹیس لیکر روانہ ہوگئی ہے۔ علی الصبح وہ یہاں پہنچ جائے گی اور ہم پشاور کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

"خدا کی قسم شیراز! مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ تم شاید مذاق کر رہے ہو۔"

"میرے کام ایسے ہی ہوتے ہیں سنسنی خیز اور چونکا دینے والے ـــــ کیا تمہیں علم نہیں ـــــ؟"

"لیکن یار! میں اتنی دُور جارہا ہوں۔ کم از کم دفتر میں چھٹی کی درخواست تو دے دیتا"

"درخواست کا کیا ہے۔ جہاں جاؤ گے۔ لکھ کر بھیج دینا۔" مگر تم لوگوں کا کتنے عرصے پروگرام ہے۔"

"اندازاً" ہم لوگ ایک ماہ وہاں رہیں گے۔ ویسے اگر کسی کا دِل اُکتا جائے تو وہ پہلے بھی واپس آسکتا ہے۔" اُس نے کمرے کی کنڈی چڑھالی اور اطمینان سے وہسکی کی بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔

"آؤ بسم اللہ کرو ـــــ"

"نہیں یار!" حماد نے ایک کتاب کھول لی۔

"ارے ظالم۔ آج انکار نہ کرو۔ اس کا غم بھلانے کو پیو۔ جس نے تمہیں درد دیا ہے۔"

"میں ان باتوں کا قائل نہیں ہوں۔"

"واقعی۔"

ایسے موقعوں پر ہمیشہ اُسے بابا جان یاد آجاتے۔ نہ جانے یہ بابا جان کی صحبت کا اثر تھا یا اس کی فولادی قوتِ ارادی کا کرشمہ۔ کہ دوست آج تک اُسے مجبور کرکے شراب نہیں پلا سکے تھے۔ اُن کی ہر دلیل اور ہر قسم رائیگاں گئی تھیں۔

یہ نہیں کہ وہ فرشتہ تھا۔ عام نوجوانوں والی خرابیاں اُس میں بھی تھیں۔ مگر شراب کو اُس نے ہمیشہ بڑی گھٹیا شے جانا تھا۔ اُس نے شراب پینے والوں کی حالتیں بہت اچھی طرح دیکھی تھیں۔ جب وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو شراب کے حوالے کر دیتے تھے تو پھر اُن پر شراب حکمرانی کرتی تھی۔ اُن کا چہرہ۔ زبان، نگاہیں۔ لب و لہجہ حتیٰ کہ دِل و دماغ بھی بدل جاتا تھا۔ اور جب وہ اول فول بکتے تو وہ سوچتا۔ خداوندا! اچھے خاصے ذی ہوش انسانوں کو کیا ہوا ہے ـــــ کم سے کم وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ شراب جیسی شے اُس پر حکمرانی کرے۔ اُس کے لاشعور سے ابھی بچپن کے واقعات محو نہیں ہوتے تھے۔ ممی اور ڈیڈی کی عبرت ناک لڑائیاں ـــــ وہ آج بھی سوچتا تھا۔ اگر اُس کے ڈیڈی نے اپنے آپ کو شراب کے حوالے نہ کیا ہوتا تو وہ ایک بہترین باپ ہوتے۔ بہترین انسان ہوتے ـــــ بہترین افسر تھے یا نہیں۔ اُس کا اُسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

"او بے وقوف ـــــ

او گدھے ـــــ

اُس سنگدل کی قسم! جس نے تجھے ٹھکرایا ہے۔ لے اس لال پری کو سینے سے لگالے "شیراز اب بہک رہا تھا۔ اور حماد کی طرف گلاس بڑھا رہا تھا۔

"نہیں ـــــ" حماد نے ناگواری سے سر ہلایا ـــــ

"اس کے باوجود وہ تجھے ٹھکراتے جاتے گی۔ اُلّو کے پٹھے!" شیراز نے اپنی لال آنکھیں نکال کر کہا۔ "تیری پارسائی کس کام کی۔ اُس کی نظر میں تیرا کیریکٹر کوئی شے نہیں ـــــ مجھے ـــــ آ مجھ سے سبق سیکھ۔ مجھے کوئی لڑکی نہیں ٹھکرا سکتی۔ میں وقت کا شہنشاہ

ہوں۔ شہنشاہِ معظم ہوں ——— ہر لڑکی میرے پاؤں کی ٹھوکر میں ہے ———......

"لے پی جا ——— ظالم ———"

شیراز کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

حماد کا دل اور بھی بُرا ہونے لگا۔ شیراز نے اُسے آمنہ کی قسم دی تھی۔

کیا وہ جام اُٹھا لے۔ اور مُنہ سے لگا لے۔ واقعی یہ آگ تو بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ شاید اُسے بجھانے کا یہی ایک طریقہ ہو۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں کہ شراب ہی غموں کا واحد علاج ہے ——— آج جب وہ غم اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہے تو کیوں نہ شراب کا سہارا لے ——— یہ پی کر انسان بگڑ جاتا ہے تو کیا ——— ! اُس کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ تو کیا ——— ؟ گھڑی بھر کو دُکھ میں تو کمی آ جاتی ہے۔ وہ گلاس میں ملتی ہوئی شراب کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو شیراز ابھی تک اُس کی جانب بڑھائے ہوئے تھا۔

اُس کا دل چاہا۔ فوراً اس گلاس کو تھام لے۔ اور غٹ غٹ پی جائے۔ اپنے فلسفۂ حیات کو چکنا چور کر دے۔ اور آمنہ کے غم سے نجات حاصل کر لے ———

لیکن یہ کیا ——— ؟

آمنہ اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ——— ؟

بُزدل ایسا کرتے ہیں ——— ایک غم مٹانے کی خاطر ہزاروں اور غم گلے سے لگا لو گے ———

نہیں ——— ! نہیں ! وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تو نہ جا ——— تو نہ جا ——— تیرا غم بھی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور عظیم غم کو میں شراب جیسی ذلیل شے کے حوالے نہیں کروں گا۔

یہ محبت کی توہین ہے۔

یہ تیری بھی توہین ہے۔

شرطِ وفا تو یہ ہے کہ میں خاک ہو جاؤں اور اُف نہ کروں۔ اگر میں نے اپنے آپ کو شراب کے حوالے کر دیا تو پھر تیری طلب مٹ جائے گی۔ تیرا غم نہ رہے گا۔ پھر تجھے کون تلاش کرے گا۔ کون حاصل کرے گا۔ میں تیرے عشق سے دست بردار ہو کر شراب کے عشق میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اور پھر ساری زندگی تیرے غم کا پردہ اس پر ڈالتا رہوں گا۔

نہیں ——— ! تو خفا نہ ہو ——— میں زندگی بھر ایک بددُعا کی طرح بے چین پھرتا رہوں گا۔ مگر تیرے غم کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میں تیرے پاس آؤں گا منوں۔ میں تیری ...ت ہوں منوں ———

وہ اضطراب کے عالم میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

شیراز کا قہقہہ اُس کا پیچھا کرتا رہا۔

جب وہ دیوانہ وار سڑک پر نکل آیا۔ تو اُسے محسوس ہوا رات کافی گذر چکی ہے۔ کیونکہ ہر طرف اندھیرا تھا اور چہل پہل بھی ختم ہو گئی تھی۔

اُس نے آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔

چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی۔

اور آج ——— منوں نے کہا تھا ——— "رات کو خوب باتیں کریں گے"۔

وہ تنہا چھت پر بیٹھی ہو گی ——— رو رہی ہو گی ——— یا سو رہی ہو گی ———

واہ کیا اتفاقات ہیں زمانے کے ———

من چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

آج رات ہم نے آئندہ زندگی کے منصوبے بنانے تھے۔ پیار کی نئی راہیں متعین ...لی تھیں۔ اور حالات مجھے کتنی دُور لے آئے ہیں۔ انسان تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہے۔ کل رات مجھے بالکل معلوم نہ تھا ——— آج کیا ہونے والا ہے ———

اور پھر ایک ظالم ہاتھ مجھے پکڑ کر یہاں لے آیا ہے ——— اب یہاں سے کہیں ا
لے جائے گا ——— دُور ——— تم سے بہت دُور۔
نہیں منوں! میں اپنی منزل سے دُور نہیں جا سکتا ——— اور، اور دُور نہیں جاؤں
میں واپس تمہارے پاس آؤں گا۔ میں تمہاری ماں کے ساتھ کیا ہوا ہر قول بھول جاؤں گا۔ م
جاؤں گا۔ عہد توڑ دوں گا۔ مگر تمہارے ساتھ کیا ہوا عہد نبھاؤں گا۔ میں بے وقوف تھا
میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہ
میں صبح ہوتے ہی تمہارے پاس آؤں گا ——— جس طرح بچھڑا ہوا بچہ اپنی ماں کی طرف آتا ہ
تم میرا انتظار کرنا ——— مجھے بے وفا اور سنگدل نہ کہنا ———
بس آج کی رات ——— صرف آج کی رات انتظار کرو ———
تمام رات وہ دیوانوں کی طرح سڑک پر پھرتا رہا ——— اس وقت اگر اُسے کوئی سوار
مل جاتی تو وہ یقیناً واپس چلا جاتا۔
مگر اس رات پھر قسمت اُس پر مہربان نہ تھی ——— تمام رات اضطراب کے عالم م
تڑپ تڑپ کر صبح کے قریب وہ ہوٹل کے گیٹ پاس بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا۔
اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی۔ جب شیراز اُسے مکے مار رہا تھا اور گالیاں دے رہا
کہ یہ کونسی سونے کی جگہ ہے۔ میں رات بھر تمہیں سارے ہوٹل میں ڈھونڈتا پھرا ہوں
اُس نے اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا تو گیٹ کے باہر ایک بس کھڑی تھی لوگ
اپنا اپنا سامان رکھ رہے تھے۔ شیراز نے اُسے بازو سے گھسیٹا اور بس میں پچھلی سیٹ
بٹھا دیا۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے ——— اس پر تھکاوٹ ——— نیند اور پژمردگی
اتنا غلبہ تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکا ——— کٹھ پتلی کی مانند شیراز کے اشاروں پر ناچتا رہا
سوچنے سمجھنے کی قوت مفقود ہو چکی تھی ———
بس جب اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئی تو ——— ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ل

اُسے پھر اونگھ آنے لگی۔
سارا دن اور ساری رات کا تھکا ہارا ——— مغموم اور مضمحل حماد وہیں
پر سر رکھ کر سو گیا ———

مگر میں کیوں جا رہا ہوں۔؟

میں یوں جوں اُن کے ساتھ آگے جا رہا ہوں۔ اپنی زندگی سے ــــ شادمانی سے'
رت سے دُور ہوتا جا رہا ہوں۔

پھر میں کیوں جا رہا ہوں کہ میں مجبورِ محض ہوں۔

میری ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے ــــ وہ مجھے کٹھ پتلی والا ناچ نچا رہا ہے۔ اور
ناچے جاتا ہوں۔

یہ مجبوری نہیں تو کیا ہے۔ کل تک اسے اپنی منزل کا علم نہ تھا۔ آج انجانے ہاتھوں
دھکا دے کر اُسے یہاں بھیج دیا تھا۔

آگے اور کیا ہونا ہے ــــ؟

وہ اس سے بھی خوفزدہ تھا۔

وہ سوچ سوچ کر تھک گیا۔ تو اُس نے ایک بار پھر خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔ جب انسان
گتھیوں کو سلجھا نہ سکے تو پھر خود کو حالات کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ممکن ہے۔ اسی میں کوئی اچھی صورت نکل آتے۔

مگر آمنہ کیا کہے گی۔ اسمٰعیل کیا سوچے گا۔ دفتر والے کیا کریں گے۔

بہرحال۔ اُس نے سوچا وہ کسی مناسب مقام پر پہنچ کر انہیں اپنے حالات سے مطلع کریگا۔
یہ بھی ممکن ہے۔ اُس کی اس طرح گم شدگی۔ وہاں حالات کو پلٹ دے۔ وہ سب اُس
حق میں ہو جائیں۔ اور اُسے اپنانے کو تیار ہو جائیں۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ بہت خوش ہوا۔

اچھا ہے۔

اُس نے دِل میں کہا ــــ

کچھ دن دور رہ کر دیکھنا چاہیئے۔ اور مہینہ تو جلدی گزر جائے گا۔ جب وہ ایک ماہ بعد

اُس کی نیند اُس وقت کھُلی جب کارواں کابل کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا۔ اور بس پر
بلا کا شور تھا۔ سب مِل کر اودھم مچا رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ کھا رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے
تھے اور چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ اُن کے نعروں اور بے معنی شور و غل سے اُس کی آنکھ
کھُل گئی۔

آنکھ کھُلنے پر اُس نے چاروں طرف حیران ہو کر دیکھا۔ نئے لوگ۔ نئی جگہ۔ وہ کسی طرف
رواں ہے پہلے تو اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ مگر ذہن پر زور دینے سے اُسے رات کی ساری
باتیں یاد آگئیں۔ اُس نے اپنی یقین دہانی کی خاطر رات کی تمام باتوں کو ذہن میں دہرایا۔ تو
سب کچھ یاد آگیا۔ اور یہ کہ شیراز کی چابک دستی رنگ لائی ہے اور اب وہ اُن سب کے
ساتھ جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں ہے۔

یہ سب لوگ کتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی زندگی کو خوشیاں بخشنے کے لئے
کہیں جا رہے ہیں۔ زندگی کے لئے تازگی اور شگفتگی حاصل کرنے کے لئے جا رہے ہیں
اُن میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ کسی کی کیا لگتی تھیں اُسے علم نہ تھا۔ اور نہ یہ جاننے کی
تمنا تھی۔ ایک غالباً نو بیاہتا جوڑا بھی تھا۔ اُن کے جانے کا مقصد سمجھ میں آ رہا تھا۔

آئے گا۔ تو خود اُس میں بھی خوش کُن تبدیلی آ چکی ہوگی۔ جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وہ اُس کی عدم موجودگی میں آمنہ کی شادی کر دیں۔

یہ سوچ کر پھر اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اور اُس کا دل چاہا۔ کارواں میں سے چھلانگ لگا دے اور پیچھے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔

ان وہموں کا خاتمہ کرنے کے لئے اس نے سوچا وہ جلد از جلد انہیں خط لکھ دے گا اب یہاں سے واپس جانا بھی درست نہیں ـــــ شیراز نے کافی رقم خرچ کی تھی۔ عجیب جیالا دوست ہے۔ اُس کا خلوص مجروح ہو جائے گا۔

وہ ہمیشہ سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز حرکتیں کرنے کا عادی تھا۔ کیا عجب جو وہ اسے یہاں پکڑ لایا ـــــ اور وہ ہمیشہ کا جلد باز تھا۔ پھر ناممکن کو ممکن کر دکھانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بعد ازاں اپنے کارناموں کی دل کھول کر داد لیا کرتا تھا۔

حماد نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر شیراز کو ڈھونڈا۔ شیراز کارواں میں نظر نہیں آ رہا تھا. پہلے تو وہ گھبرایا۔ پھر ایک ساتھی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ڈرائیونگ پہ اُسکی ڈیوٹی ہے. کابل میں تھوڑی دیر رُک کر انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ شیراز نے آکر اُسے تھپکی دی اور اُس کا حال وال پوچھا اور اُسے خوش رہنے کی تلقین کر کے پھر خود جا کر اسٹیرنگ سنبھال لیا.

ان کا سفر خاصا دلچسپ تھا۔ یہ اور بات کہ وہ اپنی عادت کے مطابق اُن کی خوش فعلیوں اور خوش گپیوں میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ بس خاموش بیٹھا تھا۔ یا کتاب پڑھتا رہتا۔ یا آنکھیں موند کر آمنہ کے تصور میں گم ہو جاتا۔ وہ ہر موڑ پہ آ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگتی۔ اُس کی پیاری پیاری خوشبو اُسے مدہوش کر دیتی۔ پھر وہ تصور ہی تصور میں اُس سے بے شمار باتیں کرتا۔ اُسے بُلا کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اور سفر کے دشوار ترین لمحے آسان ہو جاتے۔

ایک دِن اور ایک رات وہ لوگ کابل میں رُکے۔ وہاں کے مشہور مقامات دیکھے بازار کی سیر کی۔ اور اگلے دن علی الصبح ایران کو روانہ ہوتے۔ کبھی حماد کو ایران جانے کا بہت

[...]تھا مگر ـــــ اب ـــــ اب وہ سوچ رہا تھا ـــــ

جنت وہی جگہ ہے جہاں جی بہل گیا

اور اُس کی جنت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ایک میلے کچیلے کوچے میں۔ اور ایک تنگ اور [...]لی کے پاس۔ وہ اپنا جلتا ہوا فانوس گندگی کے ڈھیر پہ چھوڑ آیا تھا۔ پھر یہ سبزہ زار ـــ یہ [...]واتیں۔ یہ باغ ـــــ اور ہوائیں . . . اُسے کیا دے سکتی تھیں۔

صبح ہی صبح شیراز حماد کے پاس آیا اور بولا۔ ”جانتے ہو۔ میں تمہیں زبردستی ساتھ لایا ہوں؟“

”نہیں۔“ حماد نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیونکہ تم ایک پیشہ ور ڈرائیور ہو۔“ اُس نے اس انداز سے کہا کہ تھکے ہوئے اداس [...]ا ہنسی نکل گئی۔

”بس۔ یہی وقعت ہے میری!“

”جی ہاں“۔ شیراز مستی سے بولا۔ ”جناب اب جبکہ آپ کو اپنی وقعت کا علم ہو گیا ہے تو [...]حواسوں میں آجاؤ اور اپنی چھٹی حس کو بھی بیدار کر لو۔ ماتم کرنے کے لئے زندگی پڑی [...]ہے۔ تم کسی جنازے کے ساتھ نہیں جا رہے ہو جو ایسی سوگوار شکل بنا رکھی ہے۔ سنا!“

”اور اپنے لئے نہ سہی تو یاروں کے لئے سہی ـــــ ذرا ہنسو مسکراؤ۔“ پھر وہ اپنا [...]ہل کر اور اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا ـــــ

”زندگی چند روزکی ہے۔ یہ چند روز ضائع نہ کرو۔ اب آ گئے ہو تو ہمیں مشکور ہونے [...]کا موقع بھی دو۔ سب لوگ تمہاری حالت کو محسوس کر رہے ہیں۔ دیکھو سب کیسے ہنستے [...]گاتے ناچتے جا رہے ہیں۔ ایک تم ہی منحوس شکل بنا کر بیٹھے ہو۔ وہ مجھ سے بار بار [...]پوچھتے ہیں۔ یار تمہارے اس دوست کو کیا ہوا ہے ـــــ کیا اُس کا کوئی مر گیا ہے ـــ“

حماد سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

"شیراز کیسی باتیں کر رہے ہو ——— ؟"

"ہاں اسی طرح سب محسوس کر رہے ہیں۔ کیا تمہیں ان سب لوگوں کے احساسات کا پاس نہیں ہے۔ چلو مجھے تو چھوڑو۔"

"شیراز!" حماد کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ "تم جانتے ہو تم مجھے زبردستی لے آئے ہو۔ میں اس خوش آگیں اور ہنگامہ پرور محفل میں شریک ہونے کے قابل، ذہنی طور پر بالکل نہ تھا"

"اچھا اب ڈائیلاگ نہ بولو۔"

"بھائی میں شرمندہ ہوں" حماد اُداسی سے بولا۔ "تم سب کے احساسات کا پاس کرونگا زبردستی ان ہنگاموں میں شامل ہونے کی کوشش کروں گا ——— بس ———"

"ہاں ——— شاباش ———"

"اور آج کے بعد ڈرائیونگ تم کرو گے۔"

"میں ———؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"جی۔ آپ۔ جناب ڈرائیور حماد احمد صاحب، سمجھے ——— اور یہی مقصد تھا آپ کو یہاں لانے کا ——— ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ اتنے لمبے سفر میں مسلسل کارواں کو چلا سکے ——— اور تم . . . یہ کام کر چکے ہو۔" اُس نے شرارت سے آنکھ بند کی۔

"شیراز! مجھے ڈرائیونگ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں آج کل میری ذہنی کیفیت اس قابل نہیں ہے کہ میں کارواں چلا سکوں، مجھے ڈر ہے میں یہ فریضہ ادا نہ کر سکوں گا"

"میں دیکھتا ہوں۔ تم کس طرح یہ "فریضہ" ادا نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے ساتھ آگے بیٹھوں گا۔ تم اسٹیرنگ پکڑو۔ تمام راستہ تمہارا مزاج درست کرتا جاؤں گا ——— اور جب تم ——— یہ فریضہ ادا نہ کر سکو گے تو خود اسٹیرنگ لے لوں گا۔"

شیراز خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اسے مذاق نہ سمجھو۔"

"مذاق کون اُلّو کا پٹھا سمجھ رہا ہے" "میں تمہارا مزاج درست کر دونگا۔ تم بیٹھو تو سہی۔" شیراز نے اُسے کالر سے کھینچا۔ اور کارواں کے آگے بٹھا دیا۔ اور پھر چلّا چلّا کر سب لوگوں کو بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔

بے بسی سے حماد ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ آخر وہ اتنا بے بس کیوں ہو گیا ہے۔ اس کو کیا ہوا ہے۔ کہ وہ اپنی مدافعت میں بالکل نہیں بول سکتا ———

وہ احتجاج نہیں کر سکتا ———

چلا نہیں سکتا ———

اپنی مرضی نہیں منا سکتا ———

کیا وہ ایک لاش ہے ———؟

کمال ہے۔ ساری دُنیا ہی اُسے بے وقوف بنا رہی ہے۔

اتنے میں شیراز دوسری طرف سے اُس کے پاس آکر بیٹھ چکا تھا اور اُسے اسٹارٹ کرنے کو کہہ رہا تھا۔ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس لئے اُسے یہ ڈیوٹی سنبھالنی پڑی ——— وہ سڑک پر کارواں روانہ ہو گیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں نے اودھم مچانا شروع کر دیا حماد نے دل میں شکر کیا ———

جو کچھ "ہلہ گلہ" پیچھے ہو رہا تھا۔ وہ کم از کم اُس سے تو بچ گیا ہے۔

اپنی دانست میں وہ بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو ٹیڑی میڑی ڈرائیونگ کرنے کا عادی تھا۔ مگر اب اس پر اتنے لوگوں کی ذمہ داری تھی۔ اور اُس کا دل نہیں تھا ——— سوچیں اُسے ورغلا کر لاہور لے جاتیں۔ اور وہاں۔ اُس کا ذہن آوارہ ہونے لگتا۔ وہ گیئر بدلتا اور جلدی سے خود کو اس کشادہ شاہراہ پر لے آتا۔

وہ لوگ ایران پہنچ گئے ———

ایران میں اُن کا ارادہ دو دن رُکنے کا تھا۔ مگر وہ چھ دن رُکے رہے ـــــ سب لوگ سارا دن گھومتے ـــــ اور رات کو آکر کارواں میں سو رہتے۔ حماد نے بہت کوشش کی کہ وہ اُن کے ساتھ کہیں نہ جائے ـــــ کوئی الگ سا گوشہ ڈھونڈ کر بیٹھ جائے کہیں سے کاغذ اور قلم مہیا کرے ـــــ اور آمنہ کو اپنے دِل کی تڑپ سے آگاہ کر دے

اُس نے کئی بار شیراز سے قلم مانگا اور کہا اُسے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دے۔ کیونکہ اُسے کچھ ضروری خط لکھنے ہیں۔ مگر شیراز نے اُسے ایک لمحہ بھی نہیں دیا اور بولا "تم کوئی پرانی بات یاد نہیں کرو گے۔ کوئی خط نہیں لکھو گے۔ تم کو تنہائی بالکل نہیں دی جائے گی۔ جب تک کہ تم ایک نارمل آدمی نہیں بن جاتے ـــــ"

نارمل آدمی بننے کی خاطر اُس نے اُن کے ہنگاموں میں شریک ہونا شروع کر دیا۔

عجیب بات ہے ـــــ وہ جب سے آمنہ سے بچھڑا تھا۔ اُس نے ہر رات اُسے خواب میں دیکھا تھا ـــــ اور خواب بھی وہ اس قسم کے دیکھتا کہ اُن پر حقیقت کا گمان ہوتا وہ اُس کے اتنی قریب ہوتی کہ وہ اُسے چھُو کر دیکھ سکتا ـــــ مگر آنکھ کھلنے پر ہر نظارا محو ہو جاتا۔ اور صبح کو وہ اور بھی سراسیمہ ہوتا۔

وہ چاہتا اُسے رات بھر نیند نہ آئے۔ تاکہ وہ کوئی خواب نہ دیکھے ـــــ کہیں سے نیند اُڑانے کی دوا ملتی تو وہ ضرور لے آتا۔ کافی دیر تک وہ اضطراب میں کروٹیں بدلتا رہتا۔ مگر جونہی اُس کی آنکھ لگتی۔ وہ اپنے حشر ساماں وجود کو لئے آ حاضر ہوتی۔

وہ رات اُن کی مشہد میں آخری رات تھی۔ کافی دیر تک باہر گھومنے کے بعد سب لوگ تھکے ہارے آئے تھے اور جلدی سو گئے تھے۔ حماد بھی تھک چکا تھا۔ مگر سونا نہیں چاہتا تھا۔

جونہی وہ آنکھیں بند کرتا۔ وہ اُس کی پلکوں تک آجاتی۔ کروٹ بدلتا تو پہلو میں آجاتی اُٹھ کر بیٹھتا تو جھولی میں گر جاتی۔ وہ پریشان ہو اُٹھتا ـــــ نہ جانے کیوں ـــــ وہ یوں

وں کر رہا تھا ـــــ جیسے آمنہ کا سراپا وہ نہیں جو ہمیشہ ہنستا مسکراتا اُس کے پاس آتا وہ اُسے بالکل زندگی سے عاری لگتی ـــــ کم زور ـــــ مضمحل ـــــ لاغر ـــــ ی سہی ـــــ کبھی کبھی تو بالکل مُردوں کی طرح نظر آتی ـــــ ....

نہیں نہیں ـــــ وہ گھبرا جاتا ـــــ آج مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرے وسوسے ب رنگ اختیار کر رہے ہیں ـــــ اُس میں سے زندگی کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے۔

وہ ایسی کیوں نظر آ رہی ہے ـــــ اور ـــــ

معطر سانسوں کی جگہ ذہن میں کافور کی خوشبو کیوں رچی جاتی ہے ـــــ

یا اللہ ـــــ یہ تو نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

میں تو اتنا وہمی کبھی بھی نہیں تھا۔

تمام رات وہ ایک پل نہ سو سکا۔ آج وہ چاہتا تھا کہ سو جائے۔ تاکہ ہمیشہ کی ح خواب میں اُس کا اصل پیکر دیکھ لے۔ مگر نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ سگریٹ پھونک پھونک بح ہو گئی۔

صبح اُس نے شیراز سے صاف صاف کہہ دیا کہ آج وہ ڈرائیونگ نہیں کرے گا ـــــ!

مگر شیراز نے اُس کی ایک نہ سُنی ـــــ

بلکہ بولا ـــــ تمہیں میرے سر کی قسم یار! آج انکار نہ کرو ـــــ آج چلاؤ گاڑی ے کے بعد تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم چلاؤ یا نہ چلاؤ ـــــ کیونکہ آج ہم میں سے ئی اس قابل نہیں ہے ـــــ

اُس نے اپنے سر کی قسم دے کر اُسے اسٹیئرنگ پر بٹھا تو دیا ـــــ مگر اُس سے واقعی یئرنگ سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

صبح ہی صبح وہ ترکی کو روانہ ہوتے ـــــ

حماد ساری رات نہیں سویا تھا۔ اُسے کچھ غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے

شیراز کو بتایا۔

شیراز بولا ——— میں تمہارے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تمہیں نیند نہیں آئے گی۔

مگر وہ ——— کہاں شیراز کی باتیں سُن رہا تھا ——— اُس کا ذہن مڑ مڑ کر پیچھے جاتا۔ جیسے وہ اُسے بُلا رہی تھی۔ پکار رہی ہے ——— کبھی اُسے محسوس ہوتا ——— اُس نے ایک رُوح کا رُوپ دھار لیا ہے۔ اور سفید کپڑوں میں ملفوف اُس کے ساتھ ساتھ دوڑتی آرہی ہے ——— یہ سوچ کر اُس کو جھرجھری آجاتی۔ کبھی وہ تصوّر میں بہت بڑا ہجوم دیکھتا ——— پھر لاحول پڑھنے لگتا ———

خدایا ——— ایسے فضول وسوسے کیوں ذہن میں آرہے ہیں۔ پھر اُس نے ماضی کی اچھی باتوں کو ذہن میں دہرانا شروع کر دیا تاکہ سفر آسان ہو جائے ———

شروع سے لے کر آخر تک ———

پہلی ملاقات سے آخری تک ——— وہ یادوں کی کڑیاں ملانے لگا ———

یونہی تار سے تار جوڑتے ہوئے ——— جانے وہ کہاں کھو گیا۔۔۔ اُسے کچھ ہوش نہ رہا ———

یہ بھی سمجھ نہ آئی ——— کہ شیراز کیوں چلا رہا ہے۔ کیوں اُسے پکار رہا ہے ———

ایک دھماکہ سا ہوا ——— اور جیسے ہر شے بجھ گئی ۔۔۔۔۔۔

پھر اُس کو ہوش اُس وقت آیا۔ جب وہ ایک ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر اور نرسیں اُس کے گرد جمع تھے اور اُسے ہوش میں لا رہے تھے۔

جب وہ اپنے حواسوں میں واپس آیا۔ تو اُس نے اس حادثے کی نوعیت کے بارے میں سوالات کیے۔

جو کچھ اُسے بتایا گیا ———

وہ اُسے پاگل کر دینے کو بہت کافی تھا۔

اُن کا کارواں ایک بس ٹرالی کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ دروازے کے کھل جانے کی وجہ سے پہلے دھچکے کے ساتھ ہی دُور سڑک پہ جا گرا تھا۔ اور معجزانہ طور پر بچ گیا تھا حتیٰ کہ اُسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔

مگر شیراز ——— ؟

شیراز کی تو لاش بھی نہیں پہچانی جاتی تھی ———

وہ تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ چُور چُور ہو گیا تھا ——— لہولہان ہو چکا تھا ———

اُس کا ایک ہاتھ کٹ کر دُور جا گرا تھا۔ اُس کی کلائی پر ابھی تک گھڑی لگی تھی۔ اور ڈاکٹر نے گھڑی اُتار کر جب حماد کے حوالے کی تھی۔ تو اُس نے اس بے جان گھڑی کو اپنے ں میں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جو ایک زندہ انسان کی کلائی پر بندھی دِل کی مانند دھک کرتی رہتی تھی ——— زندہ انسان خاموش ہو چکا تھا اور گھڑی ابھی تک سلامت تھی۔

اُس نے گھڑی کو اُلٹ کر دیکھا۔ اُس کی پشت پر شیراز کی کلائی کے گوشت کا ننھا لگا ہوا تھا۔

شیراز او میرے زندہ شیراز!

حماد نے گھڑی زمین پہ پٹک دی۔ اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔

کارواں میں جو لوگ پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ تمام بچ گئے تھے۔ بس کچھ لوگوں کو معمولی آئی تھیں۔ وہیں ہسپتال میں اُن کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

سب ہی سوگوار بیٹھے تھے ——— ہر طرف ایک ماتمی فضا تھی۔ اور شیراز کا تابوت جا رہا تھا۔

اور اس سارے حادثے کا ذمہ دار حماد تھا۔

حماد۔ جو صرف اپنے ہی غم کی آگ میں جل رہا تھا۔ جو یہ سمجھتا تھا کہ اس سے بڑا حادثہ دنیا میں نمودار ہو ہی نہیں سکتا ——— جو ظلم اُس کے ساتھ ہوا ہے۔ اُس سے بڑا

ظلم روئے ارض پر نہیں ہو سکتا ——— جس طرح اُس کی رُوح مجروح ہوتی ہے ———
کسی کی نہیں ہو سکتی ———

لیکن اب روئے ارض پر اُس سے بڑا حادثہ ہو گیا تھا ———

ایک نوجوان اور خوبرو آدمی ———

ایک ماں کا لال ——— ایک باپ کا سہارا ———

اس جہان سے گزر گیا تھا ———

ایک پیارا اور جیالا دوست جُدا ہو گیا تھا ———

زندگی کا ایک چراغ بُجھ گیا تھا ———

ایک کہانی ختم ہو گئی تھی ———

کیا اس سے بڑا کوئی اور حادثہ بھی ہو سکتا ہے ———

حماد اِدھر اُدھر سر ٹپک کر رونے لگا ———

واویلا کرنے لگا ———

میرے دوست! میرے پیارے دوست! تم نے تو میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا ———
میں تمہاری منت کرتا رہا۔ مجھے ساتھ مت لے جاؤ ——— میں تمہیں قسمیں دیتا ر
کہ مجھ سے گاڑی مت چلواؤ ——— میرا سایہ منحوس سایہ ہے ——— میں خود غرض ا
ہوں ——— میں کسی کی خاطر زندہ نہیں رہ سکتا ———

مگر آہ ——— تم مجھے مجبور کرتے رہے ——— تم ——— تم جوانی میں م
چاہتے تھے ——— اور مجھے زندہ درگور کرنا چاہتے تھے ——— ساری زندگی
عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہے ——— سب کو چونکانے والی ——— سب
اچنبھے میں ڈالنے والی حرکتیں ———

اور اب یہ تم نے کیا کیا۔

یں ساری زندگی ضمیر کے کچوکے کھاؤں گا ———
پچھتاووں کی آگ میں جلوں گا . . . . .
شیراز ——— تمہاری قسم ——— میں اپنے آپ کو اس کی سزا دوں گا ———
ن بڑی سزا ———

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کے بعد ——— لاش کا صندوق تیار کر لیا گیا تھا۔
ب لوگ پاکستان واپس جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ
انگی سے قبل حماد اُس کے والدین کو بذریعہ تار اطلاع دیدے۔

اور جب حماد کو پتہ چلا ——— تو اُس کا دِل اندر ہی اندر بند ہونے لگا۔ وہ تو پہلے
ا دیوانہ بنا بیٹھا تھا۔

دل ہی دل میں منصوبے باندھنے لگا۔

نہیں نہیں ——— اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

میں ہنستے کھیلتے، زندہ سلامت شیراز کے ساتھ آیا تھا ——— وہ مجھے زبردستی لایا
——— وہ میرے ساتھ واپس آنے کا وعدہ کر کے مجھے لایا تھا۔ میں اس کا تابوت لے
طن واپس نہیں جا سکتا۔ میں ایک بدنصیب ماں ——— اور ایک بوڑھے باپ کو
ا کے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر نہیں سُنا سکتا ———

میں اتنا سفاک نہیں ہوں۔ میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں۔؟

میں یہ لہولہان نوجوان لے کر وہاں نہیں جاؤں گا۔

میں اِن کرچیوں کا امین نہیں بنوں گا۔

میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔

کبھی نہیں ——— تمام عمر نہیں ———

ان راہوں پر واپس جانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے ———

میں زندگی کی ہر خوشی سے منہ موڑوں گا ———

زندہ انسانوں سے کیا ہوا ہر پیمان توڑ لوں گا ———

میں جھوٹا بن جاؤں گا۔ روسیاہ کہلاؤں گا ———

شیراز! اب تمہارے ساتھ نبھاؤں گا ——— انہی راہوں میں کھو جاؤں گا۔ جہاں تم میرا ساتھ چھوڑ گئے ہو ——— زندگی کی ہر خوشی کو اپنے اوپر حرام کر لوں گا ——— کسی کو نہیں بتاؤں گا ——— میں کیا ہوں ——— میں کون ہوں ———؟ میری تمنا کیا ہے ———؟ زندگی کی سب سے بڑی آرزو سے کنارا کر لوں گا ——— میں خود کو اس کی سزا دوں گا۔

"شیراز! میرے دوست ——— جس قدر ممکن ہوا ——— میں خود کو اس حادثے کی سزا دوں گا ———"

اور وہ سب کی نظر بچا کر ——— چپ چاپ ہسپتال کے بستر سے اٹھا ——— اور ——— اجنبی دیس کی اجنبی راہوں میں گم ہو گیا۔

اُس کی جیب میں صرف اُس کا پاسپورٹ تھا۔ اور چند سکے ———

تن پر صرف تین کپڑے ———

کوئی بات نہیں ——— اُس نے فیصلہ کن انداز میں اپنے آپ سے کہا۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ میں بغیر زادِ راہ کے نکل کھڑا ہوا ہوں۔

مجھے اپنی تقدیر اور دست و بازو کو آزمانا آتا ہے۔

اور وہ چلتا رہا ——— چلتا رہا ——— ایک لمبی شاہراہ پر۔ بغیر منزل کا تعین کئے رہا۔ اُسے کہاں جانا ہے۔ کس ہوٹل میں قیام کرنا ہے۔ یہاں اُس کا کون ہے۔ ے کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ تو ایک دل جلا آدمی تھا۔ پہلے اُسے زمانے نے سزا دی تھی اور ؛وہ خود اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے بن باس کاٹنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا جا رہا تھا ——— شیراز کی روح سے معافی ،ما رہا تھا۔ اور اُسے یقین دلا رہا تھا۔ کہ وہ بھی یہیں کہیں۔ اجنبی راہوں میں۔ ناشنا ،ؤں میں۔ وطن سے دُور۔ پیاروں سے دُور اپنے آپ کو گم کر دے گا۔ کھو دے گا ،وجُود کہیں رکھ کے بھُول جائے گا۔ اور پھر ایک اجنبی کا بوجھ اُٹھائے بغیر بقیہ زندگی ،اٹے گا۔ یادوں کی گٹھڑی کسی تیز رَو دریا کے دہانے پر رکھ کر چلا جائے گا۔ اور وہ ،ا جو زندگی کا مقصد بنی سائے کی مانند اُس کی یادوں میں دندناتی چلی آ رہی ہے۔ ،ا کے وجُود کو خود فراموشی کی تہوں میں دفن کر دے گا۔

ہاں اُس سے بڑی اور کیا سزا ہو سکتی ہے؟

چلو قصّہ ہی پاک ہوا۔

وہ جانے کیا کیا منصوبے بناتا چلا تھا۔ اسے خط لکھے گا۔ دِل کی بے تابی اور جذبات کی آگ صفحوں پر منتقل کرے گا۔ اُسے اپنے آنے کا مژدہ سُنائے گا۔ دوڑ کر اُس کے پاس جائے گا اور اُس کے قدموں پہ اپنا سر رکھ دے گا۔

اسے حاصل کرنے کی آخری ترکیب بھی کرے گا۔

یہ کرے گا۔ وہ کرے گا۔

اور تقدیر سے ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑے گا۔

مگر اس مرتبہ پھر تقدیر اسے شکست دے گئی تھی۔ اب ہر فیصلہ خود ہو گیا تھا۔

اب وہ ایک دوست سے ملے بغیر چلے آنے پر شرمندہ بھی نہیں تھا۔

اور جسے اپنی زندگی کہہ چکا تھا اُس سے منکر ہونے پر پشیمان نہیں تھا۔

ہر نئے قدم پر وہ اپنے آپ کو سرد پتھر میں ڈھالتا جا رہا تھا۔ اور ماضی کی ایک ایک بات کو خُدا حافظ کہہ رہا تھا۔ دامن سے پاؤں کی گرد جھاڑ رہا تھا اور خوبصورت امیدوں کو چُن چُن کر ذہن سے جھٹک رہا تھا۔

مگر وہ چلتا جا رہا تھا۔

آگے اور آگے ——

متوکل تو وہ ہمیشہ سے تھا ہی۔ اب بھی اجنبی راہوں کا اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔ ایک انجانا سا بھروسہ تھا۔ جیسے کوئی غیبی قوت یہاں بھی مدد کو پہنچ جائے گی۔

وہ اس ملک کی زبان بھی نہیں جانتا تھا۔ اور نہ یہاں کے اصولوں اور ضوابط کا اُسے علم تھا۔ اُس کا عِلم ان ملکوں کے بارے میں صرف کتابی تھا۔

اُس نے سوچا جہاں قدم تھک جائیں گے۔ وہاں کوئی تدبیر کرے گا۔

شاید وہ شہر سے دُور نکل آیا تھا۔

سامنے کشادہ سڑک پر ایک ٹریلر ٹرک کھڑا تھا۔ اور اُس کے قریب دو گورے چٹے

ے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی ٹرک کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اور ایک اسٹیرنگ ا ہوا تھا۔

قریب جانے پر حماد کو اندازہ ہوا کہ اُن کے ٹرک میں شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ اس وہ سڑک پر رک گئے تھے۔ قریب کوئی آبادی نہ تھی۔ اس لئے وہ خود ہی کوشش اُسے ٹھیک کر رہے تھے۔ پہلے حماد نے سوچا سر جھکا کر اُن کے قریب سے جائے۔ لیکن پھر ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اُس کے ذہن میں لپکا۔ اُس نی عرصہ ایک ورکشاپ میں کام کیا تھا۔ سوچا قسمت آزمائی کے لئے پہل کر دینی چاہیئے۔ اُن کے قریب گیا۔ علیک سلیک سے پتہ چلا کہ وہ لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ اور ھی سکتے ہیں۔

حماد نے کہا۔ "کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کون ہیں۔؟" اُن میں سے ایک نے مہذب طریقے سے پوچھا۔

"جناب میں موٹر مکینک ہوں۔" حماد نے اپنا مختصراً تعارف کرا دیا۔

"اوہ۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہم آپ سے مدد لے سکتے ہیں۔ ہمارے ٹرک میں کچھ پیدا ہو گئی ہے۔ اور ہمیں آج رات استنبول پہنچنا ہے۔" اگر آپ اس خرابی کو دُور لیں تو ہم آپ کے نہ صرف مشکور ہوں گے۔ بلکہ منہ مانگا معاوضہ بھی دیں گے۔"

حماد راضی ہو گیا۔

اُس نے اللہ کا نام لیا اور جتنی دُعائیں یاد تھیں پڑھ کر ٹرک کے کل پُرزوں میں کھو گیا گھنٹہ کی اَن تھک محنت کے بعد ٹرک بالکل دُرست ہو گیا۔ بلکہ تھوڑی دُور تک نے انہیں چلا کر بھی دکھایا۔

وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ بہت سے شکریئے ادا کر کے انہوں نے ایک معقول اد کو پیش کی۔ مگر حماد نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا، "یہ میرا اخلاقی اور انسانی

فرض تھا۔ میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔

وہ لوگ حماد کی شرافت اور گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ جب حماد کسی صورت بھی پیسے لینے پر راضی نہ ہوا تو اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اپنا کارڈ حماد کو پیش کیا اور بولا "اگر کبھی میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف یاد کیجئے۔"

حماد نے وہ کارڈ لے کر پڑھا۔ اس پر اس آدمی کا نام لکھا تھا۔ "پال ایرکسن"

یکایک حماد کی ذہانت آڑے آئی۔ اور اُس نے کہا۔ "آپ لوگوں نے ابھی کہا تھا آپ استنبول جا رہے ہیں؟"

"ہاں"۔ انہوں نے بتایا۔ "آج ہمیں استنبول جانا ہے۔"

"تو"۔ حماد بولا۔ "اتنی مہربانی کیجئے۔ مجھے بھی اس ٹرک میں بٹھا کر استنبول لے چلئے۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔"

آپس میں تھوڑے سے مشورے کے بعد وہ لوگ راضی ہو گئے۔ اور یوں حماد ترکی روانہ ہوا۔

اُس کے ہمسفر اُس کا انتظار کرتے رہے۔ اُسے تلاش کرتے رہے۔ بالآخر مایوس ہو کر وطن کو روانہ ہوئے۔ لیکن وہ خوش تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو کھو دینے کا جو عزم کیا تھا اُس کی ابتداء ہو چکی ہے۔

دورانِ سفر ان لوگوں نے اپنا اپنا تفصیلی تعارف ایک دوسرے سے کرایا۔ یہ ٹریلر دو بھائیوں کی ملکیت تھا۔ جو ڈنمارک کے رہنے والے تھے۔ "پال ایرکسن" اور "اول ایرکسن" مختلف ملکوں کی "کنسٹرکشن" کمپنیوں کو سامان سپلائی کرتے تھے۔

ایران کے کھارنج ڈیم کا ٹھیکہ جس کمپنی نے لے رکھا تھا۔ وہ اُسے سامان پہنچانے کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے۔ اور اب وہ ترکی جا رہے تھے۔ وہاں آبنائے باسفورس پر ایک عظیم الشان تاریخی پل بن رہا تھا۔ جو ایشیا اور یورپ کو آپس میں ملانے کے لیے بنا۔

تھا۔ وہاں سے انہوں نے سامان کا آرڈر لینے کے لئے جانا تھا۔

ویسے بھی ایرکسن برادرز بہت ہی دلچسپ آدمی تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی حماد بے تکلف ہو گئے۔ اور اُسے یورپ کی دلچسپ باتیں سُنا کر خوب محظوظ کرتے ہے ——— اور حماد نے بھی جھٹ اپنا چولا بدل لیا۔ اس کے اطوار ہی بدل گئے وہ ظاہر کرنے لگا۔ جیسے وہ جنم جنم سے ڈرائیوری کر رہا ہے۔ اور مکینکی اُس کا محبوب ہے ———

راستے میں اس نے ٹرک چلانے کی پیش کش بھی کی ——— جسے انہوں نے قبول ا۔ اور حماد کی ڈرائیونگ کو بہت پسند بھی کیا۔

باتوں باتوں میں حماد نے انہیں جتا دیا کہ وہ اس کے لئے کسی نوکری کا بندوبست ں۔ دونوں بھائیوں نے وعدہ بھی کر لیا۔

خدا کی قدرت کہ استنبول پہنچتے پہنچتے اُن کا ڈرائیور بیمار ہو گیا۔ اور ایک مہینے کی لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

یہ ایک مہینہ حماد نے اُن کا ٹرک چلایا ——— نتیجۃً ایرکسن برادرز نے حماد کو اپنے ہی نوکر رکھ لیا۔ اور نیا لائسنس بھی بنوا دیا۔ اب حماد کی زندگی بہت ہی مصروف ہنگامہ خیز ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ دن رات سفر میں رہتا۔ زمین پر سو جاتا ملا کھا لیتا۔ ہر وقت ڈرائیوروں کے یونیفارم میں رہتا۔ واقعی وہ اپنے آپ کو نے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ البتہ اُس کی کتابیں پڑھنے والی عادت اب بھی اپنی برقرار تھی۔ اچھی اچھی کتابیں خرید کر پڑھنا۔ جب بھی وقت ملے پڑھنا۔ اب ایک اور بھی اس میں پیدا ہو گیا تھا۔ نئی نئی زبانیں سیکھنے کا۔ وہ جس ملک میں بھی جاتا وہاں زبان سیکھنے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ اب وہ ایرکسن برادرز کے ساتھ یورپ کے دوسرے ملکوں بھی جانے لگ گیا تھا۔ وہ یوگوسلویہ۔ بلغاریہ۔ رومانیہ۔ جیسے کمیونسٹ ملکوں

میں بھی جانے لگ گیا تھا۔

یہاں بھی جاتا۔ اپنے مشاہدے کو اور عمیق کرتا۔ اُس نے اپنی ایک روزمرہ کی ڈائری بھی لکھنا شروع کر دی تھی۔ جیسے وہ ایک عام آدمی کے نقطۂ نظر سے لکھ رہا تھا۔ ان ملکوں کے "درونِ خانہ ہنگامے" اور "سیاسی حالات"؟ گاہے گاہے وہ اپنی ڈائری میں لکھتا رہتا۔ کبھی کبھی ضروری تصویریں بھی اکٹھی کرتا۔ ٹرک کے ساتھ ہی اُسے کئی بار یونان بھی جانا پڑا —— یونان۔ جسے دیکھنے کا اُسے بہت اشتیاق تھا اور جہاں کے دیومالائی قصے اُس نے بہت پہلے بہت سی کتابوں میں پڑھ رکھے تھے۔ وہ سمجھتا تھا۔ یونان ابھی تک علم و عرفان کا بحرِ بیکراں ہوگا۔ کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ وہ ریسرچ کی غرض سے یونان جائے گا۔ مگر اب اُس نے یونان کے دو تین چکر لگائے تھے اور اُس کے اندرونی حالات سے بہت مایوس ہوا تھا۔

یہ ۱۹۶۹ء کی ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ جب وہ یونان کے شہر ایتھنز کے ایک سستے سے ریستوران میں ایرکسن برادرز کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دو فوجیوں نے انہیں حراست میں لے لیا۔ اُن کے ٹرک کی تلاشی لی، پاسپورٹ ضبط کر لئے۔ اور شہر سے نکلنے پر پابندی عائد کر دی۔ بعد ازاں انہیں معلوم ہوا کہ اس مثالی جمہوری ملک میں فوج نے بادشاہت کا تختہ الٹ کر فوجی حکومت قائم کر لی ہے اور پکڑ دھکڑ اور خون خرابہ اسی سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ شہر میں خوف و ہراس چھا رہا تھا —— توپوں اور گنوں کی گاہے گاہے آوازیں آ رہی تھیں۔ اور شہر سے نکلنے والے راستوں پر فوج متعین ہو گئی تھی۔ یا الٰہی! اگر یہ جمہوریت ہے تو پھر مصیبت کسے کہتے ہیں۔

دو دن وہاں ان لوگوں کو حراست میں رہنا پڑا۔ دو دن میں حماد نے سُنی سنائی اور دیکھی دکھائی باتوں سے ڈائری بھر لی اور اپنے کیمرے سے کچھ یادگار تصویریں بھی لے لیں۔ پھر بسیار کوشش کے بعد انہوں نے ڈینش رائل ایمبیسی سے رابطہ قائم کیا۔ بمشکل

ان سے رہا ہو کر یہ لوگ جرمنی چلے گئے۔

منی پہنچ کر حماد کی سیلانی طبیعت میں اُبال آ گیا۔ یا شاید — وہ ٹرک ڈرائیوری سے یا تھا۔ اُس نے ایرکسن برادرز کی نوکری چھوڑ دی اور وہیں یونیورسٹی میں داخلہ لے گو وہ جرمن زبان سیکھتا۔ اور صبح کو یونیورسٹی جاتا۔ یہاں اُسے ایک بار پھر لکھنے کا ماحول ملا تو —— اُس نے یونانی حکومت کے تختہ الٹنے کا آنکھوں دیکھا حال یل سے لکھا اور لندن کے ایک مشہور اخبار کو بھیج دیا۔ اور وہ چند تصویریں جو اُس نے کیمرے سے لی تھیں۔ وہ بھی بھیج دیں۔ وہ پیشہ ور صحافی تھا اس لئے جانتا تھا مضمون کے ساتھ تصویروں کی کیا اہمیت ہے۔ چنانچہ۔ تصویروں سمیت وہ مضمون یا۔ چھپا ہی نہیں۔ چاروں طرف سے خوب واہ واہ بھی ہوئی۔

ں کے بعد اُس نے دوسرے ملکوں سے متعلق بھی چند مضامین لکھے۔ اور لندن ار میں ہی چھپوائے۔

ماہ بعد۔ لندن کے اخبار کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ وہ اُسے اپنے ہاں رکھنا چاہتے ——

اور حماد لندن پہنچ گیا۔

لندن پہنچ کر اُس نے کسی اخبار میں ملازمت نہیں کی۔ بلکہ "فری لانسر" بن گیا۔ اُس نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا تھا۔ ان ملکوں کے حالات وہ دلچسپ پیرائے میں ہفتے میں ایک مضمون ضرور کسی نہ کسی اخبار میں چھپ جاتا۔ اس شہرت کی وجہ سے اُسے ی میں نوکری مل گئی اور وہ وہیں کا ہو رہا۔

لیکن علم حاصل کرنے کی پیاس اُس کے اندر بجھی نہیں۔ بلکہ ہر موڑ پہ بڑھتی رہی۔ یہاں ں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

دُنیا کی مختلف زبانیں سیکھنے کا اُسے جنون تھا۔ جرمن زبان پر اُسے کافی عبور حاصل

ہوگیا تھا۔ اور اب وہ جرمنی کی مشہور کتابیں اور مشہور سیاسی مضامین کے ترجمے انگر
یں کرنے لگا تھا۔

اُسے فرانسیسی سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے سیکھنی شروع کردی تھی چھ
میں ایک بار وہ فرانس بھی ہو آیا تھا۔ گو اُس نے مستقل ملازمت اختیار کرلی تھی مگر اُس
سیلانی طبیعت اب بھی اُسے سیاحت پہ اُکساتی رہتی تھی۔ اس لئے جب بھی اسے چھٹ
ہوتیں۔ کبھی وہ مشرقِ وسطیٰ کا ایک چکر لگا لیتا۔ کبھی کسی افریقی ملک میں چلا جاتا۔ کبھی کسی
ملک کا رُخ کرلیتا۔ جہاں بھی وہ جاتا۔ ملک کے اندرونی حالات پر نظر رکھتا۔ اور اپنے مشاہدا
کی ڈائری میں اضافہ ہی کرتا رہتا۔

اُس نے بہت پیسہ کمایا تھا۔ مگر بچا یا کچھ بھی نہیں تھا۔ جتنے پیسے اکٹھے ہو جاتے ا
وہ سیاحت پہ خرچ کر دیتا۔ یا نادر کُتب خرید لیتا۔ وہ سوچتا۔ وہ پیسے اکٹھے کرے بھی تو ک
اور کس کے لئے —— اور زندگی کے ضروری لوازمات اور دُنیا داری والی آسائش
خریدے تو کیوں ——؟

وہ تو ایک سیّاح تھا۔

ایک قلندر تھا۔

اپنے من کی روشنی اور وسعت حاصل کرنا اُس کا نصب العین تھا۔

اور وہ اپنے آپ کو علم، تجربے، مشاہدے سے خوب سنوار رہا تھا۔ سجا رہا تھا

اسی لئے اجنبی ملکوں میں اُس کا نام بولا جاتا تھا۔ اُس کی مانگ تھی۔ اور یہی اُس کا سرمایہ تھا

اس کا ذہن قابلِ رشک خزینہ بن چکا تھا۔

اُس کے خیالات میں سونے سے زیادہ ٹھوس پن، چمک اور پختگی آ گئی تھی۔

اُس کا مشاہدہ ہیرے کی کان سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔

اُس کی زبان میں روپے کی جھنکار سے زیادہ دلکش تاثیر آ گئی تھی۔

وہ واقعاتِ عالم پر جب تبصرہ کرتا تو بڑے بڑے غیر مُلکی صحافی اُس کا منہ تکنے لگتے۔
اُس کا تبصرہ بے لاگ، غیر جانبدار اور غیر متعصّبانہ ہوتا ——
اُسے اُن کی زبان پہ قابُو تھا۔ الفاظ کا صحیح استعمال جانتا تھا۔ جملوں کو لونڈی کی
طرح استعمال کرسکتا تھا۔

اور یوں اُس نے زندگی سے سمجھوتہ کر رکھا تھا ——

غیروں پہ جادُو پھُونک رکھا تھا ——

زندگی کر رہا تھا ——

اور یہ سب اُس کا ذاتی سرمایہ تھا ——

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ان دِنوں عرصۂ دراز کے بعد حماد کا دل اپنے وطن کے لئے بیقرار ہوا تھا
وطن جس سے وہ بھاگ آیا تھا۔
چھُپا پھِرتا تھا۔ اور جہاں لوٹ کر نہ جانا چاہتا تھا۔
وہ تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اُس کے وطن میں کوئی اُس کا اپنا نہیں۔ کسی کو اُس کا انتظار نہیں۔ کوئی اُس کا مشتاق نہیں۔ وہ دریا میں سے نکل جانے والے قطرے کی مانِند ہے کہ جسے نکال دینے کے بعد دریا کی روانی اور لہروں کی طغیانی میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔
مگر دریا سے نِکل کر قطرے پہ کیا گذرتی ہے۔
وہ اُسے آج معلوم ہو رہا تھا۔
ایسے جیسے سینے میں ایک پھانس سی اٹک گئی ہو۔ مصیبت تو یہ تھی کہ اتنے بڑے شہر میں دِل کا حال کہنے کو کوئی بھی نہ ملتا۔ اُس کی سیلانی طبیعت بہت ہی بیکل تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے وطن پہنچنا چاہتا تھا۔
اِن دنوں اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وطن کے ایک ایک ذرّے سے اُس کا

کا رشتہ ہے۔ وہاں کا تنکا تنکا اُس کا تمنّائی ہے۔ ہر فرد اُس کا عزیز ہے ہر شے اُس کی ملکیّت ہے۔ اور وہاں کے شب و روز آنکھیں کھولے اُس کے راہیں۔ اُس کو پکار رہے ہیں۔
اور اسے لَوٹ جانا چاہیئے ——
مادرِ وطن کے پاس ——
مادرِ گیتی کے پاس!
عجیب بات ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتا۔ انسان بعض اوقات کیسی نادانی کی بن کرتا ہے۔ زندگی کی سرکش تمنّاؤں سے ہار مان کر ہم فرار کی راہ ڈھونڈتے ہیں۔
اور فرار بھی دوسرے مُلک میں ——
اجنبی دیار میں ——
گویا ماں کی گود چھوڑ کر ہم داشتہ کی آغوش میں آجاتے ہیں ——
داشتہ تو محض ایک بہلاوہ ہے ——
سراب ہے ——
وقت کی ایک بھُول ہے۔
بھٹکا ہوا راستہ ہے۔
کہیں زندگی بھر کے لئے بھی اس کے سیاہ دامن میں سکُون مِلا ہے؟
اُس کی داعدار بانہیں کبھی ازلی سہارا ہوتی ہیں؟
اس کی بکاؤ گود بھی کبھی سُکھ کا گہوارہ بنی ہے —— آدمی اُس سے بھی تھک ہے ——
اس کی اداؤں سے بھی اوب جاتا ہے ——
سرابوں اور فریبوں کے پیراہن تار تار کر کے پھر اسی مقدّس اور مطہّر گود میں واپس

آنا چاہتا ہے۔ جسے ٹھکرا چکا تھا ——— جس سے نفرت کرتا تھا ———

مگر دراصل جو اُس کا سرچشمہ تھی۔

اور جو زندگی کی انتہا بھی تھی۔

عمر کے اس موڑ پر پہنچ کر۔ اپنے وطن سے بھاگ آنے والی حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ زندگی میں آدمی جو چاہے وہ پا تو نہیں سکتا زندگی تو نام ہے جد و جہد کا۔ اس جیسے کئی اور ہوں گے۔ جو کسی ایک پیکر کو اپنی منزل بنا بیٹھتے ہیں۔ مگر اُن میں سے کتنے ہیں جو اپنی منزل کو پا لیتے ہیں۔ اور کتنے ہیں وہ جو منزل پا کر بھی مسرور ہیں۔ اور کامیاب ہیں۔

بھئی یہ زندگی ایک عجیب و غریب کھیل ہے۔

اس کے مہرے ہر ایک کے اپنے بس میں نہیں ہوتے۔ ———

چلاتا کوئی ہے۔ شہہ کسے مل جاتی ہے ———

ہارتے ہارتے جیت ہو جاتی ہے ———

اور جیتنے والے ہار جاتے ہیں۔

بھلا ایک ہی مقصد تو نہ تھا زندگی کا۔

اور بھی بہت مقاصد تھے۔ کچھ انسانوں کے حقوق تھے۔ وطن کے حقوق تھے وقت اور زمانے کے تقاضے تھے۔

وہ ان سب کو پس پشت ڈال کر چلا آیا۔

مگر اب ———

اب اُس کا جانا بہت ضروری تھا۔

وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتا تھا۔ اُس کی صلاحیتوں کی اُس کے وطن کو بہت ضرورت تھی۔

ت یہ تھی کہ۔ ہندوستان نے دوسری بار پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ اور اس بار اُس کا ظم تھا۔ اور بڑی طاقتوں کی سازشیں وریشہ دوانیاں اس کی ہم رکاب تھیں۔ اس خبری میں ہی پاکستان لٹ گیا تھا۔ اُس کا ایک بازو کٹ گیا تھا۔

شرقی پاکستان ——— سنہرا دیس ———

ہاں جانے کا حماد کو بہت شوق تھا۔ جس کی کہانیاں اُس نے کتابوں میں پڑھ ں۔ اور ہمیشہ سوچتا تھا۔ وہاں جا کے کچھ عرصہ رہے گا۔ ایک بار اُس نے اخبار سے بھی کہا تھا کہ اُسے ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔ مگر وہ پہلے ہی ایک آدمی کو بھیج تھے۔

ہاں دیکھا دیس جس کے ذرّے ذرّے سے وہ محبت کرتا تھا۔ وہ چھن گیا تھا۔ اس دکھ جو تھا وہ اپنی جگہ تھا۔ مزید دکھ اس بات کا تھا کہ اس بار وہ خود بی بی سی میں تھا۔ اور جنگ کے کئی بلیٹن اُسے خود پڑھنے پڑتے تھے۔ بڑے ملکوں کی جانبداری طور پر برطانیہ کی متعصبانہ ذہنیت کھل کر اُس کے سامنے آئی تھی۔ وہ کس انداز میں ن کی پسپائی کی خبریں دے رہے تھے اور کس کس طرح ہندوستان کی پشت پناہی تھے۔

حماد کا خون کھول اٹھا۔

اُس کا دل چاہتا اُس کے پاس کوئی ماورائی طاقت آ جائے اور وہ اُن سب کو ٹ کر دے۔ اور خود وطن واپس لوٹ جائے اور وطن کو سربلند کرے۔

اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے جنگ ختم ہوتے ہی بی۔ بی۔ سی کی نوکری چھوڑ دی پبلشنگ ہاؤس میں کتابوں کے ترجمے کرنے پر مامور ہو گیا۔

وزی کمانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تو ضروری تھا۔

اب اُس کے من میں ایک اور موج بھی اٹھی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ وہ وطن واپس

لوٹ جائے۔ اور وہاں جا کر ایک شاندار اخبار نکالے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وطن
کی صحافت غنودگی کے عالم میں ہے۔ اور صحیح چلن بھول چکی ہے۔ یا پھر اُس کی آنکھ
پر توپ و تفنگ کے پہرے ہیں۔

بابا جان نے جو چراغ فرنگی کے زمانے میں جلایا تھا۔ وہ اب اُسے ٹمٹماتا ہوا محسوس
ہو رہا تھا۔ وہ اُس کی لَو اونچی کرنا چاہتا تھا۔

اپنی صحافت کو غیر ملکی صحافت کے معیار پہ لانا چاہتا تھا۔

اپنے ملک کو بے لاگ، سچی اور صاف ستھری صحافت دینا چاہتا تھا۔

اُس نے اس جلاوطنی میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ یہ سب وہ اپنے ملک کو دینا
چاہتا تھا۔ اُن میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا کرنا چاہتا تھا۔

لوٹ جانا چاہتا تھا ———

اپنے مرکز کی طرف ———

اپنی منزل کی طرف ———

اب راہ میں کوئی تمنا حائل نہ تھی۔ اور وہ پختگی کے ایک مقام پہ پہنچ چکا تھا۔

لیکن وطن واپس جا کر اخبار نکالنے کے لئے ———

اور پریس لگانے کے لئے سرمایہ درکار تھا۔

اور پیسہ اُس نے کبھی جمع نہ کیا تھا۔

اُسے کیا معلوم کہ ایسا وقت بھی آئے گا۔ جب اُسے پیسے کی اشد ضرورت ہو

خیر اُس نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ اور اُس کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا تھا۔

اُس نے نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کی۔

ایک ساتھ کئی کتابوں کے ترجمے شروع کر دیئے۔ ایک کتاب واقعاتِ عالم پر
لکھنی شروع کر دی۔ اُس نے سوچا اب وہ ایک مشن کے تحت پیسے کمائے گا۔ اور اُسے

جمع کرے گا۔ اور پھر چند سالوں کے بعد پریس کی جدید ترین مشینری لے کر یہاں سے
وطن جائے گا۔

جنگ کے دَوران ہی اُس نے اپنے پُرانے اخبار اور دفتری عملہ سے رابطہ قائم
کر لیا تھا۔ اُنہیں غیر ملکی اخباروں کے تراشے اور آرا۔ بھیجنے لگ گیا تھا۔ دفتر والے
زیادہ تر تبدیل ہو چکے تھے۔ مگر جو پُرانے ساتھی تھے۔ اچانک اُس کی برآمدگی پر بےحد
خوش ہوئے تھے اور برابر اسے واپس آنے کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ مگر وہ انہیں
لیے لکھتا۔ کہ وہ خود وطن آنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔

مگر اب وہ لاابالی لڑکا نہیں رہا۔ کہ جدھر مُنہ اٹھایا اور چل دیا ———

اب وہ منظم طریقے سے وطن واپس جانا چاہتا تھا۔

یہاں کنزنگٹن گارڈنز کی پُرانی اور خوب صورت آبادی کے اس عالیشان بنگلے کے سجے سجائے اور خوب صورت کمروں میں گھومتا ہوا حماد سوچ رہا تھا ——

کل تک وہ کیا جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے —— قسمت اُسے ایک نیا رُوپ دکھلانے والی ہے ——....

وہ جو جنم جنم سے آوارہ گرد اور آوارہ منش بنا پھرتا ہے۔ اور جھڑتے پتّوں کی مانند اِدھر اُدھر ڈول رہا ہے۔ اس کا بھی کوئی سلسلہ ہے۔ سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ خون کے رشتے ہیں۔ عزت ہے۔ مرتبہ ہے۔ اور کوئی اُسے اپنا سمجھتا ہے۔

صرف ایک دن میں اتنا بڑا انقلاب آگیا تھا۔

کل —— وہ ایک مفلس مست قلندر، درویش تھا۔

اور آج ——

دراصل بات یہ ہوئی تھی۔ کہ کل وہ اپنے نئے دفتر میں بیٹھا ہوا ترجمے کا کام کرنے میں منہمک تھا۔ کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے تو اُس نے سوچا فون اٹھائے ہی نہیں۔ خیالات و الفاظ کا سارا تانا بانا بکھر جائے گا۔ پھر گھنٹی مسلسل بجتی رہی تو اُس نے

ے دل سے رسیور اُٹھا ہی لیا۔

اس طرف کوئی شخص ہنری بول رہا تھا۔ اُس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد حماد ے ملاقات کا وقت مانگا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے اُس کے تلخ و ترش مضامین باروں میں چھپنا شروع ہوتے تھے اُسے کتنے نئے لوگوں کے ٹیلی فون آتے تھے۔ اور ھ اس سے ملنا بھی چاہتے تھے۔ اکثر وہ اُن کو اپنے دفتر میں ہی بُلا لیا کرتا تھا۔ آج بھی ن نے یہی کہا۔ کہ وہ ایک گھنٹہ تک فارغ ہو جائے گا۔ وہ آکر اُس سے مِل سکتے ہیں

"جناب مجھے آپ سے ایک مسئلے پر تفصیلی گفتگو کرنی ہے اور مجھے کچھ زیادہ وقت اہیئے" اُس نے انکساری سے کہا۔

"مسئلہ۔ کیسا مسئلہ جناب! کیا وہ سیاسی مسئلہ ہے؟"

"جی نہیں۔ میں ایک بالکل نجی قسم کے مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے قات کا وقت دیں۔ فون پر وقت ضائع نہ کریں"

"کل اتوار ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو مجھ سے میرے گھر پر ملیں" بالآخر حماد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت اچھا رہے گا۔ کل میں بھی بالکل فارغ ہوں۔ میں کل صبح آپ کی رہائش گاہ پر آجاؤں گا"

حماد نے اُسے اپنا پتہ بتایا۔ اور ریسیور فون پر رکھ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

اتوار کی صبح دس بجے اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک اجنبی اُس سے ملنے آرہا ہے۔ گر وہ پُرسکون تھا۔ اس کاروباری شہر میں اس قسم کی ملاقاتیں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ٹھیک وقت پر وہ اُس کے گھر تھا۔ اور اپنا تعارف کرا رہا تھا۔

"جناب! میں وکیل ہوں۔ اور آپ کے لئے چند خوشگوار سنسنی خیز خبریں لایا ہوں"

"خبریں ——؟" حماد نے کافی کی پیالی اُسے تھماتے ہوئے کہا۔

"جی ـــــ مگر وہ سیاسی خبریں نہیں ہیں بلکہ کچھ آپ کے خاندان سے متعلق ہیں۔"

"خاندان سے متعلق ـــــ؟ میرے خاندان سے متعلق۔" وہ اور بھی حیران ہوا۔

"کیا آپ جانتے ہیں۔ آپ کے نانا کون تھے؟"

"جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔" حماد کچھ غیر یقینی انداز میں بولا۔

"آپ کچھ اپنی والدہ کے متعلق بھی جانتے ہوں گے۔"

"والدہ ـــــ؟" سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر حماد سوچ میں کھو گیا ـــــ

والدہ ـــــ ماں ـــــ امّی ـــــ کیا ہوتی ہے ـــــ کیسی ہوتی ہے؟ کیا اُس کی اپنی بھی کوئی ماں تھی ـــــ؟ ممّی عاصمہ ـــــ بیگم رقیہ جہانگیر ـــــ بیگم ابراہیم ـــــ۔۔۔۔ اور آخر میں وہ تصویر جو بابا جان کی لائبریری میں لگی تھی۔ جو کسی خوش شکل ولایتی ملکہ کی تصویر لگتی تھی۔ وہ اُس کی ماں تو نہ تھی۔۔۔۔ گو سب یہی کہتے تھے۔۔۔۔

ماضی کے خاموش سمندر میں غوطے لگاتا وہ باہر نکل آیا اور بولا۔ "مجھے اپنی والدہ اور ننھیال کے متعلق کچھ تفصیل سے معلوم نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"

"تعجب ہے۔" مسٹر مہری نے کہا۔ "نہ معلوم کیوں یہ سب باتیں آپ سے پوشیدہ رکھی گئیں۔"

"کوئی خاص وجہ نہ ہو گی۔" حماد نے اپنے فطری سکون کو بروئے کار لاتے ہوتے کہا۔ "درحقیقت! وکیل صاحب میں اُس عمر میں اپنے گھر سے نکل آیا تھا، جس عمر میں بچے ماں کے زانو پر سر رگڑ رگڑ کر ضدیں کرتے ہیں۔ اُس وقت میری عمر اتنی پختہ نہ تھی کہ مجھے اپنے ننھیال کے بارے میں تفصیل سے بتایا جاتا۔ پھر۔ اُس کے بعد آج تک گھر لوٹ کر نہیں گیا۔ کوئی مجھے کب اور کیسے بتاتا ـــــ؟"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ گھر سے کیوں بھاگ آئے تھے۔ اور پھر لوٹ کر کیوں نہ گئے؟"

"کوئی خاص بات نہ تھی۔" حماد نے اُس کے پوچھنے کا ذرا بھی بُرا نہ مانا اور بولا۔ "آپ اسے

ری کی جذباتی سی بغاوت کا نام دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنے ڈیڈی کے گھر کا ماحول اور یلی ماں کا طرزِ عمل پسند نہیں آیا تھا۔"

پھر اُس نے ایک سچے اور معصوم آدمی کی طرح اپنے گھر سے فرار ہونے کی داستان اور مختصر الفاظ میں اُسے سُنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ تب سے باہر گھوم رہا ہے اور واپس نے کا ارادہ بالکل نہیں رکھتا۔

مسٹر مہری حماد کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئے اور اُن کے دل میں حماد کے لئے دی اور احترام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ بولے ـــــ "مجھے خوشی ہے کہ آپ پر بہت باتوں کا انکشاف کرنے کا فرض مجھے سونپا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کچھ اُداس خبروں کے تھ میں آپ کو کچھ مسرت آگیں اور حیرت انگیز خبریں بھی دینے والا ہوں۔ آج کے دن آپ رغ ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔" حماد نے خوش دلی سے کہا۔ اور دوبارہ گرم کافی پیالیوں میں انڈیلنے لگا۔

اور آج۔۔۔۔

آج ان خوب صورت کمروں میں گھومتا ہوا حماد سوچ رہا تھا کہ وہ کیا جانتا تھا کہ یہ مخصوص کا وکیل اُسے کیا خوش خبری سُنانے آیا ہے۔ کیا کہنے آیا ہے ـــــ کون سی داستان باب اُلٹے گا۔ بھلا ان خبروں سے اُسے کیا حاصل ہو گا۔ وہ تو ایک اچھے سامع کی ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی بیان کردہ داستان سُن رہا تھا۔ پھر داستان سنتے سنتے اُسے یوں دس ہوا اُس کا دل بار بار دھڑک اُٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ بھر آتی ہے۔ اور اُس پر ہیجان طاری ہو جاتا ہے۔ جسے چھپانے کے لئے کبھی وہ سگریٹ سُلگا لیتا ـــــ کبھی کافی بنانے اور کبھی یونہی اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔

آج سے پینتیس برس پہلے منشی زیاد احمد نے اپنے لختِ جگر سجاد احمد کو بیرسٹری

کی تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجا تھا۔ وہ دیس اور وہاں کا رہن سہن سجاد احمد کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ فطرتاً سجاد احمد بڑے شرمیلے تھے اور لاڈ پیار میں بگڑے ہوئے بھی تھے۔ اس لئے منشی زیاد احمد نے اپنے ایک صحافی دوست کے نام انہیں رقعہ لکھ کر دیا تھا تاکہ وہ اُس کی رہائش کا خاطر خواہ بندوبست کہیں کر دیں۔

مسٹر جان اسمتھ انگلینڈ کے ایک غیر جانبدار اخبار کے ایڈیٹر تھے اور وہ کئی بار ہندوستان آبھی چکے تھے۔ اس ضمن میں اُن کی منشی زیاد احمد سے جان پہچان ہو گئی تھی اور یہی جان پہچان آگے چل کر اچھی خاصی دوستی میں بدل گئی تھی۔

وہ جب بھی ہندوستان آتے۔ لاہور کا چکر ضرور لگاتے۔ اور لاہور میں وہ منشی صاحب کے مہمان خانے میں ٹھہرا کرتے۔ اور اکثر ملکی حالات پر تبصرہ بھی کرتے رہتے۔ یہ تبصرہ اور چپقلش اُن کی خط و کتابت میں بھی جاری رہتی۔

سجاد احمد جب اپنے والد کا خط لے کر مسٹر جان اسمتھ کے گھر پہنچے وہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اُنہوں نے اسے کہیں اور ٹھہرانے کا بندوبست نہیں کیا بلکہ اسے اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔

وہ انگلینڈ کے صاحبِ حیثیت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا اُن کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنے پیشے سے لو لگا لی تھی۔

فلوریٹا اُن کی ایک ہی بیٹی تھی۔ جسے انہوں نے بہت لاڈ و محبت سے پالا تھا اور اُسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اُنھوں نے سوئیٹزرلینڈ کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔

وہ وہاں ہوسٹل میں رہتی تھی بس چھٹیوں میں ہی گھر آیا کرتی تھی۔

اور اُن کا اتنا بڑا سجا گھر بالکل خالی رہتا تھا۔ جسے اُن کی پرانی نوکرانی بیٹسی چلاتی تھی۔ اسی نوکرانی نے آیا بن کر فلوریٹا کو بھی پالا تھا۔ اور اب گھر کا تمام کام کاج کرتی تھی۔

جب اُنھوں نے اصرار کیا۔ تو سجاد احمد کو وہیں رہنا پڑا۔ انہوں نے سجاد احمد کو بھی بیٹسی کے حوالے کیا تاکہ آج سے وہ اس کا دھیان گھر کے ایک فرد کے مانند رکھے۔

وہاں سجاد احمد کو گھر کی سی ساری سہولتیں میسّر ہونے لگیں اور بگڑے ہوئے شہزادے کو وہ جگہ بہت بھائی اس لئے انہوں نے اپنے والد کو خط لکھ دیا۔ اور اس میں سارے حالات لکھ دیئے۔ اور اجازت مانگی کہ انہیں مستقل طور پر سر جان اسمتھ جنہیں وہ انکل کہتے تھے، کے گھر میں رہنے دیا جائے۔ اجازت ملنے پر وہ وہیں جم گئے۔

بہار کی چھٹیوں میں جب فلوریٹا اپنے گھر آئی تو سجاد احمد کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اُس کے پپا نے اُسے ایک مہمان کی آمد کے بارے میں تو لکھا تھا مگر وہ مہمان ایسا ہوگا ——— یہ اُسے گمان تک نہ تھا۔ سیاہ آنکھوں، سیاہ بالوں۔ اور سنہری رنگت والا۔ ایک لمبا۔ شرمایا شرمایا سا لڑکا ———

اُدھر فلوریٹا کو دیکھ کر سجاد احمد کا بھی یہی حال ہوا۔ انہیں چِٹّی چمڑی کبھی اچھی نہ لگی تھی۔ انگریز عورتیں ایک دم کرخت لگتیں۔ مگر فلوریٹا کی ملیح صورت دیکھی تو دل تھام کر رہ گئے۔ پیاری شہابی رنگت، ریشم ایسے گال نیلی معصوم آنکھیں۔ مڑی ہوئی سنہری پلکیں۔ بے حد سُرخ ہونٹ اور ان سب سے زیادہ اُس کے چہرے پر ایک تقدّس تھا۔ مریم کا سا تقدّس۔ جتنی خوبصورت تھی۔ اتنی ہی شرمیلی تھی۔ شاید تنہا رہنے کی وجہ سے وہ جلدی گھُل مِل نہ سکتی تھی ———

پھر نہ جانے کیسے۔ دل و نگاہ کی ساری منزلیں طے ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کے آرزو بن گئے۔

سجاد احمد اُن کے ہاں پانچ سال رہے۔ فلوریٹا اپنی تعلیم مکمل کرتی رہی۔

جان اسمتھ بڑے سیانے آدمی تھے۔ خاموشی سے اُن کی ایک دوسرے کے لئے چاہت، اضطراب اور بے کلی کا جائزہ لیتے رہے۔ اور جب تعلیم ختم کرنے کے بعد سجاد احمد

ڈرتے جھجکتے حرفِ مُدّعا زبان پر لاتے ——— تو بظاہر اُنہیں کوئی اعتراض نہ ہوا۔ وہ سجاد احمد کے خاندان کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر اکلوتی بیٹی کی دُوری کے خیال سے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔

فلوریٹا بھی۔ جب چھوٹی سی تھی اپنے باپ کے ساتھ ایک بار ہندوستان گئی تھی۔ اُسے وہ ملک اور وہاں کے سادہ دِل لوگ بہت پسند آئے تھے۔

منشی زیاد احمد بھی اس معاملے میں مخالفت نہ کر سکے۔ کیونکہ جان اسمتھ اُن کے بڑے پیارے دوست تھے اور فلوریٹا کو بھی پیار سے وہ اپنی ہی بیٹی کہا کرتے تھے۔

لاہور آکر فلوریٹا نے واقعی انہیں بیٹی بن کر دکھایا۔ اُن کے لئے اُردو سیکھی۔ ان کا لباس اپنایا۔ خاندان والوں سے خوب گھُل مِل کر رہتی۔ ہنستی مُسکراتی دلوں پہ راج کرتی۔ فلوریٹا جس کا نام بابا جان نے فاطمہ بی بی رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دِن سب کو چھوڑ کر ایک نئے دیس کو چل دی۔ سجاد رو کر رہ گئے ——— بابا جان کچھ نہ کر سکے ——— تو بے چارے جان اسمتھ جو بیٹی کے دوسرے ملک جانے پر ہی آزردہ تھے۔ اب کیا کر سکتے تھے۔

سبھی اس گہرے گھاؤ کو کلیجے میں چھپائے زندگی کے ساتھ مگن ہو گئے۔

مسٹر جان اسمتھ نے حماد کو اُس وقت دیکھا تھا۔ جب حادثے کی اطلاع پا کر وہ لاہور گئے تھے۔ اس وقت حماد نو ماہ کا تھا۔ اُسے سینے سے لگا کر وہ خوب روئے تھے۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ اُن کے بوڑھے بازوؤں میں اتنی سکت نہ تھی کہ فلوریٹا کی نشانی کو سمیٹ کر لے جاتے اور کلیجے سے لگا کر رکھتے۔ فلوریٹا کی ماں بھی ایک حادثے میں مری تھی اور اُس کے مرنے کے بعد اُنھوں نے فلوریٹا کی پرورش کر لی تھی۔ مگر اب یہ صدمہ اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ اور بڑھاپا اُن کی راہ میں حائل تھا۔ پھر وہ حماد کی ایک تصویر اپنے ساتھ لے آئے اور حماد کو اُن کے پاس چھوڑ آئے جن کی وہ امانت تھا۔

پھر کشیدگیاں شروع ہوئیں۔ بٹوارہ ہوا۔ خوُن خرابہ ہوا۔ حالات کچھ ایسے رہے کہ

ت تک وہ لوگ ایک دوسرے کی خبر نہ لے سکے . . . . .

مگر کچھ عرصہ بعد جب بابا جان نے انہیں اپنی اور گھر والوں کی خیریت کی اطلاع بھجوائی اسمتھ پاکستان آئے تھے۔ اس وقت وہ بھی بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ بابا جان ح۔ حماد کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اس کے لئے بے شمار تحفے لائے سارا دن اُس کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

لیکن ڈیڈی کچھ اس طرح مصرُوف تھے کہ اُن سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکے شاید مِی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ آزردہ ہو کر واپس چلے گئے۔ مگر جب تک بابا جان زندہ رہے وہ اُن سے خط و کتابت کرتے رہے اور ہر سال حماد کی ایک تازہ ترین تصویر انہیں تے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ سر جان اسمتھ کا حماد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ مگر بابا جان کی وفات کے بعد مسٹر اسمتھ کے لئے یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ پھر وہ ں کے سہارے زندہ رہے۔ اور اس آس پہ کہ ایک دن جوان ہو کر اُن کا نواسا خوُد سے ملنے آئے گا۔

پچھلے پانچ برسوں سے وہ علیل رہتے تھے . . . . حماد کو ہمیشہ یاد کرتے رہتے تھے ں کی تصویروں سے دل بہلاتے تھے۔ پھر طویل بیماری سے جنگ لڑتے لڑتے ایک وہ خاموش ہو گئے۔ مگر اپنی ساری جائیداد حماد کے نام لکھ گئے۔ یہاں کنزنگٹن گارڈنز ں کا ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک ذاتی دفتر تھا۔ بنک میں جمع شدہ پونجی بھی۔

جب سے وہ فوت ہوتے تھے۔ اُن کا وکیل ہنری حماد کو ڈھونڈنے کی کوشش تھا۔ اُن کے والد سے بار بار رابطہ قائم کیا گیا۔ مگر اُنھوں نے کوئی تسلی بخش جواب دیا۔ کیونکہ وہ خوُد بھی نہ جانتے تھے کہ حماد کہاں ہے ؟

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب حماد ڈرائیور بنا ملک ملک پھر رہا تھا۔ کوئی اُسے تا . . . بھی کیسے ؟ مگر مسٹر ہنری نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور ایک بار اس

عرض سے پاکستان بھی گئے۔ وہاں حماد کے دفتر والوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اور اُن سے کہا کہ انہیں جونہی حماد کی اطلاع ملے اُس کے پتہ پر لکھیں۔

وہ واپسی پر حماد کی جوانی کی تصویر بھی لیتے آتے تھے۔

اور قسمت کی خوبی دیکھئے ——

کہ اب جبکہ حماد مستقل طور پر لندن میں ٹک گیا تھا۔ اُس نے اپنے پُرانے اخبار کو اپنے مضامین بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ یُوں مسٹر ہنری اُسے اپنے ملک میں تو نہ ڈھونڈ سکے تھے۔ مگر اخبار والوں کی اطلاع پر آج چھاپا مارا تھا۔

ساری باتیں تفصیل سے بتانے کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اُس میں حماد کی وہ تمام تصویریں تھیں، جو باباجان وقتاً فوقتاً مسٹر جان اسمتھ کو بھیجتے رہے تھے۔

حماد بڑے شوق سے اپنے بچپن کی سب تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

ایک تصویر میں باباجان بھی حماد کے ساتھ کھڑے تھے۔ حماد غالباً تین چار سال کا ہوگا۔ باباجان کا عصا پکڑے۔ ان کی ٹانگوں کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اور سفید ریش باباجان سفید کپڑوں میں۔ مُسکراتے چہرے کے ساتھ کوئی سماوی مخلوق لگ رہے تھے۔

حماد نے ہاتھ بڑھا کر یہ تصویر اُٹھالی اور اپنی آنکھوں کے نزدیک لے آیا۔

باباجان ... باباجان .... آپ کہاں کھو گئے ہیں ..... میں آپ کی سوٹی پکڑ کر چلا کرتا تھا۔ یہ سوٹی گم کیا ہوئی میں ہی کھو گیا... مجھے کسی نے ڈھونڈا نہیں... اب تو مجھے خود بھی اپنا پتہ نہیں .... دو آنسو اُس کی آنکھوں کے خشک صحرا سے پھوٹے اور باباجان کی داڑھی اور چہرے کو بھگو گئے۔ اُس نے جلدی سے تصویر صاف کی۔ اور مسٹر ہنری سے معذرت کرنے لگا۔

مسٹر ہنری محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس وقت جذبات کے کون سے موڑ پر

اور پھر انہیں تو اس کا ہر قسم کا ردِّ عمل دیکھنا تھا۔

"یہ آپ ہی کی تصویر ہے نا۔؟" انہوں نے بات کا رُخ پلٹنے کے لئے پوچھا۔

"جی ...." حماد نے اعتراف کیا۔

"چلیئے آپ کو آپ کے نانا جان کا۔ اور اب آپ کا گھر دکھائیں ....." "ابھی ——؟"

"ہاں ابھی —— میں تو فارغ ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ابھی چلیں..."

"وقت تو ہے —— مگر آپ نے وہاں کسی کو اطلاع تو دی نہیں" "وہاں ان دنوں ان کی پرانی خادمہ بیٹھی ہی رہتی ہے۔ وہ اب کافی ضعیف ہوگئی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مرتے دم تک اسے گھر سے نہ نکالا جاتے۔ جس گھر کے ہر فرد کی اس نے خدمت کی ہے۔ میں نے کل اُسے آپ کی دریافتگی کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ آپ سے ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ اور کہہ رہی تھی۔ اگرچہ میرے جسم میں اب خدمت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ پھر بھی میں اپنی فلوریٹا کے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاؤں گی۔"

اس کے تصوّر میں بھی نہ تھا کہ اُس کے نانا جان کا بنگلہ اتنی اچھی آبادی میں ہوگا اور اتنا خوب صورت وکشادہ ہوگا۔ گو گھر پُرانی طرز کا تھا۔ مگر اس سے بھی شان وشوکت ٹپکتی تھی۔

ہال کمرے میں بڑے بڑے پورٹریٹ آویزاں تھے۔ مسٹر ہنری ایک تصویر کے آگے رُک گیا۔ اور حماد سے تعارف کرانے لگا۔

"یہ ہیں مسٹر جان اسمتھ آپ کے نانا جان"

حماد احتراماً رُک گیا۔ سر کو ذرا سی جنبش دی اور پھر غور سے اُن کے خدوخال دیکھنے لگا۔ وہ اس لباس میں ملبوس تھے جس میں پُرانے زمانے کے لارڈز ہوا کرتے تھے چہرے سے ذہانت اور دبدبہ ٹپکتا تھا۔ بڑے فطین اور شفیق نظر آتے تھے۔

"کاش میں آپ کی زندگی میں آپ سے مل سکتا۔ پھر میں آپ سے کیا کچھ نہ حاصل کر

لیستا۔" اُس نے حسرت سے سوچا۔

"یہ آپ کی والدہ کی تصویر ہے؟"

ایک نہایت ہی دیدہ زیب سنہری فریم میں ایک بہت بڑی تصویر کمرے کے وسط میں آویزاں تھی۔ وہ اس کے قریب رُک گیا.... غور سے دیکھا.... ایک خوبرو دوشیزہ سر سے پاؤں تک لمبے سے فرغل میں ملبوس تھی۔ لبادہ پوری آستینوں کا اور جھالروں والا تھا۔ گھونگھریالے بال جو ایک خوبصورت ہیٹ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ.... چہرے پر تقدس اور حیا، مسکراہٹ میں دوشیزگی کی کشش.... زندگی، حسن، محبت.... وفا.... وہ تصویر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا قریب چلا گیا.... اور قریب.... اور قریب.... اور پھر دو زانو ہو کر قالین پر بیٹھ گیا۔

ماں۔

میری ماں!

اُس کا ایک ایک رواں پکار بن گیا۔

میرا دل کہتا ہے تم میری ماں ہو۔

تمہی میری ماں ہو۔

اتنی مقدس.... اتنی پاک.... جتنی مریم....

لمبے لمبے لبادوں میں لپٹی ہوئی حیا کی دیوی ——

وفا کی دیوی.... رنگت اور زبان سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تیرا خون تو آبِ زم زم سے بھی زیادہ مقدس ہے۔

ماں —— تیری آنکھیں تو حیا اور محبت کے پیمانے ہیں ماں....

تو نے، محبت، ایثار اور وفا کے ملے جلے جذبات سے مجھے جنم دیا....

مجھے.... اجنبی دیس —— اور اجنبی لوگوں سے لے کر اپنی کوکھ میں چھپا لیا ——

ے انسانی پیکر میں ڈھالا.... اپنا خون پلایا.... اور پھر —— خود —— خود —— دامن

ڑا لیا —— کیوں ماں —— کیوں —— ؟

تیرے بعد میں کسی کو ماں نہ کہہ سکا۔

تیرے بعد میری کوئی ماں نہ بن سکی ——

کسی عورت کے پاس تیری طرح کا محبت بھرا دل نہ تھا ——

جو عورت جنم نہیں دیتی —— وہ ماں کبھی نہیں بن سکتی۔

پھر تو کس حوصلے پر مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔

تیرے جانے کے بعد ڈیڈی بھی بدل گئے.....

حقیقتوں سے دُور ہو گئے۔

بناوٹ اور تصنع میں کھو گئے ——

میں تجھے کھوجتا پھرا —— پکارتا پھرا ——

نہیں ماں میں نے جھوٹ بولا ہے۔ نہ میں نے تجھے ڈھونڈا نہ پکارا ——

ہی ——

میں تجھ سے ایک بے نام سی نفرت کرتا رہا —— تجھ سے چھپتا پھرا —— تجھے

ستا رہا.... مگر

آج —— بالآخر تیری ممتا خود مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ یہ میرا کمال نہیں

ری محبت کا اعجاز ہے۔ کہ میں یہاں تیرے قدموں میں آ بیٹھا ہوں۔

اور میں جو کچھ بھی ہوں، تیری وجہ سے ہوں۔ میں بھٹکا ضرور ہوں۔ گمراہ کبھی نہیں ہوا

یہ سب تیرے مقدس خون کی بدولت ہے۔ تیرے مطہر دودھ کا اعجاز ہے۔

تیری ممتا کا کمال ہے۔

ے میری ساری خطائیں معاف کر دے۔ ایک بار ممتا سا بچہ بنا کر مجھے گود میں لے لے

مجھے پیار کرلے۔ تیرے پیار کے لئے تو میں پھر سے بچہ بننے کو تیار ہوں۔ اور پیار کے لئے تو میں جنم جنم سے ترس رہا ہوں۔

اور پھر دیکھتے دیکھتے.... اس کا راہوار خیال کہاں سے کہاں پہنچ گیا ــــ اُس کے آنسو اُس کے رخساروں پہ ٹھٹک گئے اور اُس کی نظریں ماں کی تصویر کے چہرے پر تھیں.... اور خیال جانے کیسے اور کس طرح اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی تصویر کے پہلو سے چشمے پھوٹنے لگے۔

بابا جان ــــ مسکراتے ہوئے ــــ نور لٹاتے ہوئے ــــ

اماں جان ــــ سہلاتی ہوئیں ــــ دعائیں دیتی ہوئیں ــــ

اور پھر..... پھر.... آمنہ ــــ

آمنہ ــــ

آمنہ کہاں سے نکل آئی؟

وہ گمشدہ لڑکی ــــ جسے اُس نے ذہن کے طاقچوں سے کھرچ کر زمانے کے حوالے کر دیا تھا۔ دن پہ دن اور سال پہ سال بیتتے رہے ــــ وہ اُس کی یاد پہ ماہ و سال کی دبیز تہیں چڑھاتا رہا ــــ وقت کی آڑ لے کر خود کو فریب دیتا رہا ــــ

ایک بہادر انسان کی طرح زندہ رہا ــــ زندگی کے لئے تگ و دو کرتا رہا ــــ زمانے کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور خود کو باشعور اور ذی ہوش انسان سمجھ بیٹھا..... ہاں اُس نے ہی ایک دن اس لڑکی کو ذہن کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا ــــ ایک ہی بار اُس کے لئے رو لیا تھا ــــ جیسے کہ واقعی مرنے والے پہ ایک بار جی بھر کر رو لیتے ہیں۔ اور پھر صبر آجاتا ہے ــــ اُسے بھی یادوں کے قبرستان میں دفن کر دینے کے بعد اُسے صبر سا آگیا تھا ــــ وہ اس کے بغیر زندہ تھا ــــ جی رہا تھا ــــ خوش تھا ــــ کامران تھا ــــ

پھر آج ــــ

آج وہ بھولی بسری، دفن شدہ لڑکی فاصلوں کے تابوت توڑ کر مُردہ ممی کے پہلو سے سلامت نکل آئی تھی

اور اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی ــــ

اور وہ سوچ رہا تھا۔ یادیں کبھی نہیں مرتیں ــــ کبھی نہیں مرتیں....

یادیں.... انسانی سائے کی طرح انسان کا پیچھا کرتی ہیں۔ جس طرح تاریکی میں سایہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات دنیا کی جھوٹی چکاچوند میں یادیں بھی گم ہو جاتی ہیں ہوتی ہیں ــــ ختم نہیں ہوتیں ــــ یا لاشعور کا کوئی اندھیرا اور ٹھنڈا کونا ڈھونڈ کر ل پر اجمان ہو جاتی ہیں....

اور پھر جب سناٹوں کا دور آتا ہے.... انسان نقلی انسانوں کے ہجوم میں خود تنہا محسوس کرتا ہے ــــ اُسے اپنے ذہن کے سوئے ہوئے ویرانوں میں ماضی کی پ سنائی دیتی ہے ــــ یادیں دستک دیتی ہیں.... آہٹیں دل کو گدگداتی ں....

بھولے بسرے نغمے یاد آجاتے ہیں ــــ

سوتے درد انگڑائیاں لیتے ہیں.....

اور پہلو میں میٹھی میٹھی چبھن ہونے لگتی ہے ــــ جی چاہتا ہے۔ زندگی ایک جست میں پیچھے کی طرف لوٹ جائے ــــ بہت پیچھے.... اور ادھوری کہانیوں ٹی ہوئی پتنگ کا ڈولتا، سرکتا آخری سرا لپک کر پکڑ لے ــــ

مگر اُس کا سرا کہاں ہوتا ہے ــــ

وہ تو محض سراب ہوتا ہے....

اور آج.... جانے کیسے..... اُس کا جی پھر اسی سراب کو چھونے کو چاہنے لگا تھا۔

یہ کیسا ظلم تھا کہ جب وہ یہاں آیا تو بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی تھا ـــــ اور کھڑے کھڑے یادوں کی گٹھڑی اتنی زور سے اس پر گری تھی ـــــ کہ اس کا اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہوگیا تھا ـــــ

ممی آپ مجھے کیوں نظر آگئیں.... اور میں اپنے ماضی کی کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے کیوں لپکنے لگا ـــــ؟

وہ ممی سے اس ظلم کے لئے احتجاج کرنے والا تھا کہ وکیل صاحب نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

اُس نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کرکے پیچھے مڑکر دیکھا.... ایک عمر رسیدہ خاتون جس کا چہرہ جھریوں اور سلوٹوں کا جال بن چکا تھا۔ بالوں پر کتی سالوں کی برف جمی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ چائے کا ٹرے تھامے کھڑی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے حماد کو دیکھ رہی تھی۔ حماد کو دیکھ کر اُسے جو خوشی محسوس ہوئی تھی وہ اس کے بوڑھے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وکیل صاحب نے تعارف کرایا۔

"یہ بیٹسی ہیں۔ اُونچا سنتی ہیں۔ میں نے انہیں آپ کے متعلق بتادیا ہے۔ اب یہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

حماد نے ٹرے اُس کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ دیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ گرم جوشی سے پکڑ لئے۔ مگر وہ اُسے پیار کرنا چاہتی تھی اور حماد کے چہرے تک اُس کی رسائی نہیں ہورہی تھی۔ اس لئے حماد جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ قریب آئی۔ اس نے حماد کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے تھاما۔ کافی دیر غور سے اُس کے چہرے کے نقوش دیکھتی رہی۔ پھر اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بولی۔

"وہی چہرہ.... بالکل وہی چہرہ.... وہی قد.... وہی بال.... پیارے تم اپنی ماں اور باپ کا خوب صورت سنگم ہو...." وہ ایک سانس میں

ا فقرہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لئے جملے توڑ توڑ کر اپنے جذبات کا اظہار کررہی تھی۔

تمہارا باپ جب پہلے پہل آیا تھا.... تو.... بالکل ایسا تھا... جب میں نے یں پُشت پر سے دیکھا تو تم مجھے ویسے ہی لگے ـــــ مگر جب.... تم نے مجھے ڑ دیکھا.... تو مجھے محسوس ہوا.... تمہارے چہرے میں تمہاری ماں.... چھپی ہوئی ہ.... تم نے اپنی ماں کی تصویر دیکھی ـــــ؟

اُس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

حماد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہاری آنکھیں.... ہونٹ اور مسکرانے کا انداز.... بالکل اپنی ماں جیسا ہے۔"

اوخدایا۔ میں کتنی خوش ہوں۔ آج میں.... نے.... اپنی فلوریٹا کے.... بچے کو ھا ہے....

حماد نے اس بوڑھی خاتون کا بڑے ادب سے شکریہ ادا کیا۔ مگر اونچا سننے والا آلہ انے کے باوجود وہ اس کی بات ٹھیک سے نہ سُن سکی تھی۔ یا شاید وفورِ جذبات سے ننا نہ چاہتی تھی۔ صرف کہنا چاہتی تھی۔

اور جانے وہ منہ ہی منہ میں کیا کیا بدبدا رہی تھی۔ جو حماد اور وکیل کی سمجھ میں بھی یں آرہا تھا۔

چائے پینے کے بعد وکیل نے جائیداد کی تمام ضروری دستاویزات اور بینکوں کاغذات حماد کے حوالے کئے.... اور اتنا بڑا ترکہ حاصل کرنے پر اُسے بہت ت مبارک باد دی اور بولا۔

"بہتر یہ ہے آپ کل سے اسی گھر میں منتقل ہوجائیں۔ یہ اب آپ کی رہائش گاہ ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" حماد نے جواب دیا۔ "میں تنہا اس اتنے بڑے گھر میں

کیسے رہ سکتا ہوں۔ اسے مقفّل ہی رہنے دیجئے۔"

"جناب! جب آپ یہاں آئیں گے تو تنہائی کا ساتھی بھی خود بخود مل جائے گا!" وکیل نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔" ویسے اولڈ میڈ ہیلٹسی کی بھی یہی خواہش ہے کہ آپ چند دن اُس کے مہمان رہیں۔"

اور آج ——— جب وہ دیارِ غیر کو چھوڑ کر ایک عرصے کے بعد اپنے وطن روانہ ہو
تھا۔ جہاز میں بیٹھا۔۔۔ اپنے نو سالہ پُرانے ماضی کو دہرا رہا تھا۔ وہ کیسے اور کن حالات
وطن سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا ———

دنیا کی اتنی بڑی بساط پر انسان ایک حقیر سا مہرہ ہی تو ہے۔ جسے ہمیشہ انجانے
چلاتے رہتے ہیں۔ جب وہ جنم لیتا ہے۔ تو والدین اُس کے متعلق کیا کچھ نہیں سوچتے
جب وہ شعور کو پہنچتا ہے تو اُن کی ہر سوچ کا اُلٹا عکس بن جاتا ہے۔ اور پھر اپنے لئے
پنے مستقبل کے لئے ایک نئے اور اک انوکھے جہان کے سپنے بُننا شروع کر دیتا ہے۔

لیکن بالآخر وہ ——— وہی کچھ بن جاتا ہے۔ جو ہاتفِ غیبی اُسے بنا ڈالتا ہے ———
زندگی کتنے بڑے چکر کاٹ کر ——— کتنی راہ داریوں سے ——— کتنی بھول بھلیوں
نکال کر اُسے پھر اُنہی راہوں پر لئے جا رہی تھی۔ جو راہیں اس کے لئے اجنبی بن چکی تھیں
ں اپنے وطن میں ——— اپنے پیاروں کے دیس میں ——— وہ کس آس پہ جا رہا
ہے ———

وہاں اس کا کون انتظار کر رہا ہوگا ———؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس کا کون سا ناطہ رہ گیا ہے وہاں ——

ڈیڈی —— ؟ آہ بچارے ڈیڈی —— جن سے وہ انجانی سی نفرت کرنے لگا تھا۔ اس جذباتی سی عمر میں وہ اُن کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ ایک باغی وائد بن کر اُن کی پرچھائیں سے دُور دُور بھاگتا رہا تھا۔ انہیں زندگی کی سب سے بڑی اذیت پہنچانے کے لئے ——

مگر اب وہ ڈیڈی کہاں تھے —— ؟

وہ شکست خوردہ باپ بھی اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا

یہ اطلاع اُسے لندن ہی میں چھ ماہ پیشتر ملی تھی۔ جب وہ مستقل طور پر اپنے نانا کی شاندار کوٹھی میں منتقل ہوگیا تھا۔ تو کچھ دنوں بعد ہی اُسے ڈیڈی کے خصوصی وکیل کی معرفت ایک چھٹی اور کچھ کاغذات بھی ملے تھے۔

اُن میں اُس کے ڈیڈی کا وصیت نامہ بھی تھا۔

ڈیڈی نے پچاس ہزار نقد اور لاہور والی حویلی حماد کے نام چھوڑی تھی۔ اور اُسے آخری وصیت . . . . میں لکھوایا تھا کہ وہ ضرور پاکستان چلا آئے اور یہیں آکر مستقل سکونت اختیار کرے۔

ڈیڈی —— جن کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ ممی کے سحر میں گرفتار ہیں۔ اور اس سے محبت نہیں کرتے۔ یہ انھی ڈیڈی کی طرف سے آخری تحفہ تھا۔

اور اس روز وہ جی بھر کر رویا تھا۔ اس اکیلے کمرے میں جہاں آکر اُس کا ماضی زندہ ہوگیا تھا۔

وہ ڈیڈی کو یاد کر کے بہت رویا تھا۔ اُس نے تو کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اتنی جلدی اس کے ڈیڈی مر جائیں گے۔ وہ تو سوچا کرتا تھا۔ پاکستان جاتے ہی سب سے پہلے ڈیڈی کے پاس جائے گا۔ اور انہیں اپنی آوارگی کی ساری کہانیاں سنائے گا۔ اور پھر

ھر کے متعلق بھی بتائے گا۔ جہاں انہوں نے اپنی جوانی کا بہترین وقت گذارا تھا اور —— وہ وہاں رو رہا تھا ——

واقعی اپنے نانا کے گھر آنے کے بعد۔ جانے حماد کو کیا ہوگیا تھا۔ کہ اُس کے سے وہی روٹھا روٹھا، حساس اور تنہائی کا شکار حماد نکل آیا تھا۔

جس بیڈروم میں اُس کے ڈیڈی رہا کرتے تھے۔ وہی بیڈروم اُس نے اپنے پا تھا۔

اور جب سارے دن کے کاموں سے تھک ہار کر وہ وہاں آکر لیٹتا تو تصورات پرچھائیوں سے کھیلنے لگتا۔ اپنے زرخیز ذہن کی بدولت اس ان دیکھے اور ان بوجھی ئے سرے سے جوڑتا۔ جو اُس کے ڈیڈی اور ممی نے کسی زمانے میں شروع

یہاں ڈیڈی رہتے ہوں گے۔ وہاں ممی رہتی ہوں گی۔ دونوں ایک دوسرے کی بن گئے ہوں گے —— ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل اُٹھتے ہوں گے —— تے ہوں گے —— وہ کرتے ہوں گے —— غرض محبت کرنے والے جن جن ت سے گذرتے ہیں۔ وہ دونوں بھی گذرے ہوں گے۔ تب اُن کے لئے زندگی حسین ہوگئی ہوگی؟

عشق کے مرحلوں کو انتہا تک پہنچانے کے جنون میں انہیں کیا علم تھا کہ اُن کی کہاں اور کس موڑ پر فنا ہو جائے گی۔ اور جس بچے کو اتنی چاہت سے جنم دے یں۔ اُس کا کیا حشر ہوگا —— . . . . . وہ محبت کو ترسنے کے لئے آوارہ و انسان بن جائے گا۔ ماں بھی چھن جائے گی اُس سے —— اور باپ بھی مجبور ئے گا۔

آہ وہ بچہ —— جو دو محبت بھرے دلوں کے ملاپ کی ایک خوبصورت نشانی

تھا ـــــــ عشق کی خلوتوں میں سینچا ہوا مہکتا ہوا پھول تھا ـــــــ

اس بچّے کا آخر کیا ہوا ـــــ؟

نہ ممّی کو علم نہ ڈیڈی کو ـــــ

اُس نے تو جب پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تو ـــــ سب سہارے دُور ہو گئے ـــ

اور تب سے وہ پا پیادہ بچہ چل رہا ہے۔

کس کا بچّہ ہے وہ ـــــ

کون ہے وہ ـــــ؟

کسی نے اُس کو اب تک اپنایا ہی نہیں ـــــ

پھر اُسے اپنا ماضی یاد آنے لگتا۔۔۔۔۔

جب کوئی اُس کی زندگی تھا ـــــ اُس نے بھی کسی کے لئے جینا چاہا تھا ـــ مرنا چاہا تھا ـــ ایک کہانی کا آغاز کیا تھا ـــ محبّت بھری روحوں کو جنم دینے کے ـــ مگر تقدیر راہ میں حائل ہو گئی تھی۔۔۔۔

اُس کی کہانی کے اوراق تو ابتدا ہی میں بکھر گئے تھے۔ نہ جانے کیوں جب سے وہ اِس گھر میں آیا تھا آمنہ اُسے بار بار یاد آتی تھی۔ کبھی اس دروازے سے نمودار ہوتی کبھی اُس دروازے سے ہنستی ہوئی اندر داخل ہوتی اور کہتی۔ "مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے صاحب ـــ؟"

ہاں وہ اس سے بچ کر اتنی دُور چلا آیا تھا۔ اور سمجھ رہا تھا کہ وہ ان سفلی خواہشات سے بہت بُلند و بالا ہو گیا ہے۔۔۔۔ اُس نے اپنی ہر تمنّا پاؤں تلے کچلی ہے ـــ اور جذبے کو انتہا تک پہنچا کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اور کیا ہے اس دنیا میں جو ا نے نہیں دیکھا۔ اب اُس کے نفس کی لگامیں اُس کے اپنے ہاتھ میں تھیں۔ اور وہ ذ کے تابع ایک پختہ کار زندگی بسر کر رہا تھا ـــ سڑک پر بکھرے موتی دیکھ کر اب وہ چپ

ہیں تھا۔

زندگی کا رازداں بن گیا تھا۔

اس لئے آمنہ ـــــ اور آمنہ جیسی ہر لڑکی کارواں کے غبار کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

پر اب یہاں آکر ـــ اس گھر میں ـــ عرصۂ دراز کے بعد اُسے ایک گھر میں رہنا نصیب ہوا تھا۔ اُس کا دِل محبّت کی گرمی اور جذبات کی حدّت کے لئے مچلنے لگا تھا ـــــ اور جب وہ محبّت کے بارے سوچنے لگا ـــ تو اُسے وہی لڑکی یاد آ گئی۔ جس کے جسم سے چھوٹے بچّوں والی خوشبو آتی تھی۔ جس کے کورے ہونٹ صداقت کی تصویر تھے۔ اور جسے چھُو کر ننھی منی لرزتی ہوتی چڑیا کو مٹھی میں بند کر لینے احساس ہوتا تھا ـــــ

اس کی اوّلین محبّت!

پہلی محبّت کے بارے میں مرد اتنا حسّاس نہیں ہوتا۔ عورت یقیناً اُسے اپنی زندگی کی آخری خواہش بھی بنا لیتی ہے۔

مگر آج اُسے معلوم ہوا ـــ وہ لڑکی اس کی زندگی کے چوکھٹے میں کچھ اس طرح فٹ آئی تھی کہ آج تک وہ اسے اس چوکھٹے سے نکال کر نہیں پھینک سکا۔ شعوری طور پر اُسے بھلانے کی کوشش میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا ـــ یہی وجہ تھی شاید کہ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اور نہ شادی کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ یوں چاہنے والیاں اُسے زندگی کے ہر موڑ پر ملتی رہی تھیں ـــ

اور اب وہ بار بار سوچتا تھا۔ کاش اس گھر میں آمنہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ اس کے بچّوں کی ماں ہوتی۔ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ اسے ہر جا نظر آتی رہتی۔۔۔۔ لیکن اب کہاں ہوگی وہ ـــ اور وہ کس حال میں ہوگی ـــ میں تو خود ہی اُسے

چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ اب یہ آس تو فضول ہے۔ کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی ــــ اتنا طویل عرصہ ــــ اور ایک بے نام سا انتظار۔۔۔ کس لئے بھلا ــــ؟

اگر وہ زندہ ہے تو ضرور اُس کی شادی ہو گئی ہو گی۔ ہمارے ملک کے معاشی سماجی حالات کسی لڑکی کو اتنے طویل انتظار کی اجازت نہیں دیتے ــــ وہ تو مجبورِ محض تھی بیچاری ــــ

اور پھر میں نے اُسے کیا دیا تھا۔ جس کے صلے میں وہ اپنی جوانی میرے نام پر لگا دیتی۔۔۔۔

اب تو اُس کے بچے بھی ہو چکے ہوں گے۔۔۔۔ اب وہ ایک بھاری بھر کم عورت ہو گی۔

ممکن ہے، وطن واپس جانے کے بعد ــ کبھی۔۔۔ کسی جگہ ــ کسی سڑک پر ۔۔۔ اس سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ اُسے پہچاننے سے صاف انکار کر دے گی اُسے دیکھتے ہی ماتھے پر بل ڈال لے گی۔۔۔ اور بچوں کو تیز تیز قدم چلنے کا حکم دے گی ــــ لیکن خود بھی پیچھے مڑ کر دیکھتی جائے گی ــــ اس کے ماتھے پر بدستور بل پڑے رہیں گے۔ اور جو اُس کا شوہر پوچھ بیٹھے گا۔ کیا بات ہے۔ کیوں اتنے غصّے میں نظر آ رہی ہو ــــ؟ تو کہے گی۔۔۔۔

"دیکھتے نہیں ایک لفنگا ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ جلدی گھر چلو۔" گھر پہنچ کر ــ یونہی ذرا سے قصور پر اپنے بچوں کو پیٹنے لگے گی۔ اور پھر بغیر وجہ کے اپنے کمرے میں گھس جائے گی۔ اندر سے کمرے کی کنڈی لگا لے گی۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔۔۔ اس لئے کہ دل میں ابھی تک پرانی یادوں کا بسیرا ہو گا۔۔۔۔ اور کوسے گی کہ وہ کم بخت اتنے سالوں کے بعد کیوں نظر آ گیا۔ اچھی بھلی زندگی بسر ہو رہی تھی ــــ

یہ ہے ہمارے ملک کی عورت ــــ"

ایسی اور ہزاروں اور سینکڑوں باتیں وہ اس بیڈ روم میں لیٹے لیٹے سوچا کرتا۔ اور ان سوچوں سے تنگ آ کر ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وطن واپس جائے گا۔ اور ضرور جائے گا ــــ

اب اس کے پاس سرمایہ بھی تھا وہ بآسانی جدید ترین پریس کی اعلیٰ ترین مشینری لگا سکتا تھا ــــ پھر یہاں رہ کر اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ ــــ؟

اور آج ــــ چھ ماہ بعد اپنے تمام تر ارادوں اور منصوبوں کے ساتھ وہ جہاز میں بیٹھا وطن کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ گو وہ اپنی عادت کے مطابق ایئر پورٹ ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ اور بڑی عجلت میں جہاز میں سوار ہوا تھا۔ مگر وہ اپنے دل میں بہت خوش تھا اور اب اپنے وطن کے جہاز کو پُر شوق نگاہوں سے بار بار دیکھ رہا تھا ــــ کچھ عرصہ تو وہ کتاب میں مستغرق رہا ــــ پھر خیالوں سے کھیلتا رہا اور اب جہاز کے اندر اِک اِک مسافر کا جائزہ لے رہا تھا۔ آتی جاتی ایئر ہوسٹسوں کو دیکھ رہا تھا ــــ ان کے لباس پر غور کر رہا تھا ــــ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان کو بُلائے ــــ اُن سے ڈھیر ساری باتیں کرے اور اُن سے پوچھے ــــ کہ اُس کی عدم موجودگی میں وطن میں کیا ہوتا رہا ہے۔ سب کچھ اُسے بتایا جائے۔ پَل پَل، دِن دِن کا حساب ــــ لیکن وہ یہ سب کس سے کہے ــــ اور کیسے کہے ــــ؟ لوگ کہیں اُسے اور خبطی نہ سمجھ بیٹھیں ــــ وہ اپنے جذبات دباتا رہا ــــ

لیکن پھر ایک خوش شکل سی ایئر ہوسٹس سے وہ بات کئے بنا نہ رہ سکا ــــ ہم وطن لڑکی سے بات کرنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

لڑکی بھی بہت ذہین اور تیز تھی۔ اُس کی باتوں سے وہ بہت محظوظ ہوا۔

پھر جب وہ کراچی ایئر پورٹ پر اُترا تو اور بھی مسرور ہوا ــــ

اپنے دیس کی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں جب اُس کے سینے سے آکر ٹکرائیں تو اُس کا سینہ اور بھی کشادہ ہو گیا۔

کراچی ——

پیارا کراچی ——

بالکل ویسا ہی تھا ——

مُسکراتا، جگمگاتا —— زندگی سے بھرپور —— رواں دواں اور تیز ——

کتنا اچھا لگ رہا تھا اپنے وطن کی سرزمین پر چلنا ... اپنے لوگوں کو دیکھنا ——

اُن کی زبان سُننا —— اُن کو کام میں مگن دیکھنا ——

وہ اِک اِک شے کو —— اِک اِک آدمی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا ——

وہ لندن میں تو بہت گھبرا رہا تھا کہ وطن میں پہلی تنہا شام کیونکر گزارے گا ——

کیونکہ اب وہاں اس کا کوئی دوست یار تو تھا نہیں ——

مگر یہاں اُترتے ہی اُسے اپنے اندر زندگی کا اتنا بھرپور احساس ہوا کہ وہ شامِ غم بھول گیا۔

وہ یونہی مُسکراتا، دھیرے دھیرے چلتا ہوا جب لاؤنج میں پہنچا تو اُس نے اُسی ایئر ہوسٹس کو وہاں کھڑے پایا۔ ہم وطنی کے احساس سے وہ پھر مغلوب ہو گیا اور یونہی ازراہِ مروت اُس نے اس ایئر ہوسٹس کا نام و پتہ پوچھ لینا چاہا۔

کیا خبر تھی —— ؟ کہ نام و پتہ پوچھ لینے کے جرم میں کاتبِ تقدیر اُس پر ایک اور جال پھینک دے گا۔ اُس نے تو یونہی دو چار روز کی شناسائی مستعار مانگی تھی۔

یونہی اجنبیت کے احساس کو زائل کرنے کے لئے —— ہم وطنی کی آڑ لی تھی

اب اُسے کیا پتہ تھا کہ زندگی بھر کے لئے پاؤں میں ایک زنجیر آ پڑے گی۔ دو قدم ساتھ چلنے کی پاداش میں زندگی بھر کی ہمسفری قبول کرنی پڑے گی —— ایک

اجنبی اور انجانی لڑکی کے ساتھ ——

وہ کسی اور کی کشش میں یہاں تک کھنچا چلا آیا تھا۔

وہ تو غالباً ماضی کے کھنڈروں سے نئے دفینے تلاش کرنے کی دُھن میں تھا۔

اچانک سجو اُس کی راہ میں آن کھڑی ہوئی۔

سجو ایک غم زدہ۔ لیکن انتہائی پُرکشش لڑکی۔ جب اُس نے جھولی پھیلا کر اُس سے اُس کی زندگی کی بھیک مانگی۔ تو وہ انکار ہی نہ کر سکا —— عورت نے دامن پھیلا کر ہو تو مرد انکار نہیں کر سکتا۔

وہ —— کہ اس کا کوئی حال و مستقبل نہ تھا۔ اس عظیم قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔

قدرت پھر اس مہرے کو اپنے اشاروں پر چلا رہی تھی۔ وہ کس طرح ہار جیت کا ل کر سکتا تھا —— ؟

وہ قدرت کی انجانی چالوں کا عادی تھا ——

جو مانگو وہ چُھپا لیتی ہے —— اور جو نہ مانگو وہ جھولی میں ڈال دیتی ہے —— جھولی میں آئی خیرات کو زمین پر پھینک دینا بھی تو ناشکری ہے۔

سجو سے شادی کر لینے کا وعدہ تو اُس نے جذبات میں آ کر کر لیا تھا۔ مگر وہ ساری ں نے سگریٹ پھونک پھونک کر اور سوچ سوچ کر گزاری تھی۔

آیا اس قسم کی شادی کو وہ نباہ بھی سکے گا یا نہیں —— گو اسے یقین تھا کہ اب ے زندگی بھر مُلاقات نہ ہو سکے گی۔ نہ اس کا سامنا ہونے کا ہی امکان تھا —— جانے کیوں اُسے عجیب سا دُکھ ہو رہا تھا۔ جیسے اُس نے ایک خوبصورت اور ن مکان بنا رکھا تھا —— سجا رکھا تھا —— اور ایک مہمان کے انتظار میں آنکھوں روشن کئے بیٹھا تھا۔

اور پھر اچانک ایک مہمان نے دستک دی —— مگر یہ وہ مہمان نہیں تھا جس

کے لئے اُس نے آنکھیں فرش راہ کر رکھی تھیں۔

مگر آئے ہوئے مہمان کو آ کہنا ہی پڑتا ہے۔

اب اس نئے مہمان کو اندر بُلا کر بٹھانا پڑ رہا تھا۔ نہ صرف بٹھانا ہی ——— بلکہ سارا گھر اُسے سونپنا پڑ رہا تھا۔ اور اُسے مالکانہ حقوق سونپتے ہوئے دُکھ بھی ہو رہا تھا تاہم وہ سجّو کے آگے بودا بھی ثابت نہیں ہونا چاہتا تھا ——— صبح تک وہ اپنے ارادے پہ قائم رہا ——— اور اُس کی نو سالہ ریاضت کو سجّو کی التجائیں لے اُڑیں۔ ہاں شادی کے بعد وہ مطمئن سا ہو گیا۔ کہ شاید ایسا ہی ہونا تھا۔

اُس نے سجّو کو بہترین زندگی دینے کا عہد کر لیا تھا۔ اب تک اُس کی زندگی کسی کے کام نہ آئی تھی۔ ایسی بے مصرف زندگی کا کیا فائدہ ؟ اور پھر مرد کو تو شادی کے بعد گھر کا آرام اور بچّوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی عشق و جنون کی کہانیاں اُس کے کیریئر میں دب جاتی ہیں وہ بھی اب بقایا عمر کیریئر کے ساتھ عشق کرنے میں گزارنی چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ سجّو کے ساتھ رہ کر اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو اب منظّم طریقے سے شروع کرے گا۔ اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس لڑکی کا ساتھ دے گا۔ جو اتنی محبت کرنے والی اور مخلص ہے۔

لیکن جب اُس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تو قدرت نے ہمیشہ کے لئے اس لڑکی کو اس سے چھین لیا۔

یہ ایسا اچانک اور جانکاہ صدمہ تھا کہ کئی دِن تک وہ اپنے حواسوں میں نہیں آیا۔ آخر قدرت نے اس سارے کھیل میں اُسے کیوں منتخب کیا تھا۔ کیا وہ دیارِ غیر صرف اِسی کام کی خاطر بُلایا گیا تھا۔ کیا اُس نے اپنی ساری قسمیں اور ضدیں اسی لئے چھوڑ دی تھیں۔ کیا اُس کی زندگی میں اس قسم کے حادثے کی گنجائش تھی۔ ؟ وہ تو پہلے تہی دامن تھا۔ نہ کسی سے کچھ لیتا نہ کسی کو کچھ دیتا تھا۔

جوگی بنا پھرتا تھا۔

بڑا بے نیاز ——— بڑا لا اُبالی ———

پھر اُس نے اپنے آپ سے بغاوت کر کے بہت بڑا قدم اٹھایا اور اپنی زندگی کسی کے نام لگا دی۔

اُس کا کسی کو کیا فائدہ ہوا ——— ؟

بھلا قدرت ایسے مذاق مجبُور انسانوں کے ساتھ کیوں کرتی ہے۔ اگر اُس کی شادی سے نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا۔ تب وہ اس حادثے کا اتنا گہرا اثر نہ لیتا۔ صرف اخبار پڑھ کے ——— اُس کو ذرا سا ملال ہوتا۔ مگر اب ——— وہ کئی دنوں سے گم صُم تھا خاموش تھا ——— اُداس تھا ———

قدرت کو کوس رہا تھا۔

اس ہنگامہ پرور شہر میں اُس کا کوئی غمگسار نہ تھا۔ اور وہ اس شہر کو جلد از جلد چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

مگر اُسے اپنی مشیتری کے لئے رُکنا پڑ رہا تھا۔

جتنے دن بھی وہ وہاں رہا کرب و بلا میں مبتلا رہا۔ اس شعبدہ باز لڑکی کی پرچھائیں سے آ آکر تنگ کرتی رہی۔ اور وہ اپنی جلد بازی پہ پچھتاتا رہا۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ . . . . اُس نے خود کو وقت کے حوالے کر دیا کہ شاید اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہو ——— دامن پہ یہ داغ بھی لگنا مقدر ہو۔

اور اسی طرح اُس کی اُلجھی سنوری حیات سنور جائے۔

حماد کو لاہور آئے ایک سال ہو گیا تھا۔ گویا ایک آوارہ مزاج و بے خاماں راہی نے تنکے جمع کر کے اپنا ایک آشیانہ بنا لیا تھا۔ یعنی

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جس خاک کا وہ ذرہ تھا، اُسی میں آکر مِل گیا تھا۔ اور جس شعلے سے یہ شرارہ پھوٹا تھا۔ پھر اُسی میں ضم ہو گیا تھا۔

اپنا نیا پریس اُس نے سمن آباد میں لگایا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی بڑا خوب صورت ایئر کنڈیشنڈ دفتر بنایا تھا۔

پریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ایک شعبۂ نشر و اشاعت کے لئے مخصوص تھا۔ ساتھ ہی اُس نے نئے طرز کے ایک روز نامے کا اجراء بھی کر دیا تھا۔ جس کے پیٹرن کو خاص و عام نے پسند کیا تھا۔ اور خوب جا رہا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک نیم ادبی، نیم سیاسی ہفت روزہ بھی نکالے۔ کیونکہ کچھ عرصہ بعد وہ باقاعدہ سیاست میں حصہ لینا چاہتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ خواتین کے لئے بھی ایک روزنامہ نکالنا چاہتا تھا جس کے لئے اُسے کچھ خواتین کے تعاون کی ضرورت

اپنی زندگی کی ازسرِ نو تنظیم کر کے گویا وہ خود بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ یعنی یہ اُس کی اپنی زندگی مرادور تھا۔ دو دور جو بیت چکے تھے۔ عارضی تھے۔ اب اُس کا خیال تھا۔ وہ دلجمعی یک ہی جگہ ٹک کر کام کرے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد واضح تھا اور وہ باباجی کے کو پورا کرنا چاہتا تھا۔

یوں ایک مقصد بنا لیا جائے۔ تو زندگی چل ہی پڑتی ہے کہ چلنا زندگی کا کام ہے گی کو لمبے پڑاؤ پسند نہیں۔ پل پل گزرنے کی اطلاع دیتی۔ وہ یونہی بھاگتی چلی جاتی ہے انسان تمام زندگی منصوبوں کی بھول بھلیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ آج یہ یہ توکل وہ ـــــ آج ایک خیال نے دامن پکڑا تو کل دوسرے نے ـــــ

آج اور کل ـــــ

دو فریب ہیں زندگی کے بہت بڑے ـــــ

انہی آج اور کل کی باہوں میں زندگی اٹکی رہتی ہے۔ آج جو اپنی گرفت میں ہے ـــــ اور کل جو بہت بڑی نوید لے کر آنے والا ہے۔

دونوں قریب تر لگتے ہیں ـــــ اپنے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے دونوں ندگی کو جکڑ لیا ہے یہ ہٹ گئی ہے ـــــ ہماری ہو گئی ہے۔

مگر ـــــ

یہ آج اور کل کس قدر چالباز ہیں۔ اس کا پتہ بہت دیر بعد لگتا ہے ـــــ ـــــ وقت کا دریا پوری روانی سے بہہ جاتا ہے ـــــ عمرِ عزیز چہرے م سے منحرف ہونا شروع ہوتی ہے ـــــ تو معلوم ہوتا ہے ـــــ آج ل جو ہمارے جوان اور خوبصورت خیالوں کی نگری میں ٹھہر گئے تھے۔ ساکن ہو تھے۔ بہت ہی تیز رفتار تھے۔

ہاتھوں سے یوں نکلے چلے گئے۔ جیسے چلتے ہوئے فلم کی ریل ـــــ یا اڑتی

ہوتی پتنگ کی ڈور ———
وقت کا ایک ہی تو چلن پیارا ہے ———
کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ ورنہ اس ہرجائی سے لوگ یُوں
خوف کھاتے جیسے ملک الموت سے کھاتے ہیں۔
اپنے وطن میں واپس آنے کے بعد ———
حماد ہمیشہ سے زیادہ تنہائی کا شکار ہوگیا۔
خدا جانے اُس نے لاشعور میں ایسی تمنائیں کیوں چھپا کر رکھ دی تھیں کہ جواب اُسے
ہمیشہ سے زیادہ ستا رہی تھیں۔
وہ تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ عمر کے ایک پختہ دَور میں داخل ہوچکا ہے۔ امنگوں کی
سرکشی ختم ہوچکی ہے۔ شادی کے پُل صراط سے گذر گیا ہے۔
اب تو اُس کی دُلہن، محبوبہ یا جنم جنم کا ساتھی اُس کا کیریئر ہوگا۔ اُس کا مشن ہوگا
آئندہ زندگی کا لائحہ عمل ہوگا۔ مگر اُسے اچانک یُوں محسوس ہوا کہ یہی تو عمر ہوتی ہے۔
جب ایک مستقل ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔
وہ گھر، گھر نہیں لگتا۔ جہاں شام کو کوئی نہیں ملتا ———
رات کتنی بے جان اور سرد ہو جاتی ہے۔ اگر چھوٹے بچّوں کے رونے کی
آوازیں نہ آئیں۔
دیواریں ڈسنے لگتی ہیں۔ اگر مزاج کی برہمی کا سارا غبار شریک سفر پہ نہ نکالا جائے
یوں بیتنے کو زندگی بیت ہی جاتی ہے۔ مگر کس قدر روکھی پھیکی، ویران اور نامانوس
سے الگ ———
یا شاید یہاں اپنے وطن میں آکر وہ ایسی باتیں سوچنے لگا تھا۔
یا پھر اپنے موروثی گھر میں آکر اُس کی بچپن کی خواہشیں جاگ اٹھی تھیں۔ اُس نے
اپنی رہائش کے لئے، دادا جان والی حویلی ٹھیک کرالی تھی ——— اُس کی مرمت کراکے
اُسے جدید طرز پہ آراستہ کر لیا تھا۔ اور اب اس آراستہ اور خوبصورت گھر میں اُس کا جی
نہیں لگتا تھا۔ شام کو جب بھی گھر آتا۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ کبھی تو شام ہوٹلوں میں
گزر جاتی۔ اور کبھی رات گئے تک دفتر سے لوٹتا۔ ———
پہلے پہل جب وہ آیا تو ایسی کیفیت نہ تھی۔
بہت سے کام اُس نے ایک دم سے شروع کر لئے تھے۔ پریس، دفتر کی بلڈنگ
اور گھر کی تعمیر ———
جلد جلد وہ ان کاموں سے فارغ ہوکر۔۔۔۔۔
ہاں مگر ایک دن اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اور وہ اپنی موٹر میں اُڑتا چلا گیا
——— انہی تنگ گلیوں میں جہاں کبھی اس کا دِل سجدہ ریز ہوا تھا۔
جہاں اُس نے زندگی کا عرفان پایا تھا۔
اور پھر ——— اشک ریز آنکھوں سے ——— اپنے دل کی کرچیاں بکھیرتا وہ
چلا آیا تھا ———
آج بھی وہ گلی کوچے اسی طرح آباد تھے ——— انسان، بے شمار انسان، بچّے،
عورتیں، شور و غل۔
سڑکیں ویسی ہی تھیں۔
مگر سب کچھ اُسے کتنا اجنبی لگ رہا تھا ——— یا شاید وہ سب اُسے اجنبی سمجھ
رہے تھے۔
اتنی بڑی موٹر کا گذر بھلا ان تنگ سڑکوں سے کب ہوا تھا۔؟ وہ کس شان
سے چلا رہا تھا۔
جیسے ابھی ———

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کوئی چلمن اُٹھائے گا ـــــ اور بھٹکتے ہوئے راہی کو اپنی چاند سی صورت کی مشعل دکھا کے صحیح راستے پر لے آئے گا۔

وہ گھر ـــــ

کس قدر بدل چکا تھا۔ جہاں کبھی وہ لوگ رہتے تھے۔ شاید اب اس میں دو خاندان بس رہے تھے ـــــ بے شمار بچے ـــــ باہر کھیل رہے تھے ـــــ گندگی کے ڈھیر اور مکھیاں ہر سو نظر آ رہی تھیں ـــــ

وہ موٹر سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور حیرت و حسرت سے اس گھر کو تکنے لگا۔

ایک موٹر والے بابو کو دیکھ کر بچوں نے اُس کے ارد گرد اکٹھے ہونا شروع کر دیا۔

کوئی اپنے گندے ہاتھوں سے اُس کی سفید براق سی موٹر کو چھیڑتا اور کوئی مٹی سے لت پت آ کے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لگ جاتا مگر وہ کھڑا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چلمن نہیں اٹھی تھی۔

اِدھر کوئی دِل نہیں دھڑکا تھا۔

کسی نے چوڑیاں نہیں کھنکھنائی تھیں۔ بیمان کی بجلی کوندی بھی تو کیسے ـــــ؟

کوئی اشارہ ـــــ کوئی کنایہ اس کی رہنمائی نہیں کر رہا تھا۔ عین ممکن ہے اُن میں سے کوئی بچہ منوں کا ہو ـــــ اُس نے چاروں طرف بکھرے ہوئے بچوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

نہیں ـــــ اُس کے دل نے کہا ـــــ

نہیں ـــــ؟

اُس کی شبیہہ تو خود ایک روشنی تھی، جو گندگی میں پڑی دمک رہی تھی۔

اِن بچوں کے چہرے بجھے بجھے اور پژمردہ ہیں۔

پھر ایک دم سامنے کا بوسیدہ پردہ ہٹا ـــــ اُس کا دل حلق تک آ گیا ـــــ

ایک لمبے لمبے دانتوں والی بڑی بی، پان کی پیک اچھالتی اس کی طرف بڑھی ـــــ

"اجنبی دِکھتے ہو بیٹا ـــــ؟ کس کی تلاش ہے؟"

کس کی تلاش ہے ـــــ؟

کس کی تلاش ہے ـــــ؟

اُس نے اپنے دِل سے پوچھا ـــــ اب کس کی تلاش ہے۔ جب منزل کا نام و نشان ہی مِٹ چکا ہو۔ تو پھر آدمی کیسے بتائے کہ کس کی تلاش ہے؟

تلاش زندگی ہے۔ یا زندگی ایک تلاش ہے۔

بھلا یہ جستجو مٹ کیوں نہیں جاتی ـــــ

انسان اس چنگاری کو پہلو میں دباتے، نگر نگر، گلی گلی ـــــ دیوانہ کیوں بنا پھرتا ہے۔

اور جب بڑی بی اُسے کوئی دیوانہ فلمی ہیرو سمجھ کر جانے والی تھیں۔ اُس نے جلدی سے اسمٰعیل کا پتہ بتا دیا۔

"ہم نہیں جانتے۔ ہم سے پہلے تو یہاں سرفراز صاحب رہتے تھے۔"

تو اس سے پہلے کوئی اور ـــــ

پھر اس سے پہلے کوئی اور ـــــ

کتنے زمانے بیت گئے ـــــ مجھے تو کچھ احساس ہی نہیں ـــــ یہیں کل کی بات سمجھ رہا ہوں ـــــ

کل ـــــ

جس کے اُوپر سے کئی سال گزر گئے ہیں۔

سڑک پر تو اب اچھا خاصا ہجوم ہو گیا تھا۔ ہمارے ملک کے لوگ بہت زیادہ ڈرامائی ہیں۔ چھوٹی سی بات سے ڈرامہ پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر اُن کے پاس بے شمار

وقت ہوتا ہے۔ کہ کہیں بھی ضائع کیا جاسکتا ہے۔ ذرا سی سائیکل کی ٹکر ہو جائے یا بڑا حادثہ ـــــ چیونٹیوں کی مانند اِدھر اُدھر سے لوگ آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ حادثے کی وجہ سے نہیں۔ لوگوں کی وجہ سے ٹریفک رُک جاتی ہے۔

اب صرف یہ کہ ـــــ اس میلی کچیلی بستی میں حماد ذرا صاف ستھرا اور اُجلا دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی سی کار اُس کے پاس کھڑی تھی اور وہ اپنی مایوس نگاہوں سے جانے ان گلی کوچوں سے کیا پوچھ رہا تھا۔

مارے تجسّس کے اس کے اردگرد لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کی ابتدا بچوں نے کی۔

بڑھتے ہوئے ہجوم سے حماد گھبرانے لگا تھا۔ جو بھی آتا یہی پوچھتا۔ کس سے ملنا ہے آپ کو ـــــ؟

کس کا گھر ڈھونڈھ رہے ہیں ـــــ؟

اسمٰعیل کو یہاں سب لوگ بھول چکے تھے۔ یا شاید وہ ان بچّوں کے جوان ہونے سے پہلے کہیں چلا گیا تھا۔

مگر کہاں ـــــ؟

وہ مایوسی سے قدم اُٹھاتا موٹر کی طرف جارہا تھا۔ جب ایک سائیکل سوار نے رُک کر استفسار کیا۔

اسمٰعیل کا نام سُن کر وہ رُک گیا۔ اور بولا۔

"وہ جو کسی زمانے میں ریلوے میں ٹی ٹی تھے؟"

"جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔" حماد کی ذرا ہمّت بندھی۔

"لمبے سے تھے، خوبصورت سے تھے۔ دُبلے پتلے تھے۔"

"جی ۔۔۔ جی بالکل ـــــ"

حماد کو اس وضاحت کی بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا نووارد جلدی سے ن کا پتہ بتادے۔

"وہ تو جی کب سے چلے گئے ـــــ"

"کہاں ـــــ؟"

"جی انہوں نے ریلوے کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اور سُنا تھا ملک سے باہر کہیں چلے گئے ہیں۔"

"اوہ ـــــ" حماد کا دِل ڈوب گیا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمّت کرکے ایک اور وال پوچھ ڈالا۔

"اور اُن کے گھر والے ۔۔۔؟"

"گھر والے ـــــ" نووارد سر کھجانے لگا ـــــ پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بولا۔

"جی اُن کے سب گھر والے بھی اُن کے ساتھ چلے گئے تھے۔"

"کتنا عرصہ ہوا ـــــ؟"

"یہی کوئی آٹھ نو سال ہوتے ہوں گے۔"

"آٹھ نو سال ـــــ اُس نے دِل میں سوچا ـــــ سو وہ بھی وطن کو خیرباد ہ گئے ۔۔۔۔

"مگر کیا آپ نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں؟"

"جی ۔ میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تب میں کچھ اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ ایسی باتیں د رکھتا یا کسی سے پوچھتا۔ مجھے شاید کہیں سے پتہ چلا تھا کہ وہ غالباً کسی عرب ملک ں چلے گئے تھے۔"

"کیا محلے میں کوئی اور اُن کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟" حماد نے پھر اپنی مایوسی کو ایک مارا دیا۔

نووارد لڑکا کچھ دیر تک آنکھیں گھماتا رہا۔ اور پھر بولا ——

میرے خیال میں تو اُن کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ دراصل جی پُرانے محلّے والے بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ نئے لوگ ایک دوسرے کی خبر نہیں رکھتے۔ مَیں خود اب اس کالونی میں نہیں رہتا۔ مغل پورے چلا گیا ہوں۔ اور آج تو اتفاق سے اپنے ایک دوست سے ملنے آگیا تھا۔"

اس کے بعد سب لوگ حماد کے مایوس چہرے اور قیمتی کپڑوں کو دیکھنے لگے۔

اُس نے سوگواری کے عالم میں قدم اٹھائے اور اپنی موٹر کی طرف بڑھا۔

اتنے میں ہی بچّوں نے اپنے گندے ہاتھوں سے اُس کی سفید موٹر پر کائی گُل بوٹے بنا دیئے تھے۔

جب وہ بیٹھ گیا۔ تو بہت سے بچّے مل کر اُس کی موٹر کو دھکا دینے کی کوشش کرنے لگے۔

بڑی احتیاط سے حماد نے موٹر اسٹارٹ کی تاکہ کوئی بچّہ نیچے نہ آجائے اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا ریلوے کالونی سے باہر نکل آیا۔

سو وہ آخری آس، جو اُس کے لاشعور نے اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔

وہ اس شہر میں ہوتی —— کسی بھی حال میں ہوتی —— وہ اس کو ڈھونڈ نکالتا —— اپنے دل کے سو بار منع کرنے کے باوجود ایک بار ضرور اقبالِ جرم کرنے اُس کے سامنے چلا جاتا —— کچھ تو ہوتا —— !

مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا!

جانے کن حالات میں اسمٰعیل جیسا سیدھا سبھاؤ کا آدمی ملک چھوڑنے پر مجبُور ہو گیا ہو گا۔

ضرور حالات ابتر ہو گئے ہوں گے۔

ضرور کچھ انہونی ہو گئی ہو گی۔

خُدا جانے آمنہ کی وجہ سے مجبُور ہو گئے ہوں۔ یا آمنہ ہی مجبُور کر کے انہیں اس ل سے لے گئی ہو۔

وہ تو خاک چھان کے —— صبح کا بھُولا بنا —— شام کو گھر آگیا۔

مگر گھر والے ہی نہ رہے ——

گھر کا دروازہ ہی مقفّل ہو گیا۔

مگر اس گھر کا دروازہ کس آس پر کھُلا رہتا۔ دیا کون روشن رکھتا۔

وہ تو کسی کے ساتھ بھی واپس آنے کا وچن کر کے نہیں گیا تھا ——

حتیٰ کہ جس کو اُس نے اپنا دین و ایمان سمجھا تھا —— اُس کے آنچل پر آخری سجدہ ی نہیں کیا تھا۔

کیا وہ ان لوگوں کو منہ دِکھانے کے قابل تھا —— اپنے اعمال کی سزا میں ُس نے آمنہ کو بھی شامل کر لیا تھا —— اس کا قصور کیا تھا ——

بے وقوف لڑکیوں کی طرح اپنی پہلی محبّت اُس نے حماد پر لٹا دی تھی۔ نچھاور ردی تھی۔

پھر کتنا طویل عرصہ گزر گیا۔

دس سال ——

دس سال میں تو دُنیا بدل جاتی ہے۔

خصُوصاً ایک عورت کی دنیا ——

ممکن ہے اسمٰعیل نے اُسے کسی باہر کے ملک میں بیاہ دیا ہو۔ یہاں اُس نے ناپسند نہ کیا ہو؟ اپنی سیاحت کے دوران وہ عرب ممالک میں بھی جاتا رہا تھا۔ کاش

قدرت اتنی مہربان ہوتی کہ کہیں بھی —— کسی جگہ بھی اُس کی ایک جھلک بھی دکھا دیتی۔
وہ اب کیسی ہو گئی ہو گی۔
اُسے دیکھنے کے لئے اُس کا جی مچلنے لگا۔
وہ اُس کے حافظے میں اسی طرح محفوظ تھی، نِکھری نِکھری —— معصُوم اور مُقدّس
چمپا کی کلی!
وقت اور زمانہ انسان پر تو اپنا اثر کرتا ہے۔ مگر ذہن میں جو یادیں۔ یا تصویریں
ہوتی ہیں۔ انہیں کیوں اسی طرح چھوڑ دیتا ہے —— نہ وہ یاد مٹتی ہے ——
نہ وہ تصویر بگڑتی ہے۔
اس شب وہ یونہی سڑکوں پہ مارا مارا پھرتا رہا —— بے تحاشا سگریٹ پیتا رہا۔
عرصۂ دراز کے بعد —— ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا رہا۔ اور یادوں کے سیلنے کھرچتا رہا۔
رات گئے جب گھر آیا تو کافی مضمحل تھا۔
یہ عمر کا دور بھی عجیب ہے اُس نے سوچا ——
اس عمر میں اگر تنہائی مقدّر بن جائے تو آدمی صرف موت کے بارے میں سوچتا ہے
بال بچے نہ ہوں۔ تو آگے کیا رہے۔؟
یہ سب ٹھاٹھ باٹھ —— روپیہ پیسہ —— کرّوفر —— ایک تنہا آدمی کو تو
ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔
ہوں۔
تو شادی کے لئے تم راہ ہموار کر رہے ہو!
شادی!
وہ اپنے پہ خود ہی ہنسا ——
شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آدمی کے پاس دولت ہو تو وہ شادی کسی عمر میں

ہو سکتا ہے۔
مسئلہ یہ ہے کہ انہونی، انہونی ہی رہی ——
برخوردار حماد احمد —— تُو نے تو من ہی من میں یہ سوچ رکھا تھا —— کہ تیری
جوگن بن کے اس نے بن باس لے لیا ہوگا۔
تیرے نام کی مالا جپتی —— چمٹا بجاتی —— در در پہ تیرے درشن کی بھیک
ی پھر رہی ہوگی۔
تو جائے گا تو تجھے دیکھتے ہی تیرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گی۔ ہاں
ت کی ریت تو یہ ہے ——
مگر ایک رسمِ وفا بھی ہے۔
جھوٹا ہی سہی تو اُسے کوئی آسرا تو دے گیا ہوتا —— کوئی اُمید بخش گیا ہوتا ——
بزدلوں کی طرح خود بھاگ نکلا —— جا کر ایک خط بھی نہ لکھا ——
اور اب کس حوصلے سے محبت کے مزار پہ پھول چڑھانے آگیا ہے؟
اور اب سارا الزام اُس کو دے کے دِل کا غبار نکالنا چاہتا ہے۔
نہیں نہیں ——؟
حماد نے تڑپ کر اپنے بستر پہ کروٹ لی۔
ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ قصوروار میں ہوں۔ مجرم میں ہوں —— مگر
ں آکر مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں ساری زندگی اسی کے عشق میں مبتلا رہا ہوں۔
اسی کو کھوجتا پھرا ہوں۔
اسی کو مرکز بنا کر زندگی کا ہر مقصد حاصل کرتا رہا ہوں۔
اب یہاں پاکستان میں آگیا ہوں۔
تو اُس کے لئے اور بھی بیکل ہو گیا ہوں۔

جب سے پتہ چلا ہے کہ وہ مجھ سے دُور ہو گئی ہے۔ اُس کا دیکھنا تک ایک ناممکن سی بات بن گئی ہے تو درد کی شدّت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

مَیں کوئی جذباتی سا لڑکا نہیں ہوں۔

شادی بھی کہیں ہو سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جو اچانک سُرخ سُرخ آندھی اُٹھ رہی ہے تو کیوں ——؟

محبّت یک طرفہ عمل نہیں ہوتی۔

اُس نے اگر کہیں بھی میری محبّت کا چراغ نہیں جلا رکھا —— تو مجھے تپش کیوں محسوس ہو رہی ہے ——!

وہ کہیں قریب نہیں۔ تو اُس کی آنچ سے دل کیوں پگھلا جا رہا ہے۔ محبّت اگر وقت کی تہوں تلے دب جاتی ہے تو پھر پہلو میں پرانی یادوں کی چنگاری کیوں دہک رہی ہے۔

وہ کہیں نہیں ہے۔ تو نگاہ اُس کی متمنّی کیوں رہتی ہے۔

وہ کسی کی ہو چکی ہے تو اس سے ملنے کی آس مِٹ کیوں نہیں جاتی۔

وہ مجھے بھول چکی ہے۔ تو میں اپنی زندگی میں مگن کیوں نہیں ہو جاتا۔

حماد میاں! بات صرف اتنی ہے کہ مرد انتہائی خُود پسند اور خُود غرض ہوتا ہے۔

وہ جس عورت سے عشق کرتا ہے۔ اُسے حاصل کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیّتیں صرف کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اُسے نہ مل سکے، مقدّر یا زمانہ راہ میں حائل ہو جائے۔ تو وہ چاہتا ہے۔ عورت اس کی خاطر اپنی زندگی ختم کر دے۔

اس کے انتظار میں فنا ہو جائے۔

یا اُس کے فراق میں جان سے گذر جائے۔

اُس کی انا کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہوتا ہے۔

عورت کی سب سے بڑی قربانی جو مرد کو سب سے زیادہ پسند آتی ہے۔ وہ یہی ہے —— جان سے گذرنا —— اپنی زندگی اُس پر وار دینا۔

اور تمہیں آج یہی خلش چین نہیں لینے دیتی۔ کہ اُس نے تمہارے علاوہ کسی اور سے بیاہ رچا لیا ہے۔ دُنیا کے کسی حصّے میں بس رہی ہے۔ اور حالات سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔

سچ کہو۔ اگر آج تمہیں اس خبر کی بجائے اُس کی موت کی خبر ملتی تو کیا تمہارا یہ حال ہوتا؟ کم از کم یہ اطمینان ضرور ہوتا کہ وہ تمہارے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکی۔ باقی قیامت میں ملنے نہ ملنے کی باتیں تو محض خیال آرائیاں ہیں۔ قیامت کو کس نے دیکھا ہے ——؟

اُف میرے خدا!

خیالات کی عجیب و غریب قسم کی یورش سے حماد تنگ آ گیا تھا۔

کبھی واہموں کی یلغار کبھی سرزنش کی پھٹکار ——

مجبور ہو کر اُس نے اپنی دراز میں سے نیند کی ایک گولی نکالی۔ پانی کے ساتھ اُسے نگلا اور لیمپ بجھا کر سو گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انسان بڑی خوبصورت شے ہے، تڑپتا ہے، مچلتا ہے، بھڑکتا ہے ـــــ مگر اپنے بہلنے کا سامان بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اُسے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے اتنی بے شمار صلاحیتیں عطا کی ہیں کہ وہ زندگی کو مفلوج کرنے کی بجائے ہر بار اُسے از سرِ نو منظم کر کے جدوجہد کی طرف رواں ہو جاتا ہے۔

تھوڑے دن پرانی آگ کے شعلوں میں جھلس کر حماد کو جیسے قرار سا آ گیا تھا۔

اور وہ کیا کرتا ـــــ؟

وہ تو ہمیشہ سے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرتا آیا تھا۔

بہت سے کام ابھی کرنے والے تھے۔

پریس لگ چکا تھا۔

دفتر کی بلڈنگ بھی مکمل ہو گئی تھی۔

اُس نے اللہ کا نام لے کر ملازمین کی بھرتی شروع کر دی۔

اپنے پرنٹنگ پریس کا نام اُس نے "امین پرنٹنگ پریس" رکھا۔

نہ جانے کیوں جب بھی وہ اپنے پریس میں جایا کرتا۔ اسے منوں بہت یاد آتی۔ منوں جو اُس کے زندگی کے منصوبوں میں برابر کی شریک تھی۔ اور ہمیشہ اُسے کہا کرتی تھی کہ وہ ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹائے گی۔

اب واقعی اُسے منوں کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے رسالے کو سنبھالنے کیلئے۔ مگر منوں! تو نہ جانے کہاں خواب و خیال ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ منوں کے نام لگا دے۔ اُس نے آج تک اُسے کچھ نہیں دیا تھا۔ سوائے پریشانیوں کے ـــــ اس لئے وہ اپنی ہر شے پر اُس کی گہری چھاپ دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر وہ آمنہ کے نام کو اشتہار بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے لفظوں کے ہیر پھیر سے کام لیا۔ اور "امین" پرنٹنگ پریس کے نام سے اپنا کام شروع کر دیا۔ اُس کے روزنامے کا نام "ندا" تھا۔

اخبار نکالنے کے بعد تو واقعی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اُسے دن رات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

لگن کی شمع من میں جل رہی ہو تو پھر آدمی کبھی نہیں تھکتا۔

جس جگہ حماد نے اپنا پریس لگایا تھا۔ اسی سڑک پر ایک بڑا سا گراؤنڈ چھوڑ کے، لڑکیوں کا ایک کالج اور ایک ہائی سکول بھی تھا اور جہاں یہ سڑک ختم ہو کے مڑتی تھی۔ وہاں پہ ایک بس اسٹاپ تھا۔ جہاں اکثر اوقات اسکول اور کالج کی لڑکیوں کا ہجوم ہوتا۔ خصوصاً صبح کے وقت اور دوپہر کے بعد ـــــ

حماد جب کبھی دوپہر کے وقت اپنے دفتر سے اپنی لمبی سی کار میں نکلتا تو اُسے یہاں بے شمار لڑکیاں بس پہ چڑھتی یا بس سے اُترتی نظر آتیں۔ یہ ایک معمول سا بن گیا تھا۔

پہلے پہل تو وہاں سے گزرتے ہوئے وہ ارد گرد پہ غور ہی نہیں کرتا تھا۔ مگر

کچھ دن سے . . . جب سے اس نے اِردگرد کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ اُسے احساس ہوا تھا کہ چھٹی کے وقت کتی اور لڑکیوں کے ہمراہ یہاں پہ ایک عجیبُ غریب لڑکی نظر آتی تھی۔ عجیب وغریب اس لئے کہ وہ ہمیشہ سب لڑکیوں سے الگ ہٹ کے درخت کے تنے کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوتی اور سامنے اس نے ایک کتاب کھول رکھی ہوتی۔ جیسے کہ وہ اس وقت بھی مطالعے میں غرق ہے . . . .

کبھی کبھی وہ بس اسٹاپ پر تنہا بھی ہوتی۔ مگر اسی انداز میں کہ اُس کا ریشمی دوپٹہ اُس کے سر اور گردن کو اچھی طرح ڈھانپے ہوتا۔ بڑا سا چرمی بیگ بغل میں لٹک رہا ہوتا۔ آنکھوں پہ بڑے بڑے شیشوں کی کالی عینک ہوتی . . . اور اپنی کتاب کھولے . . . مطالعے میں مگن ہوتی۔ جب کوئی بس آکر اسٹاپ پہ رُکتی تو وہ ذرا کی ذرا مڑ کر اُس کا نمبر دیکھتی اور پھر سڑک کی جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی۔

کبھی کبھی دوپٹے اور گوگل کی اوٹ سے اس کی ہلکی سی جھلک نظر آتی۔

یونہی وہاں سے گذرتے ہوئے۔ حماد کی نظر اس لڑکی پہ پڑ جاتی۔ . . . پھر ہر آدمی کی طرح اس کا دل چاہتا۔ ذرا سا آگے جا کر اس کا چہرہ دیکھ لے ——

اونہہ —— پھر دل ہی دل میں سوچتا۔ بعض لوگ محض اپنی انفرادیت کی وجہ سے دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اب اس لڑکی کو دیکھو —— معلوم لڑکی ہے

یا عورت ——

کبھی کبھی اُس نے پرنٹڈ سوٹ پہنا ہوتا —— اُونچی سی تنگ قمیض میں پیچھے سے اس کا جسم بڑا بھلا لگتا۔ مگر ہمیشہ سڑک کی جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہوتی۔ تاکہ ہر راہگیر کا دِل مچلے —— اور خواہ مخواہ آگے بڑھ کر اسے دیکھنا چاہے۔ ممکن ہے اُس کی صورت میں ہی کوئی نقص ہو۔ آنکھیں بھینگی ہوں —— دانت نکلے ہوتے ہوں —— یا چہرے پہ بدنُما داغ ہوں۔ مگر عورتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ چہرہ ساتھ نہ دے رہا ہو تو

ہم کو ایسے زاویئے پر رکھتی ہیں کہ راہ چلتے ہوتے ہر مرد کی نگاہ جسم سے اُلجھے۔ اور پھر خود بھی اُلجھ کر اُن کے گرد منڈلاتا رہے۔

بڑا گھاگ آدمی تھا حماد —— مگر پھر بھی جب وہ وہاں سے گزرتا —— اور دیکھتا کہ وہی اسٹائلش لڑکی تنہا کھڑی ہے تو پاس سے گزرتے ہوئے یونہی اپنی کار کا ہارن بڑے زور سے بجاتا تاکہ وہ چونک کر پیچھے دیکھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی یوں معلوم دیتا کہ اُس نے یا تو ہارن سُنا ہی نہیں۔ اور اگر سُنا ہے تو اس طرح کہ ہارن کا بجنا بھی اُس کے لئے ایک معمول بن چکا ہے۔

"ممکن ہے بچاری بہری بھی ہو" وہ دل میں سوچتا۔ کیوں میاں کچھ گھاس کھا گئے ہو! پھر خود ہی کہتا۔ کیا پھر کوئی نیا معاشقہ لڑانے کا ارادہ ہے۔ سُکھ چین کی روٹی ہضم ہوتی نہیں —— ذرا اپنی عمر تو دیکھو۔ چالیس کے ہوا چاہتے ہو۔ یہ عمر تو پیغمبری ملنے کی ہوتی ہے۔

بھئی عمر کا کیا ہے ——؟

یہ کمبخت تو ایسے ہی بیت جاتی ہے —— ارمان پُورے ہوتے نہیں —— حسرتیں بر آتیں نہیں۔ ابھی ہم یہ وہ کرنے کی سوچ رہے ہوتے ہیں۔ کہ یہ ڈھل دینا شروع کر دیتی ہے۔

پھر میں کون سا شادی شُدہ ہوں۔ یوں اس جُرم میں شامل ہوا تو تھا۔ پھر انگلی کٹانے سے کوئی شہید تو نہیں کہلا سکتا۔ پھر وہی تنہا کا تنہا —— اور کنوارا کا کنوارا ہوں —— اس لحاظ سے مجھے ہر نوجوان عورت کو دیکھنے کا حق پہنچتا ہے۔ رہا معاشقہ تو اس کی واقعی سکت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اب وقت اجازت دیتا ہے۔

اب کسی مرد سے یہ توقع رکھی جائے کہ عمر کے کسی دور میں وہ عورت کی طرف دیکھنا بند کر دے۔ یا جوان عورتوں میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔

پر نہ جانے کیوں۔ یہ لڑکی میرے جیسے منتقی کی بھی توجّہ خود بخود کھینچتی ہے۔

بن رہی ہے کم بخت ——— یہ بھی کوئی ادا ہے۔ کہ میں ایک عرصے سے اسی رستے سے آ جا رہا ہوں۔ بلکہ اب جان بُوجھ کر اسی راستے سے، اسی وقت نکلتا ہوں۔ مگر کبھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔

ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ حماد ابھی اپنے دفتر سے نکل کر سڑک کے قریب ہی آیا تھا کہ سامنے سے اومنی بس آگئی وہ دل میں خوش ہوا۔ موٹر کو تیز کیا۔ لڑکی نے بس کی آواز پہ مڑ کے اُدھر دیکھا۔ اور پیشتر اس کے کہ حماد اُسے قریب آکر دیکھتا اُس کے اور لڑکی کے درمیان بس حائل ہوگئی۔

اور جب مطلع چھٹا تو بس اُسے نگل کر جا چکی تھی۔ درخت اُداس اور تنہا ہوگیا تھا۔ بس اسٹاپ اُجڑا اُجڑا لگ رہا تھا۔

یار یہ کیا ہوگیا ——— ؟

حماد کو بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ یک لخت اُس کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوگئی کہ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔ اور حواس بھی معطّل ہو رہے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے یار ——— ؟

اُس نے پھر خود کو جھنجوڑا ——— اس ایک ذراسی جھلک نے اس کو مجبور کر دیا کہ اس لڑکی کی مکمّل جھلک دیکھ لے۔

اگلے دن وہ ایک کامیاب منصوبہ بنا کر گھر سے نکلا۔ دفتر میں بیٹھا ہوائی قلعے بناتا رہا۔ لیکن جب باہر نکلا تو بس اسٹاپ پر وہ لڑکی نظر نہ آئی ——— اس کے بعد پورا ایک ہفتہ وہ لڑکی دکھائی نہ دی۔ حماد کو اپنے پر غصّہ آیا۔

اگر وہ چاہتا تو کالج کے قریب رہ کر اُسے غور سے دیکھ سکتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک بس اسٹاپ کے آس پاس منڈلاتا رہتا تو کسی لمحے اُسے چڑھتے یا اُترتے ہوئے

دیکھ سکتا تھا۔

لیکن پھر اُس نے خود ہی زیادہ دلچسپی لینی مناسب نہ سمجھی۔ دفتر میں انہی دنوں نئی بھرتی شروع ہوگئی۔ وہ اس میں اتنا مصروف ہوا کہ باہر کی دنیا کی ساری باتیں بھول گیا۔ بعض اوقات وہ دفتری کاموں میں اس قدر مصروف ہوتا کہ رات نو دس بجے گھر جانے کے لئے نکلتا۔

یونہی ایک مہینہ بیت گیا۔ وہ لڑکی بھی اُس کے ذہن سے نکل گئی۔ اور اُس کا واہمہ بھی۔

ایک دن پھر۔ دوپہر کے وقت وہ گھر جا رہا تھا۔ کہ موڑ پر اچانک وہی لڑکی۔ اسی انداز کے ساتھ کھڑی نظر آگئی۔ اُس نے نادانستہ طور پر زور سے ہارن بجایا۔ لڑکی کے ہاتھ سے کتاب گر گئی۔ یا شاید اتفاقیہ گر گئی۔ لڑکی نے کتاب اٹھاتے وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حماد اُسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں کی ہوس ابھی نہ مٹی تھی کہ اس کے دل میں عجیب سا طوفان اُٹھا۔

اُس نے سڑک کے ایک طرف کار کھڑی کی اور ابھی اُترنے کے لئے دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دُوسری طرف سے بس آگئی۔ لڑکی نے حماد کو دروازہ کھول کر اُترتے ہوئے دیکھا اور نظر بھر کر دیکھا۔ پھر نہ جانے کس خوف سے ابھی بس ٹھیک طرح رُکی بھی نہ تھی کہ وہ دوڑ کر اُس میں چڑھ گئی۔ حماد حیران و پریشان اپنی جگہ پہ کھڑا رہ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے کوٹ کے کالر پکڑ رکھے تھے۔ اور پھٹی آنکھوں سے بس کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر لڑکی کھو گئی تھی۔

حماد کو یُوں محسوس ہوا کہ بس کے سبھی مُسافر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر طنزیہ ہنس رہے ہیں۔ اُسے ایک پیشہ ور لفنگا سمجھ کر اُس کے ٹھٹھے اُڑا رہے ہیں۔ . . . حماد کا دل چاہا وہ آج اس بس کا پیچھا کرے اور جب لڑکی بس سے اُترے تو قریب جا کر اُسے غور سے دیکھے۔

مگر دوسرے لمحے اسے یہ حرکت بڑی بُری لگی۔ اس حرکت کو کوئی بھی شریفانہ حرکت نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور ہو سکتا ہے وہ لڑکی بھی اُسے کوئی اوباش آدمی سمجھ کر شور مچا دے۔

جبکہ بس والوں نے بھی اسے بس کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

حماد نے اُس کے پیچھے جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور گھر کی طرف چل پڑا۔

پر نہ جانے کیوں۔ شام تک اس لڑکی کے خیال نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک عجیب سی بے کلی اور تجسس نے اُس کا جینا حرام کر دیا۔

یہ کیسا تجسس تھا کہ جس کی پیاس وہ نہ بجھانا چاہتا تھا۔ اور جس کی کسک بھی وہ نہ مٹانا چاہتا تھا۔ کبھی جی چاہتا آگے بڑھ کر اُس کا نقاب چاک کر دے ـــــ اور کبھی جی چاہتا تھا۔ نقاب پڑا رہنے دے

اَن دیکھی، اَن جانی چیزوں میں بڑا حُسن ہوتا ہے۔ تجسس مِٹ گیا ـــــ تشنگی ختم ہوگئی تو انتظار کا الاؤ بھی بجھ جائے گا ـــــ

اس عمر میں صرف فریب سے آنکھ مچولی کھیلی جائے ـــــ لیکن اس آنکھ مچولی سے تو پیاس اور بھی بڑھ جائے گی۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا۔ کہ وہ لڑکی پھر تنہا نظر آگئی۔ اور ایک لمحے میں حماد وہی پُرانا اور جیالا حماد بن گیا۔ اُس نے آواز پیدا کئے بغیر کار چلائی اور آہستہ سے اُس لڑکی کے قریب کھڑی کر دی۔ اور دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکلا۔ اسی وقت اپنے پیچھے خطرہ محسوس کر کے لڑکی پوری طرح گھوم گئی۔ صرف گھومی ہی نہیں اُس نے اپنی آنکھوں سے عینک بھی اُتار دی۔

"معاف کیجئے۔ ہے تو بڑی غیر شریفانہ حرکت۔ مگر میں ایک عجیب اُلجھن میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ....."

مگر جب اُس نے بات پوری کرنے سے پیشتر گھبرائی ہوئی لڑکی کی صُورت غور سے دیکھی تو جہاں کھڑا تھا بت بن گیا۔ مزید ایک لفظ اُس کی زبان سے نہیں نکلا۔

لڑکی کا چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور قوتِ گویائی جیسے

سلب ہو چکی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پاگلوں کی طرح مگر بے یقینی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا۔ جیسے لڑکی گر جائے گی۔ اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔

"مجھے..... مجھے..... چکر آ رہے ہیں..... میں گر جاؤں گی۔" لڑکی نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کہیں بٹھا دیجئے۔"

"کار میں بٹھا دوں ـــــ" حماد نے جلدی سے آگے آکر کہا۔

"پیچھے ـــــ!" پیشتر اس کے کہ وہ لڑکھڑاتی حماد نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے بازو سے پکڑا اور پچھلا دروازہ کھول کر سیٹ پر ڈال دیا۔

وہ منہ کے بل سیٹ پر گر گئی۔

اُس نے پچھلا دروازہ احتیاط سے بند کیا۔ اگلی طرف آ کے خود بیٹھا اور پھر حواس مجتمع کر کے سڑک کے چاروں طرف دیکھا۔ آیا اس کی اِس حرکت کو کسی نے دیکھا تو نہیں۔ لیکن شکر ہے خُدا کا اس وقت سڑک سنسان پڑی تھی۔ دُور دُور لوگ نظر آ رہے تھے۔ قریب کوئی نہ تھا۔

خداوندا!

خداوندا!

خداوندا!

اُس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اور دل پھٹنے کو بے قرار تھا۔ اور لب پھڑک رہے تھے۔ اتنے ڈھیر سارے سوال۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں ـــــ اتنی پامال شدہ خوشیاں۔

ایسا عجیب سنگھم ـــــ

زندگی کا سب سے بڑا سنگھم ـــــ

اب کون سا موڑ شروع ہوگا۔

کار ایک خاموش۔ تنہا اور ٹھنڈی سڑک کی جانب آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

آج اُس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ کار تیز نہیں چلا سکتا تھا ـــــ

تھوڑی دُور جانے پر اور ٹھنڈی ہوا لگنے سے لڑکی خود بخود ہوش میں آ گئی۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ رُومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔ بال درست کئے۔ اور اپنے ہوش بجا کئے ... تو حماد نے ایک جانب درختوں کے جھنڈ کے پاس کار روک دی۔

اور اپنا منہ پیچھے کی جانب موڑ لیا۔

لڑکی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہونٹ نیلے تھے مگر لرز رہے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ ایک نظر بھر کر اس آدمی کو پھر دیکھے۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے اپنی پلکیں اٹھانی شروع کیں ... حماد اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے چہرے تک نظریں لانے کے بجائے وہ راہ ہی پلٹ گئیں۔

دیکھو ـــ ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھو ـــ میں تمہارے تصوّر کا ہیولہ نہیں ہوں .... آج جیتا جاگتا ـــ تمہارے سامنے ہوں۔ مجھے چھُو کر دیکھو ـــ ....

حماد نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے پھیلا دیئے .... اُس کے مضبوط اور خوبصورت ہاتھ ... جن پر زمانے کی سختی کے نشان تھے اُس کے آگے پھیلے ہوئے تھے .....

اُس کی خوبصورت، رَس گھولتی، محبت میں ڈوبی آواز اُس کے کانوں میں آ رہی تھی .....

وہ اُسے چھو کر دیکھے ... وہ اُسے جھنجھوڑ کر دیکھے ... وہ اپنی آنکھوں سے اُس کا ایک ایک نقش دل میں اتارے ـــ یا اسے ٹھوکر مار کر اس موٹر سے اُتر جائے

شدّت جذبات سے وہ رونے لگی ـــ روتے گئی ـــ آنسو شدّت سے بہنے لگے ... حماد اُسے خاموشی سے دیکھنے لگا۔ جب جذبات میں طغیانی آتی ہے تو آنسو ہی اظہار کا وسیلہ بنتے ہیں۔ خود حماد کی اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ

بہت عرصہ بعد ـــ

آج اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی روئے ـــ بہت زیادہ روئے ـــ اس لڑکی کو

ے سے لگا لے ـــ یہ لڑکی جو اب اُس کے لئے بالکل اجنبی تھی۔؟

یہ اُس کی کیا ہوتی تھی ـــ ؟

کیا لگتی تھی ـــ ؟

جو اُسے دیکھتے ہی اس کے کندھے کے ساتھ لگ کر رونے کو جی چاہنے لگا ہے۔

اُس کے اپنے آنسو بھی ٹپ ٹپ بہتے رہے ـــ ....

پھر تھوڑی دیر بعد جب جی ہلکا ہوا تو اُس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اور بڑی بوجھل آواز میں بولا۔

"منوں! میں معجزوں کا اس سے پہلے اس طرح قائل نہ تھا ـــ"

مجھے کبھی اُمید نہ تھی تو اس طرح سرِ راہ مل جاتے گی۔ تمہارے اور میرے درمیان ت کے طویل فاصلے ہیں ....

منوں! میں نے جب پہلے دن تمہیں بس اسٹاپ پر اس انداز میں کھڑے دیکھا۔ را دل تمہاری طرف کھنچنا شروع ہوا۔ میں اُسے صرف مرد کی ایک جبلّت سمجھ کر ٹالتا کرتا رہا ... مگر آج ... آج میں مان گیا۔ محبت کی کشش کے آگے مہینے، سال، صدیاں کچھ نہیں ہوتے۔

تیری کشش نے مجھے کھینچ لیا۔ میں مجبور ہو گیا کہ تمہیں ڈھونڈوں ـــ تمہیں وں ـــ تمہیں پاؤں ـــ تم جو میری راہ میں کھڑی تھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا را دل تمہارے قدموں کی آہٹ نہ سُن پاتا ـــ تم زمانے سے کتنا بھی منہ پھیر کھڑی ہوتیں ـــ ... مجھ سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھیں۔ آج زندگی کا کتنا ورت اور انوکھا دن ہے ـــ

آمنہ کافی رو چکی تھی ـــ اُس نے رومال سے اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ مگر وہ بولنے کے قابل بالکل نہیں ہو سکی اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُس

کے گلے میں کوئی شے اٹک گئی ہے۔اُس نے اپنی سوجھی سوجھی آنکھیں اُٹھا کر پہلی بار حماد کی جانب دیکھا ——

حماد نے آنکھیں بند کر کے اپنا چہرہ اپنی سیٹ کی پُشت پر رکھ دیا۔

آمنہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔

وقت نے اُس پر بھی اپنا اثر چھوڑا تھا ——

وہ شوخ و شنگ مستی لٹانے والی آنکھیں کتنی سنجیدہ ہو گئی تھیں۔رنگ بچّا سانولا ہو گیا تھا۔آنکھوں کے گرد باریک باریک لائنیں اُبھر آئی تھیں۔کنپٹیوں پر بال سفید ہو گئے تھے —— ایک لا اُبالی لڑکے کی بجائے وہ بھرے بھرے جسم والا پختہ مرد دکھائی دیتا تھا۔اُس کے ہاتھ —— جنہیں وہ بہت پسند کرتی تھی' اب اور بھی خوبصورت ہو گئے تھے —— سخت کھُردرے —— اور مضبوط —— بھری بھری لمبی انگلیاں صاف و شفاف چمکدار ناخن . . . . انگلیوں کے پوروں میں سرخ سُرخ خون کی جھلک . . . . یہ ہاتھ . . . . یہ ہاتھ —— جو اُسے چھُو لیتے تھے۔تو اُس کا تن من آگ میں جلنے لگتا تھا۔اس کا دل چاہا۔ان دو مضبوط اور خوبصورت ہاتھوں کو زور سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لے۔اور کہے ——

کہ ان ہاتھوں کے سہارے کے بغیر وہ کس قدر تنہا تھی۔ویران تھی —— بوڑھی ہو گئی تھی —— آہ کہاں چلے گئے تھے۔یہ ہاتھ —— لیکن پھر ایک دم اُسے خیال آیا کہ وہ بے مروّت اور بے وفا انسان ہے۔جو اسے ایک دن روتا بلکتا چھوڑ گیا تھا سب وعدے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے —— وہ اسی کی خاطر موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی تھی —— پھر وہ اُسے زندہ رہنے کے قابل کہاں چھوڑ گیا تھا۔وہ تو اب تک یونہی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔اس کو جینا تو نہیں کہتے۔

اور اب اپنی شاندار زندگی بنا کے —— اپنا مستقبل سنوار کے —— عیش و نشاط

لی ساری منزلیں طے کر کے یہ آدمی پھر اُسے اپنے ٹھاٹھ باٹھ دکھانے کے لئے آ گیا ہے۔

اُس نے غصّے سے مُنہ پھیر لیا۔اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"بہت خفا معلوم ہوتی ہو" حماد نے اپنی بھاری اور اُداس آواز میں کہا۔

تمہیں حق پہنچتا ہے منوں —— تمہیں ہر حق پہنچتا ہے۔مگر میں تمہیں اتنی آسانی سے خفا نہیں ہونے دوں گا۔تمہیں منانے کی ایک آخری کوشش ضرور کروں گا۔"

"میں نے آپ کو نہیں پہچانا آپ کون ہیں —— اور کیوں میرے راستے میں اُکھڑے ہوئے ہیں۔مہربانی کر کے مجھے میرے گھر چھوڑ دیجئے ——!" آمنہ نے بقت تمام یہ الفاظ ادا کئے۔

"ہاں میں مانتا ہوں تم نے مجھے نہیں پہچانا۔اِسی لئے تو مجھے دیکھتے ہی تمہیں چکّر نے لگے —— تم بیہوش ہو گئیں —— اور پھر شدّتِ جذبات سے رونے لگیں —— اقعی تم نے مجھے نہیں پہچانا۔پھر تمہارے دل میں یہ طوفان اور زیر و بم کیوں اُٹھ رہے ہیں . . . . تم نے کبھی میرا انتظار نہیں کیا۔اسی لئے تو شادی کرنے کی بجائے کالج کے بس سٹاپ پہ نظر آ رہی ہو . . . . تم کو مجھ سے کبھی محبت نہ تھی۔اسی لئے تو اب اتنی کھُردری ہو گئی ہو —— دنیا سے منہ موڑے رہتی ہو —— اپنی ذات میں گم رہتی ہو۔آس پاس سے' اردگرد سے تمہیں کوئی مطلب ہی نہیں۔واسطہ ہی نہیں ——

لاشعوری طور پر میرا انتظار کرتے کے باوجود —— اب مجھے ٹھکرا رہی ہو —— مجھ سے بدلہ لے رہی ہو —— یا اپنے آپ سے —— مجھ سے ضرور لینا۔مگر اپنے آپ سے نہیں —— میں تمہارا مجرم ہوں۔گنہ گار ہوں —— چور ہوں —— جھوٹا ہوں —— قاتل ہوں ——

"ہے نا؟ ——"

حماد نے اتنے اُداس لہجے میں کہا۔کہ آمنہ پھر رونے لگی۔

حماد نے اُسی اداس اور دھیمے لہجے میں پھر کہا ——

"منوں! تم کتنا بدل گئی ہو —— کتنا بدل گئی ہو ——"

"ہر انسان کو وقت کے ساتھ بدل جانا چاہیئے۔" آمنہ نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔ "کیا آپ کو آئینے میں اپنی صورت نظر نہیں آتی ——؟"

"میں صورت کی بات تو نہیں کر رہا منوں۔ میں تو دل کی بات کر رہا ہوں۔ اگر صورت کے معاملے میں یہ کہوں کہ تم ابھی تک ویسی ہی ہو تو اس کو مبالغہ نہ کہنا۔ ہاں تمہاری آنکھوں میں ایک اُداسی رَچ گئی ہے اور چہرے پر اتنی زیادہ سنجیدگی آگئی ہے کہ اُسے دیکھ کر دِل ڈوبنے لگتا ہے۔ یہ شاید تم نے خود ہی طاری کر لی ہے۔ ورنہ تو تم بالکل ویسی ہو وہی دس سال پہلے والی منوں —— میری منوں ——؟"

"آپ کی ہوتی تو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے ——"

"منوں! خدا کے لئے میری روداد سننے سے پہلے کوئی فیصلہ مت صادر کرنا۔"

"میں تمہیں آج —— ابھی سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ ورنہ آج رات میں سو نہ سکوں گا۔"

"نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"میں ہر بات مختصراً بتاؤں گا۔ تفصیلاً پھر کبھی سہی۔ میرے گھر چلو گی۔ وہاں چل کر باتیں کریں گے۔"

"نہیں ——"

"کیوں ——؟"

"آپ کی بیوی کیا کہے گی ——؟"

"ہا ہا ہا۔ حماد نے زور کا قہقہہ لگا۔ "میری بیوی ——؟"

"کیا کیا . . . . آپنے شادی نہیں کی اب تک . . . ." ڈرتے ڈرتے آمنہ نے آخر

سوال کر ہی دیا۔ اور اس طرح کیا۔ جیسے اس کے جواب پر کسی پھانسی کے تختے پر لٹکے تے انسان کی زندگی کا دارومدار ہو —— وہ یہ سوال پوچھنا نہ چاہتی تھی —— اُس جواب اُس کی بقیہ زندگی بنا سکتا تھا —— مٹا سکتا تھا —— مگر اس سوال کا جواب حل کئے بغیر وہ کیسے اُس کے ساتھ چل سکتی تھی —— . . . .

حماد نے اپنا پائپ سُلگا کر منہ میں رکھ لیا۔ اور اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

آمنہ کا دِل دھڑ دھڑاتا رہا۔ ڈوبتا رہا۔ اُبھرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد حماد نے اُسے اپنی داستان مختصر کر کے سنانی شروع کی۔ کہ وہ ن حالات میں اور کیوں پاکستان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اُس پر کیا کیا بیتی —— ؟ اور نسا جذبہ اُسے واپس اپنے وطن میں لایا ہے۔ یہاں آکر اُس پر کیا بیتی ——؟

آمنہ سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی۔ مگر وہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں تھی کہ اس ت کو قبول کرے کہ حماد نے اس کے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ خواہ چند ں کے لئے سہی۔ شادی بغیر کسی سمجھوتے اور محبت کے نہیں ہو سکتی۔ اور جب مرد ی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ تو اُس کا مطلب ہے، اُس نے پہلی لڑکی کی محبت ں خیانت کی ہے ——

یہ بات سُن کر آمنہ کا دِل ایک دم بجھ گیا۔

کاش حماد مِلا ہی نہ ہوتا۔ وہ تو اپنے دل میں سمجھ رہی تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح دل ا انتظار کی شمع جلائے اسے کھوجتا پھرتا ہوگا۔

مگر ——

اب وہ تہی دامن ہو کے اُس کے پاس آگیا ہے۔ اُسے حماد سے شدید نفرت وس ہوئی۔ مرد کی فطرت کوئی نہیں بدل سکتا —— سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں

اگرچہ حماد نے اُسے سنجو کے ساتھ شادی کے تمام واقعات پوری تفصیل سے

بتاتے تھے۔ پھر بھی اُس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ حماد کی ہر خطا اور ہر آوارگی معاف کر سکتی تھی۔ مگر یہ نہیں ——

اِس لئے اُس نے اس کی کہانی سُن کر کچھ نہیں کہا۔ بس اتنا بولی۔

"آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔ یا مَیں گھر چلی جاؤں"

"اب تم کہاں رہتی ہو؟" حماد نے پوچھا۔

"میں یہیں سمن آباد میں کوبی کے پاس رہتی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ ذرا جلدی کریں۔"

"تم نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی نہیں دی منوں!" حماد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

"ہمارا گھر اس قابل کہاں۔؟"

"اب تم طنز کرنا بھی جان گئی ہو۔"

مگر آمنہ چُپ بیٹھی رہی.... ایسے لگتا تھا کہ اُس کے جذبات کے جلتے الاؤ ایک دم بُجھ گئے ہیں۔ اور یہ حماد بھی سمجھ رہا تھا۔ مگر جتنا کچھ وہ بتا چکا تھا۔ آج اُس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس لئے وہ مصلحتاً خاموش بیٹھا رہا....

آمنہ نے اُسے گھر کا راستہ بتایا —— حماد نے گھر کے باہر اپنی کار روک دی۔

بہت مُردہ دلی کے ساتھ آمنہ موٹر سے باہر نکلی۔ یوں جیسے اُس نے آج باقیماندہ پونجی بھی لُٹا دی ہو —— دامن جھٹک دیا ہو۔ کتنا درد فرسا انجام تھا اُس کے انتظار کا۔

لوگ تو کہتے ہیں ——

کہ انتظار کا درخت ہمیشہ ثمر لاتا ہے۔

مگر یہاں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی —— یکایک خزاں کی آمد کے آثار ہو گئے تھے ——

جلتا ہوا دیا بجھ گیا تھا۔ اور اُسے دُکھ ہو رہا تھا۔ اُس نے دل میں انتظار کی شمع اتنے تمام سے کیوں روشن رکھی۔؟

کیوں ——؟

کیوں ——؟

کیوں ——؟

ساری تپسیا .... سارا جوگ .... سارا تقویٰ اُسے آج مہمل اور بے معنی لگ رہا تھا۔

قوانینِ قدرت سے اُلجھتے نہیں۔

بھلا آدمی جو کچھ سوچتا ہے، کبھی بالکل ویسا بھی ہوا ہے؟

کتنی بے شمار دِل جلانے والی باتیں اُس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ ایک دم وہ اُلجھ گئی تھی کہ اُس کا چہرہ بھی اُس کی دلی کیفیت کا آئینہ بن گیا تھا۔

حماد یہ سب اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ اس وقت جذباتی کشمکش کے ایک پُل صراط سے گزر رہی ہے۔ حماد کو معلوم تھا کہ کھُل کر برسنے کے لئے بادلوں کو وقت درکار ہے۔

بس اُس نے اتنا کہا۔

"میں کل دس بجے آؤں گا۔ اور کوبی سے ملوں گا۔ کل اتوار ہے، تمہیں بھی چھٹی ہو گی!!"

شاید آمنہ نے اس بات کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی یا پھر جواب سے کہ وہ اپنے دلی جذبات اس پر عیاں کرنا چاہتی تھی۔

یونہی مرے مرے قدموں سے چلتی گئی۔

دو چار قدم آگے جا کر وہ رُک گئی۔ جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا —— پلٹ کر حماد کی

طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ کا سامان ہمارے ہاں پڑا ہے لے جائیے گا۔"

"سامان ــــــــ؟"

حماد بے حد حیران ہوگیا۔ اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آیا۔

"میرا سامان ــــــ؟؟"

جی ــ آمنہ طنز سے ہنسی۔ آپ کا سامان ــ جاتے وقت جسے آپ نے اُٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی ــــــ

"کسی بے وقوف نے یہ جانا کہ شاید ــــ سامان آپ اس یاددہانی کے طور پر چھوڑے جا رہے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ضرور آئیں گے۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔"

ایک دم حماد کو اپنا آپ بڑا حقیر نظر آنے لگا۔

اور یہ لڑکی دنیا کی عظیم ترین عورت معلوم ہونے لگی ــــ

دس سال اس معمولی سے سامان کے سہارے گزارنا ــــ اور اُسے سنبھالے رکھنا ــــ

حماد کا رواں رواں سجدہ ریز ہونے لگا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس وقت وہ کیا کرے ــــ

اس لڑکی کے قدموں میں جھک جائے ــــ یا اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر لے جائے۔

وہ لوگ سڑک کے کنارے کھڑے تھے ــــ اور جذبات ایک عجیب سے موڑ پر آ گئے تھے۔ مگر آمنہ نے اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ گیٹ کھول کر اندر جانے لگی۔

"تھوڑے سے دن اور سامان کی حفاظت کرو منوں! میں اپنا سامان تمہارے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

جانے آمنہ نے اُس کے یہ الفاظ سنے یا نہیں ــــ اُس کے اندر غائب ہو جانے کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اگلے دن ٹھیک دس بجے حماد آمنہ کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اُس نے دو تین بار ہارن دیئے۔ مگر اندر سے کوئی نہیں نِکلا ـــــ اُسے تعجب ہوا۔ کہ وہ تو آمنہ سے کہہ کر گیا تھا کہ صبح دس بجے آئے گا۔ مگر یہاں کسی کو اُس کا انتظار ہی نہ تھا۔ یُوں معلوم دے رہا تھا۔ جیسے گھر میں کوئی مکین ہے ہی نہیں ـــــ پھر اُسے شک گزرا کہ کہیں وہ غلط گھر میں تو نہیں آگیا۔ باہر نکل کر پورے گھر کا چکر لگایا۔ باہر وہی نمبر لکھا تھا جو کل وہ نوٹ کر کے لے گیا تھا۔ پھر ـــــ اندر سے کوئی وارد کیوں نہیں ہو رہا ـــــ ابھی وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گھنٹی تلاش کر رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا لڑکا شب خوابی کے لباس میں ڈگمگاتا ہوا باہر نِکلا۔

حماد اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا۔

"السّلام علیکم"

اُس نے قریب آکر کہا۔

"وعلیکم السّلام" حماد نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

دونوں ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ گویا پہچاننے کی کوشش ناکام

ہے ہوں۔

"مجھے یعقوب کہتے ہیں ـــــ" بالآخر کوبی نے انکساری سے کہا۔ وہ حیران ہو تھا کہ آج ایک خوش پوش، پڑھا لکھا آدمی مرسڈیز میں اُسے ملنے کیسے آگیا۔ غالباً ط گھر میں آگیا ہے۔

"اوہ کوبی!" حماد نے بڑی خوش دلی سے اُس کا نام لیا۔ "اچھا تو تم ہی ہو کوبی بھائی۔ یو میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم تو خوب تگڑے جوان بن گئے ہو۔ مگر پہچانتا بھی کیسے ں سے پہلے میرا اور تمہارا باقاعدہ تعارف تو ہوا نہیں تھا۔ اور نہ کبھی بالمشافہ گفتگو ہی ئی تھی۔"

کوبی حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

"میرا نام حماد ہے ـــــ شاید تم نے گھر میں کبھی سُنا ہو۔ میں اسمٰعیل کا ایک نا دوست ہوں۔"

"اوہ! حماد بھائی ـــــ" جیسے کوبی کو کوئی بھولی بسری بات یاد آگئی۔ اس ر میں اُس نے حماد بھائی کا نام بارہا سُنا تھا اور منوں آپا کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی تھی ں سے بھی واقف تھا۔ جلدی سے بولا۔ "اندر تشریف لائیے بھائی صاحب۔ بیگانوں طرح باہر کیوں کھڑے ہیں ـــــ؟"

وہ حماد کو ڈرائنگ رُوم میں لے گیا۔ بڑے ادب سے بٹھایا۔ اور پھر خود بھی ساتھ یٹھ گیا۔

"واقعی میری آپ سے مُلاقات نہ ہوئی تھی۔ مگر میں منی آپا اور اسمٰعیل بھائی سے پ کا تذکرہ اتنی بار سُن چکا ہوں کہ ہمیشہ آپ مجھے اپنے ہی خاندان کے ایک فرد لگے ہیں۔"

"شکریہ مہربان دوست!" حماد نے مسکرا کر کہا۔ "کل اچانک سڑک پر میری آمنہ

سے ملاقات ہو گئی تھی۔" حماد نے کہنا شروع کیا۔ "کتنا عجیب اتفاق ہے۔ اتنے عرصے بعد اُس سے ملاقات ہوئی اور میں نے اسے پہچان لیا۔ پھر میں نے اُسے کہا تھا۔ میں کل دس بجے تم لوگوں کے گھر آؤں گا۔ معلوم ہوتا ہے اُس نے تمہیں نہیں بتایا ــــــ"

واقعی آمنہ نے کوبی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کل سے وہ اپنے اسی پُرانے قنوطی موڈ میں تھی۔ سارا دن اور ساری رات بستر میں گھسی رہی تھی۔ نہ اُس نے کچھ کھایا تھا اور نہ کسی کو بُلایا تھا۔ اور کوبی سوچ رہا تھا۔ ضرور کوئی خلافِ معمول بات ہو گئی ہے۔ جب کوئی خلافِ معمول بات ہو جاتی تھی، اُس پر اسی طرح یاسیت کے دَورے پڑتے تھے۔ ایسے میں یعقوب اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ دو چار دن بعد وہ خود ہی اپنی اس کیفیت سے باہر آجاتی تھی۔

"نہیں ــــــ آپا نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔" کوبی نے شرمندگی سے کہا۔ "کل سے اُن کی طبیعت خراب ہے۔ شاید انہیں یاد نہ رہا ہوگا ــــــ ویسے آپ کا اطلاع دے کر آنا کوئی ضروری نہ تھا۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب چاہیں آسکتے ہیں۔" بے ڈھنگے سے کوبی نے بڑے سلیقے سے بات بنائی۔

"اُس کی طبیعت خراب نہیں ہے کوبی! تم نہیں جانتے آمنہ مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ بہر حال میں اُسے منانے کے لئے آگیا ہوں۔ اگر تم میری مدد کرو تو۔!!"

اس ایک فقرے میں حماد نے یعقوب کو سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اور اب کوبی وہ لاابالی، غیر ذمّے دار اور کھلنڈرا کوبی نہیں تھا۔ اور اُسے اچھی طرح علم تھا کہ آمنہ اور حماد ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اور آمنہ نے اُس کے جانے کے بعد شادی نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال۔ اس وقت وہ خاموش رہا۔ اٹھتے ہوئے بولا ــــــ

"میں ذرا منی آپا کو آپ کی آمد کی اطلاع دے آؤں۔"

وہ اُٹھ کر چلا گیا تو حماد ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ملحقہ تھے اور بہت سلیقے سے سجے ہوئے تھے ہر شے میں آمنہ کی نفاست اور سادگی نظر آرہی تھی۔

کوبی جب آمنہ کے کمرے میں گیا تو وہ گھٹنوں پر سر رکھے ابھی تک اپنے بستر میں بیٹھی تھی۔ گو اُس نے کل سُن لیا تھا کہ حماد آنے کا کہہ رہا ہے۔ مگر غصّے اور رنج کے مارے نہ تو اُس نے کوئی جواب دیا تھا۔ اور نہ ہی کچھ سوچنا چاہا تھا ــــــ کل سے وہ ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ اُسے حماد سے اس قسم کی توقع نہ تھی۔ یوں اُس سے بچھڑ کر اُس نے ہر روز چاہا تھا کہ وہ کہیں سے آجائے۔ کسی حالت میں۔ کسی عالم میں۔ وہ اُسے قبول کرلے گی۔ اور اب جب وہ اُس کے سامنے آگیا تھا ــــــ تو اُس کے دل نے ضد پکڑ لی تھی۔ وہ اُس کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی عہد شکنی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ اُس سے رُوگردانی کرنا چاہتی تھی۔ مگر اُس سے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ اپنے بستر میں گھسی اپنے آپ سے اُلجھ رہی تھی۔

آج صبح سے کئی بار اس نے حماد کے بارے میں سوچا تھا۔ سڑک پر جاتی ہوئی موٹروں کی آواز سُن کر اُس کا دل کئی بار دھڑک اٹھا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ ضرور آئے گا ــــــ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے ــــــ مگر جب وہ آیا ــــــ اُس کی کار کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔ تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پتھر بن کے بیٹھی رہی ــــــ

پھر کوبی اُٹھ کر گیا۔ اُسے اندر لے آیا ــــــ

اور اب وہ سر نہوڑائے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"منی آپا ــــــ" کوبی نے اُس کے نزدیک جاکر پکارا ــــــ

"منی آپا ــــــ"

آمنہ نے سر اٹھایا ــــــ

"حماد بھائی آئے ہیں۔"

آمنہ نے اس طرح نظریں اُٹھائیں جیسے کہہ رہی ہو" پھر میں کیا کروں؟"

"ذرا چائے بنا کر ڈرائنگ رُوم میں لے آؤ نا ــــــ"

"آمنہ خاموش بیٹھی رہی ــــــ

گھر آئے آدمی سے اچھی طرح ملنا چاہیئے ــــــ وہ بہت عرصے بعد آئے ہیں"

آگے کوبی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

ہاں واقعی گھر آئے آدمی کی تو مدارات کرنی چاہیئے۔ وہ کیا کہے گا۔ اتنا عرصہ ہمارے گھر میں رہا ــــ اور اب ہم اتنے بد اخلاق ہو گئے ہیں۔

آمنہ نے بستر سے پاؤں باہر نکالے۔ چپل پہنے۔ آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اپنے بال درست کئے۔ اس کے کپڑے سلوٹ زدہ تھے۔ کل سے اُس نے کپڑے نہ بدلے تھے۔ پہلے سوچا باتھ رُوم میں جا کر منہ ہاتھ دھوئے کپڑے بدلے اور پھر باہر جائے۔ لیکن دوسرے لمحے اُس نے سوچا اس اہتمام کی ضرورت نہیں۔

پہلے وہ باورچی خانے میں گئی۔ ملازم لڑکے کی مدد سے چائے بنائی۔ ساتھ کھانے کی کچھ چیزیں منگوائیں ــــ سب کچھ ٹرالی پہ سجایا۔ اندر لے جانے لگی۔ تو جانے اُسے کیا خیال آیا۔ ملازم لڑکے کو بلا کر دوپہر کے کھانے کے متعلق کچھ ہدایات دینے لگی۔ شاید وہ اسے دوپہر کے کھانے تک بٹھانا چاہتی تھی۔

جب وہ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئی تو حماد کھڑا ہو گیا۔

سلام دُعا کے بعد اُس نے چائے کی ٹرالی حماد کے آگے لگائی۔ اور پھر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

حماد زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اُس کا حُلیہ کہہ رہا تھا کہ وہ ابھی تک اُس سے خفا ہے اور وہ اُسے منانا خوب اچھی طرح جانتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آمنہ چائے بنانے لگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُسے پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ جب حماد اُس کے ہاتھ کی چائے پیئے بنا گھر سے نہیں نکلا کرتا تھا۔ پھر جب نکل گیا تو اُسے اُس کے ہاتھ کی چائے کبھی یاد نہ آئی ــــ

ہرجائی ــــ

وہ یونہی دل میں کڑھنے لگی۔

چائے بنا کر اس نے ایک پیالی حماد کو دی اور دوسری کوبی کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

پھر وہ لوگ آپس میں گھُل مِل کر گذرے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ حماد کو بہت تجسّس تھا کہ وہ اسمٰعیل کے بارے میں معلوم کرے۔ سکینہ آپا کے متعلق کچھ جانے۔ وہ لوگ کیسے رہے ــــ کس عالم میں رہے ــــ

اب آمنہ کمرے میں آ گئی تھی۔ تو کوبی کو بھی سب بتانے کا حوصلہ ہو گیا تھا۔ آمنہ نے اور کوبی نے مل کر گھر کے مفصل حالات اُس کو بتائے۔

اُس کے جانے کے بعد آمنہ بہت سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اُس کو غشی کے دَورے پڑنے لگ گئے تھے۔ اور جب کبھی ہوش میں آتی تو چیخنے چلّانے لگتی۔ ڈاکٹروں کے متفقہ مشورے سے آمنہ کو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ وہاں چھ مہینے تک اُس کا علاج بڑی توجہ سے ہوتا رہا۔ وہ تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگی۔ مگر بیگم ابراہیم کھاٹ پر پڑ گئیں۔ انہیں ہر وقت یہ غم ستائے جاتا کہ انہوں نے اپنی بے زبان اور صابر بچی پر ظلم کیا ہے ــــ گھُل گھُل کے وہ آدھی بھی نہیں رہ گئی تھیں۔ اُن کا بلڈ پریشر بہت لو رہنے لگا تھا۔

انہوں نے اور اسمٰعیل نے مل کر حماد کو بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی ــــ مگر یوں معلوم دیتا تھا۔ حماد کو یا تو زمین نگل گئی ہے یا آسمان نے اٹھا لیا ہے۔

جب آمنہ ہسپتال سے ٹھیک ہو کر گھر آئی تو ــــ کچھ ہی دنوں بعد بیگم ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ مگر مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے سب بچوں سے وعدہ لیا تھا کہ

وہ آمنہ کا خیال رکھیں گے۔ اور آئندہ کبھی اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔

اُن کے مرنے کے بعد گھر کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔

وکی بھائی نے کراچی میں ایک فیکٹری لگائی تھی۔ اس لئے وہ اور سکینہ آپا مع بچگان ہمیشہ کے لئے وہاں چلے گئے تھے۔ اسمٰعیل بھائی نے اپنی پسند سے ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ شادی کر لی تھی اور آج کل دونوں میاں بیوی لیبیا میں تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ آمنہ کو ساتھ لے جائیں۔ مگر اُس نے لاہور چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

عُرفی سینئر کیمبرج کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا تھا اور وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے آج کل سُنا ہے اُس نے ایک امریکی لڑکی سے شادی بھی کر لی ہے۔

چھمّی نے پچھلے سال پاک آرمی میں کمیشن لے لیا تھا۔ اور آجکل کاکول میں ٹریننگ لے رہا تھا۔

باقی رہ گئے یعقوب اور آمنہ —— تو کوبی نے آمنہ سے کیا ہوا اپنا عہد نبھا دیا تھا اُس نے بڑی سنجیدگی سے ایک موٹر ورکشاپ میں کام سیکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنا ایک ذاتی ورکشاپ بنا لیا تھا۔ محنت اور لگن سے کام کرتا تھا۔

دس مرلے کا ایک پلاٹ لے کر اُس پر اُس نے چھوٹا سا مناسب گھر بنا لیا تھا۔ اوپر کا پورشن کرائے پر دے دیا تھا اور نیچے دونوں بہن بھائی رہتے تھے۔

آمنہ نے اپنی ذہنی صحت بحال ہوتے ہی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایم اے کرنے کی اپنی دیرینہ خواہش پوری کر لی تھی۔ اور اب ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔

وہ اس شرط پر کوبی کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوئی تھی کہ کوبی اسے کبھی شادی کے لئے مجبور نہیں کرے گا۔

ہاں۔ اُس نے وعدہ تو کر لیا تھا۔ مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا۔ کہ جب تک منی آپا کنواری بیٹھی رہے گی وہ بھی اپنا گھر آباد نہیں کرے گا۔ وہ اپنی بیوی لا کر اُسے مزید کوئی سزا نہیں

دینا چاہتا تھا۔

وقت کی چکی کس منظم طریقے سے گھومتی ہے —— کہ تبدیلیاں اپنے اپنے وقت پر اور اپنی اپنی جگہ پر خود بخود ہوتی جاتی ہیں۔

وہ ساری دوپہر حماد نے ان لوگوں کے ساتھ گزاری —— اُن کے مفصل حالات سُنے —— اپنی رُوداد انہیں سُنائی ——

وہ تینوں ایک ہی خاندان کے افراد لگ رہے تھے۔ اُن میں بیٹھا ہوا حماد کتنا خوش تھا۔ جیسے اُسے اپنی کھوئی ہوئی زندگی کا کوئی سرا مل گیا ہو۔

یوں ایک عرصہ بعد مِل بیٹھنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچھا تو آمنہ کو بھی لگ رہا تھا —— مگر وہ حماد کو اس کی بے وفائی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ کڑی سے کڑی سزا۔

او بے وقوف لڑکی! اس بار بھی اگر تو نے وقت کے ہاتھوں مات کھا لی تو کیا کرے گی۔

تو کیا کرے گی ——؟

اُس کے ذہن میں ہتھوڑے سے بج رہے تھے۔ اور اُدھر کوبی سوچ رہا تھا —— حماد بھائی واقعی بہت پیارے آدمی ہیں —— اور منی آپا کو اُن سے بہتر آدمی کوئی نہیں مل سکتا ——

کاش منی آپا اپنی ضد چھوڑ دے۔

دو مہینوں سے اُن کے درمیان عجیب سی رسہ کشی ہو رہی تھی۔آمنہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اب حماد سے شادی نہیں کرے گی۔اور حماد ہر روز شام کو اُن کے ہاں آ جاتا تھا —— بحث ہوتی —— بحث طویل بھی ہو جاتی اور تلخ بھی —— مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا تھا۔

حماد نے پہلے یہ معاملہ کوبی کے سپرد کر دیا تھا —— اپنے تمام حالات اُسے بتا کر، اُسے اپنا وکیل بنا لیا۔مگر آمنہ کے آگے اُس کی وکالت نہ چل سکی۔ایک تو وہ آمنہ سے چھوٹا تھا۔دوسرے اُس نے آمنہ کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا۔کہ اُس کی مرضی کے خلاف اُسے شادی کرنے پر کبھی مجبور نہیں کرے گا۔یہ عہد اُس نے حماد جیسے نفیس آدمی کے لئے توڑا تھا۔اُسے دنیا کی ساری اُونچ نیچ سمجھائی تھی۔اور یہ بھی کہا تھا کہ حماد سے اچھا آدمی اُسے نہیں مِل سکتا —— مگر آمنہ نے صرف ایک بات کہہ کر کوبی کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی تھی کہ ——

"کوبی! اگر تم اس معاملے میں دخل انداز ہوتے تو میں سمجھوں گی۔تم میرا بوجھ اٹھاتے تھک گئے ہو۔پھر میں کسی ہوسٹل میں چلی جاؤں گی۔" اس کے بعد کوبی بچارا کیا کہتا —— ؟ حالانکہ اگر اُس کا بس چلتا تو ایک دن کی دیر نہ کرتا۔فوراً آمنہ کا حماد سے نکاح کر کے اسے رُخصت کر دیتا۔

بالآخر اُس نے یہ معاملہ حماد کو واپس لوٹا دیا اور بولا۔

"بھائی صاحب! میں بہت مجبور ہوں۔آپ اس گتھی کو خود سلجھائیں۔ ویسے مجھے اُمید ہے۔منی آپا مان جاتے گی۔اُس کو اپنا غصہ نکالنے کا وقت دیں۔مہلت دیں۔"

سو حماد اُسے اپنا غصہ نکالنے کا وقت دے رہا تھا۔ہر روز شام کو آ کے بیٹھ جاتا۔اور کوئی ایسی بات چھیڑ دیتا۔جس سے آمنہ کے اُبلتے ہوئے جذبات چھلک پڑتے اور پھر وہ حماد پر خوب تیر و نشتر آزماتی۔کبھی کبھی کوبی اُن کا ساتھ دیتا۔مگر اکثر کام کا بہانہ کر کے اٹھ جاتا۔

آمنہ کو حماد کی اس ڈھٹائی پہ بہت غصہ آتا۔بھلا اس عمر میں یہ چوچلے کوئی اچھے لگتے ہیں۔جتنی دیر وہ بیٹھا رہتا۔وہ بھی جلی کٹی سُناتی رہتی۔

اور جب وہ اُٹھ کر چلا جاتا۔تو آمنہ کو ہر سُو ویرانی اور سناٹا ملتا —— گھپ اندھیروں میں وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتی۔

یا اللہ میں کیا کروں؟

کدھر جاؤں۔؟

اس روز بھی وہ اپنے خیالوں سے اُلجھ رہی تھی کہ حماد آ گیا —— شام کا وقت تھا۔اس نے سفید کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔بہت قرینے سے بال بنائے ہوئے تھے —— اُس کا چہرہ چمک رہا تھا —— پائپ کے نفیس تمباکو کی خوشبو اس کے ارد گرد پھیل رہی تھی۔وہ بہت ہی اُجلا اور شاندار لگ رہا تھا۔

آمنہ نے اُس کو نظر بھر کے دیکھا —— پھر ٹھنڈی سانس چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں ——

حماد مسکراتا ہوا اُس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"آج کا نیا فیصلہ کیا ہے تمہارا او ظالم خاتون!" حماد نے اسی انداز میں مسکراتے ہوئے ذرا چہرہ اُس کے قریب لاکر پوچھا۔

"فیصلہ ——— ؟"

"ہاں ——— تم آجکل ہر روز مجھے ایک نیا جرم یاد دلاتی ہو۔ اور پھر ایک نیا فیصلہ صادر کردیتی ہو۔ میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آج کیا حکم ہے ——— ؟"

"کوئی حکم ہے نہ کوئی فیصلہ، اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ ایک دن آپ مجھے روتا بلکتا چھوڑ گئے تھے۔ آج میرا دل آپ کے ساتھ کسی بندھن پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ کوئی زبردستی کا تو سودا نہیں ہے ———"

"دیکھو آمنہ بی! میں کوئی بچّہ نہیں ہوں، جو تم مجھ سے پہیلیوں میں بات کررہی ہو۔ سیدھی سی بات ہے۔ سیدھے سے الفاظ میں کہو۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ یہ بھی تمہاری ایک طفلانہ ضد ہے۔ یوں میں تم پر کوئی زبردستی کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ تمہاری مجال کہ تم شادی سے انکار کردو۔ ابھی چاہوں تو تمہیں زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ مجھ سے بازپرس کرنے والا کوئی مائی کا لعل آگے نہیں آئے گا۔"

"واہ ———" آمنہ کو تاؤ آگیا ——— "باتیں تو ایسی کررہے ہیں۔ جیسے یہی بھاٹی دروازے کے نامی گرامی غنڈے ہوں۔ میں کسی دھونس دھاندلی کو نہیں مانتی ذرا میری مرضی کے خلاف مجھے ہاتھ لگاکر تو دیکھئے ———"

"اتنا بڑا چیلنج نہ دو مجھے منوں ——— تمہیں یاد ہوگا۔ اس پہلے روز میں نے کس طرح تمہیں سڑک سے اُٹھا کر موٹر میں ڈالا تھا۔" بس اس طرح اغوا کرکے لے جاؤں گا۔"

"مہربانی کرکے آپ اس وقت چلے جائیے۔ انتہائی غیر مہذب اور جنگلی لگ رہے ہیں آپ۔ اور میں آپ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔" آمنہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

اور حماد بڑی دیر تک قہقہے لگاکر ہنستا رہا۔ خوب ہنستا رہا۔ جب اچھی طرح ہنس
کا تو بولا۔

"منوں! تو تو اب مذاق کی باتوں کا بھی بُرا ماننے لگی ہے۔ کیا ہوگیا ہے تجھے ——— اسے لئے بتا کیا ہوگیا ہے تجھے۔؟"

"اب آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں ذہنی طور پر شادی کے قابل نہیں ہوں ———" نہ نے کہا ——— "اب ہماری اور آپ کی کبھی نہیں بن سکتی۔"

"بنے گی تو ایسی کہ دُنیا دیکھے گی۔ اور تو ذہنی طور پر شادی کے قابل ہے یا نہیں۔ ں کا فیصلہ تو نہیں کرسکتی۔ یہ تو شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔ کہ کون سچّا تھا۔ کون ھوٹا ——— ؟"

"آپ شادی کرچکے ہیں۔ زندگی کی ساری خوشیاں دیکھ چکے ہیں۔ اب کیوں میرے پے ہیں۔"

"منوں! کیا تو مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ میں نے ساری ت تجھے کھول کر بتادی۔ اگر میں اپنی زندگی کا یہ باب تم سے چھپا جاتا تو کیا تم مجھے قابل تبار سمجھتیں۔ اچھا انسان سمجھتیں۔ ساری زندگی مجھ سے بدگمان رہتیں۔ اور اس کے وہ جانے اور کیا کیا غلط فہمیاں تمہارے دل میں جنم لیتی رہتیں ———"

"یں ایک دیانت دار آدمی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ مجھے اُس لڑکی سے کل محبت نہیں تھی۔ کوئی تعلق نہ تھا۔ کوئی علاقہ نہ تھا ——— وہ بھکارن تھی ——— ارث ——— اور یکّہ و تنہا ——— وہ میری راہ میں دامن بچھاکر کھڑی ہوگئی۔ ں جو گلی کوچوں میں کنکریوں اور پتھروں سے تمہارا پتہ پوچھتا آرہا تھا۔ میرا اُس سے تصادم گیا۔ تم تصوّر نہیں کرسکتیں۔ جب ایسی عورت مرد سے بھیک مانگتی ہے تو اُس کے ن پہ کیا گزرتی ہے۔ شاید اس وقت قدرت میرا سب سے بڑا امتحان لے رہی تھی۔

تم ہی سوچو اگر میں تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو کیا پاکستان میں ہی آکر کرتا ——— اور وہ بھی آنے کے دوسرے دن، ایک اجنبی اور نامعلوم سی لڑکی کے ساتھ۔ آخر ایسی کیا مجبوری تھی ——— ؟ کیا ان ممالک میں جوان اور خوبصورت لڑکیاں نہیں تھیں۔ آٹھ دن ایک عورت کے ساتھ رہنے سے کیا میری وہ محبّت فنا ہو گئی، جو برسہا برس سے میرے دل میں چھُپی تھی۔ اور جس نے ہمیشہ مجھے ایک بہتر انسان بننے میں مدد دی۔ یہ بھی خدا کی کوئی مصلحت تھی۔ یا شاید وہ تم سے زیادہ پیاسی تھی۔ تشنہ تھی ——— تھکی ہوئی تھی ——— کہ خدا نے چند دنوں کے لئے اُسے میری جھولی میں ڈال دیا۔ شاید اُس کے گناہ مُعاف کرنے کے لئے ——— یا اُس کی زندگی کی آخری خواہش پُوری کرنے کے لئے ——— قدرت ایک چشمے سے کئی انسانوں کی پیاس بجھاتی ہے۔

باقی رہی عیاشی کی بات ——— تو عیاشی کے لئے مرد شادی ہرگز نہیں کرتا شادی وہ صرف بچّوں کے لئے ——— اور گھر بسانے کے لئے کرتا ہے۔ عیاشی گھر سے باہر زیادہ مزہ دیتی ہے۔ جب باہر کی دنیا میں قدم قدم پر یہ لوازمات مل سکتے ہیں تو پھر اُسے پاؤں میں زنجیر ڈلنے سے کیا حاصل ——— ؟"

اس کی اتنی لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد آمنہ نے مری ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اگر میں نے بھی حالات کی مجبُوری کے تحت کسی آدمی سے شادی کر لی ہوتی۔ اور اب وہ مر گیا ہوتا۔ یا مجھے چھوڑ گیا ہوتا ——— تو آپ مجھ پر لاکھ احسان جتا کر مجھ سے شادی کرتے ——— اور شادی کرنے کے بعد بھی دن میں سو مرتبہ طعنہ دیتے کہ تم میرا انتظار نہ کر سکیں۔"

"ہاں میں ایسا ضرور کرتا۔ منوں! تم بالکل سچ کہتی ہو۔ اس معاملے میں مرد بڑا تنگ

۔اور کمینہ ہے۔ وہ عورت کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ مگر یہ کشادہ دِلی اور عالی ظرفی باری تعالیٰ نے عورت کو ودیعت کی ہے۔ وہ مرد کی ہر خطا اور ہر گناہ معاف کر کے اُسے اپنے دامن میں چھُپا لیتی ہے۔ بلکہ اُس کے عصیاں کے داغ بھی اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالتی ہے۔ یہی مرد اور عورت میں بنیادی فرق ہے۔"

"آپ کی ایسی خوشامدانہ باتیں مجھے میرا خیال بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔"

"کیا تم عورت نہیں ہو ——— ؟"

"یہی سمجھ لیجئے کہ میں عورت نہیں ہوں۔"

"اوہو! یہ تو نیا انکشاف ہے۔ اگر عورت نہیں ہو تو کیا ہو ——— ؟" حماد نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔ مگر آمنہ نے اُس سے لُطف لینے کی بجائے بڑے کرخت لہجے میں کہا۔

"جب عورت تھی تو مجھ میں یہ سب صفات تھیں۔ اب زمانے نے مجھے پتھر بنا دیا* ہے۔"

"خیر میں یہ نہیں مانتا۔ عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ خواہ زمانہ اس کو کتنی بھی شکلیں کیوں نہ عطا کرے۔"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو ———" حماد بولا ——— "مجھے یہ بتاؤ کہ اتنا عرصہ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔ چلو جی میں نے تو آوارگی کرنی تھی ———"

"بس نہیں کی ———" آمنہ نے کہا۔

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ اسکول کی لڑکیوں والی بات کر رہی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم لاشعوری طور پر میرا انتظار کرتی رہیں . . . ."

"یہی سمجھ لیجئے . . . ." آمنہ نے آہستہ سے کہا۔

"اتنا لمبا انتظار کرنے کے بعد، اک چھوٹی سی خطا کی مجھے اور خُود کو کیوں سزا دے رہی ہو۔ محض ضد ہے تمہاری . . . اور کچھ نہیں۔"

"بس میرا ذہن نہیں گوارا کرتا۔ تصوّر نہیں کر سکتا۔ کہ جس شخص کا میں نے ساری عمر انتظار کیا۔ ساری جوانی اس کے انتظار میں ضائع کر دی۔ وہ مجھ سے پہلے کسی کا گھونگھٹ اُٹھا چکا ہے۔ سہرا باندھ کے کسی اور دروازے پر بارات لے جا چکا ہے ـــــ اور...

اور... وہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ جو صرف میرے لئے مخصوص تھا ـــــ!"

"بے وقوف ہو تم تو ـــــ اور یہ سب تمہارے زرخیز ذہن کی اختراع ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ نہ میں نے پہلے سہرا باندھا۔ نہ دولہا بنا۔ نہ باجے بجے۔ نہ بارات گئی۔ نہ دُلہن ڈولے میں سوار ہو کر آئی ـــــ جو کچھ بھی ہوا اُسے ایک دیوانی کی ضد تو کہا جا سکتا ہے۔ شادی نہیں کہی جا سکتی ـــــ ممکن ہے تمہاری طرح میرے بھی کچھ سپنے ادھورے ہوں۔ جنہیں میں اب پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کے لئے مبالغے سے کام نہ لیجئے اور نہ اپنی پارسائی کی قسمیں کھائیے ـــ سب کچھ کر لینے کے باوجود بھی مرد اپنے آپ کو یہی فریب دیتا رہتا ہے ـــــ کہ وہ پوتر ہے۔ معصوم ہے۔ بے چارا ہے ـــ!"

"منوں... منوں... تو سمجھتی کیوں نہیں۔ بعض حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ مرد اور عورت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عورت جب ایک مرد سے محبت کرتی ہے تو اپنا جسم و جان اُس کے لئے محفوظ کر لیتی ہے۔ وہ مل جائے تو ٹھیک۔ ورنہ ساری زندگی اُس کی یاد میں خشک صحرا کی مانند گزار دیتی ہے۔ مگر مرد ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک وقت آتا ہے۔ جب محبت اور جسم الگ ہو جاتے ہیں۔ مرد اپنی محبت کو پا لینا چاہتا ہے مگر اُسے حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو سرد پتھر میں نہیں تبدیل کر سکتا ـــــ اگر وہ ناکامی کی کیلیں ٹھونک ٹھونک کر اپنے جسم کو تابوت میں بدل دے۔ تو وہ دُنیا کے لئے بھی ناکارہ بن جاتا ہے۔ اس کو بعض حقائق اور مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض تقاضے مجبوراً پورے کرنے پڑتے ہیں۔ منوں! تو اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہے

کالج میں سائیکالوجی پڑھاتی ہے۔ اور ابھی تک زندگی کے بعض تلخ ترین حقائق کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔"

آمنہ نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئی۔

یا شاید وہ سوچ کے گہرے کنوئیں میں کود گئی۔

حماد نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ مرد و عورت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر دونوں کے جہاں میں بہت فرق ہے۔ عورت صبر اور تحمل کے ساتھ انتظار کا طویل اور کٹھن دَور کاٹ سکتی ہے۔ مرد کی راہ میں کئی موڑ اور کئی زمانے آتے ہیں۔ وہ تجربات اور حوادث کا عادی ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی غم کو کلیجے سے لگا کر راہ میں نہیں بیٹھ سکتا ـــــ

اور پھر مرد کی فطرت ـــــ

ہاں اُسے کون بدل سکتا ہے؟

زمانے اور وقت کے تقاضے اُسے نبھانے پڑتے ہیں... مرد سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ بھی عورت کی طرح زندگی کا ایک مرکز بنا کر ساری عمر بتا دے۔ تو کٹھن کام ہے۔ حماد نے تو صرف اس سے مایوس ہو کر یا بقول اُس کے بحالتِ مجبوری شادی کر لی تھی۔

مگر ایسے بھی مرد ہیں جو اپنی بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی اُن کی پرواہ نہیں کرتے ـــ جب تک دوسری عورت ان کا پہلو نہ گرمائے انہیں چین نہیں آتا۔ وہ ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتے ـــــ اُس کے اپنے کالج کی کئی پروفیسرز شادی شدہ تھیں۔ مگر ہمیشہ اپنے شوہروں کے ہرجائی پن کے قصّے بیان کرتی رہتیں۔ کئیوں کے شوہر تو اسی کالج کی لڑکیوں کے ساتھ علی الاعلان گھومتے تھے ـــــ بیویوں کو اذیّت دیتے تھے ـــ اور ذرا بھی اُن کی پرواہ نہیں کرتے تھے ـــــ

یہ بھی مرد کی فطرت کا ایک پہلو ہے۔ آمنہ سوچا کرتی۔ مگر کتنا گھناؤنا پہلو ہے ـــــ وہ ہمیشہ عورت کو ہر رُوپ میں ایک کھلونا ہی سمجھتا ہے ـــــ.

بیوی ہو ـــــ محبُوبہ ہو ـــــ یاداشتہ ہو ـــــ

اور جو سڑکوں پہ ہزاروں آدمی ہر روز نظر آتے ہیں۔ اُن کا رویّہ کتنا دل جلانے والا ہوتا ہے۔ راہ چلتی ہر عورت کو نظروں میں تولتے ہیں۔ آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موٹر دُور تک اُس کے پیچھے لے جاتے ہیں ـــــ

بوڑھی ہو۔ جوان ہو ـــــ خوبصورت ہو یا بدصُورت۔ ان کی نظر میں عورت، عورت ہی ہے۔

ہائے ان پہ کوئی بھروسہ بھی کرے تو کیسے ـــــ؟

جانے آمنہ سوچتے سوچتے کہاں نکل آئی تھی۔ کہ حماد جو بیٹھا اُس کا جائزہ لے رہا تھا، بولا۔

"اب کیا سوچ رہی ہو!"

"کیا سوچ رہی ہوں ـــــ؟" آمنہ نے بڑی ایمانداری سے اُسے بتا دیا کہ وہ مردوں کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ تم مرد کی سرشت میں اُلجھنے کی کوشش ہی نہ کرو۔ اُس کا فلسفۂ حیات کچھ عجیب ہوتا ہے۔ لیکن میری زندگی کا سارا فلسفہ تمہاری ذات کے گرد گھُومتا ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ میرا ماضی تمہارے سامنے ہے... ماضی میں جو کچھ بھی ہوا۔ تمہارے لئے ناقابل برداشت اور ناقابلِ معافی سہی۔ مگر میں تمہیں ایک اچھے مستقبل کی ضمانت دے رہا ہوں۔ میں ان مردوں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو محبّت کی شادیاں رچاتے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ بعد گھر سے باہر رت جگے مناتے ہیں۔

منوں! شادی کے بعد تُو میری زندگی کی سب سے آخری عورت ہو گی۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا ایک مشن بنا لیا ہے۔ اس کے لئے مجھے تمہاری جیسی عورت کی

ورت ہے ـــــ اپنی منتشر اور بے ڈھنگی زندگی کو ایک ڈھنگ پر لانے کے لئے ری ضرورت ہے۔ تمہارے استقلال کی ـــــ تمہاری سُبک روی ـــــ میانہ روی تمہارے تحمّل و تدبّر کی ـــــ تمہارے سوا مجھے کوئی نہیں سنبھال سکتا ـــــ ے جیسے لااُبالی آدمی کے بچّوں کو تم جیسی ذمّہ دار، فرض شناس اور ذہین ماں کی ورت ہے۔

گھر کی عورت تو پُورا ایک زمانہ ہوتی ہے۔ ایک صدی ہوتی ہے۔ ایک نسل ہوتی ہے۔ خاندان کی بنیاد رکھنے کے لئے ایک اچھّی ماں کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ

اور میرا اِس دُنیا میں کون ہے ـــــ میں تو اپنا ایک چھوٹا سا خاندان بنانا چاہتا ہوں۔ زندگی کی ابتداء کرنا چاہتا ہوں۔ ہر نوجوان لڑکی اس قابل نہیں ہوتی کہ میرے یسے آدمی کے مستقبل کا سارا بوجھ اٹھا سکے ـــــ پھر میں تو ناز نخرے اٹھانے والی یج سے گذر چکا ہوں۔

ذرا میری طرف دیکھو! اس عمر میں اب مَیں ان ناپختہ اور افسانوی لڑکیوں کے پیچھے یچھے پھروں ـــــ زندگی کم ہے۔ اور کام زیادہ ـــــ غصّہ تھوک دو ـــــ آؤ مل کر وجھ بانٹ لیں اور اپنی زندگی بنا لیں.....

تم تھوڑے سے میرے ناز بھی اُٹھاؤ گی نا؟ ـــــ میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں ختیاں اٹھا رہا ہوں۔ اب تو پیار کرنے کے قابل بھی نہیں رہا ـــــ اب تم مجھ سے کرو گی نا؟ ان سب محرومیوں کا مداوا کرو گی نا؟ مجھے جینا سکھاؤ ـــــ

گو میں ایک فضول قسم کا جھگڑالو ـــــ بے ڈھنگا اور تند خُو شوہر ثابت ہوں گا تمہارا اور صرف تمہارا ـــــ کیا ایک لڑکی کے لئے۔ اتنی بڑی ضمانت کافی نہیں ہے۔

منوں! جواب دو!"

آمنہ کیا جواب دیتی۔

حماد سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

ہر لڑکی کو شادی سے پہلے یہ کھٹکا ہوتا ہے کہ جانے اُس کا شوہر زندگی بھر اُس کا رہے گا یا نہیں —— اُس کی ضمانت مِل جائے۔ تو اُس کی زندگی کا سارا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے ——

کیا ہوا جو ماضی نے اتنی تکلیفیں پہنچائیں۔۔۔ مستقبل تو اُمید افزا نظر آ رہا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک سراب ہی نہ ہو ——

وہ پھر بدگمان ہو گئی۔ مرد کا کیا ہے۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ بہت میٹھا بن جاتا ہے۔ جانے حماد اب ویسا رہا ہے یا نہیں۔ اور اب پھر اسے حماد کی امارت کے سامنے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی —— کہ کہیں یہ فرق اُن کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو۔

"حماد! آپ کو معلوم ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں اور ——"

"چھوڑو آمنہ! کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔" حماد نے اُسے ٹوک دیا۔ "اب میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔۔۔"

آمنہ نے اُس کی بات سمجھے بغیر جلدی سے کہا۔ "یہ تو آپ کی موٹر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہو! اب مجھے مرسڈیز میں گھومنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس مرتبے پر پہنچنے کے لئے میں نے محنت کی ہے۔ جان توڑ محنت۔ دُنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا ہے۔ فاقے کئے ہیں۔ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ تب اس قابل ہوا ہوں کہ موٹر خرید سکوں۔ تیرے لئے —— تیرے بچوں کے لئے —— ورنہ میں تو ابھی تک وہی درد لیش ہوں۔ وہی ——

جن کی جان ہو گدڑی میں ——"

آمنہ ویسے ہی غصے میں تنی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس کی گفتگو کا آخری حصہ سُنا ہی نہیں۔ اور بولی۔

"جی ہاں —— اب آپ میں بڑے آدمیوں والی دوسری عادتیں بھی پیدا ہو گئی ہوں گی۔"

"دوسری عادتیں ——؟ مثلاً۔۔۔"

"مثلاً آپ کلب بھی جاتے ہوں گے۔ شراب بھی پیتے ہوں گے —— قیمتی سوٹ بھی پہنتے ہوں گے —— اچھے برانڈ کے امپورٹڈ سگریٹ بھی پیتے ہوں گے۔ آپ کی پرفیومز بھی پیرس سے آتی ہوں گی۔"

حماد ہنسا ——

"جلی کٹی سُنا رہی ہو؟ بھئی تمہاری ساری باتیں درست ہیں۔" وہ رُکا ——

"سوائے دو باتوں کے۔۔۔ کلب میں نہیں جاتا۔ میں ایسے پیشے میں قدم رکھ رہا ہوں۔ جو میرے دفتر کو ہی کلب بنا دے گا۔ زندگی کے ہر شعبے کا فرد خود بخود میرے پاس آئے گا۔

باقی رہی شراب —— تو وہ میں نے آج تک کبھی نہیں پی۔ کسی دباؤ یا ڈر کے اثر سے نہیں۔ وہ جو بچپن سے مجھے شراب سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ ساری زندگی مجھ پر مسلط رہی۔ میں ملکوں ملکوں پھرا ہوں۔ شراب ہر جگہ اتنی سستی تھی کہ ہر خواہش پر چھا سکتی تھی مگر تم جانتی ہو۔ سستی چیزوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں اپنی ہستی کو کسی گھٹیا شے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ میرا ذہن اور میری ہستی میرا سرمایہ ہے۔ اور شراب دیمک ہے! میں نے کبھی نہیں چاہا یہ دیمک میرے سرمائے کو چٹ کر جائے۔ میں نے اپنی کھلی آنکھوں سے اس کے کرشمے ضرور دیکھے ہیں۔ لوگوں کو اس میں ڈوبتے ابھرتے دیکھا ہے۔ اُسے لوگوں پر حکمرانی کرتے دیکھا ہے۔ مگر خود اُس کا اسیر نہیں ہوں —— یہی وجہ ہے کہ

میری صحت اتنی اچھی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہیں میں کتنا جوان اور تنومند لگتا ہوں۔" حماد نے اسی اپنی پرانی شوخ فطرت کو بروئے کار لاتے ہوئے آخری فقرہ کہا۔

"جی ہاں! آپ ماشاءاللہ بہت صحت مند نظر آتے ہیں۔ مگر یہ جو کن پٹیوں پر سفید بال ہیں۔ یہ کس کا تحفہ ہیں۔۔۔"

"یہ ——" حماد شوخی سے ہنسا —— "یہ تو بھئی وقت کی ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ وہاں کی لڑکیاں کن پٹیوں پر سفید بال بہت پسند کرتی ہیں۔"

"ہوں ——" آمنہ نے جل کر ایک ہنکارہ بھرا —— "تو یہ اصل راز ہے آپ کے جوان رہنے کا۔ تو جناب آپ میں رئیسوں والی ساری عادتیں سرایت کر چکی ہیں۔ اور میں بہت غریب لڑکی ہوں۔ مٹی کے اسی ٹیلے پہ بیٹھی ہوں۔ جہاں آپ مجھے بٹھا گئے تھے —— اور خاک آلود کپڑوں والے اتنی شاندار موٹر میں نہیں بیٹھتے ——"

"منوں! حماد تڑپ اُٹھا۔ اور اُٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا منوں —— تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تُو تو بالکل بدل گئی ہے۔ تو وہ پہلے والی بذلہ سنج اور کشادہ دِل لڑکی نہیں رہی۔ اتنی تنگ دِل کیوں ہو رہی ہے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی۔۔۔۔"

"زندگی جن پر تنگ ہو —— وہ تنگ دل ہو جاتے ہیں حماد! میری محرومیوں نے مجھے حاسد بنا دیا ہے۔ اور شاید میں احساسِ کمتری کا شکار بھی ہو گئی ہوں۔ زندگی کے ساتھ چلنے کے لئے مجھ میں خود اعتمادی نہیں رہی۔ اس پر جہاں آپ کھڑے ہیں وہ جگہ مجھ سے خود بخود اونچی ہو گئی ہے۔ میں تو اس لڑکے کی یاد میں سُلگتی رہی ہوں۔۔ جو میرے جیسا تھا۔۔۔۔ غریب تھا۔۔۔۔ خوبصورت تھا۔۔۔ خوب سیرت تھا۔ خوش خلق تھا —— محبت کرنے والا تھا —— مخلص تھا —— ——

لاابالی تھا —— اُجڈ تھا —— جنگلی تھا —— مگر آپ۔۔۔ آپ تو وہ نہیں ہیں۔ یہ میری بھول ہی تھی۔ جو میں نے آپ کی وہی شبیہ اپنے ذہن میں رکھی ——؟ آخر وقت اور زمانہ تو ہر ایک پر اثر انداز ہوتا ہے —— یہ نہ سمجھئے کہ مجھے آپ کی اس حالت سے خوشی نہیں ہوئی۔ آپ کو اس مرتبے پر دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔ آپ میرے ہر خیال سے بہت بڑے نکلے۔ آپ اُس وقت بھی بہت بڑے آدمی ہی تھے جب ایک مفلس کا روپ بدل کر ہمارے ہاں آ گئے تھے۔

مگر تب میں اور اب میں بہت فرق آ گیا ہے۔ تب میں قدرت کی بہت سی نعمتوں سے مالا مال تھی۔ اور خود کو تہی دامن نہ سمجھتی تھی۔ مگر اب خالی ہاتھ ہوں۔ اور بڑے خلوص سے آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ آپ اس شہر کے کسی اچھے خاندان سے ناطہ جوڑ لیں۔ اور کسی نوخیز لڑکی کو اپنا ہم سفر بنا لیں۔"

"منوں! تُو تو سچ مچ پاگل ہو گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تیرے حالات کا تقاضا ہے۔ اس لئے تو تیری کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ مگر یاد رکھو! میں شادی صرف اسی لڑکی سے کروں گا جو دس سال سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ اگر وہ مجھے ایک مفلس کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ میں یہ موٹر بیچ دوں گا۔ گھر بیچ دوں گا۔ سب کچھ غریبوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اور قلاش بن کر اُس کے در پہ آؤں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"نہیں ——"

"کیوں نہیں ——؟"

"میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ آپ نے سب کچھ محنت سے حاصل کیا ہے۔ آپ کا اُس پر حق ہے۔ آپ نے ایک عمر محنت میں گزاری ہے۔ کوئی چوری کر کے یا ناجائز ذریعے سے یہ سب کچھ نہیں بنایا —— آپ کیوں اُسے ٹھکرائیں۔ آپ کی یہ صورت بھی بہت اچھی ہے —— مگر۔۔۔۔"

"مگر کیوں منوں؟ تُو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ یہ سب میں نے اپنے بیوی بچّوں کے لئے حاصل کیا ہے۔ مجھے ان کی کیا ضرورت تھی؟"

"مگر کہاں ہیں آپ کے بیوی بچّے ——؟"

"بچّے ——؟ بچّے بھی آجائیں گے۔ اگر بیوی حامی بھر لے گی تو ——"

آمنہ کے چہرے پر رنگ سا آگیا۔ اُسے وہی شریر اور نڈر سا حماد یاد آگیا۔ اور خوشی بھی ہوئی کہ نئے حماد کے اندر ابھی تک پُرانا حماد زندہ ہے ——"

آمنہ کو شرما کر چُپ ہوتے دیکھ کر حماد اور نرم پڑ گیا اور بڑی محبت سے بولا ——

"منوں! تجھے یاد ہے۔ تو نے ایک مرتبہ مجھے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا ——؟" آمنہ نے پلکیں اُٹھائیں ..... کتنی ہی باتیں کہی تھیں .... اب وہ کس کس کو ذہن میں لاتی۔

"جب میں نے تجھے بتایا تھا کہ تین پشتوں سے ہمارے خاندان میں ایک ہی لڑکا چلا آتا ہے۔ تو تُو نے کہا تھا۔"

"اب یہ رسم بدل جائے گی۔ آپ کے ہاں دو بیٹے ہوں گے۔"

"سچ ——؟" میں نے خوشی سے پوچھا تھا۔

"ہاں سچ ——" تم نے بڑے وثوق سے مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور میں نے تمہارے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ اور جلدی سے کہا تھا۔ میں نے تو نام بھی سوچ لئے ہیں —— ایک کا نام فواد احمد اور دوسرے کا جواد احمد ——"

"شیخ چلی ——" تم نے حسبِ عادت میرا مذاق اڑایا تھا۔ اور پھر کہا تھا۔

"ایک لڑکی بھی ہوگی جناب۔ اُس کا نام بھی ابھی سے سوچ لیں ——"

اور میں نے کہا تھا —— "بھئی لڑکی کا نام تم اپنی مرضی سے رکھ لینا۔ آخر تم ماں ہو۔ تمہیں بھی تو کوئی حق ملنا چاہیئے۔ کیا یاد کرو گی؟"

پھر کتنے دن تک میں تمہیں سب کے سامنے چھیڑ دیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا ——

"منوں! تم نے کوئی نام سوچا ——؟"

اور تم سب کی موجودگی کو محسوس کر کے گھبرا جایا کرتی تھیں۔ دُور دُور سے مجھے آنکھیں دکھاتی تھیں۔ اور چُپ رہنے کو کہتی تھیں۔ ایک بار خالہ جان نے پلٹ کر پوچھ لیا تھا۔ "بھئی کیسا نام ——؟"

تو تم جلدی سے بول پڑی تھیں۔

"امّی انہوں نے ایک آرٹیکل لکھا ہے۔ اور نام مجھ سے پوچھ رہے ہیں ——؟"

تمہاری حاضر دماغی کی میں نے داد دی تھی۔ مگر بعد میں تم نے مجھ سے وہ لڑائی لڑی کہ میں نے ایسے سوال کرنے سے توبہ کر لی تھی۔

"یاد ہے تمہیں منوں ...؟" حماد نے پھر پوچھا۔

آمنہ کا دِل بھر آیا —— حماد کو ذرا ذرا سی تفصیل یاد تھی —— خود آمنہ کو بھی یہ بات یاد تھی، اسے تو اس زمانے کی ایک ایک بات یاد تھی —— اور ہر بات اُس نے ذہن میں کئی بار دہرائی بھی تھی .....

اور اب ... ظالم پھر ماضی کے اوراق الٹا رہا تھا....

"بولو —— منوں بتاؤ ——" اُس نے قریب آکر آمنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ——

"مجھے کل بھی تمہاری بات کا یقین تھا۔ اور آج بھی ہے۔ تمہاری ہر بات میرے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے تو میں نے پہلے ہی دن 'اٰمنّا و صدّقنا' کہہ دیا تھا۔"

"مجھے یقین ہے".... وہ سرگوشی میں بولا —— میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوگی.... اور وہ تم سے ہوں گے۔

تم —— صرف تم میرے بچوں کی ماں کہلانے کے قابل ہو۔

بتاؤ نا ؟ مجھے فواد اور جواد کب دے رہی ہو —— میں اب بوڑھا ہونے لگا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اولاد کی حسرت دل میں ہی رہے۔ بتاؤ نا ....“ اُس نے آمنہ کو جھنجھوڑا ——

آمنہ چھم چھم رونے لگی ——

حماد چُپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ پتھر کو جونک لگ چکی تھی۔ شاید یہ اُس کے دل کا آخری غبار ہو ——

وہ کافی دیر تک روتی رہی —— اور حماد اُس کے آنسو پونچھتا رہا ——

پھر جب ذرا آنسوؤں کی طغیانی کم ہوئی تو بولا۔

”میرے خیال میں تم نے ابھی تک لڑکی کا کوئی نام نہیں سوچا ہوگا۔ چلو یہ مشکل بھی میں ہی حل کئے دیتا ہوں —— اب تمہیں کیا تکلیف دوں —— ہم اپنی پیاری بیٹی کا نام زلیخا رکھیں گے —— ہے نا ؟ —— اچھا نام ہے نا ؟ ——“

آمنہ نے جب اپنی آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر حیرت سے حماد کے چہرے کو دیکھا۔ تو وہ بے حد سنجیدہ بنا بیٹھا تھا۔

اُس کے انداز پر روتی روتی آمنہ کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ اُس کا دل چاہا آج اُسے پھر شیخ چلی کہے —— مگر اُس نے مُنہ پھیر لیا —— اور اندر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی ——

”منہ اُدھر کیوں پھیر رہی ہو منّوں ....“ حماد بھی اُس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا...

جب آمنہ نے کچھ جواب دیئے بنا جانے کے لئے قدم اٹھائے —— تو حماد اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ——

پھر اُس نے لرزتی ہوئی آمنہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا .... اور اپنے سینے سے

لگا لیا .....

اور دونوں کو آج سے بہت عرصہ پہلے کی ایک رات یاد آ گئی ——

محبّت کی امین وہ رات ——

جب دلوں پر وصل کا انکشاف ہوا تھا ——

لوگ کہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ جذبے مر جاتے ہیں۔ نہیں تو ——

وہ دونوں تو آج بھی اسی قسم کے احساسات سے دوچار تھے۔ اُن کے ارد گرد الاؤ سے سُلگنے لگے —— حماد کے مضبوط ہاتھوں کا لمس اور آمنہ کا دھک دھک کرتا ہوا دل —— وہ زبردست حقیقتیں تھیں۔ ——

”تم ابھی تک وہی ڈرپوک چڑیا ہو ....“ حماد نے اُس کے کان میں سرگوشی کی —— تو آمنہ کو جیسے ہوش آ گیا ——

نظریں بچا کر جانے لگی تو حماد بولا۔

”آج بھی مجھے شیخ چلی کہتی جاؤ ....“

”آج ——“ آمنہ رُک گئی ——

”آج شیخ چلی نہیں کہوں گی۔“

”کیوں —— ؟“

”کیونکہ —— !“ لیکن فقرہ پورا کرنے سے پہلے وہ زار و قطار رونے لگی۔

”منّوں ....“ حماد نے اُسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑا .... ——

”حماد .... اس ایک آخری لمحے کے آگے مَیں ہار گئی ہوں۔ حماد —— ... آج کے بعد ہر خواب حقیقت میں ڈھل جائے گا۔ میری کہی ہوئی ہر بات اور تمہاری ہر تمنّا پوری ہوگی۔

تمّت بالخیر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام